اسلام کا نظامِ سلام ومصافحہ

تالیف

محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی

خادم الحدیث والافتاء دارالعلوم حیدرآباد

وسابق معین المدرسین دارالعلوم دیوبند

ناشر

شعبۂ نشرواشاعت دارالعلوم حیدرآباد

○

○

نام کتاب	:	اسلام کا نظامِ سلام ومصافحہ
مولف	:	محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی
		(خادم الحدیث والافتاء دار العلوم حیدر آباد)
		(وسابق معین المدرسین دار العلوم دیوبند)
سنِ اشاعت	:	۱۴۳۶ھ - ۲۰۱۵ء
تعدادِ صفحات	:	۵۰۲
کمپیوٹر کتابت	:	محمد بُشیر معروفی قاسمی (دار العلوم حیدر آباد)
قیمت	:	225/=
ناشر	:	جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدر آباد، شیورام پلی، حیدر آباد 500052

ملنے کے پتے

(۱) محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی (دار العلوم حیدر آباد) موبائل: 07207326739

(۲) مکتبہ سنابل، مغل پورہ، حیدر آباد، موبائل: 09347024207

(۳) مکتبہ ابن کثیر، پانی کی ٹنکی، مغل پورہ، حیدر آباد، موبائل: 09346603305

فہرست کتاب

عناوین | صفحہ

چھٹا باب: رُموزِ سلام ۲۴۶-۲۸۶

گیارہواں باب: سلام کے وقت کھڑے ہونے کا بیان ۴۵۰-۴۷۴

﴿بارہواں باب: درود وسلام کا بیان﴾ ۴۷۵-۴۹۴

انتساب

☆	اُن تمام مشفق ومکرم اساتذۂ کرام کے نام......جن کے سامنے راقم الحروف نے زانوئے تلمذ وادب تہ کیا۔
☆	اُن تمام اداروں کے نام......جہاں راقم الحروف نے کچھ سیکھا؛ بالخصوص دارالعلوم حیدرآباد کے نام جہاں یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی۔
☆	اپنے مرحوم والدین کے نام......جن کی مخلصانہ دعائے سحر گاہی کی وجہ سے ہر مشکل آسان معلوم ہوئی۔
☆	اپنے برادرِ مکرم محمد شمشیر عالم کے نام......جن کی سرپرستی ہر طرح کے سکون واطمینان کا ذریعہ ہے۔
☆	اُن تمام محبین ومخلصین معاونین کے نام......جن کی دعاؤں اور تعاون سے یہ کتاب شائع ہوئی یا آئندہ ہوگی۔

جزاهم الله أحسن الجزاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

یہ کتاب متعلقہ موضوع پر ماخذ ومرجع ثابت ہوگی

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، جس کی تعلیمات زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہیں، عقائد ہوں یا عبادات، معاشرت ہو یا اخلاقیات، صنعت وحرفت ہوں یا تجارت ومعاملات، ہر موقع اور ہر موڑ پر اسلام کی روشن تعلیمات اور واضح ہدایات انسان کی رہنمائی کرتی ہیں۔ اور اُسے وہ راستہ سُجھاتی ہیں جو اُس کی فطرت سے ہم آہنگ، اُس کے دل کی آواز اور اُس کے اندرون کا تقاضا ہوتا ہے کہ یہ راستے اُسی ذات عالی کے بتائے ہوئے ہیں جس نے خود انسان کو وجود بخشا ہے۔

انسانوں کی باہمی ملاقات کے موقع پر سلام ومصافحہ ! بھی اسلام کے جامع اور مکمل نظام حیات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں، اور اِس سلام ومصافحے کے تعلق سے بھی ایک جامع اسلامی نظام موجود ہے، کہ سلام کیسے کیا جائے؟ اُس کے الفاظ کیا ہوں؟ اُس کے مواقع کیا ہیں؟ جوابِ سلام کیوں کر ہوگا؟ مصافحہ کیسے کیا جائے؟ کب کیا جائے اور کب نہ کیا جائے؟ نیز مصافحہ دونوں ہاتھ سے کیا جائے یا ایک ہاتھ بچا کر رکھا جائے؟ وغیرہ وغیرہ۔

آج مذہب بے زاری، دین سے دوری اور مغرب کی اندھی نقالی کے اِس دور میں جہاں دین سے ناواقفیت وبا کی طرح پھیلتی جارہی ہے، مسلم معاشرہ کے عام افراد سلام ومصافحہ کے بنیادی اسلامی آداب سے بھی بے خبر ہوتے جارہے ہیں۔ اُنہیں نہ تو سلام کی اہمیت کا پتہ ہے اور نہ ہی اُس کی فضیلت کا علم؛ نتیجتاً وہ اِس مہتم بالشان اسلامی شعار کو چھوڑ کر غیروں کا طریقہ اپنا رہے ہیں، اِن

حالات میں ضرورت ہے کہ دین کے دیگر گوشوں کی طرح سلام ومصافحہ جیسے اہم اسلامی شعار کی طرف بھی عام مسلمانوں کو توجہ دلائی جائے، اِس کی اہمیت اجاگر کی جائے، اِس کی فضیلت بتائی جائے، اِس کے ڈھنگ سکھائے جائیں اور اسلامی نظام سلام ومصافحہ کی برتری دلوں میں بیٹھائی جائے۔

مقامِ خوشی ہے کہ نوجوان فاضل عزیزم مفتی محمد تبریز عالم صاحب قاسمی سلمہ اللہ تعالیٰ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور انتہائی بسط وتفصیل سے اسلام کے نظام سلام ومصافحہ پر بحث کی ہے، راقم الحروف کی محدود معلومات کی حد تک اس موضوع پر اتنی مفصل کوئی کتاب اردو میں موجود نہیں ہے۔

کتاب میں آیات واحادیث کی روشنی میں سلام ومصافحہ کی اہمیت، فضیلت، مسائل اور احکام وآداب، نیز دیگر ادیان ومذاہب کے نظام سلام پر اسلامی سلام کی برتری وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب متعلقہ موضوع پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے مآخذ ومرجع ثابت ہوگی، ان شاء اللہ۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ نوجوان مؤلف کی اِس کاوش کو قبول فرمائیں، اِس کا نفع عام فرمائیں اور مؤلف کو دینِ متین کی مزید خدمات کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔ فقط

سعادت علی قاسمی

ریاض العلوم گوریني، جونپور

(شیخ الحدیث وصدر المدرسین مدرسہ ہذا)

۱۳ محرم الحرام ۱۴۳۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

اب تک اس موضوع پر ایسی جامع اور وقیع کتاب نہیں آئی

الحمد للہ رب العالمین، والصلاة والسلام علی أشرف الأنبیاء والمرسلین، محمد بن عبد اللہ الأمین، وعلی آلہ وصحبہ أجمیعن، وعلی من تبعھم بإحسان إلی یوم الدین!. أما بعد!.

سلام ایک دوسرے سے ملاقات، تعارف، شناسائی اور تعلق ومحبت حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے، اس روئے زمین پر جب سے انسان آباد ہوئے، اُسی وقت سے دنیا کی قوموں میں سلام وتحیہ کا رواج ملتا ہے؛ البتہ اُس کے طریقے مختلف رہے، کوئی قوم سینے پر اپنے دونوں ہاتھ باندھ لیتی، کوئی قوم اپنا سر جھکا دیتی، کوئی قوم بڑوں کے سامنے سجدہ کر کے ادب وتحیہ کا مظاہرہ کرتی، یہودی قوم سلام کے لیے انگلیوں کے ذریعہ اشارہ کرتے، نصاریٰ اپنی ہتھیلیوں کے ذریعہ اشارہ کرتے، یعنی سلام کے لیے کوئی لفظ نہیں بولتے، بعد میں اِس کے لیے الفاظ بھی بولنے لگے، انگریزوں نے گڈ مورننگ اور گڈ نائٹ کہنا شروع کیا تو اہلِ ہنود کے یہاں رام رام، نمستے، نمشکار، پرنام، جے رام جی وغیرہ کہا جاتا ہے۔

مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام کلمات میں کوئی معنویت، کوئی گہرائی اور جامعیت نہیں؛ کیوں کہ یہ سب بندوں کے ایجاد کردہ کلمات ہیں، اِن کے برخلاف اسلامی سلام یعنی ''السلام علیکم'' کو دیکھا جائے تو یہ کلمہ بے شمار خوبیوں سے بھرا ہوا ہے، الفت ومحبت، انسیت وتعلق، انسانی تعظیم وتکریم اور خیر اندیشی کے لیے اِس سے زیادہ جامع کوئی کلمہ تصور نہیں کیا جاسکتا، یہ انتہائی جامع دعائیہ کلمہ ہے، یہ اللہ کا انعام ہے، اِس میں سلامتی کی دعا ہے، اِس میں شفقت اور پیار

ومحبت بھی ہے، اِس میں تعلق بھی ہے، تذکیر بھی ہے، اِس میں ایک طرح کا معاہدہ بھی ہے کہ ہماری زبان سے، ہمارے ہاتھ سے آپ کو اذیت وتکلیف نہیں پہونچے گی، اِس میں حسد وکینہ کا ازالہ بھی ہے، آپس کی دوری اور بے گانگی اِس کے ذریعہ ختم ہوجاتی ہے، مَن وتُو کا فرق اٹھ جاتا ہے اور اِس کلمہ میں شرک کی کوئی آمیزش نہیں۔

عزیز محترم مولانا مفتی محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی سلمہ کو اللہ تعالیٰ بہت بہت جزاءِ خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے ''اسلام کا نظامِ سلام ومصافحہ'' کتاب لکھ کر امت پر بڑا احسان فرمایا، اپنے موضوع پر بہت شاندار کتاب لکھی، سلام ومصافحہ کے تمام مالہ وماعلیہ کو بڑے سلیقہ کے ساتھ جمع فرمایا، سلام کی حقیقت، اس کی اِفادیت، اُس کے مواقع، اُس کا اجروثواب اور اس سے متعلق بے شمار مسائل مستند کتابوں کے حوالوں کے ساتھ یکجا کردیا، یہ کتاب اپنے بہت سے کارآمد عناوین، جاذب نظر مواد اور گراں قدر اوصاف کی حامل ہے، اب تک اس موضوع پر ایسی جامع اور وقیع کتاب نہیں آئی۔

اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کی اِس کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے اور اُنھیں اپنی شایانِ شان پوری امت کی طرف سے بہت بہت جزاءِ خیر عطا فرمائے، اِس کتاب کے فیض کو اور اِس کی نافعیت کو عام تام بنائے اور عزیز موصوف کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین ثم آمین۔

حبیب الرحمٰن خیرآبادی عفا اللہ عنہ

مفتی دارالعلوم دیوبند

۶؍ربیع الاول ۱۴۳۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعائیہ کلمات

سلام ومصافحہ کے موضوع پر قابلِ قدر کتاب

عزیز محترم مولانا محمد تبریز عالم قاسمی استاذ دارالعلوم حیدرآباد نے اسلامی آداب میں سلام ومصافحہ کے موضوع پر قابلِ قدر کتاب تصنیف کی ہے، اُنھوں نے ازراہِ کرم مسوّدے کے اوراق راقم کے پاس بھی ارسال کیے اور اُن پر اظہارِ رائے کے لیے فرمائش بھی کی۔

بندہ ضعفِ بصارت اور کم ہمتی کی وجہ سے موصوف کے حکم کی تعمیل نہ کرسکا؛ لیکن محترم المقام حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی زید مجدہم، صدر دارالافتاء دارالعلوم دیوبند نے کتاب دیکھ کر نہایت وقیع الفاظ میں تقریظ تحریر فرمائی ہے۔

اِس لیے کہا جاسکتا ہے کہ کتاب سلام، مصافحے اور معانقے وغیرہ کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہے اور اِس اِسلامی ادب میں بعض علاقوں یا بعض طبقات میں جو خامیاں پیدا ہوگئی ہیں، اُن کی بھی نشان دہی کی گئی ہے؛ تاکہ اہلِ اسلام سنتِ نبوی کے مطابق اُن قیمتی آداب پر عمل کریں۔

کتاب کے آخر میں روضۂ اقدس پر صلوۃ وسلام پیش کرنے کے آداب کا اضافہ بھی قابلِ قدر اور لائقِ ستائش ہے۔

بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مولف محترم اپنے مقصد میں کامیاب ہیں، راقم الحروف دعا گو ہے کہ پروردگارِ عالم اپنے فضل وکرم سے مزید علمی خدمات کی توفیق عطا فرمائے، علم وعمل میں ترقیات سے نوازے اور کتاب کو اپنی بارگاہ میں حسنِ قبول اور مسلمانوں کے درمیان قبولِ عام کی دولت سے سرفراز کرے، آمین۔

والحمد لله أولا وآخرا

ریاست علی بجنوری غفرلہ

خادم تدریس دارالعلوم دیوبند

۴؍ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حوصلہ افزائی

ایک بے نظیر کتاب

نحمده ونصلي على رسوله الكريم أما بعد!

حضور اکرم ﷺ کو جو شریعت دی گئی ہے وہ آخری زمانے تک جاری رہنے والی شریعت ہے اور عالمی سطح پر ہر علاقہ ہر ملک کے لوگوں کے لیے یکساں ہے، اسی بناء پر آپ ﷺ کو خاتم الانبیاء والرسل قرار دیا گیا ہے اور آپ ﷺ کی شریعت کو بھی مکمل شریعت بتایا گیا ہے، جس میں اب کوئی ترمیم نہیں ہوگی، حضور اکرم ﷺ کی لائی ہوئی شریعت مکمل ہے اور سارے انسانوں، زمانوں اور آئندہ آنے والے انسانوں کے حالات کے لحاظ سے تا قیامت باقی رہنے والی شریعت ہے؛ اِس لیے اس سے واقف ہونا اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا لازم قرار دیا گیا ہے۔

انسان مدنی الطبع ہے، اس کی فطرت میں باہمی میل جول اور انس وتعلق داخل ہے، جب وہ ایک دوسرے سے ملتا ہے تو اظہار تعلق کی خاطر کچھ نہ کچھ جملے ضرور ادا کرتا ہے، یہ نہ صرف زمانۂ جاہلیت بلکہ موجودہ دور کی دوسری تہذیبوں میں بھی بوقت ملاقات رائج ہے؛ لیکن ان سب کا مفہوم نہایت محدود؛ بلکہ بسا اوقات مبہم و بے معنی سا لگتا ہے، زمانۂ جاہلیت میں سلام کے بجائے حياك الله یا أنعم صباحا کہنے کا رواج تھا، ہمارے معاشرہ میں بھی بعض مرتبہ السلام علیکم بندگی کہا جاتا ہے اور اس کے جواب میں بڑے بوڑھوں کی زبان پر وعلیکم السلام کے بجائے ''جیتے رہو'' چڑھا ہوا ہے، یہ کوئی دعا نہیں ہے، جینے کو تو ہزاروں جیلوں اور ہسپتالوں میں بھی جی رہے ہیں؛ لیکن کیا یہ واقعی جینا ہے؟ اسی طرح صبح بخیر میں صرف سلامتی کا تذکرہ ہے، دوسرے اوقات کے بارے

میں یہ جملہ خاموش ہے، یہی حال گڈ نائٹ (Good Night)، گڈ ایوننگ (Good Evening)، گڈ آفٹر نون (Good Afternoon) اور گڈ مارننگ (Good Morning) کا ہے، جن میں سے ہر ایک پورے دن کے بجائے ایک خاص وقت کی بہتری اور خوبی کے لیے مخصوص ہے، اور اگر قرائن اور عرف عام کا سہارا نہ لیا جائے تو بظاہر ان الفاظ کا مخاطب سے کوئی جوڑ اور ربط بھی نہیں ہے، نمستے یا نمشکار کا مفہوم اور زیادہ غیر واضح ،مبہم اور بے معنی ہے، اس میں کہنے والا مخاطب کی سلامتی کی دعا کرنے کے بجائے اس کی پرستش کی بات کرتا ہے۔

جب کہ اسلام کے متعین کردہ دو بول السلام علیکم نہایت جامع ، پرمغز اور باوزن ہیں، اس میں لفظ السلام اسم ہے جو دوام واستمرار کو چاہتا ہے، اس طرح السلام علیکم کہنے والا دراصل یہ کہتا ہے کہ شب وروز کے ہر لمحے اور زندگی کے ہر موڑ پر اور نہ صرف اس دنیائے دوں میں بلکہ قبر و برزخ اور پھر حشر ونشر کی زندگی میں ہمیشہ ہمیش تمہارے لیے سلامتی ہو۔قرآن پاک میں سلام کرنے اور اس کا جواب دینے کا ایک اصول بیان کیا گیا ہے: وَإِذَا حُيِّيْتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّواْ بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا (النساء:۸۶) کہ جب تمہیں سلام کیا جائے تو اُس کا جواب اچھے الفاظ میں دو؛ ورنہ کم از کم اُسی جیسا جواب دو، آپ ﷺ نے اپنے عمل سے اِس کی وضاحت یہ فرمائی کہ ایک صحابی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے السلام علیکم کہا تو جواب میں آپ نے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ فرمایا، پھر دوسرے صحابی آئے اور انہوں نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا تو آپ نے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ فرمایا، پھر ایک تیسرے صحابی آئے اور انہوں نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا تو آپ نے جواب میں فرمایا وعلیکم ،عرض کیا گیا کہ حضور ﷺ! آپ نے پہلے دو حضرات کے سلام کے جواب میں جس طرح اضافہ فرمایا، اس تیسرے صاحب کے جواب میں ایسا نہیں کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص نے اضافہ کے واسطے ہمارے لیے کچھ چھوڑا ہی نہیں؛ اس لیے ہم نے اسی پر اکتفاء کیا۔(تفسیر ابن کثیر)

سلام کوئی رسمی بول نہیں ہے؛ بلکہ یہ درحقیقت امن وسلامتی کا پیغام ہے اور سلام کرنے

والا اپنے مخاطب کو یہ پیغام دیتا ہے کہ تم میری طرف سے اپنی جان ومال کے بارے میں مطمئن رہو اور پھر دوسرا بھی پلٹ کر پہلے کو یہی اطمینان دلاتا ہے، سلام کی یہی وہ اہمیت وعظمت ہے کہ بعض صحابہ کا مشن اوراوڑھنا بچھونا فروغ سلام بن کررہ گیا تھا، اوروہ بازاروں اورکوچوں میں صرف سلام کی خاطر جایا کرتے تھے، سلام کا تکملہ مصافحہ ہے اور معانقہ ہے، اس سے بھی اظہار یگانگت اور آپسی محبت وتعلق میں اضافہ ہوتا ہے۔

بڑی مسرت کی بات ہے کہ مولانا مفتی محمد تبریز عالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم جو دارالعلوم حیدرآباد کے ذی استعداد اور مقبول اساتذہ میں ہیں اور سنجیدگی ومتانت میں اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں، آپ نے اسلامی آداب میں سلام اور مصافحہ ومعانقہ کے موضوع پر قابل قدر اور تفصیلی کتاب تصنیف کی ہے جو قوتِ استدلال اور اس باب کی جزئیات کے احاطہ کے لحاظ سے ایک بے نظیر کتاب ہے، مزید خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ تحقیقی کتاب اسی ادارہ میں اور اسی کے منظّم کتب خانہ سے مراجعت کے بعد مکمل ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی محنت کو بارآور فرمائے اور امت مسلمہ کو اس سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

محمد رحیم الدین انصاری
ناظم دارالعلوم حیدرآباد

۸/۵/۱۴۳۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمۃ المولف

دنیا میں موجود مختلف ادیان وملل میں، دینِ اسلام ہی ایسا واحد مذہب ہے، جس نے انسان اور انسانیت سے متعلق ہر شعبے میں مکمل اور لائقِ تقلید رہنمائی فرمائی ہے، تعلیماتِ اسلام کی افادیت وآفاقیت کو کوئی دوسرا مذہب چیلنج نہیں دے سکتا، اسلام نے اجتماع وارتباط اور الفت ومحبت کی جتنی شکلیں بتائی ہیں، اُتنی شکلیں کسی اور مذہب نے نہیں بتائی، روزانہ پانچ وقت باجماعت نماز، ہفتے میں ایک روز جمعہ کی شکل میں ایک بڑا اجتماع، اور اس سے بھی بڑا اجتماع عیدین کے موقع پر، یہ سب اجتماع وارتباط کی اہمیت وافادیت پر دال ہیں۔

آپسی الفت ومحبت، اسلام کا ایک اَبدی پیغام ہے، جو معاشرہ، سماج اور ملک کی شیرازہ بندی کا ذریعہ ہے، الفت ومحبت کے طور طریقے اور اسباب وذرائع مختلف ہوسکتے ہیں؛ چناں چہ اسلام کی تعلیم وتربیت اور اخلاق وآداب میں محبت ومودت کے مختلف اسباب وذرائع کی نشان دہی کی گئی ہے؛ تاکہ انھیں اپنا کر الفت ومحبت کی پُر لطف فضا قائم کی جاسکے، بوقتِ ملاقات، اسلامی سلام، مصافحہ اور معانقہ کی تعلیم، درحقیقت اسی پیغامِ محبت کو عام کرنے کا ایک موثر اِقدام ہے؛ چناں چہ اس پیغامِ محبت کا ایک پُر اثر نظام ہے، جس سے مکمل طور سے واقفیت ہر مسلمان کے لیے نہایت ضروری ہے۔

ضروری تھا اور ہے کہ اسلامی سلام ومصافحہ کو برت کر، اِس پیغامِ محبت کی اِشاعت میں حصہ لیا جائے، اللہ کے پیارے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: أفشوا السلام بينكم کہ آپس میں سلام کو رواج دو، اِس کا چلتا ہوا اور ثانوی درجے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نظامِ سلام ومصافحہ کی آیات وروایات، روایتی تشریحات اور فقہی تصریحات کی اشاعت بھی کی جائے، رسائل ومضامین

کی شکل میں یا تصنیف وتالیف کی صورت میں یا پھر جدید ذرائع اِبلاغ اختیار کر کے؛ بہر صورت اِس پیغام کو عام وتام کیا جائے، پیشِ نظر تالیف ''اسلام کا نظامِ سلام ومصافحہ'' اسی مِشن کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے اور اسی تحریک کی ایک کڑی ہے۔

تقریبِ تالیف

بات ۲۰۰۹ء کے اوائل کی ہے جب راقم الحروف دار العلوم دیوبند میں شعبۂ تدریب المعلمین (معین مدرسی) سے وابستہ تھا، اُس وقت راقم نے پندرہ صفحات پر مشتمل ایک مضمون بنام: ''سلام اسلامی تہذیب کا اٹوٹ حصہ'' تیار کیا تھا، جو ماہنامہ ''ریاض الجنۃ'' دسمبر ۲۰۰۹ء تا فروری ۲۰۱۰ء کے شمارے میں قسط وار اور ماہنامہ ''ترجمانِ دیوبند'' کے شمارہ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ مطابق جنوری ۲۰۱۰ء میں پورا مضمون شائع ہوا، اُس وقت اِس تعلق سے مزید کچھ لکھنے کا تقاضا تھا؛ لیکن ہمت نہ ہوسکی، اگر اُس وقت راقم الحروف سے کوئی یہ کہتا کہ تم کچھ سالوں کے بعد اِس موضوع کی تفصیلی کتاب کا پیشِ لفظ یا مقدمہ تحریر کروگے تو یقین مانیے، یقین نہیں آتا۔

۲۰۱۰ء کے اواخر میں مولف تدریسی ملازمت کے بہانے دار العلوم حیدرآباد پہنچ گیا، یہاں دار العلوم حیدرآباد میں تصنیف وتالیف کے عمومی ماحول اور یہاں کے کتب خانہ سے استفادہ کی آسانی کی وجہ سے، اُس سابقہ خیال کو مزید تقویت ملی کہ اب اِس موضوع پر کچھ لکھنا چاہیے؛ لیکن امروز فردا میں تین سال گذر گئے؛ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اِس دوران ''سلام اور متعلقاتِ سلام'' کے تعلق سے کچھ اشاریے اور شذرات جمع ہوگئے، ۲۰۱۴ء کے وسط میں بتوفیق الٰہی اِس کی ترتیب وتالیف کا بیڑا اُٹھالیا، نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

کیا اس موضوع پر لکھنا ضروری تھا؟

راقم الحروف کا پختہ ارادہ تھا کہ اگر اِس موضوع پر کوئی ایسی کتاب اردو میں پہلے لکھی جاچکی ہو جو سلام ومصافحہ اور معانقہ کے ضروری مسائل کے ساتھ ساتھ دیگر مضامینِ سلام کا بالتفصیل احاطہ کرتی ہو، اور مولف کے ذوق کے مطابق ہو تو پھر اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا جائے گا؛ مولف نے

اِس موضوع سے متعلق کتابوں کو اپنی ناقص حد تک خوب تلاش کیا؛ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اردو کیا عربی میں مستقل طور سے اس پر خاطر خواہ کام کم ہوا ہے؛ البتہ شروحِ احادیث اور فقہ وفتاویٰ میں غیر مرتب طور سے اچھا خاصا ذخیرہ نظر آیا، اور اِس موضوع سے متعلق کچھ خاص کتابیں بھی ملیں، جن کے اسماء فہرست مراجع میں لکھے گئے ہیں؛ لیکن اُن میں موضوع کا احاطہ نہیں تھا یا پھر سب کے لیے استفادہ آسان نہیں تھا، مولف راقم الحروف کے اِس ارادہ کو تقویت ملی کہ اِس ذخیرہ کو یکجا کر کے قومِ مسلم کے سامنے پیش کر دیا جائے، کام شروع کیا، راہ رو ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

دورانِ تلاشِ کتب، راقم الحروف کو دو کتابیں غیر مقلدین صاحبان کی ملیں، ''سلام کے احکام وفضائل'' اور ''سلام اور مصافحہ کے فضائل ومسائل''۔ اول الذکر میں سلام کے تعلق سے تفصیلی گفتگو کی گئی ہے؛ لیکن اس کتاب کا دوسرا حصہ فقہ حنفی کی تردید میں لکھا گیا ہے اور ثانی الذکر کتاب میں سارا زور اس پر لگایا گیا ہے کہ دو ہاتھ سے مصافحہ کرنا بالکل غلط ہے، راقم الحروف نے اُن اعتراضات کا جواب دینا بھی ضروری سمجھا، یہ بھی تالیفِ کتاب کی ایک اضافی اور ذیلی وجہ ہے۔

مولف کا کام

مولف راقم الحروف کو اپنی کم علمی، کم فہمی اور کم ہمتی کا پورا اعتراف ہے، زیرِ نظر تالیف، مولف کی جانب منسوب ہے؛ لیکن یہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی ایسی تحقیق ہے، جو اب تک قوم کے سامنے آنے سے رہ گئی تھی؛ بلکہ مولف نے کتبِ تفسیر، متونِ حدیث، شروح حدیث اور فقہ وفتاویٰ میں پھیلے ہوئے غیر مرتب مضامین ومسائل کو مرتب انداز میں یکجا کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، یعنی یہ دبستانِ تفسیر وحدیث اور گلستانِ فقہ وفتاوی سے منتخب کیے گئے چند پھول ہیں، جنھیں ایک گلدستہ میں سجا کر قارئین کے سامنے پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے، کمال پھولوں کا ہوتا ہے یا گلدستہ کا بتانے کی ضرورت نہیں۔

علمی اعتبار سے یہ دور تحقیق وتعلیق کا ہے، مولف نے اِس کی بھرپور کوشش کی ہے کہ کتاب اُسی معیارِ تحقیق وتعلیق کی ایک مثال بنے، کتاب میں موجود حوالوں کی کثرت کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنا

چاہیے۔

اگر کتاب اصولی انداز میں لکھی جاتی تو اِس کی ضخامت کم ہوتی؛ لیکن مولف کے مشفق اساتذہ کرام نے کتاب کا مسودہ دیکھ کر مشترکہ طور سے یہ تأثر ظاہر کیا کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر ''ماخذ ومرجع'' ثابت ہوگی؛ اِس بنیاد پر مولف نے حتی الامکان اصل کتابوں کی اصل عبارتوں کو کتاب میں جگہ دی ہے، لازمی طور سے ضخامت بڑھنی تھی اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی کہ مولف کو کچھ اپنی طرف سے لکھنا چاہیے، وہاں ہمت کرکے لکھ دیا گیا ہے۔

کتاب کا اجمالی تعارف

مذکورہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب: تاریخ وتحقیقِ سلام کے نام سے ہے، اِس باب میں سلام کی لغوی واصطلاحی تحقیق کے ساتھ، اُس کی تاریخی حیثیت سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا باب: آیاتِ سلام کے عنوان سے ہے، اِس باب میں سلام کے تعلق سے چوبیس آیات اور اُن کی مختصر تفسیر کا تذکرہ ہے؛ تاکہ امت کے سامنے یہ آسکے کہ قرآن میں، سلام کے حوالہ سے کیا مواد ہے، ضمنی طور سے اور بھی فوائد جمع ہوگئے ہیں۔

تیسرا باب: احادیثِ سلام کا ہے، اِس باب میں سلام کے فضائل ومسائل کے حوالے سے اکیس احادیثِ سلام کا تذکرہ کیا گیا ہے؛ احادیث کا سادہ ترجمہ پھر مناسب تشریح پیش کی گئی ہے، یہ باب نہایت اہمیت کا حامل ہے، اور عوام وخواص سب کے لیے یکساں مفید ہے۔

چوتھا باب: سلام کے احکام ومسائل پر مشتمل ہے، سلام اور جوابِ سلام کے متعلق مسائل کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، جن کا پڑھنا، جاننا اور اُن پر عمل کرنا ہر دیندار مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

پانچواں باب: ممنوعاتِ سلام کے عنوان سے ہے، اِس باب میں پانچ فصلیں ہیں، پہلی فصل میں اُن تمام مواقع کا تذکرہ کیا گیا ہے، جہاں سلام کرنا ممنوع یا مکروہ یا پھر غیر اولیٰ ہے، اِس فصل میں ضمنی طور سے، غیر مقلدین کے بے جا اعتراضات کے جوابات اصولی اور مثبت انداز میں لکھے گئے ہیں، اِس باب کی دوسری فصل نہایت اہم ہے، اِس میں غیر مسلم برادرانِ وطن اور یہود ونصاریٰ وغیرہ کے سلام اور جوابِ سلام کے مسائل تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، موجودہ ماحول میں اِن مسائل سے واقفیت ہر دیندار مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

اِس باب کی تیسری فصل میں، غائبانہ سلام و جوابِ سلام اور اِسی طرح تحریری سلام اور جوابِ سلام کے طریقہ کے تعلق سے ایک نفیس بحث پیش کی گئی ہے، اور اُس میں پائی جانے والی کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، دورانِ مطالعہ یہ احساس ضرور ہوگا کہ ایسے مسائل مرتّب انداز میں یکجا طور پر پہلی بار پیش کیے جارہے ہیں، اور چوتھی فصل میں موبائل اور ٹیلیفون پر سلام وجوابِ سلام کے تعلق سے مفید مسائل لکھے گئے ہیں؛ جب کہ پانچویں فصل میں قبرستان میں مُردوں کو سلام کرنے کے طریقے کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

چھٹا باب: رُموزِ سلام کے نام سے ہے، یہ خالص علمی باب ہے، سلام کے جملہ رموز واِشارات اور اَسرار ومصالح سے متعلق ایک عمدہ تحریر ہے، یہ دل چسپ علمی بحث پہلی بار سلام کی کسی اردو کتاب کا حصہ بن رہی ہے۔ فلله الحمد.

ساتواں باب: متفرقاتِ سلام کے عنوان سے ہے، اِس باب میں کیف ما اتفق، سلام کے مختلف پہلوؤں پر خامہ فرسائی کی گئی ہے، یہ بھی ایک دلچسپ باب ہے۔

آٹھواں باب: سلام کی اغلاط کے نام سے ہے، اِس باب میں، سلام میں در آنے والی بہت ساری غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کی گئی ہے؛ تاکہ اصلاح کی جاسکے۔

نواں باب: تکملۂ سلام کا ہے، اِس باب میں پانچ فصلیں ہیں، پہلی فصل میں مصافحہ کی لغوی وشرعی حقیقت بیان کرنے کے ساتھ، فضائل کی احادیث اور مصافحہ کے ضروری مسائل وفوائد لکھے گئے ہیں، اور دوسری فصل میں مصافحہ کی دعا سے بحث کی گئی ہے؛ جب کہ تیسری فصل میں ''مصافحہ ایک ہاتھ سے یا دونوں ہاتھ سے'' کی بحث ہے، اور غیر مقلدین کے نقطۂ نظر کی تحقیق کی گئی ہے اور اِس باب کی چوتھی فصل میں فجر وعصر اور عیدین کے بعد مصافحہ کے تعلق سے اکابر کے ارشادات وعبارات کی روشنی میں اصولی بحث پیش کی گئی ہے، اور آخری فصل میں مصافحہ کی تیرہ غلطیوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

دسواں باب: اِس میں دو فصلیں ہیں: پہلی فصل میں معانقہ کے تعلق سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے ہر طرح کے مسائل لکھے گئے ہیں؛ جب کہ دوسری فصل میں تقبیل (دست بوسی) کے مسائل تحریر کیے گئے ہیں، یہ بحث بھی پہلی بار مستقل طور سے سلام کی کسی کتاب کی زینت بن رہی ہے۔

گیارہواں باب: اس باب میں سلام کے وقت ''قیام'' کے حوالے سے، احادیث وفقہ کی روشنی میں ایک تحقیقی بحث پیش کی گئی ہے، اور ضمناً مروّجہ قیامِ میلادی کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

بارہواں باب: یہ باب حصولِ برکت اور کتاب کے تتمہ کے طور پر شامل ہے، اِس میں اختصار کے ساتھ درود وسلام سے متعلق قیمتی معلومات لکھی گئی ہیں۔

راقم الحروف نے کتاب کا نام ''اسلام کا نظامِ سلام ومصافحہ'' اِس لیے رکھا؛ تاکہ علمی حلقوں میں یہ تأثر پیدا نہ ہو کہ یہ صرف فضائل ومسائل پر مشتمل کتاب ہے؛ اِسی وجہ سے مذکورہ کتاب میں صرف مسائل پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے؛ بلکہ سلام کے جتنے گوشے ہو سکتے ہیں، اُن سب کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شکریہ نامہ

اِس کتاب کو قارئین کے ہاتھوں میں پہنچانے کے لیے کسی بھی طرح تعاون کرنے والے ہر ہر فرد کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے؛ خصوصاً اُن تمام کتابوں کے مولفین ومصنفین اور شارحینِ حدیث جن کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور بطور خاص حضرت الاستاذ مولانا سعادت علی قاسمی زید مجدہم (شیخ الحدیث وصدر المدرسین مدرسہ عربیہ ریاض العلوم جونپور) کا صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کرنا ضروری ہے، جن کی تربیتِ فکر اور توجہات ودعائیں مولف کے ہر تعلیمی وعلمی سفر میں ساتھ رہیں، اور جنھوں نے کتاب کا پورا مسودہ از اول تا آخر پڑھ کر مفید مشورے دیے اور غلطیوں کی اصلاح فرمائی فجزاهم الله تعالیٰ۔ اور مولف، حضرت الاستاذ مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی زید مجدہم (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) اور حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری دامت برکاتہم (سینئر استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند ومرتب ''ایضاح البخاری'') کا بے حد ممنون ہے کہ اِن حضرات نے اپنی تقاریظ سے کتاب کو زینت بخش کر مولف کی حوصلہ افزائی فرمائی، اِس کے ساتھ ساتھ مولف (موقع شناس، مردم شناس اور زندہ دل شخصیت) محترم مولانا محمد رحیم الدین انصاری صاحب (ناظم دارالعلوم حیدرآباد ورکن آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ) کا تہہِ دل سے شکرگزار ہے کہ انھوں نے پُرمغز تقریظ اور دعاؤں سے نوازا، اللہ اِن تمام حضرات کے سایہ کو ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔ (آمین)

مولانا عبدالکفیل حسامی اور مولانا بُشیر معروفی قاسمی صاحبان بھی شکریہ کے مستحق ہیں، اول الذکر نے بحیثیت ناظم کتب خانہ دارالعلوم حیدرآباد، متعلقہ کتب کی فراہمی میں وسعتِ ظرفی سے کام لیا؛ جب کہ ثانی الذکر نے کمپوزنگ کے مراحل کو صبر وتحمل کے ساتھ انجام دیا، اور دارالعلوم حیدرآباد کے اُن مخلص احباب اور طلبۂ افتاء کا بھی شکریہ، جنھوں نے مولف کا علمی تعاون کیا اور مفید مشورے دیے۔ فجزاهم الله تعالیٰ.

اعتراف ودرخواست

یہ بات مولف کے ایمان ویقین کا حصہ ہے کہ اُس ذات مقدس کے کرم وتوفیق کے بغیر کسی کے لیے ممکن نہیں کہ ایک لفظ بھی لکھ سکے، وہ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے بس لے لیتا ہے، یہ تالیف بھی اُسی ذات مقدس کے فضل وکرم کی ایک چھوٹی سی مثال ہے؛ ورنہ اپنی بے علمی، بے عملی اور بے بضاعتی کے ساتھ کسی علمی کام سے عہدہ برآ ہونا اپنے بس میں نہیں تھا، اِس کتاب میں جو کچھ قرآن وحدیث اور مسلک اہل السنۃ والجماعۃ اور اکابر کے ارشادات کے مطابق ہے، وہ اللہ کے بے پایاں فضل کا نتیجہ ہے، اور اگر اِس میں کوئی لفظی یا معنوی غلطی یا چوک ہے تو مولف کی کم علمی کی وجہ سے ہے، مولف کے جذبات کے صحیح ترجمان یہ دو شعر ہیں ۔

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

اخیر میں قارئین سے درخواست ہے کہ مولف کے مرحوم والدین کے لیے- اگر ممکن ہو- مغفرت ورفعِ درجات کے لیے دعا فرمائیں، آنکھیں نم ہیں؛ اگر آج وہ زندہ ہوتے، تو اپنی مخلصانہ سحر گاہی دعاؤں کا ادنیٰ اثر دیکھ کر نہایت مسرور ہوتے، اور اُن کی خوشی، مولف کے لیے قرار وسکون کا سامان ہوتا۔ (رب ارحمهما كما ربياني صغيرا)

اور یہ دعا ضرور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کتاب کو مولف کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے؛ ورنہ سرِ ورق نام کی اشاعت بے فائدہ ہے۔

والحمد لله أولًا وآخراً وما توفيقي إلا بالله

محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی (عفا اللہ عنہ) ۱۳ر جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ

مقیم حال: دار العلوم حیدر آباد ۳ر اپریل ۲۰۱۵ء (۱۰ر بجے شب جمعہ)

پہلا باب

﴿هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾

(الحشر:۲۳)

تحقیق وتاریخِ سلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلام کی لغوی تحقیق اور اس کے معنی

السلام علیکم میں لفظ "سلام" جو بطور تحیہ مسلمانوں میں رائج ہے، اس کی لغوی تحقیق کے بارے میں دو آراء ہیں: ایک رائے یہ ہے کہ "السلام" سلَّم باب تفعیل سے اسم مصدر ہے بمعنی سلامتی جیسے کَلَّمَ کلاماً میں کلاماً اسم مصدر ہے، یعنی تمام آفات سے سلامتی اور شر سے حفاظت (۱) خواہ دینی ہو یا دنیاوی، جانی ہو یا مالی، اور جنت کا ایک نام "دار السلام" اِسی وجہ سے ہے کہ وہ آفات سے سلامتی کا گھر ہے، قرآن میں ہے: لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِندَ رَبِّهِمْ (۲) (لسان العرب: س ل م)

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، اور اِس صورت میں بھی یہ اسم مصدر (۳) اور مصدر دونوں ہوسکتا ہے، اسم مصدر کی صورت میں مضاف محذوف ہوگا یعنی ذو السلام اور مصدر کی صورت میں اسم فاعل کے معنی میں ہوگا یعنی السالم کے معنی میں۔

قرآن میں بھی اللہ کے ناموں میں یہ نام مذکور ہے:

هُوَ اللَّهُ الَّذِيْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ (الحشر: ۲۳) اور امام بخاری نے اپنی کتاب میں "السلام من أسماء الله" کے عنوان

---

(۱) علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: السلام مصدر نعت به والمعنى: ذو السلامة من كل آفة ونقيصة، عمدۃ القاری: ۱۵/۳۵۰

(۲) (الانعام: ۱۲۷)

(۳) اسم مصدر: ایسا مصدر ہے جو اپنے فعل کے باب کے قیاسی وزن پر نہ ہو اور؛ اگر اپنے قیاسی وزن پر ہو تو اُسے مصدر کہیں گے؛ چنانچہ اگر أفعل (أكرم) کا مصدر إفعال، فعّل کا تفعیل آئے تو یہ مصدر ہے اور فعل کا مصدر فَعال کے وزن پر آئے تو اسم مصدر ہے، جیسے كَلَّمَ کا مصدر تكليم اور اسم مصدر "کلام" ہوگا؛ لہٰذا سَلَّمَ کا مصدر تسليماً اور اسم مصدر سلاماً ہوا، بدائع الفوائد: ۲/۱۳۷

سے ایک باب قائم کیا ہے، جس کے تحت یہ روایت نقل کی ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ جب ہم لوگ حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تو یوں کہتے: السلام علی اللّٰہ قبل عبادہ، السلام علی جبرئیل، السلام علی میکائیل، السلام علی فلان وفلان.....

یعنی اللہ پر اُس کے بندوں کی طرف سے سلام ہو، جبرئیل پر سلام ہو، میکائیل پر سلام ہو اور فلاں فلاں پر سلام ہو۔

جب حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: إن اللّٰہ ھو السلام یعنی "السلام علی اللّٰہ" مت کہو؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ خود "السلام" ہیں۔

(بخاری: ۶۲۳۰، کتاب الاستئذان)

ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

> وقوله ﷺ "إن اللّٰه ھو السلام" صریحٌ في کون السلام اسماً من أسمائه یعنی حضور ﷺ کا ارشاد "إن اللّٰہ ھو السلام" یہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ السلام اللہ کا نام ہے۔ (بدائع الفوائد: ۱۴۲/۲)

یعنی حضور ﷺ کا ارشاد "إن اللّٰہ ھو السلام" یہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ السلام اللہ کا نام ہے۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

إن السلام اسم من أسماء اللّٰه تعالی وضعه في الأرض، فأفشوا السلام بینکم. (الأدب المفرد، رقم الحدیث: ۹۲۵)

یعنی سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، جسے اللہ نے زمین میں رکھا ہے؛ لہٰذا تم آپس میں سلام کو خوب عام کرو۔

ایسی صورت میں "السلام" کا مطلب ہوگا: اللہ تعالیٰ ایسی ذات ہے جو حدوث وعیوب سے سالم ہے، اس کی صفات، نقائص سے محفوظ ہیں اور اس کے افعال، شر محض سے پاک ہیں اور اس معنی کی بنیاد پر "السالم" اسماء تنزیہہ میں سے ہوگا۔ (عمدۃ القاری: ۱۵/۳۵۱)

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے جتنے صفاتی نام ہیں اُن میں لفظ سلام، مذکورہ معنی کے اعتبار سے بڑا جامع اور کامل ومکمل ہے، اور خداوند قدوس نے اپنی ذات پر جتنے ناموں کا اطلاق کیا ہے، ان میں سلام ایک ایسا نام ہے، جس کا وہ سب سے زیادہ مستحق ہے؛ کیوں کہ اس کا مفہوم ہوا: اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں ہر طرح کے عیوب ونقائص سے پاک ہیں، اسی طرح صفات میں ہر طرح کے عیوب ونقائص سے محفوظ ہیں اور افعال میں بھی عیوب ونقائص، شر، ظلم اور بلا حکمت کسی فعل کے وقوع سے پاک ہیں، یہی تنزیہہ کی حقیقت ہے۔

فهو السلام من الصاحبة والولد، والسلام من النظير والكفء، والسلام من الشريك.

اور اسی بنیاد پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر آپ اللہ کی صفات کا جائزہ لیں گے تو ہر صفت میں سلامتی کا مفہوم پائیں گے، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں: اللہ کی صفت حیات، موت، نیند اور اونگھ سے محفوظ ہے، صفت قدرت، تھکن اور پریشانی سے محفوظ ہے، صفت علم، نسیان، غور وفکر سے محفوظ ہے، صفتِ کلام، جھوٹ اور ظلم سے سالم ہے، صفتِ غنا دوسروں کے سامنے کسی بھی درجے میں محتاجگی سے سالم ہے، یہ چند مثالیں ہیں، آپ غور کریں اللہ کا یہ نام "السلام" اپنے اندر تنزیہہ کے معانی کا ایک سمندر رکھتا ہے اور بقول ابن قیمؒ: کتنے لوگ ہیں جنہوں نے لفظ "السلام" کو یاد کیا تو اس کی برکت سے کتنے نامعلوم، بے حد وشمار اَسرار ورُموز اور معانی وحِکَم کے موتیوں تک رسائی حاصل کر لی، یہ بحث جو ایک علمی بحث ہے مالہ وما علیہ کے ساتھ بدائع الفوائد میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (بدائع الفوائد: ۲/۱۳۵)

حافظ ابن حجرؒ نے ابن دقیق العیدؒ سے نقل کیا ہے کہ السلام: بمعنی سلامتی کے بھی آتا ہے اور بمعنی تحیۃ کے بھی؛ جب کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ (فتح الباری:۱۳/۱۸)

راجح بات: مسلمانوں کے سلام وتحیہ کی اصل قرآن کی آیت اور بہت ساری روایات کی روشنی میں یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے(۱) جیسا کہ ابن مسعود اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی روایات سے معلوم ہوا، نیز علامہ بیہقیؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت ذکر کی ہے: لأنه اسم الله وهو تحية أهل الجنة (شعب الایمان، رقم الحدیث:۸۴۴۹)

ابن بطالؒ لکھتے ہیں:

ولمّا كان السلام من أسماء الله، لم يجز أن يقال: السلام على الله، وجاز أن يقال: السلام عليكم؛ لأن معناه: الله عليكم. یعنی لفظ سلام اللہ کا نام ہے؛ لہٰذا "السلام على الله" غلط ہے اور "السلام عليكم" صحیح ہے۔ (شرح ابن بطال:۹/۹)

سلام تحیہ کا مفہوم

السلام عليكم کا معنی اللہ تعالیٰ کے نام ہونے کے لحاظ سے یہ ہوا کہ: الله رقيب عليكم اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ونگہبان رہے كلأ الله عليك وحفظه. تم اس کی حفاظت میں رہو، اس کے نام کی برکت تم پر نازل ہو، جس طرح کہا جاتا ہے: الله معك ومصاحبك. اللہ تعالیٰ تمہارا ساتھی ہو، وہ تمہارے ساتھ ہو۔ (عمدۃ القاری:۱۵/۳۵۱)

اور اگر "السلام" اسم مصدر بمعنی سلامةً (سلامتی) کے ہو تو پھر سلام تحیہ کا مفہوم ہے، سلامةُ اللهِ عليكم. اللہ کی سلامتی تم پر ہو، اور تم ہمیشہ سلامت رہو۔

---

(۱) فائدہ: ذكر محمد بن يزيد: أن السلام في لغة العرب، أربعة أشياء: (١) فمنها سلمتُ سلاماً مصدر سلَّمت (٢) منها السلام جمعُ سلامة (٣) ومنها السلام اسم من أسماء الله تعالىٰ (٤) ومنها السلام شجر (لسان العرب س ل م) ولم يرد في القرآن غالبا إلا منكرا، أيضا.

والسلام هو اسم الله، فالمعنى اسم الله عليكم أي أنت في حفظه. وقيل: السلامة أي السلامة مستعلية عليك، ملازمة لك. (ارشاد الساری:۱۳/۲۲۹)

علامہ بیہقیؒ نے ایک مفہوم یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جیسے بسم اللہ سے برکت وسعادت کے حصول کی خواہش کی جاتی ہے، اور جو اس کا مفہوم ہے، وہی مفہوم "السلام علیکم" کا ہے، سلام کرنے والا جان ومال اور آل واولاد میں برکت کی دعا دیتا ہے۔

وقد قيل: معناه اسم السلام عليكم أي اسم الله عليكم أي كانت فيكم البركة ولكم اليمن والسعادة كما فيما ذكر بسم الله. (شعب الایمان:۶/۵۱۳)

ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

"السلام علیکم" دو معانی پر مشتمل ہے، "السلام" اللہ تعالیٰ کے نام ہونے کے لحاظ سے اللہ کا ذکر ہے اور مطلب ہوا: اسم السلام علیکم، والسلام هنا هو الله عزوجل ومعنى الكلام نزلت بركة اسمه عليكم وحلت عليكم یعنی تم پر اللہ کے نام کی برکت نازل ہو، اور سلام بمعنی سلامتی بھی ہو سکتا ہے؛ لہٰذا جو بندہ السلام علیکم کہتا ہے وہ اللہ کے نام کے ذکر کے ساتھ اسی اللہ سے سلامتی بھی طلب کرتا ہے۔ (بدائع الفوائد:۲/۱۴۳)

اور سلام کے معنی عیوب ونقائص سے پاک کے ہوں تو السلام علیکم کا مطلب ہوگا کہ: اللہ تعالیٰ تم سے باخبر ہیں؛ لہٰذا تم غافل مت رہو۔ (لسان العرب: س ل م)

خلاصۂ کلام: ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

اس سلسلے میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ دونوں معانی لازم ملزوم ہیں؛ کیوں کہ ضابطہ ہے کہ انسان اگر اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اسے اللہ سے سوال کرنے میں خاص اس وصف کا لحاظ

رکھنا چاہیے جو اسے مانگنا ہے مثلاً: اسے توبہ واستغفار کرنا ہے تو وہ "یا غفور" کے ذریعہ اللہ سے توبہ کرے، عافیت کی دعا کرنی ہے تو اللهم إنك عفو كريم کہہ کر دعا کرے، رزق مانگنا ہے تو یا رزاق کہہ کر مانگے، ایسے ہی یہ مقام ''طلب سلامتی'' کا ہے؛ لہٰذا اللہ کے اسماء حسنیٰ میں لفظ "السلام" کے ذریعہ سلامتی کی دعا مانگے۔ (بدائع الفوائد: ۲/۱۴۳)

سلام کا تاریخی پس منظر

تحیہ اور سلام کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے، جتنی انسان کے زمین پر آباد ہونے کی تاریخ قدیم ہے؛ چوں کہ سلام، ایک دوسرے سے ملاقات، تعارف اور حصولِ شناسائی کے حوالے سے بنیادی اور کلیدی حیثیت رکھتا ہے؛ اس لیے دنیا کی تمام متمدن قوموں میں اس کا رواج پایا جاتا تھا اور پایا جاتا ہے، ہاں طریقے اور انداز الگ الگ تھے اور ہیں، ذیل میں ان کا تقابلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے؛ تاکہ اسلامی سلام کی معنویت، گہرائی وگیرائی اور جامع ومکمل ہونے کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکے۔

مختلف اقوام میں سلام کا طریقہ

ابوطالب مکیؒ نے "كتاب التحيات" میں مختلف گروہوں اور قوموں کے طریقہ ہائے سلام کا تذکرہ کیا ہے، شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ نے اپنی کتاب "أوجز المسالك" میں "شرح الإقناع" کے حوالے سے اسے نقل کیا ہے، اختصار کے ساتھ پیش ہے۔

یہودی اور عیسائی سلام اور جوابِ سلام یا دونوں کے لیے محض اشاروں پر اکتفا کرتے تھے، سلام کا لفظ نہیں بولتے تھے؛ چناں چہ ترمذی کی روایت ہے: تسليم اليهود، الإشارةُ بالأصابع

وتسليم النصارى، الإشارة بالأكف یعنی یہودیوں کا سلام کرنا، انگلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنے اور عیسائیوں کا سلام کرنا ہتھیلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔

(ترمذی، رقم الحدیث: ۲۶۹۵، کراهية إشارة اليد بالسلام)

اہل کسریٰ کا سلام اپنے بادشاہ کے سامنے سجدہ اور زمین بوسی کے ذریعہ ہوتا تھا اور فارس کے لوگ اپنے بادشاہ کے سامنے زمین پر اپنے ہاتھوں کو ڈال دیتے تھے، اور اہل حبشہ ملاقات کے وقت سکون واطمینان کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لیتے تھے، رومی لوگ سلام کے وقت سر کھول کر جھکا دیتے تھے، حِمْیَر کے لوگ سلام کے وقت پکار کر انگلیوں سے اشارہ کرتے تھے، یمامہ کا تحیہ یہ تھا کہ جس کو سلام کرنا ہے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا جاتا تھا، اگر حد درجہ اظہار محبت مقصود ہوتا تو بار بار ہاتھ کو رکھا اور اٹھایا جاتا تھا، اور اہل نوبہ کا سلام یہ تھا کہ سلام کرنے والا اپنے ہاتھ کو اپنے سر اور چہرہ پر رکھ دیتا اور اپنے منھ سے اشارہ کرتا تھا۔ (أوجز المسالک: ۱۷/۲۰۷)

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ اسلام کی آمد سے قبل جو متمدن قومیں آباد تھیں اُن کے سلاموں میں تلفظ کے بجائے صرف اشاروں پر اکتفا کیا جاتا تھا؛ البتہ عربوں کے سلام میں الفاظ تھے؛ چناں چہ حدیث میں ہے:

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ کا بیان ہے: کہ ہم لوگ اسلام سے پہلے ملاقات کے وقت آپس میں أَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْناً (خدا آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب کرے) اور أنعِمْ صَبَاحاً (تمہاری صبح خوش گوار ہو) کہا کرتے تھے، جب ہم لوگ جاہلیت کے

اندھیرے سے نکل کر اسلام کی روشنی میں آ گئے تو ہمیں اس کی ممانعت کر دی گئی یعنی اس کے بجائے ہمیں "السلام علیکم" کی تعلیم دی گئی۔ (ابوداؤد، رقم الحدیث: ۵۲۳۷)

اسی طرح مجوسی بھی الفاظ میں سلام کیا کرتے تھے اور کہتے تھے: ہزار سال بزی، ہزار سال جیو! (حجۃ اللہ البالغۃ: ۱۹۶/۲)

اسلام کی آمد کے بعد دوسری اقوام میں بھی اشاروں سے سلام کا رواج عموماً ختم ہو گیا اور سلام کے الفاظ کہنے کا رواج چل پڑا؛ چناں چہ مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

دنیا کی تمام متمدن قوموں اور گروہوں میں ملاقات کے وقت پیار ومحبت یا جذبۂ اکرام وخیر اندیشی کا اظہار کرنے اور مخاطب کو مانوس ومسرور کرنے کے لیے کوئی خاص کلمہ کہنے کا رواج رہا ہے اور آج بھی ہے، ہمارے ملک ہندوستان میں ہمارے برادران وطن ہندو، ملاقات کے وقت ''نمستے'' کچھ پرانے قسم کے کم پڑھے لکھوں کو ''رام رام'' کہتے ہوئے بھی سنا ہے۔ (۱)

یورپ کے لوگوں میں صبح کی ملاقات کے وقت ''گڈ مارننگ'' (اچھی صبح) اور شام کی ملاقات کے وقت ''گڈ ایوننگ'' (اچھی شام) اور رات کی ملاقات میں ''گڈ نائٹ'' (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے، رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت عربوں میں اسی طرح کے کلمات أنعم صباحاً وغیرہ ملاقات کے وقت کہنے کا رواج تھا۔ (معارف الحدیث: ۱۴۹/۶-۱۵۰)

اسلامی سلام کا آغاز

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: کہ جب اللہ تعالیٰ نے

(۱) اسی طرح ''نمشکار'' ''پرنام'' اور جے رام جی کا بھی رواج ہے: مؤلف

حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام کو پیدا فرمایا تو اُن سے کہا:

اذ هَبْ فسلّم على أولئك نفر من الملائكة جلوس، فاستمع ما يحيونك؛ فإنها تحيتك وتحية ذريتك، فقال: السلام عليكم، فقالوا: السلام عليك ورحمة الله، فزادوه: ورحمة الله.

یعنی جاؤ اور فرشتوں کی بیٹھی ہوئی اس جماعت کو سلام کرو اور سنو کہ وہ تمہیں کیا جواب دیتی ہے وہ (جو جواب دے گی) وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا جوابِ سلام ہوگا؛ چناں چہ حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام گئے اور کہا: "السلام عليكم" فرشتوں نے جواب دیا "السلام عليك ورحمة الله" (حضور ﷺ نے فرمایا) فرشتوں نے حضرت آدم کے سلام کے جواب میں "ورحمة الله" کا اضافہ کیا۔ (بخاری، رقم الحدیث: ۶۲۲۷، باب بدء السلام)

دو حل طلب باتیں: اس حدیث میں دو باتیں حل طلب ہیں:

پہلی بات: اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ "ان کو سلام کرو" تو کیا آدم علیہ السلام کو سلام کا طریقہ بتایا گیا تھا؟ جواب یہ ہے کہ ان کو سلام کے الفاظ نہیں بتائے گئے تھے؛ بلکہ یہ امر ان کی رائے اور اختیار پر چھوڑا گیا تھا؛ پس آدم علیہ السلام نے حق کو پالیا یعنی اللہ تعالیٰ کو جو الفاظ پسند تھے انہیں لفظوں سے آدم علیہ السلام نے سلام کیا۔(۱)

دوسری بات: اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ "وہ تمہارا اور تمہاری اولاد کا دعا وسلام کا طریقہ ہوگا" اس کا کیا مطلب ہے؟ جواب: یہ ارشاد تشریعی ہے یعنی یہی وجوبی طور پر حکم خداوندی ہے، رہا یہ سوال کہ حضرت آدم اور ملائکہ جس طرح دعا وسلام کریں گے وہ حکم خداوندی کیسے ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ طریقہ اللہ ہی الہام فرمائیں گے جیسے اذان کی مشروعیت اور اس کے الفاظ حظیرۃ القدس ہی سے فرشتہ پر مترشح ہوئے تھے۔ (رحمۃ اللہ الواسعۃ: ۵/۴۳)

بہر حال اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں والا یہ سلام حضرت آدم علیہ السلام سے

(۱) وأن التحية بالسلام هي التي أراد الله أن يتحيّا بها، شرح ابن بطال: ۹/۳

ہی چلا آرہا ہے، نیز فرشتوں کا آپسی دعاوسلام السلام علیکم ہی ہے اور جنت میں بھی اہل جنت کا سلام انہیں الفاظ سے ہوگا۔

وتحية العرب بالسلام وهو أفضل التحيات وهو تحية الملائكة بينهم وتحية أهل الجنة في الجنة قال الله تعالى: وتحيتهم فيها: سلام أي: يُحَيّ بعضهم بعضا. (شرح الإقناع:۱/۴۲۶)

کیا یہ سلام ہر آسمانی دین میں تھا؟

"فإنها تحيتك وتحية ذريتك" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلام پچھلی امتوں میں بھی تھا اور ہر آسمانی دین میں یہی سلام رائج رہا ہے؛ چناں چہ شرح ریاض الصالحین میں ہے:

أن السلام عليكم هي التحية التي شرعها الله تعالى لعباده منذ خلق آدم وهي واحدة في الأديان.

(نزھۃ المتقین :۱/۵۷۷)

لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام صرف اس امت کے لیے مشروع کیا گیا ہے، پچھلی امتوں کا سلام "السلام علیکم" نہیں تھا، روایت پڑھیے:

لكن في حديث عائشة مرفوعا "ما حَسَدتكم اليهود على شيء ما حسدتكم على السلام والتأمين" یعنی یہودیوں نے سلام اور آمین پر جتنا حسد کیا ہے اتنا کسی اور چیز پر حسد نہیں کیا۔ (ابن ماجہ رقم الحدیث:۸۵۶)

وهو يدل على أنه شرع لهذه الأمة دونهم.

(ارشادالساری:۱۳/۲۲۹)

خلاصہ یہ نکلا کہ سلام اور جواب سلام سنت قدیمہ ہونے کے ساتھ ساتھ جنتی گفتگو اور بہشتی آداب کی نقل بھی ہے جو اس امت کو عطا کی گئی۔ فلله الحمد.

ایک اشکال کا جواب

السلام علیکم کے جواب میں عموما "وعليكم السلام" یا "وعليك السلام"

کہا جاتا ہے؛ جب کہ فرشتوں نے حضرت آدمؑ کے سلام کے جواب میں "السلام علیك ورحمة الله" کہا؟ جواب یہ ہے کہ ممکن ہے فرشتوں نے بھی سلام میں پہل کرنے کا ارادہ کیا ہو جیسا کہ عموماً ایسے موقع پر ہوتا ہے جب دو آدمی آپس میں ملاقات کرتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک پہل کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور دونوں ہی "السلام علیکم" کہہ دیتے ہیں۔ (مرقاۃ المفاتیح: ۵/۴۷)

اسلامی سلام کی معنویت وعالمگیریت

مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوا کہ اسلامی سلام کسی بندے کا بنایا ہوا سلام نہیں ہے؛ بلکہ رب کائنات نے حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام کے دل میں اس کا الہام کیا اور ان کی زبان سے یہ لفظ نکلا اور مسلمانوں کو یہ تحفہ وتحیہ ملا؛ اس لیے اِس کی جامعیت وعالمگیریت کو کوئی اور دنیاوی سلام چیلنج نہیں کرسکتا، چناں چہ مولانا منظور نعمانیؒ لکھتے ہیں:

> آج بھی کوئی غور کرے تو واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی کلمہ، محبت وتعلق اور اکرام وخیر اندیشی کے اظہار کے لیے سوچا نہیں جاسکتا، ذرا اس کی معنوی خصوصیات پر غور کیجیے یہ بہترین اور نہایت جامع دعائیہ کلمہ ہے، اس کا مطلب ہے کہ اللہ تم کو ہر طرح کی سلامتی نصیب فرمائے، یہ اپنے سے چھوٹوں کے لیے شفقت اور مرحمت اور پیار ومحبت کا کلمہ بھی ہے اور بڑوں کے لیے اس میں اکرام اور تعظیم بھی ہے، اور پھر "السلام علیکم" اسماء الٰہیہ میں سے بھی ہے، قرآن مجید میں یہ کلمہ انبیاء ورسل علیہم السلام کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور اکرام اور بشارت کے استعمال فرمایا گیا ہے اور اس میں عنایت اور پیار ومحبت کا رس بھرا ہوا ہے، ارشاد ہوا ہے:
>
> سَلَامٌ عَلَى نُوحٍ فِي الْعَالَمِيْنَ (الصافات:۷۹) سَلَامٌ عَلَى إِبْرَاهِيْم (الصافات:۱۰۹) سَلَامٌ عَلَى مُوسَى

وَهَارُونَ (الصافات:۱۲۰) سَلَامٌ عَلَى إِلْ يَاسِيْن (الصافات:۱۳۰)......

اور اہل ایمان کو حکم ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھی اسی طرح سلام عرض کریں، السلام عليك أيها النبي الخ ......
اور ایک جگہ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا ہے کہ جب ہمارے وہ بندے آپ کے پاس آئیں جو ایمان لا چکے ہیں تو آپ ان سے کہیں سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام:۵۴) السلام علیکم! تمہارے پروردگار نے تمہارے لیے رحمت کا فیصلہ فرمایا دیا ہے...... اور آخرت میں داخلۂ جنت کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان سے فرمایا جائے گا، ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ (الحجر:۴۶) اور سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّار (الرعد:۲۴) (معارف الحدیث:۶/۱۵۰-۱۴۹)

مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

دنیا کی ہر مہذب قوم میں اس کا رواج ہے کہ جب آپس میں ملاقات کریں تو کوئی کلمہ آپس کی موانست اور اظہار محبت کے لیے کہیں؛ لیکن موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی سلام جتنا جامع ہے کوئی دوسرا ایسا جامع نہیں؛ کیوں کہ اس میں صرف اظہارِ محبت ہی نہیں؛ بلکہ ساتھ ساتھ ادائے حقِ محبت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ آپ کو تمام آفات اور آلام سے سلامت رکھیں، پھر دعا بھی عرب کے طرز پر صرف زندہ رہنے کی نہیں؛ بلکہ حیات طیبہ کی دعا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اس کا بھی اظہار ہے کہ ہم اور تم سب اللہ

تعالیٰ کے محتاج ہیں، ایک دوسرے کو نفع، کوئی بغیر اس کے اذن کے
نہیں پہنچا سکتا، اس معنی کے اعتبار سے یہ کلمہ ایک عبادت بھی ہے اور
اپنے بھائی مسلمان کو خدا تعالیٰ کی یاد دلانے کا ذریعہ بھی............
خلاصہ یہ کہ اسلامی تحیہ ایک عالمگیر جامعیت رکھتا ہے (۱) اس میں
اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے (۲) اپنے بھائی مسلمان سے اظہار تعلق
ومحبت بھی (۳) تذکیر بھی (۴) اس کے لیے بہترین دعا بھی (۵)
اور اس سے یہ معاہدہ بھی کہ میرے ہاتھ اور زبان سے آپ کو کوئی
تکلیف نہیں پہنچے گی جیسا کہ حدیث میں ہے: المسلم من سلم
المسلمون من لسانه ویده. یعنی مسلمان تو وہی ہے جس کے
ہاتھ اور زبان سے سب مسلمان محفوظ رہیں کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

(معارف القرآن:۲/۵۰۱)

سلام ہر حال میں مفید ہے

الغرض ملاقات کے وقت کے لیے "السلام علیکم" سے بہتر کوئی کلمہ نہیں ہوسکتا؛ اگر ملنے والے پہلے سے باہم متعارف اور شناسا ہیں اور ان میں محبت واخوت یا قرابت کے قسم کا کوئی تعلق ہے تو اس کلمہ میں اس تعلق اور اس کی بنا پر محبت ومسرت اور اکرام وخیر اندیشی کا پورا اظہار ہے اور اگر پہلے سے کوئی تعارف اور تعلق نہیں ہے تو یہ کلمہ ہی تعلق واعتماد اور خیر سگالی کا وسیلہ بنتا ہے، اور اس کے ذریعہ ہر ایک دوسرے کو، گویا اطمینان دلاتا ہے کہ میں تمہارا خیر اندیش اور دعا گو ہوں اور میرے اور تمہارے درمیان ایک روحانی رشتہ اور تعلق ہے۔ (معارف الحدیث:۶/۱۵۰)

سلام کی قسمیں

امام جصاص ؒ نے فرمایا: کہ سلام کی دو قسمیں ہیں، ایک سلام تحیہ جو مسلمان باہم ایک دوسرے کو کرتے ہیں، دوسرا اسلام مُسالمت ومتارکت یعنی اپنے حریف کو یہ کہہ دینا کہ ہم تمہاری لغو

بات کا کوئی انتقام تم سے نہیں لیتے یہ الفاظ دیگر کسی سے پیچھا چھڑانے کے لیے جو سلام کیا جائے۔
(احکام القرآن: ۵/۲۱۶)

جیسے حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کا اپنے والد سے کہنا سلام علیك (مریم: ۴۷)

ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

قاضی عیاضؒ کا کہنا ہے: بأن القصد بذلك، المتاركة والمباعدة وليس القصد فيها، التحية. (فتح الباری: ۱۳/۴۸)

بخاری کی شرح ارشاد الساری میں ہے:

فمعنى قول إبراهيم لأبيه سلام عليك أي أمان فلا ينالك مني مكروه ولا أذى وذلك لحرمة الأبوة. (۱۳/۲۵۹)

یعنی حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد کو جو سلام کیا تھا وہ سلام تحیہ نہیں تھا؛ بلکہ اس کا مفہوم یہ تھا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، آپ مامون رہیں اور ایسا اس وجہ سے کہا کہ وہ حضرت ابراہیم کے باپ تھے۔

سلام متارکت کی دوسری مثال

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَاماً (الفرقان: ۶۳) سورہ فرقان کی یہ آیت ہے، ان آیات میں اللہ کے مخصوص ومقبول بندوں کی تیرہ صفات وعلامات کا تذکرہ ہے، ان میں سے تیسری صفت وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَاماً ہے، اس سے پہلے والی آیت میں ان کی صفت تواضع کا بیان ہے، جس کا تعلق ان کے اپنے اعمال سے ہے اور آیت میں دوسروں کے ساتھ ان کے طرزِ عمل کو بتایا گیا ہے کہ جب ان سے جہالت والے لوگ (جہالت کی) بات کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات کہتے ہیں اور ان سے سلام کہتے ہیں۔

اس آیت میں سلام سے، سلام تحیہ نہیں؛ بلکہ سلام متارکت مراد ہے؛ چناں چہ علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں:

قال النحاس: ليس "سلما" من التسليم؛ إنما هو من التسلّم، تقول العرب: سلاما، أي تسلّما منك أي براءة منك. (القرطبی:۳/۲۹۴)

یعنی سلام سے مراد یہاں "السلام علیکم" نہیں ہے؛ بلکہ سلامتی کی بات ہے؛ کیوں کہ یہ تسلیم سے نہیں ہے؛ بلکہ تسلُّم سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں سلامت رہنا اور آیت کا مطلب ہوگا کہ وہ (عباد الرحمن) ایسی بات کہتے ہیں جو باعثِ سلامتی ہوتی ہے کہ کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی اور انہیں کوئی گناہ نہیں ہوتا؛ الغرض یہ لوگ جاہلانہ اور بے وقوفانہ باتیں کرنے والوں سے انتقام نہیں لیتے؛ بلکہ انہیں معاف کردیتے ہیں اور یہی مفہوم علامہ قرطبیؒ نے مجاہدؒ وغیرہ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

وقال مجاهد: معنى "سلما" سدادا أي يقول للجاهل كلاما يدفعه به برفق ولين. (القرطبی سورۃ الفرقان، آیت:۶۳)

سلام متارکت کی تیسری مثال

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِيْن. (القصص:۵۵)

یعنی ان لوگوں کی ایک عمدہ خصلت یہ ہے کہ جب یہ کسی جاہل دشمن سے لغو بات سنتے ہیں تو اس کا جواب دینے کے بجائے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا سلام لو، ہم جاہل لوگوں سے الجھنا پسند نہیں کرتے، اس آیت میں سلام سے سلام متارکت مراد ہے؛ چناں چہ علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں:

(سلم عليكم) أي متاركة مثل قوله "وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَاماً" (الفرقان:۶۳) أي لنا ديننا ولكم دينكم (سلم عليكم" أي أمنا لكم منا؛ فإنا لا نحاربكم ولا نسابكم، وليس من التحية في شيء (مختصر تفسیر القرطبی:۳/۳۷۳)

ملحوظہ: علامہ قرطبیؒ کی رائے کے مطابق یہ سلام متارکت شروع میں تھا اور کفار کی جاہلانہ باتوں پر مسلمان سلام کہہ دیا کرتے تھے؛ اسی لیے انہوں نے اعمال کی تفسیر دین سے کی ہے کہ ہمارا اور تمہارا مذہب الگ الگ ہے؛ چناں چہ وہ آگے لکھتے ہیں:

قال الزجاج: وهذا قبل الأمر بالقتال "لا نبتغي الجاهلين" أي لا نطلبكم للجدال والمراجعة والمشاتمة. (حوالہ سابق)

لہٰذا مسلمان اس آیت سے مستثنیٰ ہیں، مسلمانوں میں کوئی جاہلانہ گفتگو کرے اس کے باوجود اگر کوئی اسے السلام علیکم بطور تحیہ کے کہہ دے تو کوئی حرج نہیں۔

وقد اتفق الناس على أن السفيه من المؤمنين إذا جفاك، يجوز أن تقول له: سلام عليك. (القرطبی:۳/۳۹۴)

دوسرا باب

﴿ وَإِذَا حُيِّيْتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّواْ بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا إِنَّ اللّهَ كَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبا. (النساء: ٨٦) ﴾

آیاتِ سلام — ترجمہ، تفسیر اور حکمتیں

آیاتِ سلام

۱- وَإِذَا حُيِّيْتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّواْ بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا إِنَّ اللّهَ كَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا. (النساء:۸۶)

اور جب تمھیں سلام کیا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا انہی الفاظ کو لوٹا دو؛ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سلام اور جوابِ سلام کے آداب بتائے ہیں۔

حیاہ تحیۃً کے اصل معنی کسی کو زندگی کی دعا دینے کے ہیں، مثلاً: حیاك اللّٰه (اللہ آپ کی عمر دراز کرے) کہنا، سلام اور اس کے ہم معنی دوسرے دعائیہ کلمات بھی چوں کہ کم و بیش یہی یا اسی سے ملتے جلتے مفہوم اپنے اندر رکھتے ہیں، اس وجہ سے لفظ کے عام مفہوم میں وہ سب اس کے اندر شامل ہو جاتے ہیں، اسلام نے حیّاك اللّٰه یا أنعم صباحاً جیسے طرزِ تحیہ کو بدل کر "السلام علیکم" کہنے کا طریقہ جاری کیا؛ چناں چہ جمہور مفسرین کی رائے ہے کہ یہاں تحیہ سے مراد سلام کرنا ہے۔

صاحبِ روح المعانی لکھتے ہیں:

وهي في الأصل كما قال الراغب: الدعاء بالحياة وطولها، ثم استعملت في كل دعاء، وكانت العرب إذا لقي بعضهم بعضا تقول: حياك اللّٰه تعالىٰ، ثم استعملها الشرع في السلام وهو تحية الإسلام. (روح المعانی:۵/۱۰۰)

آیت کا پس منظر

جن حالات میں یہ آیت نازل ہوئی، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کشیدہ تھے اور عموماً جب تعلقات کشیدہ ہوں تو اندیشہ ہوا کرتا ہے کہ کہیں تلخ کلامی کی نوبت نہ آجائے اور گفتگو میں کجروی یا کج خلقی کی صورت نہ ہوجائے، ان دونوں باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر مسلمانوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ تم باہم ملو، تب بھی شائستہ انداز ہونا چاہیے، پیار ومحبت کا برتاؤ ہونا چاہیے اور دوسروں سے ملو تب بھی تہذیب واخلاق کے دائرے میں رہنا چاہیے، دوسرے احترام سے پیش آئیں تو تم بھی اس کے جواب میں زیادہ احترام سے پیش آؤ، شائستگی کا جواب، شائستگی ہونی چاہیے، ترش روئی تمہارے منصب کے خلاف ہے، مسلمان دنیا کے لیے داعی ہیں، ان کو تو دوسروں سے بڑھ کر مہذب وشائستہ ہونا چاہیے، سخت کلامی اور درشتی سے نفس کی تسکین بھلے ہی ہوجائے؛ لیکن ساتھ ہی وہ شخص نظروں سے گرجاتا ہے اور اس کے کاز کو نقصان پہنچتا ہے۔ (تفسیر انوار القرآن: ۳۱۸/۲)

اس آیت میں ایک دوسرے کو سلام کرنے کا حکم ہے، اور حسنِ اخلاق ومعاشرت کی اس اصل پر زور دیا ہے کہ جب کبھی کوئی شخص تمہیں سلام کرے، تو چاہیے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، اس سے بہتر طور پر اس کا جواب دو، اور اگر بہتر طور پر نہ دو تو کم از کم اسی کی بات اس پر لوٹا دو، یہ حکم یہاں اس مناسبت سے آیا کہ جنگ کی حالت ہو یا امن کی، منافق ہو یا ایمان دار؛ لیکن جو کوئی بھی تم پر سلامتی بھیجے، تمہیں بھی اس کا ویسا ہی جواب دینا چاہیے، اس کے دل کا حال خدا جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ (تفسیر ترجمان القرآن: ۳۸۲/۱)

اس آیت سے ثابت شدہ مسائل واحکام ان شاء اللہ ''مسائل واحکام'' کے تحت لکھے جائیں گے۔

۲- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا. (النور: ۲۷)

اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو؛ جب تک اجازت حاصل نہ کرلو (اور اجازت لینے سے پہلے) ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو۔

یعنی اول باہر سے سلام کر کے پھر ان سے پوچھو کہ کیا ہمیں اندر آنے کی اجازت ہے اور بغیر اجازت لیے ایسے ہی مت داخل ہو، یعنی کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے دو کام کرنا ضروری ہیں اول کام استیناس یعنی اجازت لینا اور دوسرا گھر والوں کو سلام کرنا۔

۳- فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتاً فَسَلِّمُوا عَلَى أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً. (النور:۶۱)

جب تم گھروں میں جانے لگو تو اپنے لوگوں کو (یعنی وہاں جو مسلمان ہوں ان کو) سلام کر لیا کرو (جو کہ) دعا کے طور پر (ہے) اور جو خدا کی طرف سے متعین ہے۔ اس آیت میں گھریلو معاشرت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ آمد ورفت کے وقت اہل خانہ کے ساتھ کیسا معاملہ ہونا چاہیے۔

۴- وَإِذَا جَاءكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلاَمٌ عَلَيْكُمْ. (الانعام:۵۴)

اور یہ لوگ جب آپ کے پاس آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ ان کو سلام علیکم کہیے۔

یعنی ان پر سلام کر کے یا ان کے سلام کا جواب دے کر ان کی تکریم اور قدر افزائی کریں، فأكرمهم برد السلام عليهم. (تفسیر ابن کثیر:۲/۱۳۶)

مفتی شفیع عثمانیؒ لکھتے ہیں:

> یہاں "سلام علیکم" کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ان کو اللہ جل شانہ کا سلام پہنچا دیجیے، جس میں ان لوگوں کا انتہائی اعزاز واکرام ہے، اس صورت میں ان غریب مسلمانوں کی دل شکنی کا بہترین تدارک ہوگیا، جن کے بارے میں رؤساء قریش نے مجلس

سے ہٹا دینے کی تجویز پیش کی تھی اور یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ آپ ﷺ ان لوگوں کو سلامتی کی خوش خبری سنا دیجیے، کہ اگر ان لوگوں سے عمل میں کوتاہی یا غلطی بھی ہوئی ہے تو وہ معاف کردی جائے گی، اور یہ ہر قسم کی آفات سے سلامت رہیں گے۔ (معارف القرآن: ۳/ ۳۳۷)

۵- وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِناً. (النساء: ۹۴)

اور تم سے سلام کہے تو اسے یہ مت کہو کہ تو ایمان والا نہیں۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: مسلمانوں کا دستہ بنو سلیم کے ایک آدمی سے ملا، تو اس آدمی نے مسلمانوں کو "السلام علیکم" کہا، مسلمانوں نے کہا: کہ اس نے جان بچانے کے لیے مسلمانوں والا سلام کیا ہے؛ چناں چہ اسے قتل کر کے اس کی بکریاں ساتھ لے آئے، تو مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۳۹)

اس سے معلوم ہوا کہ سلام، اسلام کی نشانی ہے اور جو شخص اسلامی سلام کرے، اسے قتل کرنا جائز نہیں؛ بلکہ اسے مسلمان تصور کیا جائے گا، اس کے دل کا حال خدا جانتا ہے، ہم نہیں جانتے۔

۶- هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ. إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَاماً قَالَ سَلَامٌ قَوْمٌ مُّنكَرُونَ. (الذاریات: ۲۴، ۲۵)

کیا آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی خبر (بھی) پہنچی ہے؟ وہ جب ان کے یہاں آئے تو سلام کیا، حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام نے جواب میں) سلام کہا اور (کہا) یہ اجنبی لوگ ہیں۔

ایک نکتہ: حضرت ابراہیمؑ اور فرشتوں کی باہمی ملاقات میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ فرشتوں نے "سلاماً" نصب کے ساتھ کہا؛ جب کہ خلیل اللہ نے جواب میں "سلامٌ" رفع کے ساتھ کہا، اس کی

وجہ ابن کثیرؒ یہ بتاتے ہیں کہ: رفع، نصب سے اقوی اور زیادہ بہتر ہے؛ کیوں کہ سلام کے مرفوع ہونے کی صورت میں یہ جملہ اسمیہ بنا؛ جس میں دوام واستمرار اور پائیداری ہوتی ہے اور سلاماً نصب کی صورت میں جملہ فعلیہ بنا سلمت سلاما، جو حُدوث وتجدُّد پر دلالت کرتا ہے، تو جیسا کہ قرآن کریم میں حکم ہے کہ سلام کا جواب، سلام کرنے والے کے الفاظ سے بہتر الفاظ میں ہو، حضرت خلیل اللہ نے اس کی تعمیل فرمائی، اس کی مزید تفصیل ''رموزِ سلام'' کے تحت آئے گی۔

(ابن کثیر: ۴/۲۳۶)

۷- تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ وَأَعَدَّ لَهُمْ أَجْراً كَرِيْماً. (الاحزاب: ۴۴)

جس دن مومنین کاملین اپنے رب سے ملاقات کریں گے، ان کا تحیہ سلٰمٌ ہوگا اور اللہ نے ان کے واسطے بڑا اچھا اجر تیار کر رکھا ہے۔

مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

یہ اسی صلاۃ کی توضیح وتفسیر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن بندوں پر ہوتی ہے، یعنی جس روز یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے ملیں گے تو اس کی طرف سے ان کا اعزازی خطاب، سلام سے کیا جائے گا، یعنی السلام علیکم، کہا جائے گا، اللہ تعالیٰ سے ملنے کا دن کون سا ہوگا؟ امام راغبؒ وغیرہ نے فرمایا کہ مراد اس سے روز قیامت ہے اور بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ جنت میں داخلے کا وقت مراد ہے؛ جہاں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی سلام پہنچے گا اور سب فرشتے بھی سلام کریں گے، اور بعض حضرات مفسرین نے اللہ تعالیٰ سے ملنے کا دن موت کا دن قرار دیا ہے کہ وہ دن سارے عالم سے چھوٹ کر صرف ایک اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کا دن ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ملک الموت جب کسی

مومن کی روح قبض کرنے کے لیے آتا ہے تو اول اس کو یہ پیام پہنچاتا ہے کہ تیرے رب نے تجھے سلام کیا ہے، اور لفظ لقاء ان تینوں حالات پر صادق ہے؛ اس لیے ان اقوال میں کوئی تضاد وتعارض نہیں ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سلام تینوں حالات میں ہوتا ہو۔ (روح المعانی)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا باہم ایک دوسرے کو تحیہ لفظ "السلام علیکم" ہونا چاہیے، خواہ بڑے کی طرف سے چھوٹے کے لیے ہو یا چھوٹے کی طرف سے بڑے کے لیے ہو۔

(معارف القرآن: ۱۷۶/۷)

علامہ قرطبیؒ نے ایک روایت ذکر کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن بندے کی روح قبض کرنے سے پہلے ملک الموت، اسے خود سلام کرتے ہیں۔

وقد ورد أنه لا يقبض روح مؤمن إلا سلم عليه، روي عن البراء بن عازبؓ قال: "تحيتهم يوم يلقونه سلم" فيسلم ملك الموت على المؤمن عند قبض روحه، لا يقبض روحه حتى يسلم عليه. (مختصر تفسیر القرطبی: ۴۷۹/۳)

اب کل چار اقوال ہوگئے۔

۸- وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا. (الفرقان: ۷۴)

یعنی جنت کی دوسری نعمتوں کے ساتھ، ان کو (مومنین) کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوگا کہ فرشتے ان کو مبارک باد دیں گے اور سلام کریں گے۔ (معارف القرآن ۴۹۸/۶)

۹- لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا . إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا. (الواقعۃ: ۲۵، ۲۶)

(اور) وہاں نہ بک بک سنیں گے اور نہ وہ کوئی اور بے ہودہ بات (سنیں گے، یعنی شراب

پی کر یا ویسے بھی ایسی چیزیں نہ پائی جاویں گی جن سے عیش مُکَدَّر رہوتی ہے) بس (ہر طرف سے) سلام ہی سلام کی آواز آوے گی..... (جو کہ دلیل، اکرام واعزاز کی ہے، غرض روحانی وجسمانی ہر طرح کی لذت ومسرت اعلیٰ درجہ کی ہوگی) (معارف القرآن: ۸/۲۶۷)

سورہ واقعہ کی ابتدائی آیات میں، میدانِ حشر میں حاضرین کی جو تین قسمیں ہوں گی، ان میں سے ''سابقین'' کے لیے بہت ساری نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ وہ لوگ ہر طرف سلام کے ترانے سنیں گے، جو رحمت اور محبت کی نشانی ہے اور غالبًا اسی وجہ سے جنت کا ایک نام "دار السلام" بھی ہے۔

۱۰- سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ. (الرعد:۲۴)

سورہ رعد کی آیات ۲۰ تا ۲۴ میں اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار بندوں کی نوصفات کا تذکرہ ہے، اس کے بعد ان کی جزاء کا بیان ہے، اخیر میں، دارِ آخرت میں ان کی فلاح وکامیابی کا مزید بیان یہ ہے کہ فرشتے ہر دروازے سے ان کو سلام کرتے ہوئے داخل ہوں گے اور کہیں گے: تمہارے صبر کی وجہ سے تمام تکلیفوں سے سلامتی ہے اور کیسا اچھا انجام ہے دار آخرت کا۔

۱۱- سَلَامٌ قَوْلًا مِن رَّبٍّ رَّحِيمٍ. (یٰس:۵۸)

اور ان کو (اہل جنت) پروردگار مہربان کی طرف سے سلام فرمایا جائے گا (یعنی حق تعالیٰ فرمائیں گے السلام عليكم يا أهل الجنة. رواہ ابن ماجہ (معارف القرآن: ۷/۴۰۰)

۱۲- تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ. (یونس:۱۰)

(پھر جب (اہل جنت) ایک دوسرے کو دیکھیں گے تو ان کا باہمی سلام یہ ہوگا السلام عليكم.

اس آیت میں اہل جنت کا حال بتایا گیا ہے کہ تحيتهم فيها سلم، تحیہ عرف میں اس کلمہ کو کہا جاتا ہے، جس کے ذریعہ کسی آنے والے یا ملنے والے شخص کا استقبال کیا جاتا ہے جیسے سلام یا ''خوش آمدید'' یا "أهلا وسهلا" وغیرہ، اس آیت نے بتادیا کہ اللہ جل شانہ کی طرف سے

یا فرشتوں کی طرف سے اہل جنت کا تحیہ لفظ سلام سے ہوگا، یعنی یہ خوش خبری کہ تم ہر تکلیف اور ناگوار چیز سے سلامت رہوگے، یہ سلام خود حق تعالیٰ کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے جیسے سورہ یٰس: ۵۸ میں ہے سَلَامٌ قَوْلًا مِن رَّبٍّ رَّحِيْمٍ اور فرشتوں کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے، جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے: والملئكة يدخلون عليهم من كل باب سلم عليكم یعنی فرشتے اہل جنت کے پاس ہر دروازہ سے سلام علیکم کہتے ہوئے داخل ہوں گے اور ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں کہ کسی وقت براہ راست اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچے اور کسی وقت فرشتوں کی طرف سے اور سلام کا لفظ اگرچہ دنیا میں دعا ہے؛ لیکن جنت میں پہنچ کر تو ہر مطلب حاصل ہوگا؛ اس لیے وہاں یہ لفظ دعا کے بجائے خوشی کا کلمہ ہوگا۔ روح المعانی (معارف القرآن: ۵۱۲/۴)

۱۳- وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِيْنَ. (الزمر:۷۳)

یعنی جب متقی لوگ جنت پر پہنچ جائیں گے تو محافظ فرشتے ان سے کہیں گے السلام علیکم تم پر سلامتی ہو، تم مزے میں رہو، پس جنت میں ہمیشہ رہنے کے لیے تشریف لے جائیے، یعنی ان جنتی مہمانوں کے سر پر عزت وشرافت کا یہ زریں تاج لامحدود زمانے تک کے لیے باندھ دیا جائے گا اور اہل جنت کا یہ استقبال ایک تاریخ ساز استقبال ہوگا، اس آیت میں قابل غور بات یہ ہے کہ ایسے مرحلہ پر خطبہ استقبالیہ کے قائم مقام یہ الفاظِ سلام ہی قابل ترجیح سمجھے گئے، آخر کیوں؟ یقیناً اس میں کوئی خصوصی تاثیر اور معنویت کا عنصر چھپا ہوا ہے؛ جس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

۱۴- وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَن سَلَامٌ عَلَيْكُمْ. (الاعراف:۴۶)

مذکورہ آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو جہنم سے تو نجات پاگئے؛ مگر ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے؛ البتہ اس کے امیدوار ہیں کہ وہ بھی جنت میں داخل ہوجائیں، ان لوگوں کو اہل اعراف کہا جاتا ہے۔

اب اصل آیت کا مضمون دیکھیے، جس میں ارشاد ہے: کہ اہل اعراف اہلِ جنت کو آواز

دے کر کہیں گے (سلامٌ علیکم) یہ لفظ دنیا میں بھی باہمی ملاقات کے وقت بطور تحفہ واکرام کے بولا جاتا ہے اور مسنون ہے اور بعد موت کے، قبروں کی زیارت کے وقت بھی، اور محشر اور جنت میں بھی؛ لیکن آیات اور روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں السلام علیکم کہنا مسنون ہے اور اس دنیا سے گذرنے کے بعد بغیر الف لام کے سلامٌ علیکم کا لفظ مسنون ہے، زیارتِ قبور کا جو کلمہ قرآن مجید میں مذکور ہے، وہ بھی سلامٌ علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار آیا ہے اور فرشتے جب اہلِ جنت کا استقبال کریں گے اس وقت بھی یہ لفظ اسی عنوان سے آیا ہے، سلامٌ علیکم طبتم فادخلوھا خالدین اور یہاں بھی اہل اعراف اہل جنت کو اسی لفظ کے ساتھ سلام کریں گے۔ (معارف القرآن:۳/۷۶۸)

۱۵- لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ. (الانعام:۱۲۷)

یعنی جو لوگ قرآنی ہدایات قبول کرنے والے ہیں، ان کے لیے سلامتی کا گھر ہے، ان کے رب کے پاس۔

اس آیت میں صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کے لیے ثمرہ کا بیان ہے کہ ان کے واسطے دار السلام ہے؛ اسی لیے دخولِ جنت کے وقت ہی انہیں سلامتی کا پیغام سنا دیا جائے گا اور کہا جائے گا ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِيْنَ. (الحجر:۴۶)

مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

> اس آیت میں لفظ دار کے معنی گھر اور سلام کے معنی تمام آفتوں، مصیبتوں اور محنتوں سے سلامتی کے ہیں؛ اس لیے دار السلام اس گھر کو کہا جاتا ہے، جس میں کسی تکلیف ومشقت اور رنج وغم اور آفت ومصیبت کا گذر نہ ہو اور وہ ظاہر ہے کہ جنت ہی ہوسکتی ہے۔
>
> اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا: کہ "السلامؑ" اللہ جل شانہ کا نام ہے اور دار السلام کے معنی ہیں اللہ کا گھر اور ظاہر ہے کہ اللہ کا

گھر امن وسلامتی کی جگہ ہوتی ہے؛ اس لیے حاصل معنی پھر یہی ہوگئے کہ وہ گھر جس میں ہر طرح کا امن وسکون اور سلامتی واطمینان ہو، جنت کو دارالسلام فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ جنت ہی صرف وہ جگہ ہے جہاں انسان کو ہر قسم کی تکلیف، پریشانی اور اذیت اور ہر خلافِ طبع چیز سے مکمل اور دائمی سلامتی حاصل ہوتی ہے، جو دنیا میں نہ کسی بڑے بادشاہ کو کبھی حاصل ہوئی اور نہ بڑے سے بڑے نبی ورسول کو؛ کیوں کہ دنیائے فانی کا یہ عالم ایسی مکمل اور دائمی راحت کا مقام ہی نہیں۔

......اور رب کے پاس ہونے کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ دارالسلام یہاں نقد نہیں ملتا؛ بلکہ جب وہ قیامت کے روز اپنے رب کے پاس جائیں گے اس وقت ملے گا، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ دارالسلام کا وعدہ غلط نہیں ہوسکتا، رب کریم اس کا ضامن ہے وہ اس کے پاس محفوظ ہے، اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس دارالسلام کی نعمتوں اور راحتوں کو آج کوئی تصور میں بھی نہیں لاسکتا، رب ہی جانتا ہے جس کے پاس خزانہ محفوظ ہے۔(معارف القرآن:۳/۴۴۸)

مذکورہ آیات میں سلام کا تذکرہ، بطور تحیہ کے تھا اور عام طور سے مومنین کاملین کے لیے استعمال ہوا ہے، یا ادب وتہذیب سکھانے کے لیے؛ اس کے علاوہ قرآن میں یہ کلمہ انبیاء ورسل کے لیے بھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور اکرام اور بشارت کے استعمال کیا گیا ہے؛ جس میں عنایت وتوجہ اور محبت کا رس بھرا ہوا ہے، وہ آیات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۶- وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا. (مریم:۱۵)

اور سلام پہنچے ان پر (حضرت یحییٰ علیہ السلام) جس دن وہ پیدا کیے گئے اور جس دن دنیا

سے رخصت ہوں اور جس دن (قیامت میں) زندہ ہو کر اٹھائے جائیں۔

یعنی حضرت یحییٰ علیہ الصلاۃ والسلام ایسے وجیہ اور مکرم تھے کہ ان کے حق میں، منجانب اللہ یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچے، جس دن کہ وہ پیدا ہوئے اور جس دن وفات پائیں اور جس دن (قیامت میں) زندہ ہو کر اٹھائے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان تین اوقات میں سلامتی کی دعا جو دی گئی ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ، ان تینوں اوقات میں انسان انتہائی ضعیف اور ضرورت مند ہوتا ہے، اور اللہ کی طرف سے نصرت، مدد اور سلامتی کا خواہاں ہوتا ہے، پیدائش اور موت کا وقت بڑا نازک ہوتا ہے اور دوبارہ زندہ کیے جانے کے وقت کی نزاکت کا کیا پوچھنا۔ (بدائع الفوائد:۲/۱۶۸)

علامہ طبریؒ کی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں ''سلام'' سے مشہور ومتعارف سلام مراد نہیں ہے؛ بلکہ یہ سلام امن وامان کے معنی میں ہے؛ لیکن ابن عطیہؒ نے اس رائے کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ اظہر قول یہ ہے کہ یہاں سلام سے وہی متعارف تحیہ مراد ہے، اور امن وامان کے مقابلہ میں یہ معنی زیادہ بہتر اور قرینِ قیاس ہے؛ کیوں کہ امن وامان کا مفہوم تو حضرت یحییٰ علیہ الصلاۃ والسلام سے عصیان کی نفی کر کے حاصل ہو جاتا ہے، شرف وسعادت تو اس میں ہے کہ اللہ انہیں سلام کریں۔

قال الطبري وغيره: معناه أمان، ابن عطيه: والأظهر عندي: أنها التحية المتعارفة فهي أشرف وأنبه من الأمان؛ لأن الأمان متحصل له بنفي العصيان عنه وهي أقل درجاته؛ وإنما الشرف في أن سلم الله عليه. (القرطبی:۳۰/۵۸)

۱۷- سَلَامٌ عَلَى نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ. (الصافات:۷۹)

اور ہم نے ان کے لیے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات رہنے دی کہ نوح پر سلام ہو عالم والوں میں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے، ان کی نظر میں حضرت نوح کو ایسا معزز ومکرم بنا دیا کہ وہ قیامت تک حضرت نوح علیہ السلام کے لیے سلامتی کی دعا

کرتے رہیں گے؛ چناں چہ واقعہ بھی یہی ہے کہ تمام وہ مذاہب جو اپنے آپ کو آسمانی کتابوں سے منسوب کرتے ہیں، سب کے سب حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت اور تقدس کے قائل ہیں، مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور نصرانی بھی آپ کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ (معارف القرآن: ۷/۴۴۴)

۱۸- وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ . سَلَامٌ عَلَى إِبْرَاهِيمَ. (الصافات: ۱۰۸، ۱۰۹)

اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات ان کے لیے رہنے دی کہ ابراہیم پر سلام ہو۔

۱۹- سَلَامٌ عَلَى مُوسَى وَهَارُونَ. (الصافات: ۱۲۰) سلام ہے موسیٰ وہارون پر۔

۲۰- سَلَامٌ عَلَى إِلْ يَاسِينَ. (۱)(الصافات: ۱۳۰)

سلام ہے الیاس پر۔

۲۱- وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ. (الصافات: ۱۸۱) اور سلام ہے رسولوں پر۔

شروع میں اللہ تعالیٰ نے کچھ پیغمبروں کے اسماء کی صراحت کر کے سلام بھیجا ہے اور اخیر آیت میں "المرسلین" کا لفظ استعمال کر کے جملہ انبیاء ورسل پر سلامتی بھیجی ہے؛ چناں چہ اس کا اثر دنیا میں یہ ظاہر ہوا کہ جب بھی انبیاء ورسل کے نام آتے ہیں، مسلمان اُن کے ناموں کے ساتھ "علیہ السلام" کا اضافہ کرتے ہیں، اِس طرح اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل کو لوگوں کی دعاؤں اور سلامتی کی بشارتوں کا مرکز بنا دیا۔

۲۲- قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى. (النمل: ۵۹)

انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے کچھ حالات اور ان پر عذاب آنے کے واقعات کا ذکر کرنے کے بعد یہ جملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: کہ آپ اللہ کا شکر ادا کریں کہ آپ کی امت کو دنیا کے عذابِ عام سے مامون کر دیا گیا ہے، اور انبیاء سابقین اور اللہ کے برگزیدہ بندوں پر سلام بھیجیے۔

جمہور مفسرین نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے اور بعض نے اس کا مخاطب بھی حضرت لوط

(۱) الیاسین بھی الیاس علیہ السلام ہی کا ایک نام ہے، اہل عرب اکثر عجمی ناموں کے ساتھ یاء اور نون بڑھا دیتے ہیں جیسے سینا سے سینین، اسی طرح یہاں بھی دو حروف بڑھا دیے گئے ہیں۔

علیہ السلام کو قرار دیا ہے، اس آیت میں الَّذِیْنَ اصْطَفٰی کے الفاظ سے ظاہر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام مراد ہیں؛ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے وسلٰمٌ علی المرسلین اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام ہیں، سفیان ثوریؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ أخرجه عبد بن حميد والبزار وابن جرير وغيرهم.

اگر آیت میں الذین اصطفٰی سے مراد صحابہ کرامؓ لیے جائیں جیسا کہ ابن عباسؓ کی روایت میں ہے تو اس آیت سے غیر انبیاء پر سلام بھیجنے کے لیے انہیں "علیه السلام" کہنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے خطبہ کے آداب بھی ثابت ہوئے؛ کہ وہ اللہ کی حمد اور انبیاء علیہم السلام پر درود وسلام سے شروع ہونا چاہیے، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے تمام خطبات میں یہی معمول رہا ہے؛ بلکہ ہر اہم کام کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام مسنون ومستحب ہے، کذا فی الروح۔ (معارف القرآن: ۶/ ۵۹۲)

۲۳- قُلْنَا يَا نَارُ كُونِيْ بَرْداً وَسَلَاماً عَلَى إِبْرَاهِيْمَ. (انبیاء: ۶۹)

ہم نے (آگ کو) حکم دیا کہ اے آگ تو ٹھنڈی اور بے گزند ہو جا، ابراہیم کے حق میں (یعنی نہ ایسی گرم رہ جس سے جلنے کی نوبت آوے اور نہ بہت ٹھنڈی برف ہو جا، کہ اس کی ٹھنڈک سے تکلیف پہنچے؛ بلکہ مثل ہوائے معتدل کے بن جا؛ چناں چہ ایسا ہی ہو گیا)

بر دو سلام کا مفہوم

اوپر گذر چکا ہے کہ آگ کے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بردوسلام ہونے کی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ آگ، آگ ہی نہ رہی ہو؛ بلکہ ہوا میں تبدیل ہوگئی ہو؛ مگر ظاہر یہ ہے کہ آگ اپنی حقیقت میں آگ ہی رہی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آس پاس کے علاوہ دوسری چیزوں کو جلاتی رہی؛ بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن رسیوں میں باندھ کر آگ میں ڈالا گیا تھا، اُن رسیوں کو بھی آگ ہی نے جلا کر ختم کیا؛ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بدن مبارک تک کوئی آنچ

نہیں آئی (کما في بعض الروایات)

تاریخی روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس آگ میں سات روز رہے اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے عمر میں کبھی ایسی راحت نہیں ملی جتنی ان سات دنوں میں حاصل تھی۔

(معارف القرآن:۶/۲۰۲)

۲۴- سَلَامٌ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ. (القدر:۵)

(اور وہ شبِ قدر) سراپا سلام ہے (جیسا کہ حدیث بیہقی میں حضرت انسؓ سے مرفوعاً مروی ہے: کہ شب قدر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کے ایک گروہ میں آتے ہیں اور جس شخص کو قیام وقعود وذکر میں مشغول دیکھتے ہیں تو اس پر صلاۃ بھیجتے ہیں یعنی اس کے لیے دعاءِ رحمت کرتے ہیں، اور خازن نے ابن الجوزی سے اس روایت میں، یسلّمون بھی بڑھایا ہے، یعنی سلامتی کی دعا کرتے ہیں، اور یصلون کا حاصل بھی یہی ہے؛ کیوں کہ رحمت وسلامتی میں تلازم ہے، اسی کو قرآن میں سلام فرمایا ہے اور امرِ خیر سے مراد یہی ہے اور نیز روایات میں، اِس میں توبہ قبول ہونا، ابواب سماء کا مفتوح ہونا اور ہر مومن پر ملائکہ کا سلام کرنا آیا ہے، (کذا في الدر المنثور)......
(اور) وہ شب قدر (اسی صفت وبرکت کے ساتھ) طلوع فجر تک رہتی ہے۔

سلامٌ، عبارت کی اصل ھي سلامٌ ہے، لفظ ھي حذف کردیا گیا، معنی یہ ہیں کہ یہ رات سلام اور سلامتی ہی ہے اور خیر ہی خیر ہے، اس میں شر کا نام نہیں اور بعض حضرات نے تقدیر عبارت سلام ھو قرار دے کر اس کو من کل أمر کی صفت بنایا اور معنی یہ ہوئے کہ یہ فرشتے ہر ایسا امر لے کر آتے ہیں جو خیر وسلام ہے۔ (معارف القرآن:۸/۷۹۴)

مولف عرض گزار ہے: کہ ان تمام آیات اور اُن کی تفاسیر سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ لفظ ''سلام'' راحت اور سلامتی کے حوالے سے ایک بحرِ بیکراں ہے، جس کی گہرائی وگیرائی اللہ کو ہی معلوم ہے؛ اور اسی لیے یہ دعا اتنی اہم اور باعظمت سمجھی گئی، اس کے باوجود اگر کوئی سلام سے بے رخی برتے یا سلام کی اصلی شکل کو مسخ کر کے غیروں کی رَوِش اپنائے یا سلام کو جوں کا توں رکھے؛

مگراس کے تقاضوں سے نابلد رہے تو یہ قابلِ افسوس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک لمحۂ فکر یہ ہے، جس کی اصلاح ضروری ہے۔

قرآن میں "السلام" کا رسم الخط

"السلام" کا لفظ اصل میں لام کے بعد الف کے ساتھ ہے؛ لیکن قرآن کریم میں کہیں کہیں سلٰم آیا ہوا ہے یعنی الف کو حذف کر کے لام پر کھڑا زبر کے ساتھ، اس کے بارے میں یہ شبہ نہ رہے کہ یہ غلط ہے؛ بلکہ یہ قرآن کا رسم الخط ہے، اور قرآن میں رسم عثمانی کی رعایت کرنا ضروری ہے، اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اصول یاد رکھنا چاہیے۔

خَطَّانِ لَا يُقَاسَانِ ☆ خَطُّ القَوافِي وَخَطُّ القُرْآن

یعنی دو رسم الخطوں کا کوئی قاعدہ نہیں ہے، ایک قافیہ واشعار کا خط، دوسرے قرآن کا رسم الخط، دیکھیے، قرآن میں قَالَ کو قٰل لکھا گیا ہے مالك کو مٰلك لکھا گیا ہے۔

(خلاصہ فتاوی ریاض العلوم: ۲/۸۰)

تیسرا باب

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِاللّٰهِ مَنْ بَدَأَ بِالسَّلَامِ

(ترمذي:٢٦٩٤)

احادیثِ سلام —— فضائل، مسائل اور تشریح مع فوائد

احادیثِ سلام —— فضائل، مسائل اور تشریح مع فوائد

۱- حضرت عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے دریافت کیا کہ: اہلِ اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کھانا کھلانا اور ہر شناسا و ناشناسا کو سلام کرنا۔ (بخاری، رقم الحدیث: ۱۲، باب اطعام الطعام)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام کا تعلق، جان پہچان اور شناسائی کے حقوق سے نہیں ہے؛ بلکہ یہ ان حقوق میں سے ہے، جو اسلام نے ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے تئیں عائد کیے ہیں؛ لیکن آج اس سلسلے میں کوتاہی اور غفلت عام ہے، عموماً لوگ چہرہ اور شخصیت دیکھ کر سلام کرتے ہیں یا اسے سلام کرتے ہیں، جس سے نفع وضرر کا تعلق ہوتا ہے، اصلاح کی ضرورت ہے، شرح ابن بطال میں ہے:

غیر شناسا کو سلام کرنا، انسیت و محبت کا پیش خیمہ ہے؛ جب کہ غیر شناسا کو سلام نہ کرنا نفرت و عداوت کا مقدمہ ہے۔ (۱۴/۹)

مطلب اور غرض کا سلام

آج کل ہمارے اندر، سلام کرنے میں بہت کمی پائی جاتی ہے، ہم صرف جان پہچان والوں کو سلام کرتے ہیں، اور جان پہچان والوں میں بھی، ہمارا ان لوگوں کو سلام کرنے کا معمول ہے، جن سے ہماری دینی یا دنیاوی کوئی غرض وابستہ ہے، اگر کوئی جان پہچان والا ہے؛ لیکن اس

سے ہمارا کوئی مطلب اور کوئی غرض نہیں یا خدانخواستہ اس سے ہماری کوئی ناراضگی ہے تو اس کو بھی سلام نہیں کرتے، یہ تو مطلب والا سلام ہوا...... ہمارے دین میں ایسا کوئی حکم نہیں، ہمارے دین میں یہ حکم ہے کہ چاہے تمہاری کسی سے کوئی غرض وابستہ ہو یا نہ ہو، چاہے تمہارے اور اس کے درمیان جان پہچان ہو یا نہ ہو، آپس میں دوستی ہو یا نہ ہو، رشتہ داری ہو یا نہ ہو، پڑوس ہو یا نہ ہو، برادری کا تعلق ہو یا نہ ہو اور چاہے وہ امیر ہو یا غریب، پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ؛ بس مسلمان ہونا چاہیے، اسے سلام کیا جائے۔(اصلاحی بیانات:۵/۴۶)

مفتی سعید احمد صاحب کے افادات میں ہے:

من عَرفتَ ومن لم تعرف (شناسا اور غیر شناسا) میں ملی معرفت وعدم معرفت مراد نہیں؛ بلکہ شخصی معرفت وعدم معرفت مراد ہے، ملی معرفت تو ضروری ہے، غیر مسلم کو اسلامی سلام کرنا جائز نہیں، اب مسلمانوں کا عجیب حال ہوگیا ہے، ملی معرفت بھی باقی نہیں رہی، راستے میں ایک شخص ملتا ہے سوچتا ہوں کہ سلام کروں یا نہ کروں؛ کیوں کہ مسلمان ہے، اس کی کوئی پہچان نہیں۔(تحفۃ الالمعی:۱/۲۱۳)

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

شناسا وغیر شناسا سب کو سلام کرنے میں کئی فائدے ہیں، مثلاً: (۱)إخلاص العمل للہ (یعنی اخلاص وللّٰہیت کا اظہار)(۲) استعمال التواضع (تواضع وخاکساری کا اظہار)(۳) وإفشاء السلام الذي هو شعار هذه الأمة (سلام جو شعائرِ اسلام میں سے ہے اس کی اشاعت)(فتح الباری:۱۱/۲۷)

۲- صرف جان پہچان کے لوگوں کو سلام کرنا، علامتِ قیامت ہے

حضرت ابن مسعودؓ سے مرفوعاً منقول ہے: قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ انسان مسجد کے پاس سے گذرے گا؛ لیکن مسجد میں نماز نہیں پڑھے گا اور یہ کہ انسان صرف جان پہچان کے لوگوں کو سلام کرے گا۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: ۹۴۸۹)

غور کریں ان دونوں علامتوں کے ظہور کا وقت اور زمانہ، کیا آئندہ آنے والا ہے یا آچکا ہے؟ دونوں قسم کے لوگ، آج معاشرہ میں بکثرت پائے جاتے ہیں، لوگ نماز سے حد درجہ غافل ہیں، اور سلام اولاً کرتے ہی نہیں، اگر کرتے ہیں تو صرف جان پہچان کے لوگوں کو، یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے، اصلاح کی سخت ضرورت ہے؛ تاہم یہ بھی افسوس کے ساتھ کہنا اور لکھنا پڑ رہا ہے کہ عام مسلمانوں نے اپنی وضع قطع، رہن سہن اور حلیہ ایسا بنالیا کہ ظاہر دیکھ کر، آپ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ مسلمان ہیں، وضع میں نصاری، تمدن میں ہنود اور انہیں دیکھ کر شرمائیں یہود کا مصداق؛ لہٰذا اگر کسی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ یہ مسلمان ہے یا نہیں اور ظاہری شکل وشباہت سے بھی مسلمان ہونا معلوم نہ ہو، تو سلام کا ترک، حدیث کا مصداق نہیں؛ لیکن اگر وضع قطع اسلامیانہ اور صورت مومنانہ ہو؛ لیکن نام وشخصیت نامعلوم ہے، تب سلام کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔

امام بخاری نے اپنی کتاب ''الادب المفرد'' میں باب باندھا ہے: باب من كره تسليم الخاصة (یعنی اس کا باب جس نے کسی کو خاص کر کے سلام کہنے کو مکروہ جانا) اور باب کے تحت حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ذکر کی ہے، جو تفصیلی روایت ہے کہ ایک شخص نے انہیں یوں سلام کیا تھا: عليكم السلام يا أبا عبد الرحمن، بعد میں حضرت نے حضور ﷺ کا ارشاد سنایا، جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے بين يدي الساعة، تسليم الخاصة، کہ قیامت کے قریب، خاص لوگوں کو سلام کیا جائے گا۔ (رقم الحدیث: ۹۸۵)

۳- عام مسلمانوں کے حقوق

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: مسلمان پر، مسلمان کے

چھ حقوق ہیں (۱) جب کوئی مسلمان بیمار ہو تو دوسرا مسلمان اس کی مزاج پرسی کرے (۲) جب کوئی مسلمان مرجائے تو (دوسرا مسلمان) اس کی نمازِ جنازہ میں شریک ہو (۳) جب کوئی مسلمان کھانے پر بلائے تو اس کی دعوت قبول کرے (۴) جب (کوئی مسلمان) ملے تو اس کو سلام کرے (۵) جب کوئی مسلمان چھینکے (اور الحمدللہ کہے) تو اس کا جواب دے (یعنی یرحمك الله کہے) (٦) خیر خواہی کرے خواہ (دوسرا مسلمان) موجود ہو یا غائب۔ (مسلم، رقم: ۵۶۵۱، کتاب السلام)

فائدہ: ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے جہاں دینی اخوت کی بنیاد پر، بہت سے حقوق ہیں، ان میں سے ایک حق، بوقتِ ملاقات "السلام علیکم" کے ذریعہ سلام کرنا بھی ہے، اور حق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے صاحبِ حق تک پہنچانا ضروری ہے، ورنہ پہلا شخص کوتاہی کرنے والا شمار ہوگا؛ لہٰذا مسلمان کا مسلمان کو سلام کرنا فرض منصبی اور اخلاقی حق کا درجہ رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ توفیق دے۔

حدیث میں جن چھ حقوق کا تذکرہ ہے، یہ بطور مثال کے ہیں، ورنہ حقوق اور بھی ہیں، حضرت حکیم الامتؒ نے عام مسلمانوں کے حقوق کی تعداد چالیس تک شمار کرائی ہے، ان میں سے اکتیسواں حق یہ لکھا ہے:

> ملاقات کے وقت اس کو (مسلمان کو) سلام کرے اور مرد سے مرد، اور عورت سے عورت مصافحہ بھی کرے تو اور بہتر ہے مکمل تفصیل کے لیے پڑھیے۔ (بہشتی زیور مکمل، حقوق کا بیان: ۲۸۷/۵)

۴- تین آسان کاموں پر جنت کی بشارت

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگو! خداوند رحمٰن کی عبادت کرو اور بندگانِ خدا کو کھانا کھلاؤ اور سلام کو خوب پھیلاؤ، تم جنت میں پہنچ جاؤ گے سلامتی کے ساتھ۔ (الأدب المفرد: ۹۱۶)

تشریح: اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے تین نیک کاموں کی ہدایت فرمائی ہے، اور ان کے کرنے والے کو جنت کی بشارت دی ہے...... ایک خداوند رحمٰن کی عبادت (یعنی بندے پر اللہ کا جو خاص حق ہے اور جو دراصل مقصدِ تخلیق ہے کہ اس کی اور صرف اسی کی عبادت کی جائے، اس کو ادا کیا جائے) دوسرے اطعامِ طعام یعنی اللہ کے محتاج اور مسکین بندوں کو بطور صدقہ اور دوستوں، عزیزوں اور اللہ کے نیک بندوں کو بطور ہدیہ اخلاص ومحبت کے، کھانا کھلایا جائے (جو دلوں کو جوڑنے اور باہم محبت والفت پیدا کرنے کا بہترین وسیلہ اور بخل جیسی مہلک بیماری کا علاج بھی ہے) تیسرے السلام علیکم اور وعلیکم السلام کو جو اسلامی شعار ہے، اور اللہ تعالیٰ کا تعلیم فرمایا ہوا دعائیہ کلمہ ہے، اس کو خوب پھیلایا جائے اور اس کی ایسی کثرت اور ایسا رواج ہو کہ اسلامی دنیا کی فضا اس کی لہروں سے معمور رہے، ان تین نیک کاموں پر رسول اللہ ﷺ نے بشارت سنائی ہے، تدخلوا الجنة بسلام (تم پوری سلامتی کے ساتھ جنت میں پہنچ جاؤ گے) (معارف الحدیث: ۶/۱۵۱)

۵- سلام، اسلامی دوستی کا بہترین ذریعہ

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم جب تک ایمان نہ لاؤ گے جنت میں داخل نہ ہو سکو گے، اور تمہارا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم (اللہ کی رضا وخوشنودی کے لیے) آپس میں تعلق ودوستی قائم نہ کرو، اور کیا میں تمہیں ایک ایسا ذریعہ نہ بتادوں، جس کو تم اختیار کرو تو آپس میں دوستی کا تعلق قائم ہو جائے اور وہ ذریعہ یہ ہے کہ تم آپس میں سلام کا چلن عام کرو۔ (مسلم، رقم الحدیث: ۱۹۴، کتاب الایمان)

فائدہ: علامہ طیبیؒ لکھتے ہیں:

سلام کو رواج دینا اور ایک دوسرے کو سلام کرنا، آپسی الفت ومحبت اور اتحاد واتفاق کا ذریعہ ہے، جس کی وجہ سے اسلام مضبوط ہوتا

ہے اور یہ آپسی محبت، کمالِ ایمان کا سبب ہوتا ہے، جس پر ہر خیر
وبھلائی کی بنیاد ہے، اور اس کے بر خلاف ترکِ سلام اور ترکِ
تعلق، دینِ اسلام کو کمزور کرنے کا سبب اور نقصانِ دین کا ذریعہ
ہے۔ (حاشیۃ الطیبی: ۹/۷)

سلام کا فائدہ اور اس کی مشروعیت کی وجہ

سورہ زمر آیت ۷۳ میں ارشاد پاک ہے: کہ جب متقی لوگ جنت پر پہنچ جائیں گے تو محافظ فرشتے ان سے کہیں گے: السلام علیکم تم پر سلامتی ہو، تم مزے میں رہو، پس جنت میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو جاؤ۔

نبی ﷺ نے سلام کا فائدہ اور اس کی مشروعیت کی وجہ بیان کی ہے کہ: سلام محبت پیدا کرتا ہے، اور محبت دخولِ جنت کا سبب ہے؛ اس لیے سلام مشروع کیا گیا؛ اس کی تفصیل یہ ہے کہ دخولِ جنت کے لیے لازمی شرط ایمان ہے اور کمالِ ایمان کے لیے، مسلمانوں کے درمیان رشتۂ الفت ومحبت ضروری ہے؛ کیوں کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، اور اس کو حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ سلام کو پھیلانا ہے، یعنی اس کو رواج دینا ہے، جب لوگ خلوص سے ایک دوسرے کو سلام کریں گے اور ان کو خوش آمدید کہیں گے، جس طرح فرشتے جنتیوں کو خوش آمدید کہیں گے تو باہم الفت ومحبت پیدا ہوگی اور وہ جنت میں لے جائے گی، یہی کام مصافحہ اور دست بوسی وغیرہ بھی کرتے ہیں۔

(رحمۃ اللہ الواسعۃ: ۵/۵۴۵)

ابن حجرؒ، ابن العربیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

افشاء سلام کا فائدہ، حصولِ محبت تو ہے ہی؛ لیکن اس کی وجہ سے
سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ، ایک دینی فضا قائم ہوتی ہے اور
شریعت پر عمل کرنا آسان ہوتا ہے، جس سے اسلام مضبوط ہوتا ہے

اور ظاہر سی بات ہے جب اسلام اور اہلِ اسلام مضبوط ہوں گے تو کفار ومشرکین اور یہود ونصاری کا زور ٹوٹے گا، ایک مضبوط ہوگا تو دوسرا خود بخود کمزوری کا شکار ہوگا اور کمزوری سے مراد ''إخــــزاء الکافرین'' کفار ومشرکین کی رسوائی وپسپائی ہے۔

وكـان ذلك لما فيه من ائتلاف الكلمة؛ لتعم المصلحة بـوقـوع الـمـعـاونة على إقامة شرائع الدين وإخزاء الكافرين. (فتح الباری:۱۱/۲۴)

مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اس حدیث سے صراحۃً معلوم ہوا کہ ایمان جس پر داخلۂ جنت کی بشارت اور وعدہ ہے، وہ صرف کلمہ پڑھ لینے کا اور عقیدہ کا نام نہیں ہے؛ بلکہ اتنی وسیع حقیقت ہے کہ اہلِ ایمان کی باہمی محبت ومودت بھی اس کی لازمی شرط ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بڑے اہتمام کے ساتھ بتلایا ہے کہ ایک دوسرے کو سلام کرنے اور اس کا جواب دینے سے، یہ محبت ومودت دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔

(معارف الحدیث:۶/۱۵۳)

اخلاص ہر عمل کی جان ہے

یہاں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ کسی عمل کی خاص تاثیر جب ہی ظہور میں آتی ہے؛ جب کہ اس عمل میں روح ہو، نماز، روزہ اور حج اور ذکر اللہ جیسے اعمال کا حال بھی یہی ہے؛ بالکل یہی معاملہ سلام اور مصافحہ کا بھی ہے کہ یہ اگر دل کے اخلاص اور ایمانی رشتہ کی بناء پر، صحیح جذبہ سے ہوں تو پھر دلوں سے کدورت نکلنے اور محبت ومودت کا رس پیدا ہوجانے کا یہ بہترین وسیلہ ہیں۔(حوالہ سابق) اسی اخلاص سے عمل قیمتی بنتا ہے، اس کے بغیر عمل بے جان رہتا ہے؛ بلکہ کبھی

وبالِ جان بن جاتا ہے۔

۶- افشاء سلام، حلاوتِ ایمانی کا ذریعہ

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس نے تین باتوں کو جمع کرلیا، اس نے ایمان کو جمع کرلیا اور دوسری روایت میں ہے، وہ ایمان کی چاشنی پائے گا۔ (۱) الإنصاف من نفسك (اپنی ذات کے بارے میں انصاف کرنا یعنی خود شناسی) (۱) (۲) بذل السلام للعالم (دنیا میں سلام پھیلانا) (۳) والإنفاق من الإقتار (تنگ دستی کے باوجود خرچ کرنا) (شرح السنۃ:۱۲/۲۶۱)

تشریح: یہ تینوں خصلتیں تکمیل ایمان کا ذریعہ ہیں؛ کیوں کہ ایمان کا مدار ان تین خصلتوں پر ہے؛ اس لیے کہ انسان جب انصاف کی صفت سے متصف ہوگا تو خود شناس، خدا شناس اور موقعہ شناس ہوگا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں کوتاہی سے گریز کرے گا، اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب اس کا شیوہ ہوگا اور بذل سلام یعنی سلام کو دنیا میں عام کرنا، اس وصف میں تواضع، انکساری وخاکساری، مکارم اخلاق، الفت ومحبت اور باہمی رواداری جیسی صفات پوشیدہ ہیں، اور تنگ دستی میں خرچ کرنا، یہ عادت جس میں ہوگی وہ سخی ہوگا، حقوقِ مالیہ کو ادا کرنے والا ہوگا، اسے خدا کی رزاقیت پر کامل درجہ کا بھروسہ ہوگا، دنیا اور اس کی دولت سے بے رغبت ہوگا، آخرت کی تیاری کرنے والا ہوگا، اب سوچیے جو اتنے سارے اوصاف حمیدہ کا حامل ہوگا تو اسے حلاوتِ ایمانی نہیں ملے گی تو پھر کسے ملے گی؟ یہی کامل ایمان کا مطلب ہے، اللہ ہمیں بذلِ سلام کی توفیق دے، آمین۔ (شرح السنۃ:۱۲/۲۶۱، زاد المعاد:۲/۳۷۷)

---

(۱) اپنے ساتھ انصاف کرنے کی مثال: دوسروں کے معاملہ میں انصاف کرنا تو ہر کوئی جانتا ہے اور کرتا ہے اور اپنے اور اپنے متعلقین کے معاملہ میں انصاف کرنے کو بھی ہر کوئی جانتا ہے، مگر یہ کام مشکل ہے، قوی ایمان والا ہی یہ کام کرسکتا ہے، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے بنو امیہ کی ناجائز املاک بحکومت ضبط کرلیں؛ یہاں تک کہ اپنی اہلیہ کا قیمتی ہار بھی بیت المال میں داخل کرادیا، اور دار العلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ نے اپنے پوتے کے معاملہ میں دو فیصد غیر حاضری کی بھی رعایت نہیں کی، اور اس کو سالانہ امتحان میں شریک نہیں کیا، یہ ہے اپنی ذات کے ساتھ انصاف کرنا۔ (تحفۃ القاری:۱/۲۴۵)

۷- سلام میں سبقت کرنا تکبر سے پاکی کی علامت

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے پاک ہوتا ہے۔ (شعب الایمان رقم الحدیث:۸۷۸٦)

تشریح: (۱) تکبر، کبریائی اور بڑائی اللہ تعالیٰ کو زیب دیتی ہے، انسان جو مٹی کا پتلا ہے، اس کے لیے تکبر و گھمنڈ مناسب نہیں؛ اِسی لیے تکبر ایک مذموم صفت ہے اور متکبر کو معاشرے میں پسندیدگی اور وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا، لوگ ایسے متکبر سے دور رہنا پسند کرتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے کتنی پیاری بات بتائی کہ سلام میں سبقت کرنے والا متکبر نہیں ہوتا؛ بلکہ متواضع ہوتا ہے؛ کیوں کہ سلام کا مطلب ہی ہے تکبر و غرور سے سلامتی؛ آیئے سلام میں سبقت کریں؛ تاکہ معاشرے اور شریعت کی نگاہ میں، معتبر و مستند شخصیت کے مالک بنیں۔

(۲) علامہ طیبیؒ لکھتے ہیں:

> سلام میں پہل کرنے والے سے مراد ایسے دو شخص ہیں جو آپس میں ملیں، اور دونوں کی حیثیت یکساں نوعیت کی ہو مثلاً: دونوں پیدل ہوں یا دونوں سوار ہوں؛ تو ان میں سے جو شخص پہلے سلام کرے گا، وہ گویا ظاہر کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تکبر و غرور سے پاک رکھا ہے۔ (حاشیۃ الطیبی :۹/۲۵)

مذکورہ حدیث کا ایک دوسرا مطلب

سلام میں پہل کرنا اس بات کی علامت اور دلیل ہے کہ اس بندے کے دل میں تکبر نہیں ہے، اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ سلام میں پہل کرنا، کبر کا علاج ہے جو بدترین رزیلہ ہے، جس پر احادیث میں عذاب نار کی وعید ہے، اللھم احفظنا. (معارف الحدیث:٦/١٥٦)

تکبر کی بیماری عام ہے تو اس کا علاج بھی اتنا ہی آسان؛ لہٰذا جو آدمی اپنے اندر تکبر محسوس

کرتا ہے اور اس کا علاج چاہتا ہے، اس کو چاہیے جو مسلمان ملے، اس کو سلام کیا کرے، اس سے ان شاء اللہ تعالیٰ تکبر ٹوٹ جائے گا اور تواضع پیدا ہو جائے گی۔ (اصلاحی بیانات: ۹/۴۳)

۸- سلام میں پہل کرنا خدا کی رحمت کا استحقاق پیدا کرتا ہے

حضرت ابو امامہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: لوگوں میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ نزدیک وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔ (ترمذی، رقم الحدیث: ۲۶۹۴، فضل الذی یبدأ بالسلام)

تشریح: جو آدمی سلام کرنے میں سبقت کرتا ہے وہ خدا کی رحمت و مغفرت کا اور لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ مستحق ہوتا ہے، جو آپس میں ملاقات کرتے ہیں؛ کیوں کہ پہلے سلام کرنے سے، اس کی زبان پر، لفظ سلام پہلے آیا، جو خدا کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام ہے اور جواب دینے والے کی زبان پر لفظ سلام بعد میں آیا؛ لہٰذا رحمت و مغفرت کے مستحق تو دونوں ہوئے؛ لیکن پہلا زیادہ ہوا؛ کیوں کہ الأول هو الأول: لہٰذا ہمیں سلام میں سبقت کرنا چاہیے، انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ لوگ ہمیں سلام کریں، آج معاشرے میں جو لوگ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں (خواہ عمر میں یا رتبہ میں) وہ جلدی سلام نہیں کرتے، سلام کرنا اپنی بڑائی کے خلاف تصور کرتے ہیں، یہ غلط ہے؛ بلکہ رحمتِ خداوندی سے دوری کا سبب ہو سکتا ہے۔ (فیض القدیر بحذفٍ واضافۃٍ: ۲/۴۴۱)

فائدہ: یاد رہے مذکورہ فضیلت کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو راستہ میں ایک دوسرے سے ملیں؛ کیوں کہ اس صورت میں سلام کرنے کے حق کے سلسلے میں وہ برابر کی حیثیت رکھیں گے؛ لہٰذا ان میں سے جو شخص پہلے سلام کرے گا وہ مذکورہ فضیلت کا مستحق ہوگا۔ (مظاہر حق جدید: ۵/۳۴۵)

فائدہ: اس کے برخلاف اگر یہ صورت ہو کہ ایک شخص تو کہیں بیٹھا ہوا ہو اور دوسرا شخص اس کے پاس آئے تو سلام کرنے کا حق اس دوسرے شخص پر ہوگا جو آیا ہے؛ لہٰذا اگر آنے والا سلام کرنے میں پہل کرے تو وہ فضیلت کا مستحق نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اس نے سلام میں پہل کر کے درحقیقت اس حق کو ادا کیا ہے جو اس کے ذمہ تھا؛ ہاں اگر سلام کرنے میں وہ شخص پہل کرے جو بیٹھا ہوا تھا تو وہ اس

فضیلت کا مستحق ہوگا۔ (مظاہر حق جدید: ۳۴۶/۵)

۹- سلام میں پہل قربِ خداوندی کی نشانی

حضور ﷺ سے پوچھا گیا: دو شخص ایک دوسرے سے ملیں تو ان میں سے سلام کی ابتداء کون کرے؟ آپ نے فرمایا: " أولاهما بالله " پہل وہ کرے جو دونوں میں اللہ سے زیادہ قریب ہے۔ (ترمذی: ۲۶۹۵)

یعنی جو بندہ نیک ہوتا ہے، وہ سلام میں پہل کرتا ہے؛ پس یہ سلام میں پہل کرنے کی فضیلت ہوئی، اس کی پہل اس کے نیک بندہ ہونے کی دلیل ہے پس زہے نصیب۔

(تحفۃ الالمعی: ۴۷۵/۶)

۱۰- سلام میں پہل کرنا ننانوے رحمتوں کا ذریعہ

حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب دو مسلمانوں کی آپس میں ملاقات ہوتی ہے اور ان میں سے ایک، دوسرے کو سلام کرتا ہے تو اللہ کے نزدیک ان میں محبوب ترین وہ ہوتا ہے جو مسکراتے ہوئے ملتا ہے، پھر جب دونوں مصافحہ کرتے ہیں تو اُن پر سو رحمتیں اُترتی ہیں، وللبادي منهما تسعون وللمصافح عشرة یعنی نوے رحمتیں سلام میں پہل کرنے والے کو ملتی ہیں اور دس سلام کا جواب دینے والے کو ملتی ہیں۔

(الترغیب والترہیب: ۴۳۳/۳)

سلام میں پہل کی ایک اور فضیلت

ایک شخص نے پہل کرتے ہوئے، ایک جماعت کو سلام کیا اور سب نے جواب دیا، ایسی صورت میں وہ تنہا شخص فضیلت کے اعتبار سے، پوری جماعت سے بڑھا ہوا ہے؛ کیوں کہ یہ ان کے جوابِ سلام کا سبب بنا اور اگر پوری جماعت جواب نہ دے تب بھی اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں؛ کیوں کہ اس کا جواب فرشتے دیتے ہیں۔

روي إذا مرّ الرجل بالقوم، فسلَّم عليهم، فردوا عليه، كان له عليه فضل؛ لأنه ذكرهم بالسلام، وإن لم يردوا عليه، ردَّ عليه ملأ خير منهم وأطيب.
(حاشیہ فیض القدیر: ۲/۴۴۱)

۱۱- اسلام کی نظر میں بخیل کون؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سب سے بڑا بخیل وہ ہے، جو سلام کرنے میں بخل کرتا ہے۔ (الأدب المفرد، رقم: ۹۷۸)

۱۲- حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جھوٹی قسم کھانے والا سب سے بڑا جھوٹا ہے اور سلام میں بخل کرنے والا، بڑا بخیل ہے۔ (ایضاً ۹۷۷)

تشریح: عموماً جو لوگ مال و دولت خرچ نہیں کرتے، دنیا انہیں بخیل اور کنجوس سمجھتی ہے؛ لیکن اسلام کے نزدیک معیارِ بخل سلام میں بخل کرنا ہے؛ کیوں کہ سلام سے حاصل ہونے والی جو دولتِ ثواب ہے، دنیا کی مادی دولت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، ایک پائیدار دولت ہے؛ جب کہ دوسری قریب الفنا دولت ہے، سلام نہ کرنے والا اس ابدی دولت سے ہی محروم ہوجاتا ہے، اور حساس قلب و دماغ کے ذریعہ غور کیجیے تو سمجھ میں آئے گا کہ مذکورہ احادیث میں بڑے پیارے، اور لطیف انداز میں، سلام کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

فائدہ: حدیث کے الفاظ إن أبخل الناس من بخل بالسلام میں سلام اور جواب سلام: دونوں صورتیں داخل ہیں، یعنی جس طرح سلام نہ کرنا بخل ہے، ویسے ہی سلام کا جواب نہ دینا بھی بخل ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ "السلام عليكم ورحمة الله" اور "وعليكم السلام ورحمة الله" ایک مختصر سا جملہ ہے، اس کی ادائیگی اور اس کے تلفظ میں کوئی پریشانی اور تکلیف نہیں؛ مزید براں اس جملے پر نیکیاں ملتی ہیں، رحمتوں کا نزول ہوتا ہے اور سلامتی کی بارش ہوتی ہے؛ الغرض لفظ قلیل اور اجر جزیل کا مصداق ہے؛ اب اگر قدرت کے باوجود کوئی شخص قصداً سلام نہیں

کرتا یا سلام کا جواب نہیں دیتا تو اس حرماں نصیب کو بخیل نہیں کہا جائے گا تو بتایئے کیا کہا جائے گا۔

(من بخل بالسلام) ابتداءً أو جواباً؛ لأنه لفظ قليل لا كلفة فيه وأجر جزيل؛ فمن بخل به مع عدم كلفة فهو أبخل الناس. (فیض القدیر:۲/۴۰۵)

۱۳- اسلامی معاشرے کی اولین تعلیم

اسلامی تہذیب وتعلیمات کا آغاز سلام سے ہوتا ہے، نبی خدا ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے صحابۂ کرام کو جن باتوں کی تلقین فرمائی، ان میں سے ایک ''سلام'' ہے، جس کی تفصیل حضرت عبد اللہ بن سلامؓ نے بیان فرمائی ہے، جو پہلے ایک بڑے یہودی عالم تھے، روایت پڑھیے۔

جب نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو میں (آپ کی زیارت کے لیے) آیا، جب چہرہ انور کو دیکھا تو میں نے یقین کرلیا کہ یہ کسی دروغ گو (جھوٹے) کا چہرہ نہیں ہوسکتا(۱) آپ نے سب سے پہلے جو بات ارشاد فرمائی وہ یہ تھی: اے لوگو! سلام عام کرو، کھانا کھلاؤ، صلہ رحمی کرو اور جب لوگ سوئے ہوئے ہوں تو اٹھ کر (تہجد) نمازیں پڑھا کرو تم سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ (شعب الایمان:۸۷۴۹)

اس اولین تعلیم کی وجہ اور فائدہ

پیچھے یہ بات گذر چکی ہے کہ سلام کو عام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر اس شخص کو سلام کیا جائے، جس کا مسلمان ہونا معلوم ہو، یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ حضور ﷺ نے سب سے پہلے رواجِ سلام پر زور کیوں دیا؟ اس کی وجہ پڑھیے:

مومن کی زندگی کا مقصود، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی ہے، سلام اس کا بنیادی اور کلیدی ذریعہ ہے؛ اس لیے آپ نے مدینہ آتے ہی، سب سے پہلے سلام عام کرنے کی تلقین فرمائی؛

(۱) چہرہ دل کا ترجمان ہوتا ہے، اندرونی کیفیات چہرے پر نمودار ہوتی ہیں، اکثر بھلا اور برا آدمی چہرے کے نشیب وفراز سے پہچان لیا جاتا ہے۔

تا کہ مواخات کا راستہ صاف ہو پھر احکامِ خداوندی کی بجا آوری اور نفاذ میں آسانی ہو اور ایک اسلامی حکومت کی مستحکم بنیاد ڈالی جا سکے جو پوری دنیا کے لیے، مرکزِ اشاعتِ اسلام ثابت ہو؛ چناں چہ اس تعلیم کا اثر بہت جلد ہی ظاہر ہوا؛ کیوں کہ ارادے نیک تھے اور حوصلے انقلابی تھے اور وحی الٰہی کی تائید حاصل تھی؛ چناں چہ تئیس سال کی قلیل مدت میں ایک ایسا انقلاب دنیا نے دیکھا؛ کہ ویسا انقلاب نہ ماضی میں دیکھنے کو ملا تھا اور نہ مستقبل میں امید ہے، آج اس انقلاب کی تجدید، افشاءِ سلام سے ہی ممکن ہے، آیئے اسے اسی نیت سے رواج دیں۔ (مولف)

مدینہ کا عمومی ماحول سلام میں پہل کرنا تھا

صحابۂ کرام حضور ﷺ کے صحبت یافتہ اور فیض یافتہ تھے، حضور ﷺ کی درافشانی نے ان قطروں کو دریا بنا دیا تھا، مردہ قلوب کو روشن اور آنکھوں کو بینا بنا دیا تھا، اور نبی رحمت نے ان کی مسیحائی کی تھی؛ اس لیے حضور ﷺ کی ایک ایک ادا پر مر مٹنے کا جذبہ اور حوصلہ ان کے اندر ایسا پیدا ہو گیا تھا؛ کہ دنیا کی تاریخ ان مثالوں کو دہرا نہ سکی اور آگے ناامیدی کے ساتھ انتظار ہے، حضور ﷺ کے ارشادات پر عمل کرنا ان کی زندگی کا پہلا اور آخری نصب العین تھا، اور ان سب کی بنیادی وجہ ''حقیقی محبتِ نبوی'' سے سرشار قلوب تھے، حضور ﷺ نے بتا دیا کہ سلام میں پہل کرنا تکبر سے پاکی کی علامت ہے، سلام میں سبقت کرنا نیکیوں میں اضافہ کا سبب ہے اور سلام کو رواج دینا، دخولِ جنت کا ذریعہ ہے؛ بس ان کی زندگی میں سلام میں سبقت اور اس کی اشاعت ایسی رچ بس گئی جیسے پھول میں خوشبو، پانی میں برودت اور جسم میں جان، اس کا اندازہ ایک روایت سے بخوبی ہوتا ہے۔

حضرت اغر مزنیؓ کا بیان ہے: کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میرا ایک شخص کے ذمہ قرض تھا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو میرے ساتھ بھیجا اور کہا: اس شخص کا حق ادا کر دو، ہم چل رہے تھے، حضرت صدیق بولے: کیا نہیں دیکھتے لوگ فضیلت میں ہم سے پہل کرتے ہیں؟ چناں چہ اس کے بعد ہم سلام میں ابتدا کرتے تھے۔ (کنز العمال رقم: ۲۵۷۳۴) اللہ ہمیں بھی توفیق دے۔ (مولف)

۱۴- گھر والوں کو سلام کرنا خیر و برکت کا سبب ہے

خادم رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضورﷺ نے فرمایا: بیٹے! جب تم اپنے گھر والوں سے ملو تو سلام کیا کرو، وہ سلام تم پر اور تمہارے گھر والوں پر خیر و برکت اور نزولِ رحمت کا باعث ہوگا۔ (ترمذی، رقم الحدیث: ۲۶۹۸)

تشریح: آج کل عمومی ماحول ہے، ہر آدمی رزق میں، آل اولاد میں اور دوکان وتجارت میں بے برکتی کا رونا روتا ہے، حضورﷺ نے اس کا آسان حل بتایا کہ گھر والوں کو اخلاص اور حضور کی سنت سمجھ کر سلام کرنا برکت کا سبب ہے، حضورﷺ کی بات کبھی جھوٹی نہیں ہوسکتی یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے، اور ایک دوسری روایت میں گھر والوں کو سلام کرنے کو دخولِ جنت کا سبب اور اللہ کی ضمانت وحفاظت میں رہنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے، روایت پڑھیے:

۱۵- حضورﷺ نے فرمایا: تین لوگ، اللہ تعالیٰ کی ضمانت وحفاظت میں ہوتے ہیں؛ اگر وہ زندہ ہیں تو اللہ کفایت فرماتا ہے اور وفات پا گئے تو جنت میں داخل ہوں گے (ان میں سے ایک) وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں میں سلام کر کے داخل ہوتے ہیں۔ (الأدب المفرد: ۱۰۲۸، فضل من دخل بیتہ بسلام)

اس کی مزید وضاحت ابن بطالؒ نے اپنی کتاب میں کی ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فإذا دخلتم بیوتا فسلموا علی أنفسکم. حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطاؒ وعکرمہؒ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کوئی خالی گھر میں داخل ہو تو وہاں سلام کرے؛ کیوں کہ فرشتے اس کا جواب دیتے ہیں، جب خالی گھر میں بوقتِ دخول سلام کا حکم ہے تو ایسے گھر میں جہاں لوگ موجود ہیں، انہیں سلام کرنا بدرجہ اولیٰ ثابت ہوتا ہے، گھر والوں کو سلام کرنا رزق میں برکت کا سبب ہوتا ہے اس کی مزید تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو زید بن اسلمؒ سے مروی ہے کہ:

حضورﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم لوگ اپنے گھروں میں جاؤ تو گھر والوں کو سلام کر لیا

کرواور اللہ کا نام لے لیا کرو؛ کیوں کہ جو کوئی بوقتِ دخول، سلام کر لیتا ہے اور کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لیتا ہے تو شیطان اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے: لا مبیت لکم ھھنا و لا عَشاء کہ چلو بھائی یہاں سونے اور کھانے کو کچھ نہیں ملے گا اور اگر داخل ہوتے ہوئے سلام نہیں کرتا اور کھاتے وقت بسم اللہ نہیں پڑھتا، تو شیطان اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے: أدرکتم المبیت و العشاء چلو سونے اور کھانے کا انتظام ہو گیا۔ (شرح ابن بطال: ۱۴/۷)

حدیث میں لا مبیت لکم الخ برکت سے کنایہ ہے اور أدرکتم المبیت الخ بے برکتی سے کنایہ ہے، گھر میں داخل ہوتے وقت سلام کے سلسلے میں کوتاہی اور غفلت عام ہے، عموماً لوگ سلام نہیں کرتے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کا علم ہی نہیں ہے، بڑے سلام نہیں کرتے تو بچوں پر اس کا اثر پڑتا ہے وہ بھی سلام نہیں کرتے؛ اس سلسلے میں بہت زیادہ اصلاح کی ضرورت ہے، اللہ توفیق دے، اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

۱۶- مسنون سلام باہمی تعلقات میں استحکام کی بنیاد

خلیفہ ثانی حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں: کہ تین چیزیں ایسی ہیں، جن کو اختیار کرنے سے مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور ایک مسلمان، اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے تئیں اخلاص ومحبت کے جذبات کو فروغ دیتا ہے (۱) ملاقات کے وقت سلام کرنے میں پہل کرنا (۲) مسلمان کو اس کے نام کے ذریعہ مخاطب کرنا، جس کو وہ پسند کرتا ہے (۳) جب وہ مجلس میں آئے تو اس کو (عزت واحترام) کے ساتھ جگہ دینا۔

(شرح السنۃ: ۲۶۳/۱۲)

۱۷- راستے پر بیٹھنے والے کی ذمہ داری؟

راستے پر بیٹھنے کو شریعت نے پسند نہیں کیا ہے، مگر کبھی راستوں پر بیٹھنا ناگزیر ہو جاتا ہے؛ اس لیے اس وقت اس کی اجازت ہے؛ مگر اس صورت میں کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کا

خیال رکھنا ضروری ہے، روایت پڑھیے۔

حضور ﷺ انصار کے کچھ لوگوں کے پاس سے گذرے، وہ راستے پر بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا: إن كنتم لا بد فاعلين، فرُدُّوا السلام وأعينوا المظلوم واهدوا السبيل یعنی اگر تمہارے لیے راستہ پر بیٹھنے کی مجبوری ہو تو سلام کا جواب دو، مظلوم کی مدد کرو اور راستہ کی رہنمائی کرو۔ (ترمذی: ۲۸۷۰، استئذان)

تشریح: حدیث کے پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ بے ضرورت راستہ پر نہیں بیٹھنا چاہیے، راستے سے عورتیں بھی گذرتی ہیں، پس نامحرم پر نظر پڑے گی؛ مگر کبھی لوگوں کے لیے اکٹھا ہونے کی کوئی جگہ نہیں ہوتی، ایسی صورت میں اگر وہ راستے پر بیٹھیں (تو سلام کریں) اور سلام کرنے والے کا جواب دیں، مظلوم کی مدد کریں اور کوئی راستہ پوچھے تو اس کو راستہ بتلائیں اور یہ ذمہ داریاں بطور مثال ہیں، ایسی اور بھی ذمہ داریاں ہوسکتی ہیں جو لوگوں کو خود سمجھنی چاہئیں۔ (تحفۃ الالمعی: ۶/۵۰۰)

۱۸- سلام کے سلسلے میں حضرت ابن عمرؓ کا شوق

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما، اتباعِ سنت میں شہرت رکھتے ہیں، حضور ﷺ کے اقوال وافعال کی نقل حد سے زیادہ کرتے تھے، محبت کی بات ہے، محبت والے سمجھیں گے، سلام کے سلسلے میں ان کا ایک واقعہ پڑھیے:

حضرت طفیل ابن اُبَی ابن کعب رضی اللہ عنہ حضرت کے پاس آیا کرتے تھے، حضرت ابن عمرؓ انہیں لے کر بازار جاتے تھے اور (راستہ میں) ہر ایک کو سلام کرتے تھے، چاہے وہ معمولی درجے کا دوکان دار ہو یا بڑا تاجر، خواہ غریب ومسکین ہو یا کوئی بھی شخص، ہر ایک کو سلام کرتے تھے، حضرت طفیل نے ایک روز ان سے پوچھا: کہ آپ بازار کیوں جاتے ہیں؟ وہاں نہ آپ کہیں رکتے ہیں، نہ خرید وفروخت کرتے ہیں، آخر بازار جانے کا سبب کیا ہے؟ بازار جانے سے بہتر ہے کہ ہم یہیں بیٹھ کر (احادیث کی سماعت کریں یا دینی باتیں کریں، حضرت نے کہا: میں بازار صرف اس

لیے جاتا ہوں؛ تاکہ ہر ملنے والے کو سلام کروں۔ (موطا مالک، رقم: ۱۷۳۲، جامع السلام)

اس واقعہ سے اندازہ لگانا آسان ہے کہ صحابہ کرام ایک ایک سنت کی ادائیگی کی کتنی فکر کرتے تھے؟ آج ہمارے معاشرے میں نہ جانے کتنی سنتیں دم توڑ رہی ہیں اور ہم خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، کاش ہم بیدار ہوتے، ہوش کے ناخن لیتے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس جذبہ اور شوق کی وجہ کیا تھی؟ شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی صاحبؒ نے اس پر روشنی ڈالی ہے: انہوں نے اپنی کتاب میں طبرانی کی ایک مرفوع روایت نقل کی ہے:

> جس نے ایک دن میں بیس مسلمانوں کو سلام کیا، چاہے اکٹھے طور سے یا الگ الگ؛ پھر اسی دن اس کا انتقال ہو جائے تو جنت اس کے لیے واجب ہو جاتی ہے۔ (رقم الحدیث: ۱۴۱۱۷)

اسی طرح ابن جریر کی ایک روایت نقل کی ہے:

> جس نے دس مسلمانوں کو سلام کیا؛ گویا اس نے ایک غلام آزاد کیا، اور اگر اسی دن اس کی وفات ہوگئی تو جنت اس کے لیے واجب ہو جاتی ہے۔ (الترغیب: ۴۸۹)

ان دونوں روایتوں کو نقل کرنے کے بعد، شیخ الحدیث صاحبؒ نے تبصرہ کیا ہے: میں سمجھتا ہوں کہ اسی ثواب کے حصول کے لیے حضرت ابن عمرؓ بازار جایا کرتے تھے۔ (أوجز المسالک: ۲۰۱/۱۷)

مولانا منظور نعمانی صاحبؒ لکھتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ کا یہ کریمانہ قانون ہے کہ اس نے ایک نیکی کا اجر، اس آخری امت کے لیے، دس نیکیوں کے برابر مقرر کیا ہے، قرآن پاک میں بھی فرمایا گیا من جاء بالحسنة فله عشر

أمثالها؛ اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے حق میں جس نے صرف ایک کلمہ "السلام علیکم" کہا تھا فرمایا: کہ اس کے لیے دس نیکیاں ثابت ہوگئیں اور جس شخص نے اس کے ساتھ دوسرے کلمہ "ورحمة اللّٰہ" کا بھی اضافہ کیا اس کے لیے آپ نے فرمایا کہ بیس نیکیاں ثابت ہوگئیں اور جس نے "السلام علیکم ورحمة اللّٰہ" کے ساتھ، تیسرے کلمہ "وبرکاتہ" کا بھی اضافہ کیا آپ نے فرمایا اس کے لیے تیس نیکیاں ثابت ہوگئیں۔ (ابو داؤد، رقم: ۵۱۹۵، باب کیف السلام) تو ابن عمر رضی اللہ عنہما اسی نیت سے بازار جاتے تھے کہ جو سامنے پڑے، اس کو سلام کریں اور ہر سلام پر کم از کم دس نیکیاں کما کر اللہ کی رحمتیں اور بندگانِ خدا کے جوابی سلاموں کی برکتیں حاصل کریں۔ (معارف الحدیث: ۱۵۵/۶)

ملحوظہ: المنتقی کے مصنف علامہ باجیؒ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا حصول ثواب وفضیلت کے لیے بازار تشریف لے جانا، اس وقت کا واقعہ ہے؛ جب کہ حق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا زمانہ تھا، لوگوں میں دین داری اور صلاح وتقویٰ کا غلبہ تھا؛ لیکن فی زماننا ایسا کرنا دشوار ہے، فتنہ وفساد اور گناہوں میں ابتلاء عام کی وجہ سے اب گھروں میں رہنا افضل ہے، اب تو بازار ہی مرکزِ گناہ ہیں۔ (المنتقی: ۲۸۳/۲)

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بازار جایا ہی نہ جائے؛ ہاں مستقلا سلام کرنے کے لیے جانا

دشوار ہے؛ ہاں اگر کسی کام سے بازار جارہے ہیں تو ضمناً اس فضیلت کو حاصل کر سکتے ہیں کہ راستے میں جو مسلمان بھائی ملیں انہیں سلام کریں، اور اگر کہیں بازار، مارکیٹ اور بھیڑ بھاڑ کی جگہیں ایسی ہیں؛ جہاں جاتے ہوئے راستے میں گناہوں میں مبتلا ہونے کا غالب گمان نہیں تو جائز ہے؛ لیکن ایسی جگہیں شاید اس زمانہ میں نہ ملیں، آپ کسی شاپنگ مال چلے جائیں، مارکیٹ و بازار کا رخ کریں، بے پردگی عروج پر پائیں گے؛ ان سب کے باوجود اس واقعہ سے اتنی بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان کو جہاں بھی موقع ملے، سلام کرنے سے چوکنا نہیں چاہیے۔

أما الحديث: يدل على جواز ارتياد المجتمعات ولو من غير حاجة: لأداء السلام على أهلها؛ إذا غلب على ظنه أنه لا يقع في طريقه بمعصية؛ فإذا خاف المعاصي، كان جلوسه في بيته أفضل. (نزهة المتقين: ۱/۵۷۸)

۱۹- سلامتی کی دعا لینے کا شوق

السلام علیکم اسلامی تہذیب کا اتنا پیارا جملہ ہے اور اس میں امن و سلامتی کا ایسا راز مضمر ہے کہ جو اس کی حقیقت سے واقف ہے، وہ اس کی اشاعت و افشا کے حوالے سے بڑا متفکر نظر آتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ کوئی مسلمان ملے کہ اسے سلام کرے؛ تاکہ وہ جواب میں وعلیکم السلام کہہ کر مجھے سلامتی کی دعا دے، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ پڑھیے، کیا غضب کی محبت تھی حضور سے اور کتنا کامل درجے کا یقین تھا، حضور ﷺ کی دعاؤں کی قبولیت پر، واقعہ پڑھیے۔

ایک مرتبہ نبی پاک ﷺ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے، آپ نے سلام برائے اجازت کیا، کوئی جواب نہیں ملا، آپ نے دوبارہ سہ بارہ سلام کیا؛ لیکن کوئی جواب نہیں ملا (چوں کہ اجازت کے لیے تین مرتبہ سلام کافی ہے) تو آپ نے کہا: قَضَینَا ما عَلَینَا، ہم نے اپنا کام کرلیا اور واپس ہوگئے (تھوڑی دیر کے بعد) حضرت سعد بن عبادہ

حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہا: یارسول اللہ! والذي بعثك بالحق، ما سلمتَ من مرة إلا وأنا أسمعُ وأرد عليك یعنی اے اللہ کے پیغمبر! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، آپ نے جتنی مرتبہ سلام کیا، میں نے سنا اور آہستہ(۱) سے جواب دیا، ولكن أحببتُ أن تُكثِر من السلام عليَّ وعلى أهل بيتي لیکن (کیا کروں) میں نے چاہا کہ آپ مجھ پر اور میرے گھر والوں پر بار بار سلام کریں۔ (الأدب المفرد: ۱۰۰۸)

یعنی اگر پہلی بار کے سلام کا جواب مَیں دے دیتا تو دو مرتبہ مزید، آپ کی زبانِ مبارک سے سلامتی کی دعا کی لازوال دولت مجھے نہ ملتی، آپ ایک مرتبہ بھی کسی کو سلامتی کی دعا دے دیں تو بالیقین وہ ہر طرح کی آفات ومصائب سے محفوظ رہے گا، تین مرتبہ کی تاثیر کا کیا پوچھنا؟ ایسا خیال اسی شخص کے ذہن میں آسکتا ہے، جس کے نزدیک حضور کی محبت، ہر محبت پر غالب ہو۔ رضی اللہ عنہ

سنن ابی داؤد میں یہ روایت تفصیل سے ہے، اسی روایت میں یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جب ان کے جذبۂ محبتِ حقیقی کو دیکھا تو یہ دعا دی: اللهم اجعل صلواتك ورحمتك على آل سعد بن عبادة اے اللہ سعد بن عبادہ کے اہل خانہ پر رحمت ومغفرت کی بارش نازل فرما۔

(رقم الحدیث: ۵۱۸۵)

ملحوظہ: (۱) یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا یہ فعل غلبۂ حال کی وجہ سے تھا یہ مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ کوئی سلام کرے اور کوئی عذر نہیں ہے تو جواب دینا چاہیے۔

(۲) اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر مرتبہ میں بڑے کو اپنے ماتحت سے کوئی کام ہو یا وہ اپنے گھر بلائے تو بڑے کو جانا چاہیے۔

(۳) اگر غلبۂ محبت کی وجہ سے کوئی ایسا کام ہو جائے جو عموماً نہیں کیا جاتا تو بعد میں عذر بیان کر دینا چاہیے۔

(۴) اگر چھوٹے کوئی اچھا کام کریں تو بڑوں کو انہیں دعا دینی چاہیے۔

---

(۱) چناں چہ ابوداؤد کی روایت میں فردَّ سعدٌ رداً خفيفاً کے الفاظ ہیں۔ رقم الحدیث: ۵۱۸۵۔

۲۰- بوقتِ ملاقات سب سے پہلے سلام —— ایک نبوی ادب

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: کہ جس نے سلام سے پہلے گفتگو شروع کر دی، اس کی بات کا جواب ہی مت دو۔ (المعجم الأوسط، رقم:۴۲۹)

تشریح: السلام علیکم ایک اسلامی تحیہ ہے؛ چناں چہ حضرت انسؓ سے مرفوعاً مروی ہے: السلام تحیة لملتنا(۱) اور تحیہ کا آغاز سلام سے ہی ہوسکتا ہے؛ اگر گفتگو پہلے ہوئی تو یہ تحیہ فوت ہو جائے گا، جیسے تحیۃ المسجد، کافی دیر بیٹھنے سے یا کسی دوسرے کام میں لگنے کی وجہ سے فوت ہو جاتا ہے؛ لہٰذا اس پر توجہ دینی چاہیے کہ کہیں جائیں یا کسی سے ملاقات ہو تو اِس نبوی ادب کو ملحوظ رکھیں، پہلے سلام کریں پھر مقصد کا اظہار کریں۔ (مرقاۃ المفاتیح:۹/۵۹)

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

السنة أن المسلم يبدأ بالسلام قبل كل كلام، والأحاديث الصحيحة وعمل سلف الأمة وخلفها على وفق ذلك، مشهورة. (الأذکار:۲۸۶)

۲۱- سلام حسد و بغض کا علاج ہے

حضرت زبیر بن عوامؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمھارے اندر پچھلی امت کا مرض داخل ہو جائے گا اور وہ حسد اور بغض کا مرض ہے اور بغض مونڈ کر رکھنے والی چیز ہے اور میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈ کر صاف کر دیتا ہے؛ بلکہ دین کو مونڈ کر ختم کر کے بے دین بنا دیتا ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم اُس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہ بن جاؤ، اور اُس وقت تک مومن نہیں بن سکتے جب تک آپس میں محبت کا ماحول پیدا نہ کرو، کیا میں تمھیں ایسی چیز نہ بتلا دوں جو تمھارے لیے محبت کا ماحول پیدا کر دے، وہ یہ ہے کہ تم آپس میں سلام کو خوب رواج دو۔ (ترمذی، رقم الحدیث:۲۵۰۶، أبواب الورع)

---

(۱) مسند الشهاب القضاعی، رقم: ٢٦٢، باب السلام تحية.

تشریح: حسد یعنی دوسرے کی نعمت دیکھ کر جلنا اور زوالِ نعمت کی آرزو کرنا اور بغض یعنی دشمنی اور عناد: یہ دونوں باطنی مرض ہیں اور اسلامی معاشرے کے لیے نہایت ہی خطرناک چیز ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اِن کا علاج بتایا کہ دلوں سے حسد وبغض دور کرنا ہے تو سلام کو پھیلاؤ، سلام کے ذریعہ حسد ودشمنی دور ہو جاتی ہے، جس کے دور ہوتے ہی آپس میں اتحاد وملنساری کا ماحول پیدا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اِس کی توفیق دے۔

خلاصۂ کلام: مذکورہ آیات وروایات اور آئندہ مزید آنے والی روایات وفقہی تصریحات سے جو بات تاکیدی اور شرعی حکم کے طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام، سلام کی اشاعت ورواج چاہتا ہے، اللہ اور اس کے رسول چاہتے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں سلام کا غلغلہ ہو، زور اور شور ہو۔

لمحۂ فکریہ

غور فرمائیں مسلمان چاہے جس علاقہ کا ہو، اس کی زبان چاہے جو بھی ہو اس کا تعلق چاہے جس خاندان سے ہو اسلام نے اس کو یہی سکھایا کہ وہ ''السلام علیکم'' ہی کہے، اِس روشن تعلیم میں اِجتماع وارتباط کا کیسا جامع اور حسین ومفید نسخہ مضمر ہے، ہر مذہب میں مذہب والوں کے لیے کچھ مخصوص علامتیں ہوتی ہیں، جس سے امتیاز ہوتا ہے کہ فلاں کس مذہب کا ماننے والا ہے، اسلام نے بھی اپنے ماننے والوں کے لیے کچھ مخصوص علامتیں مقرر کیں اور اپنی ایک الگ شناخت بنائی؛ تاکہ اسلام وکفر میں فرق ہو سکے، سلام بھی انہیں علامتوں میں سے ایک اسلامی علامت ہے، اِس سے بندگانِ خدا اور باغیانِ خدا کے درمیاں امتیاز وفرق ہوتا ہے؛ لیکن اس کا دوسرا رخ بڑا ہی مُہیب اور تاریک وتلخ ہے وہ یہ کہ آج اسلامی معاشرے سے پیغمبرِ اسلام کی یہ سنت اور اس کی اِشاعت کم ہوتی جا رہی ہے، اسلام نے شناسا وغیر شناسا، ہر ایک کو سلام کرنے کی تعلیم دی ہے؛ لیکن آج اولاً سلام ہی نہیں کیا جاتا اور اگر کیا جاتا ہے تو اکثر جان پہچان ہی کے لوگوں کو، یہ ہمارے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے اور اسی کا منفی نتیجہ یہ سامنے آ رہا ہے کہ باہمی الفت، دلی درد اور اُخوت ومُواسات کی عمارت کمزور تر ہوتی جا رہی ہے۔

موجودہ ماحول جو یورپی تہذیب سے متأثر ہے، اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اپنا اور اپنے گردوپیش کا جائزہ لیں اور اس سلسلے کی جو کوتاہیاں اور کمیاں، ہماری زندگیوں میں درآئی ہیں اسے دور کریں اور سلام کو خوب رواج دیں؛ کہ سلام اسلامی تہذیب کا اٹوٹ حصہ ہے، غیروں کی تہذیب (ہیلو، گڈبائے، نمستے، پرنام ،بائے وغیرہ) سے پرہیز کریں؛ لٰہذا ہمیں اپنی تہذیب کی اِشاعت اور اسے بروئے کار لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ نے بڑی اچھی بات لکھی ہے:

> جو قوم اپنے یونیفارم کی محافظ نہیں رہی وہ بہت جلد دوسری قوموں میں منجذب ہوگئی، مسلمان جب سے ہندوستان میں ہیں؛ اگر اپنا یونیفارم باقی نہ رکھتے تو کب کے مٹ چکے ہوتے، انہوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ کرتا، پاجامہ، عبا، قبا اور دستار محفوظ رکھا؛ بلکہ مذہب اور اسماء الرجال، تہذیب وکلچر، رسم ورواج اور زبان وعمارت وغیرہ جملہ اشیاء کو محفوظ رکھا؛ اِس لیے ان کی مستقل ہستی قائم رہی اور جب تک اس کی مراعات ہوتی رہیں گی، رہے گی؛ لٰہذا ایک محمدی کو حسبِ اِقتضاءِ فطرت اور عقل لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آقا کا سا، رنگ ڈھنگ، چال چلن، صورت وسیرت، فیشن وکلچر وغیرہ بنائے اور اپنے محبوب آقا کے دشمنوں کے فیشن سے پرہیز کرے۔ (خلاصہ مکتوبات شیخ الاسلام:۲/۱۳۰)

اللہ رب العزت ہم تمام مسلمانوں کو سلام کی اشاعت وترویج اور اس پر صد فیصد عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے؛ کیوں کہ دنیا وآخرت کی کامیابی کا راز اسلامی تعلیمات میں ہی پوشیدہ ہے۔

چوتھا باب

الاِبتِدَاءُ بِالسَّلَامِ سُنَّةٌ أَفْضَلُ مِنْ رَدِّهِ الوَاجِبِ

(الأشباه لابن نجيم ۱/۳۹۰)

سلام — احکام ومسائل

سلام اور جوابِ سلام کا فقہی پہلو

قرآن کی آیت وإذا حييتم بتحية فحيوا بأحسن منها سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے؛ لیکن ابتداءً سلام کرنے کا کیا درجہ ہے، اس کا بیان صراحۃً نہیں ہے؛ تاہم وإذا حييتم میں اس کے حکم کی جانب اشارہ موجود ہے، مفسرین لکھتے ہیں: کہ وإذا حييتم مجہول کا صیغہ ہے، جس کا فاعل مذکور نہیں ہے؛ اس میں اشارہ ہوسکتا ہے کہ سلام ایسی چیز ہے جو عادۃً سبھی مسلمان کرتے ہیں۔

سلام کی تاکید اور فضائل حضور ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں ابھی آپ پڑھ چکے، اُن سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً سلام کرنا سنت موکدہ سے کم نہیں؛ چناں چہ اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ ابتداءً سلام کرنا سنت موکدہ ہے، اور حافظ ابن حجرؒ نے ابن عبد البرؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس قول پر اجماع ہے۔ (فتح الباری: ۱۱/۴)

اور کچھ فقہاء کی رائے یہ ہے کہ ابتداءً سلام کرنا فرض کفایہ (۱) ہے؛ لیکن اِس رائے کو جمہور نے رد کردیا ہے اور پہلا قول ہی راجح اور معروف ہے؛ چناں چہ شیخ ابن عربیؒ نے لکھا ہے:

> قال علماء نا: أكثر المسلمين على أن السلام سنة ورده فرض لهذه الآية، وقال عبد الوهاب منهم: السلام ورده فرض على الكفاية. (احکام القرآن: ۱/۵۹۲)

شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ نے علامہ نوویؒ کے حوالے سے لکھا ہے:

> معلوم ہونا چاہیے کہ سلام کرنا سنت ہے اور اس کا جواب دینا واجب ہے؛ چناں چہ اگر سلام کرنے والے لوگ پوری جماعت کی شکل میں ہوں تو پوری جماعت کے حق میں سلام کرنا سنت کفایہ ہے؛

---

(۱) ایک تطبیقی رائے یہ بھی ہے کہ: پہلے سے جان پہچان اور تعارف ہے تو سلام کرنا فرض ہے؛ ورنہ سنت ہے؛ کیوں کہ جان پہچان کی شکل میں، سلام نہ کرنے سے طبیعت میں تکدر پیدا ہوسکتا ہے اور بدگمانی کا ڈر بھی ہے، فالسلام فرض مع المعرفة، سنة مع الجهالة؛ لأن المعرفة إن لم تسلّم عليه تغيرت نفسه، احکام القرآن لابن العربی: ۱/۵۹۲.

جس کا مطلب یہ ہوا کہ؛ اگر کچھ لوگوں نے سلام کرلیا تو سنتِ سلام کا
ثواب پوری جماعت کے اَفراد کو مل جائے گا۔ (أوجز المسالک: ۱۶۸/۱۷)
اور اگر پوری جماعت نے سلام نہیں کیا تو سارے لوگ ترکِ سنت
کی وجہ سے گنہ گار رہوں گے اور مذکورہ صورت میں پوری جماعت کا
سلام کرنا افضل ہے۔ (ہندیہ: ۳۲۵/۵)

جوابِ سلام کا حکم

سلام کرنا سنت ہے؛ لیکن جواب دینا واجب علی الکفایہ ہے یعنی اگر وہ شخص جسے سلام کیا گیا ہے، تنہا ہے تو اُس پر جواب دینا واجب ہے؛ لیکن جنہیں سلام کیا گیا ہے وہ پوری جماعت ہے تو جواب واجب علی الکفایہ ہے، اُن میں سے کوئی بھی جواب دے دے تو سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔ (أوجز المسالک: ۱۶۸/۱۷)

بابِ سلام میں، سنت و واجب میں افضل کون — ایک فقہی چیستاں

سنت اور واجب: یہ دونوں فقہی اصطلاحیں ہیں، واجب کا درجہ عموماً سنت سے بڑا ہوتا ہے؛ مگر سلام کرنا سنت ہے اور جواب دینا واجب؛ لیکن یہاں یہ سنت، واجب سے افضل ہے؛ حالاں کہ واجب کا ثواب اور حکم اکمل ہوتا ہے، گویا یہ ایک فقہی چیستاں (۱) ہوگئی کہ سنت، واجب سے ثواب میں بڑھ گئی۔

ملا علی قاریؒ نے اِس کی وجہ لکھی ہے کہ سلام کرنا تواضُع کی دلیل ہے، اور اس بات کی

(چند اور نظیریں: فقہاء نے ایسی چند اور مثالیں بیان کی ہیں، ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں: الفرض أفضل من النفل إلا في مسائل: (۱) إبراء المعسر مندوب أفضل من إنظاره الواجب (۲) الابتداء بالسلام سنة أفضل من رده الواجب (۳) الوضوء قبل الوقت مندوب أفضل من الوضوء بعد الوقت وهو الفرض. (الأشباه والنظائر: ۳۹۰/۱) (٤) الأذان سنة وهو على ما رجحه الإمام النووي: أفضل من الإمامة وهي فرض كفاية أو عين، الأشباه والنظائر للسيوطي: ۱٤٦/۱.

علامت ہے کہ یہ شخص متکبّر نہیں ہے، نیز یہ سنت، ادائے واجب کا ذریعہ اور سبب ہے؛ لہٰذا اِسے افضل ہونا ہی چاہیے۔ (مرقاۃ المفاتیح:۹/۴۵)

مفتی سعید احمد پالن پوری زید مجدہ لکھتے ہیں:

> سلام کرنا سنت ہے اور جواب دینا واجب ہے؛ مگر یہ وہ سنت ہے، جس کا ثواب واجب سے زیادہ ہے؛ کیوں کہ ایک تو سلام کرنے کا ثواب ملتا ہے، دوسرا الدال علی الخیر کفاعله کے ضابطے سے جواب دینے کا ثواب بھی اُس کو ملتا ہے؛ اِس لیے اس کا ثواب دوگنا ہوجاتا ہے۔ (تحفۃ الالمعی:۶/۴۷۵)

جوابِ سلام کے وجوب کی وجہ

سلام کرنے والے نے سلام میں پہل کر کے یہ اشارہ دے دیا کہ وہ امن وسلامتی کا خواہاں ہے، اب ضروری ہے کہ دوسرا بھی جواب دے کر امن وسلامتی کے ارادے کا ثبوت دے؛ اگر جواب کو واجب نہ قرار دیا جائے؛ بلکہ جواب دینے اور نہ دینے کا اختیار دیا جائے اور وہ سلام نہ کرے تو سلام کرنے والے کو اندیشہ ہوگا، خواہ مخواہ دماغ میں یہ بات آئے گی کہ یہ میرے بارے میں کوئی بری بات کا ارادہ تو نہیں رکھتا اور اس طرح وہ بدظنی کا شکار ہوجائے گا؛ لہٰذا نامناسب خیالات اور بدظنی سے بچانے کے لیے سلام کے جواب کو واجب قرار دیا گیا۔ (فتح الباری:۱۱/۱۰)

الاختیار لتعلیل المختار میں ہے:

> سلام کا جواب دینا واجب ہے؛ کیوں کہ جواب نہ دینے سے ایک مسلمان کی بے عزتی ہوتی ہے، جو شرعاً ناجائز ہے۔ (۴/۱۶۴، فصل فی مسائل مختلفۃ)

سلام اور جوابِ سلام کے الفاظ

آیاتِ سلام اور روایاتِ سلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسنون سلام کے الفاظ السلام

عليك یا السلا م عليكم ہیں اور جوابِ سلام کے لیے وعليكم السلام یا وعليك السلا م ہیں، جسے سلام کیا جارہا ہے اگر وہ ایک ہے تو السـلا م عليك واحد کا لفظ بھی مشروع ہے؛ جب کہ جمع کا لفظ: السـلا م عليكم افضل ہے، اور اگر مسلَّـم علیہ کئی ہیں تو پھر جمع کا لفظ: السلا م عليكم ہی متعین ہے۔(۱)

اسی طرح اگر سلام کرنے والا ایک ہے تو جواب وعـــليك السـلا م سے دینا بھی درست ہے؛ جب کہ جمع کا لفظ وعليكم السلا م کہنا بہر حال افضل ہے۔

آیاتِ الفاظِ سلام وجوابِ سلام

آیاتِ سلام کے تحت وہ آیتیں دیکھی جاسکتی ہیں، جن میں الفاظِ سلام کا تذکرہ ہے، مثلاً:

(۱) وَإِذَا جَاءكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلاَمٌ عَلَيْكُمْ. (الانعام:۵۴)

(۲) وَنَادَوْاْ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَن سَلاَمٌ عَلَيْكُمْ. (الاعراف:۴۶)

(۳) وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلاَمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِيْنَ. (الزمر:۷۳)

ترجمہ وتفصیل اور مزید آیات کے لیے آیاتِ سلام کا مطالعہ کریں۔

روایات: (۱) تخلیق آدم علیہ الصلاۃ والسلام کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے اُن سے کہا: کہ جایئے اور فرشتوں کی بیٹھی ہوئی جماعت کو سلام کیجیے، اور وہ جو جواب دیں، اُسے غور سے سنیے، فــإنّهـــا تحيتك وتحية ذريتك. تو حضرت آدمؑ نے جا کر کہا: السلا م عليكم. (بخاری:۶۲۲۷)

(۲) إذا لقي الرجل أخاه المسلم، فليقل: السلا م عليكم ورحمة الله وبركاته

جب آدمی اپنے مسلمان بھائی سے ملے تو کہے: السـلا م عـلـيـكـم ورحـمـة الـلـه وبركـاتـه (ترمذی:۲۷۲۱ فی كراهية أن يقول: عليك السلا م مبتدأً)

(۱) اگر عورت، تنہا ایک عورت کو سلام کرے تو السلام علیکم کہنا بہتر ہے؛ کیوں کہ مفرد کا صیغہ استعمال کرنے کی صورت میں اسے السلام علیکِ (کاف کے زیر کے ساتھ) کہنا پڑے گا؛ کیوں کہ علیکَ (کاف کے زبر کے ساتھ) مذکر کے لیے ہے، اور عورتیں عربی کم پڑھی ہوتی ہیں؛ اُن کے لیے اِس کا فرق کرنا مشکل ہے، مولف.

(۳) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضورﷺ تشریف لائے، بیت اللہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی؛ چناں چہ میں آپ کے پاس آیا اور سب سے پہلے میں نے اسلام والا اسلام کیا: میں نے کہا: السلام علیك یا رسول الله ! آپ نے جواب میں فرمایا: وعلیك ورحمة الله آپ کون ہیں؟(صحیح مسلم:۶۳۶۱)

(۴) حضرت ابوہریرہؓ سے مُسیئ الصلاۃ کی ایک لمبی حدیث مروی ہے۔

ایک شخص مسجد میں آیا، رسول اللہﷺ مسجد کے ایک کونے میں تشریف فرما تھے، اُس شخص نے نماز پڑھی، پھر آ کر آپ کو سلام کیا، رسول اللہﷺ نے فرمایا وعلیك السلام ارجع فَصَل؛ فإنك لم تصل کہ واپس جاؤ دوبارہ نماز پڑھو، تم نے صحیح نماز نہیں پڑھی۔(بخاری:۶۲۵۱، کتاب الاستئذان)

جائز اور افضل کی حد

سلام کی ادائیگی کے لیے کم از کم الفاظ ایک شخص کے لیے السلام علیك یا علیکم اور ایک سے زائد کے لیے السلام علیکم ہیں، یعنی اِن الفاظ کے کہنے سے اسلامی تحیہ ادا ہو جاتا ہے اور اس سے کم الفاظ میں اسلامی تحیہ کی ادائیگی نہیں ہوتی مثلاً: صرف سلام کہنا۔

اور جوابِ سلام کے کم از کم الفاظ ایک شخص کے لیے وعلیكَ ہے اور زیادہ کے لیے وعلیکم ہے؛ لیکن وعلیك السلام اور وعلیکم السلام افضل ہے، اور جوابِ سلام میں "وعلیکم" سے کم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اور اِس پر اتفاق ہے کہ سلام اور جوابِ سلام دونوں میں السلام علیکم اور وعلیکم السلام کے ساتھ "ورحمة الله وبرکاته" کا اضافہ افضل اور اجر وثواب میں زیادتی کا باعث ہے۔

حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام کی تخلیق والی حدیث میں ہے، جب انہوں نے فرشتوں کو سلام کیا تو فرشتوں نے کہا: السلام علیك ورحمة الله وبرکاته، حضورﷺ نے ارشاد

فرمایا: کہ فرشتوں نے حضرت آدمؑ کے سلام کے جواب میں "ورحمة الله وبركاته" کا اضافہ کیا۔(بخاری:۳۳۲۶)

آخری جملے میں جوابِ سلام کے سلسلے میں، ادب وتہذیب کی جانب اشارہ ہے کہ افضل طریقہ یہ ہے کہ اگر کوئی السلام علیکم کہے تو جواب میں کچھ دعائیہ جملے کا اضافہ کردینا چاہیے، مثلاً: وعليكم السلام ورحمة الله.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کہ ایک صاحب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: السلام علیکم آپ نے ویسا ہی جواب دیا اور فرمایا: عشرٌ (اِن کے لیے) دس نیکیاں ہیں، پھر ایک دوسرے صاحب آئے اور کہا: السلام عليكم ورحمة الله آپ نے سلام کا جواب دیا پھر وہ بیٹھ گئے، آپ نے فرمایا: عشرون (اِن کے لیے) بیس نیکیاں ہیں، پھر ایک اور صاحب آئے اور السلام عليكم ورحمة الله وبركاته کہا: آپ نے اُن کے سلام کا جواب دیا وہ بیٹھ گئے، آپ نے فرمایا (اِن کے لیے تیس نیکیاں ہیں۔(ابوداؤد، رقم:۵۱۹۵، باب کیف السلام)

والأفضل للمسلِّم أن يقول: السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، والمجيب كذلك يرد.(ہندیہ:۳۲۵/۵)

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

وأقل السلام أن يقول: السلام عليكم: فإن كان المسلَّم عليه واحداً، فأقله السلام عليك، والأفضل أن يقول: السلام عليكم؛ ليتناوله وملكيه، وأكمل منه أن يزيد: ورحمة الله وأيضا: وبركاته...... وأما صفة الرد، فالأفضل والأكمل أن يقول: وعليكم السلام ورحمة الله وبركاته......ولو اقتصر على: وعليكم السلام أو على:

عليكم السلام، أجزأه. (تحفة الاحوذی:۷/۵۰۲، بحوالہ شرح مسلم)

آیت اور اس کا مفہوم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذَا حُيِّيْتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّواْ بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا (النساء:۸۶)

اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اُس سے اچھا جواب دو یا انہی الفاظ کو لوٹا دو۔

مضمونِ آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب کسی مسلمان کو سلام کیا جائے تو اُس کے ذمہ جواب دینا واجب ہے، اگر بغیر کسی عذر شرعی کے جواب نہ دیا تو گناہ گار ہوگا؛ البتہ جواب دینے میں دو باتوں کا اختیار ہے: ایک یہ کہ جن الفاظ سے سلام کیا گیا ہے، اُن سے بہتر الفاظ میں جواب دیا جائے، جس کی صورت یہ ہے کہ سلام کرنے والے نے السلام عليكم کہا تو آپ جواب دیں "وعليكم السلام ورحمة الله" اور اُس نے کہا "السلام عليكم ورحمة الله" تو آپ جواب میں کہیں "وعليكم السلام ورحمة الله وبركاته" دوسرا اختیار یہ ہے کہ بعینہ اُنہیں الفاظِ سلام سے جواب دیا جا سکتا ہے مثلاً: سلام کرنے والے نے السلام عليكم ورحمة الله کہا آپ بھی السلام عليكم ورحمة الله کہہ سکتے ہیں، اِسی طرح السلام عليكم کے جواب میں وعليكم السلام اور السلام عليكم ورحمة الله وبركاته کے جواب میں وعليكم السلام ورحمة الله وبركاته کہہ سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ کے پاس ایک صاحب آئے اور یوں سلام کیا: السلام عليك يا رسول الله! آپ نے جواب میں ایک کلمہ بڑھا کر فرمایا: "وعليكم السلام ورحمة الله" پھر ایک صاحب آئے اور انہوں نے یوں سلام کیا: السلام عليك يا رسول الله! ورحمة الله آپ نے جواب میں ایک اور کلمہ بڑھا کر فرمایا: وعليكم السلام ورحمة الله وبركاته پھر ایک صاحب آئے انہوں نے اپنے سلام ہی میں تینوں کلمے، بڑھا کر کہا: السلام عليك يا رسول الله! ورحمة الله وبركاته آپ نے جواب میں صرف

ایک کلمہ "وعــليك" ارشاد فرمایا، اُن کے دل میں شکایت پیدا ہوگئی اور عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، پہلے جو حضرات آئے آپ نے اُن کے جواب میں کئی کلمات، دعا کے ارشاد فرمائے اور میں نے اُن سب الفاظ سے سلام کیا تو آپ نے وعليك پر اکتفا فرمایا، آپ نے فرمایا: تم نے ہمارے لیے کوئی کلمہ چھوڑا ہی نہیں کہ ہم جواب میں اضافہ کرتے، تم نے سارے کلمات اپنے سلام ہی میں جمع کر دیے؛ اِس لیے ہم نے قرآنی تعلیم کے مطابق تمہارے سلام کا جواب بالمثل دینے پر اکتفا کیا، اِس روایت کو ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے مختلف اسانید کے ساتھ نقل کیا ہے۔

اِس حدیث سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ الفاظِ سلام کی زیادتی صرف تین کلمات تک مسنون ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ سلام میں تین کلمہ کہنے والے کے جواب میں اگر صرف ایک کلمہ (وعليك یا وعـليكم) کہہ دیا جائے تو وہ بھی ادا بالمثل کے حکم میں، حکمِ قرآنی "أو ردوها" کی تعمیل کے لیے کافی ہے۔ (خلاصہ معارف القرآن: ۵۰۳/۲)

ایک شُبہ اور اُس کا حل

مذکورہ آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ جوابِ سلام کا سلام سے بڑھ کر یا برابر ہونا چاہیے، جس سے ثابت ہوا کہ جوابِ سلام، سلام سے کم نہیں ہونا چاہیے؛ حالاں کہ فقہاء نے اِس کی اجازت دی ہے، مثلاً: سلام کرنے والے نے، السلام علیکم ورحمة الله کہا تو جواب میں وعليكم السلام کہہ دینا گو افضل نہیں؛ لیکن جائز ہے، تفسیر انوار القرآن میں ہے:

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ آیت میں اکمل اور کامل صورت کو بیان کیا گیا ہے، آیت میں لفظ "أو" اختیار کے لیے اِسی اعتبار سے ہے اور امر سے جو واجب ہونا سمجھ میں آ رہا ہے وہ نفسِ سلام کے لحاظ سے ہے؛ غرض کہ مُقَیَّد تو واجب ہے اور قید اختیاری ہے۔ (انوار القرآن: ۴۲۳/۲)

سلام اور جوابِ سلام میں "وبرکاتہ" کے بعد "ومغفرتہ" وغیرہ کا اضافہ جائز یا ناجائز —— ایک تحقیقی بحث

اگر بات سنت کی کی جائے تو مسنون یہی ہے کہ السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته پر اضافہ نہ کیا جائے "وبرکاته" سلام کی اِنتہا ہے اور اِس پر اضافہ کرنا خلافِ سنت ہے۔

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

یا عائشة! هذا جبرئيل يُقرأ عليكِ السلامَ، فقلت: وعليه السلام ورحمة الله وبركاته، فذهبت تزيد، فقال النبي ﷺ: إلى هذا انتهى السلام، فقال: (رحمة الله وبركاته عليكم أهل البيت)

اے عائشہ! یہ جبرئیل تھے، تمہیں سلام کہہ رہے ہیں، میں نے کہا: وعليه السلام ورحمة الله وبركاته، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اِس پر اضافہ کرنے لگیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سلام کی حد یہیں تک ہے، پھر آپ نے (مذکورہ آیت) پڑھی (اللہ کی رحمت اور برکات تم پر ہوں اے اہل بیت!) (بخاری، رقم: ۳۰۴۵، بدء الخلق)

(۲) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موطا میں سند جید کے ساتھ محمد بن عمرو بن عطاءؒ سے روایت نقل کی ہے: وہ فرماتے ہیں:

میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا ہوا تھا، آپ کے پاس ایک یمنی شخص داخل ہوئے اور سلام یوں کیا: السلام علیکم ورحمة الله وبركاته، ثم زاد شيئاً مع ذلك پھر مزید کچھ

کلمات کہے، حضرت نے جو اُن دنوں بینائی سے محروم ہوگئے تھے کہا: کون ہے؟ لوگوں نے کہا: ایک یمنی صاحب ہیں جو آپ کے پاس آتے رہتے ہیں؛ چناں چہ لوگوں نے اُن کا تعارف کرایا تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: إن السلام انتهى إلى البركة سلام کی انتہا برکت تک ہے۔(موطا مالک، رقم: ۱۷۲۸، باب العمل فی السلام)

(۳) اسی روایت کو امام بیہقیؒ نے شعب الإیمان میں بھی نقل کیا ہے، اُس روایت میں کچھ اضافہ ہے:

ایک سائل آیا اور آپ کو سلام کیا اور کہا: السلام عليكم ورحمة الله وبركاته ومغفرته ورضوانه اور اِس کو اُس سے شمار کیا (یعنی ومغفرته ورضوانه کو سلام کا حصہ خیال کیا) تو ابن عباسؓ نے کہا: ما هذا السلام؟ وغضب حتى احمرت وجنتاه یہ کیسا سلام ہے؟ اور غصہ ہوئے؛ یہاں تک کہ آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا، پھر آپ کے بیٹے علی نے آپ سے کہا: ابا جان! یہ مسئلہ پوچھنے والا ہے، آپ نے کہا: إن الله حدّ السلام حداً وينهى عما وراء ذلك ثم قرأ "رحمة الله وبركاته عليكم أهل البيت إنه حميد مجيد" بے شک اللہ نے سلام کی ایک حد مقرر کردی ہے اور اُس سے زائد سے منع فرمایا ہے، پھر آیت پڑھی رحمة الله وبركاته عليكم أهل البيت إنه حميد مجيد. (ہود: ۷۳)(شعب الإیمان، رقم: ۸۸۷۸، فصل فی کیفیۃ السلام)

(۴) زہرہ ابن معبدؒ کہتے ہیں: کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انتهى السلام إلى

"وبرکاته" حافظ ابن حجرؒ نے کہا: اس کے رجال ثقہ ہیں۔ (فتح الباری: ۱۱/۶، رقم الحدیث: ۸۸۷۸)

(۵) ایک آدمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو یوں سلام کیا: السلام علیك ورحمة الله وبركاته ومغفرته، تو ابن عمرؓ نے اسے ڈانٹا اور کہا: حسبك إذا انتهيت إلى "وبركاته" إلى ما قال الله عزوجل یعنی تیرے لیے کافی ہے جب تو "وبرکاته" تک پہنچے، جو اللہ تعالیٰ نے کہا (ابن عمر کی مراد وہی آیت تھی جو اوپر گذری) (شعب الایمان: ۸۸۸۰)

(۶) حضرت یحییٰ بن سعیدؒ سے مروی ہے: کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ایک شخص نے یوں سلام کیا، السلام عليكم ورحمة الله وبركاته والغاديات والرائحات ابن عمرؓ نے جواباً کہا: تمہارے اوپر ہزار مرتبہ ہو. راوی کہتے ہیں: ابن عمرؓ نے ایسا جواب، اس سلام کے طریقے کو ناپسند کرنے کی وجہ سے دیا (گویا طنزاً جواب تھا)؛ کیوں کہ اُس نے وبرکاتہ کے بعد والغادیات کا اضافہ کردیا تھا۔ (موطا مالک، رقم: ۱۷۳۳)

(۷) پیچھے عمران بن حصینؓ کی روایت نقل کی گئی ہے، جس میں السلام علیکم ورحمة الله وبركاته تک کا تذکرہ ہے، جس پر تیس نیکیاں ملتی ہیں اُس میں اِس کے بعد کچھ الفاظ کا تذکرہ نہیں ہے۔ (ابوداؤد: ۵۱۹۵)

(۸) ہندیہ میں ہے: ولا ينبغي أن يزاد على البركات، قال ابن عباس رضي الله عنهما: لكل شيء منتهى، ومنتهى السلام، البركات كذا في المحيط.

(ہندیہ: ۵/۳۲۵)

(۹) صاحب المنتقیٰ علامہ باجیؒ لکھتے ہیں: سلام کے تین اجزاء ہیں (۱) السلام علیکم (۲) ورحمة الله (۳) وبركاته، جس کسی نے ایک یا دو جزوں پر اکتفا کیا تو کافی ہے اور جس نے تینوں اَجزاء کو جمع کیا تو اُس نے مقصود کو حاصل کرلیا اور جب مقصود حاصل ہوگیا تو اُس پر اضافہ کرنا درست نہیں۔ (المنتقیٰ: ۴/۲۸۰)

(۱۰) امام محمدؒ نے موطا محمد میں لکھا ہے: إذا قال: السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته، فلیکفف؛ فإن اتباع السنة أفضل یعنی اگر سلام کرنے والے نے سلام یوں کیا السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته تو اب وہیں رک جائے اضافہ نہ کرے؛ کیوں کہ سنت کی پیروی بہر حال افضل ہے۔ (موطا امام محمد: ۳۸۵)

اور موطا امام محمد کے شارح مولانا عبد الحئ لکھنویؒ نے اِس قول کی شرح میں لکھا ہے:

العمل الکثیر في بدعة لیس خیرا من عمل قلیل في سنة وظاهره أن الزیادة علی "وبرکاته" خلاف السنة مطلقاً. (التعلیق الممجد مع موطا امام محمد: ۳۸۵)

بدعت میں عملِ کثیر، سنت میں عمل قلیل سے بہتر نہیں ہے یعنی سنت کا عمل چاہے تھوڑا ہی ہو بدعت میں زیادتیٔ عمل سے بہر حال بہتر ہے؛ پس ظاہر یہی ہے کہ وبرکاته پر اضافہ مطلقاً خلافِ سنت ہے۔ تلك عشرة كاملة.

خلاصۂ کلام: مذکورہ تصریحات سے معلوم ہوا کہ سلام کا ادنیٰ درجہ السلام علیکم ہے، اِس پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور اگر السلام علیکم ورحمة الله کہا جائے تو بیس نیکیاں اور السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته سلام کا اعلیٰ درجہ ہے، اِس پر تیس نیکیاں ملتی ہیں، اور یہی حکم جواب کا بھی ہے؛ البتہ جواب ہمیشہ سلام کے مقابلہ میں اچھے الفاظ میں دینا چاہیے یعنی اگر کوئی صرف السلام علیکم کہے تو جواباً وعلیکم السلام ورحمة الله کہنا افضل ہے اور السلام علیکم ورحمة الله کسی نے کہا تو جواباً وعلیکم السلام ورحمة الله وبرکاته کہنا افضل ہے، اور اگر کسی نے ابتداءً ہی السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته کہہ دیا تو جواب میں وبرکاته پر اضافہ مسنون نہیں؛ کیوں کہ وبرکاته ابتداءً اور جواباً سلام کی حد ہے اور سنت سمجھتے ہوئے حد کو پار کرنا درست نہیں۔

شواہد و مؤیدات

مذکورہ دلائل کے علاوہ اس مسئلہ کے دیگر مؤیدات اور شواہد بھی ہیں۔

(۱) تشہُّد میں سلام کے الفاظ بھی "وبرکاته" پر ختم ہوتے ہیں: السلام عليك أيها النبي ورحمة الله وبركاته. (مسلم، رقم: ۸۷۲)

(۲) نماز سے نکلنے کے سلام کے عام الفاظ، جو احادیث صحیحہ کثیرہ سے ثابت ہیں وہ رحمة الله تک ہیں؛ جب کہ بعض احادیث میں وبرکاته بھی ثابت ہے؛ لیکن وبرکاته پر اضافہ کسی روایت میں نہیں ہے۔ علقمہ بن وائلؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں:

صليت مع النبي ﷺ فكان يُسَلِّم عن يمينه السلام عليكم ورحمة الله وبركاته. (ابوداؤد: ۱/۱۵۰)

(۳) علامہ بیہقیؒ نے شعب الایمان میں زہرہ بن معبدؒ کی روایت نقل کی ہے:

عروہ بن الزبیرؒ کو ایک آدمی نے یوں سلام کیا: السلام عليكم ورحمة الله وبركاته تو عروہؒ نے کہا: ما ترك لنا فضلا إن السلام انتهى إلى وبركاته کہ اس نے ہمارے لیے کوئی فضیلت نہیں چھوڑی؛ بے شک سلام کی انتہا وبرکاته تک ہے۔ (شعب الإیمان، رقم الحدیث: ۹۰۹۶)

اِس کی مزید تفصیل ''رموزِ سلام'' کے تحت دیکھی جا سکتی ہے۔

اُن روایات کا علمی جائزہ جن میں ''وبرکاتہ'' پر اِضافہ ہے

کتب حدیث میں کچھ روایتیں ایسی ملتی ہیں، جن سے "وبرکاته" پر اضافہ ثابت ہوتا ہے، ذیل میں چند روایات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے:

(١) حدثنا إسحاق بن سويد الرملي، حدثنا أبو مريم،

أظن أني سمعت نافع بن يزيد قال: أخبرني أبو مرحوم، عن سهل بن معاذ بن أنس، عن أبيه، عن النبي ﷺ بمعناه، زاد ثم أتى آخر، فقال: السلام عليكم ورحمة الله وبركاته ومغفرته. فقال: أربعون قال: هكذا تكون الفضائل.

......پھر ایک اور آدمی آیا اور اس نے کہا: السلام عليكم ورحمة الله وبركاته ومغفرته تو آپ ﷺ نے فرمایا: (اِن کے لیے) چالیس نیکیاں ہیں اور فرمایا: فضیلت وثواب میں ایسے ہی اضافہ ہوتا ہے۔ (ابوداؤد:۵۱۹۶، باب کیف السلام)

ابوداؤدؒ نے یہ روایت اُس روایت کے بعد متصلاً ذکر کی ہے، جس میں تیس نیکیوں کے ملنے کا تذکرہ ہے، جس کے راوی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ ہیں، مذکورہ بالا حدیث کے راوی معاذ بن انس رضی اللہ عنہ ہیں، اِس میں ومغفرته کا اضافہ ہے، نیز اِس پر چالیس نیکیوں کے ملنے کا تذکرہ ہے۔

جائزہ: لیکن علمی اعتبار سے یہ حدیث قابل استدلال نہیں، صاحب اوجز المسالک نے اِس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: علامہ منذریؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث ضعیف ہے؛ کیوں کہ سندِ حدیث کا ایک راوی ابومرحوم عبد الرحیم بن میمون ہے، اِس کی روایات قابل استدلال نہیں ہوتیں۔ (اوجز:۱۷/۱۷۶)

ابوحاتم کہتے ہیں:

يُكتبُ حديثُه ولا يُحتَجُّ به اِس کی حدیث لکھی جائے گی؛ مگر استدلال نہیں کرسکتے۔ (میزان الاعتدال:۵۰۳۷)

اِسی حدیث کے دوسرے راوی ہیں سہل بن معاذ، اِن کو بھی یحيٰ بن معینؒ نے ضعیف کہا

ہے؛ اگر چہ ابن حبانؒ نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔ (میزان: رقم: ۳۵۹۲)

حافظ ابن حجرؒ نے تقریب میں عبدالرحیم بن میمون کو صَدوق اور سہل بن معاذ کو لا بـأس به کہنے کے باوجود اِس حدیث کے بارے میں کہا ہے: کہ اِس کی سند ضعیف ہے۔ (فتح الباری: ۱۱/۸)

حدیث کے راوی ابن ابی مریم نے دوسرے راوی نافع ابن یزید کے بارے میں، سند کے اندر کہا ہے: میرا گمان ہے کہ میں نے نافع بن یزید سے سنا ہے، یعنی اُنھوں نے سماعت کا جزم اور یقین بیان نہیں کیا ہے؛ چناں چہ علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

ولا يثبت هـذا الحديث؛ فإن له ثلاث علل: إحداها، أنه من رواية أبي مرحوم عبد الرحيم بن ميمون، ولا يُحتَجُّ به.

الثانية: أن فيه أيضا سهل بن معاذ وهو أيضا كذلك

الثالثة: أن سعيد بن أبي مريم أَحَدَ رُوَاتِه لم يَجزِم بالرواية؛ بل قال: أظن أني سمعت نافع بن يزيد.

(زاد المعاد: ۲/۱۷،۴ فصل صیغۃ السلام)

اب حاصل یہ نکلا کہ ابوداوٗد کی مذکورہ روایت ضعیف ہے، اور اُن روایات کے مقابلہ میں جن میں وبرکاتہ پر اضافہ نہیں ہے یا منع کیا گیا ہے، قابلِ استدلال نہیں۔

(۲) حضرت انسؓ سے مروی ہے: کہ حضور ﷺ کے پاس سے ایک جانور چَرانے والے صاحب گذرتے تھے، تو یوں سلام کرتے تھے "السلام عليك يا رسول الله! تو رسول اللہ ﷺ جواب یوں دیتے: وعليك السلام ورحمة الله وبركاته ومغفرته ورضوانه...... الحديث (عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی: رقم: ۲۳۵، منتھی رد السلام)

اس حدیث میں "وبركاته" پر دو الفاظ ومغفرته ورضوانه کا اضافہ ہے؛ لیکن مذکورہ حدیث ضعیف ہے، محققین کی آراء پڑھیے:

علامہ نوویؒ کہتے ہیں: رويناً في كتاب ابن السني بإسناد ضعيف عن أنس.
(الأذکار:۲۰۹)

حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں: وأخرج ابن السني في كتابه بسندٍ واهٍ من حديث أنس. (فتح الباری:۱۱/۶)

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں: وأضعف من هذا، الحديثُ الآخر عن أنس.

(زادالمعاد:۲/۴۱۸)

خلاصہ یہ کہ مذکورہ حدیث ابوداؤدوالی حدیث سے بھی زیادہ ضعیف ہے اور بقول ابن حجرؒ: اس کی سند واہی تباہی ہے؛ لہٰذا وبركاته پر اضافہ کی مسنونیت پر استدلال درست نہیں۔

(۳) عن زيد بن أرقم قال: كنا إذا سلم النبي ﷺ علينا، قلنا: وعليك السلام ورحمة الله وبركاته ومغفرته. زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب نبی ﷺ ہمیں سلام کرتے تو ہم جواب میں وعليك السلام ورحمة الله وبركاته ومغفرته کہا کرتے تھے۔ (شعب الإیمان: رقم:۸۸۸۱، فصل فی کیفیۃ السلام)

اس حدیث پر بھی شارحینِ حدیث نے کلام کیا ہے؛ چناں چہ محقق حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

وأخرج البيهقي في "الشعب" بسندٍ ضعيف أيضاً، من حديث زيد بن أرقم. (فتح الباری:۱۱/۶)

حاصل گفتگو: سلام وجوابِ سلام میں ومغفرته وغیرہ کے اضافہ کے جواز کے بارے میں یہ چند روایات ذکر کی گئیں؛ جن کا حال ظاہر ہوا کہ علمی اعتبار سے ضعیف ہیں؛ جب کہ دوسری طرف سلام اور جوابِ سلام کا "وبركاته" پر ختم ہونا اور اُس پر اضافہ کے عدمِ جواز کی روایات سامنے آ گئیں؛ لہٰذا اب ثابت یہ ہوا کہ ابتداءً اور جواباً دونوں صورتوں میں سلام کی آخری حد وبركاته ہے اور یہی مسنون ہے۔

حافظ ابن حجر کی رائے

حافظ ابن حجرؒ شارحِ بخاری نے اِن روایات پر گفتگو کرتے ہوئے اخیر میں لکھا ہے:

وهذه الأحاديث الضعيفة إذا انضمّت قوي ما اجتمعت عليه من مشروعية الزيادة على "وبركاته" یعنی وہ روایات جنھیں محدثین نے ضعیف کہا ہے، اگر انہیں جمع کیا جائے اور اُن کے شواہد وتوابع کو دیکھا جائے تو کم از کم اتنا تو ثابت ہوسکتا ہے کہ "السلام عليكم ورحمة الله وبركاته" پر اضافہ مشروع ہے۔ (فتح الباری:۱۱/۶)

شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ کی رائے

موطا مالک کے حنفی شارح شیخ الحدیث صاحب نور اللہ مرقدہ اوجز المسالک میں لکھتے ہیں:

اِن روایات سے زیادہ سے زیادہ "وبركاته" پر اضافہ ثابت ہوسکتا ہے؛ لیکن سنتِ سلام کا مصداق وہی روایات ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ "وبركاته" پر اضافہ نہ کیا جائے؛ رہ گئی یہ بات کہ ابوداؤد کی وہ روایت جس میں "ومغفرته" کے اضافہ پر آپ ﷺ نے چالیس نیکیوں کے حصول کی بات کہی ہے، تو وہ کسی مخصوص حال یا عارض کی وجہ سے ہے۔

ایسا ہوتا ہے کہ ایک عمل کا ثواب متعین ہوتا ہے اور اُس میں کبھی کسی عارض کی وجہ سے زیادہ ثواب مل جاتا ہے؛ لیکن اُس عارضی چیز پر مسئلہ کا مدار نہیں ہوتا؛ بلکہ پہلا طریقہ ہی معمول بہ اور مسنون ہوتا ہے، اِس کی نظیر صحیح مسلم کی وہ روایت ہے، جو حضرت انسؓ سے مروی ہے: کہ ایک صحابی نماز کی صف میں اُس وقت شامل ہوئے؛ جب کہ اُن کی سانسیں پھول رہی تھیں، انہوں نے کہا: الله أكبر، الحمدُ لِلهِ حَمْداً كَثيراً طَيِّباً مُبَارَكاً فِيهِ، اِسی روایت میں آگے ہے کہ حضور نے فرمایا: کہ میں نے بارہ فرشتوں کو دیکھا کہ وہ اِن کلمات کی جانب سبقت کررہے ہیں۔

(مسلم، رقم الحدیث: ۶۰۰، فضل قول الحمد للہ)

بخاری کی روایت میں ہے کہ ایسا واقعہ قَومہ میں پیش آیا تھا اور حضور ﷺ نے فرمایا: کہ تقریباً تیس فرشتے اِس کلمے کو لینے میں سبقت کررہے تھے (رقم الحدیث: ۷۹۹) اور نسائی کی

روایت میں ہے کہ آپ کے پیچھے، ایک صحابی نماز پڑھ رہے تھے کہ انہیں چھینک آ گئی، انہوں نے الحمد لله حمدا كثيرا طيباً مباركا فيه کہہ دیا۔(رقم الحدیث:۹۳۱)

الغرض واقعہ تکبیر تحریمہ کا ہو یا قومہ کا یا نماز میں چھینک آنے کا، بہر حال اتنا طے ہے کہ اِن مواقع پر اِن الفاظ کا کہنا، معمول بہا اور مسنون نہیں ہے؛ حالاں کہ اِس ذکر کی خاص فضیلت حضور ﷺ نے بیان کی ہے؛ لہٰذا جیسے یہاں اِس ذکر کی فضیلت کے باوجود، اِس کا مسنون ہونا لازم نہیں آتا، ٹھیک اِسی طرح "وبركاته" پر اضافہ کی وجہ سے چالیس نیکیوں کی فضیلت جو بیان کی گئی ہے، لازم نہیں آتا کہ وہ بھی مسنون ہو؛ الغرض اختلاف مسنون ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں ہوا، رہ گئی گنجائش کی بات، سو اضافہ کی گنجائش ہے۔(خلاصہ اوجز المسالک:۱۷۷/۱۷)

چناں چہ مولانا عبدالحئ لکھنویؒ لکھتے ہیں:

> فالأولى: القول بتجويز ذلك أحيانا، والاكتفاء على "وبركاته" أكثرياً.
>
> یعنی اکثر اور عمومی احوال میں تو وبركاته پر اضافہ نہ کیا جائے، کبھی کبھار ومغفرته وغیرہ کا اضافہ ہو گیا تو کوئی حرج نہیں ہے۔(التعلیق الممجد علی موطا امام محمد:۳۸۵)

مفتی سعید صاحب زید مجدہ لکھتے ہیں:

> پس فیصلہ کن بات یہ ہے کہ عام طور پر "وبركاته" تک ہی اضافہ کرنا چاہیے؛ لیکن اگر کوئی اور اضافہ کرے تو یہ بھی جائز ہے۔
>
> (تحفۃ الالمعی:۶/۴۷۰)

خلاصہ: احیاناً جوازِ اضافہ ثابت ہے؛ البتہ اختلاف، اضافہ کی سنیت کے بارے میں ہوا، اور سنت یہ ہے کہ اضافہ نہ کیا جائے، گو جائز ہے؛ جواز اور سنت کا فرق یاد رکھنا چاہیے۔

الفاظِ سلام کی تعریف وتنکیر (لفظ سلام ال کے ساتھ اور ال کے بغیر)

قرآن کریم کی متعدد آیات میں سلام کے دونوں صیغے: یعنی السـلام الف لام کے ساتھ اور سـلامٌ بغیر الف لام کے آئے ہیں؛ اِسی طرح احادیث میں اکثر وبیشتر مواضع میں لفظ سلام مُعَرَّف آیا ہے، مُنَکَّر (۱) برائے نام آیا ہے، اِسی بنا پر فقہاء نے کہا ہے کہ لفظِ سلام کی تعریف وتنکیر دونوں درست ہیں؛ لہٰذا سلامٌ علیکم اور السلام علیکم دونوں کہنا جائز ہے؛ لیکن "سلامٌ علیکم" نکرہ کہنے کے بجائے "السلام علیکم" کہنا افضل اور بہتر ہے۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

ولو حذف اللام، فقال: سلامٌ عليكم أجزأ، قال الله تعالى: والملائكة يدخلون عليهم من كل باب سلام عليكم (الرعد:۲۳) وقال تعالى: فقل سلام عليكم كتب ربكم على نفسه الرحمة (الأنعام:۵۴) وقال تعالى: سلام على نوح في العالمين (الصافات:۷۹) إلى غير ذلك؛ لكن باللام أولىٰ؛ لأنها للتفخيم والتكثير وثبت في حديث التشهد السلام عليك أيها النبي. (فتح الباري:۷/۱۳)

یعنی الف لام کے حذف کے ساتھ بھی جائز ہے؛ لیکن الف لام کے ساتھ اولیٰ اور افضل ہے؛ کیوں کہ الف لام میں معنی کی زیادتی اور کثرت ہے، اِس صورت میں جنسیت واستغراق مراد ہوگا اور سلامتی کی ہر نوع اور جنس اِس دعا میں آجائے گی اور تشہُّد جو نماز میں مشروع ہے، اُس میں بھی الف لام کے ساتھ السلام علیك ہی ہے۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

لو نَوَّن المجرد من أل كما هو تحية الملائكة لأهل

---

(۱) سلام کے بارے میں صحیح تلفظ السلام علیکم ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اسی پر عمل پیرا تھے، سلامٌ علیکم کہنا درست ہے؛ البتہ یہ شیعوں کا شعار ہوچکا ہے؛ اِس لیے سلامٌ علیکم کہنے سے احتراز کرنا چاہیے، دار الافتاء دار العلوم دیوبند: ۳۰۰۰۱۔

الجنة، يجب الرد؛ فيكون له صيغتان.

یعنی اگر کسی نے ال کے بغیر سلامٌ نکرہ استعمال کیا تو جواب دینا واجب ہے؛ کیوں کہ یہ فرشتوں کا، اہلِ جنت کو سلام کرنے کا طریقہ ہے؛ لہٰذا اسلام کے دو صیغے ہوئے۔ (ردالمختار:۹/۵۹۶)

السلام علیکم اور سلامٌ علیکم کا ایک فرق

آیات اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں السلام علیکم کہنا مسنون ہے اور دنیا سے گذرنے کے بعد بغیر الف لام کے سلامٌ علیکم کا لفظ مسنون ہے، زیارتِ قبور کا جو کلمہ قرآن مجید میں مذکور ہے، وہ بھی سلامٌ علیکم بما صبرتم فنعم عقبى الدار آیا ہے اور فرشتے جب اہلِ جنت کا استقبال کریں گے اُس وقت بھی یہ لفظ اِسی عنوان سے آیا ہے، سلامٌ علیکم طبتم فادخلوها خالدین اور یہاں بھی اہل اَعراف اہلِ جنت کو اِسی لفظ کے ساتھ سلام کریں گے۔ (معارف القرآن:۳/۵۶۸)

ایک غلط رواج: یاد رہے کہ سلام کے مسنون صیغے صرف دو ہیں: السلامُ علیکم (شروع میں الف لام اور میم پر پیش) اور سلامٌ علیکم (شروع میں الف لام کا حذف اور میم پر تنوین) اس کے علاوہ آپ جتنے صیغے، سلام کے بولیں وہ سب غیر مسنون ہوں گے۔

آج خصوصاً عجم میں جہاں عربی اور عربی گرامر سے ناواقفیت عام ہے، یہ رواج عام ہے کہ لوگ السلامُ علیکم کی جگہ سَلَامْ علیکم کہتے ہیں یعنی سلام کے میم کو ساکن کرکے بولتے ہیں، درمختار نامی کتاب میں ہے:

أنه لا يجب رَدُّ "سلامْ عليكمْ" بجزم الميم یعنی ایسے سلام کا جواب دینا واجب نہیں ہے۔

اس کی شرح میں علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

ثم رأيتُ في الظهيرية: ولفظ السلام في المواضع كلها:

السلامُ عليكم أو سلامٌ عليكم بالتنوين وبدونِ هذين كما يقول الجُهّالُ، لا يكونُ سلاماً؛ لمخالفته السنة التي جاء ت بالتركيب العربي. (الرد مع الدر:۹/۵۹۶)

یعنی السلام علیکم یہ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے شروع میں الف لام اور اخیر میں پیش ہے، حدیث میں بھی ایسے ہی وارد ہے، اب اگر یوں کہیں "سلامْ علیکم" میم کے سکون کے ساتھ تو اِس صورت میں ایک تو شروع سے الف لام حذف ہو گئے، دوسرے جب اسم پر الف لام نہ ہو تو عموماً اُس کے اخیر میں تنوین آتی ہے، اور یہاں وہ بھی نہیں ہے، تو یہ نہ صرف عربی قواعد کے خلاف ہے؛ بلکہ الفاظِ حدیث کے موافق بھی نہیں؛ لہٰذا یہ مسنون نہیں ہے؛ بلکہ بقول علامہ شامیؒ: ایسے سلام کرنے والے ناواقف اور جاہل ہوتے ہیں، اور ایسا عموماً بے توجہی اور جلد بازی کی وجہ سے ہوتا ہے؛ اِس لیے اس پہلو پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، خود بھی السلامُ علیکم کہیں اور دوسروں کو بھی بتائیں۔

چند اور غلط صیغے: (۱) سَلَامْ لِیکُم (۲) سَلَامَا لِیکُم (۳) السلامٌ علیکم (۵) السام لیکم (٦) السام علیکم (۷) سام علیکم (۸) سام لیکم (۹) السلامْ عَلِیکُم (میم کا سکون اور علیکم میں لام کے زیر کے ساتھ) (۱۰) السلام أَلَیکم.

یہ سب سلام کے غلط اور غیر مسنون صیغے ہیں، جو ناواقفیت کی وجہ سے لوگ بول دیتے ہیں، علامہ شامی کا فیصلہ یاد رکھیں ولفظ السلام في المواضع كلها: السلامُ عليكم أو سلامٌ عليكم بالتنوين، وبدون هذين كما يقول الجهال، لا يكون سلاماً.

لفظ سلام ہر جگہ السلامُ علیکم یا سلامٌ علیکم ہے، اِن دونوں الفاظ کے علاوہ جتنے الفاظ ہیں وہ سب مسنون سلام نہیں ہیں۔

سلام کے موقع پر ''علیک السلام'' کہنا

ابتداءِ سلام میں نبی کریم ﷺ کے تعلیم کردہ الفاظ السلام علیکم یا السلام علیك

ہیں، اور آپ ﷺ ابتداءِ سلام میں علیك السلام یا علیکم السلام کو ناپسند فرمایا کرتے تھے، حضرت جابر بن سُلیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو یوں سلام کیا، علیك السلامُ یا رسول الله! (آپ نے جواب نہیں دیا) اور کہا: لا تَقُل: علیك السلام؛ فإن علیك السلام تحیة الموتی کہ علیك السلام (شروع میں) مت کہا کرو، یہ تو مُردوں کا سلام ہے۔ (ابوداؤد، رقم: ۵۲۰۹)

مسئلہ: سلام کا آغاز علیك السلام یا علیکم السلام کے ذریعہ مکروہ ہے۔ (عمدۃ القاری: ۱۵/۳۴۶)

مسئلہ: اِس طرح سلام کرنا مسنون طریقہ نہیں ہے؛ لہٰذا اِس کا جواب دینا ضروری نہیں؛ ورنہ حضور ﷺ پہلے جواب دیتے پھر ادب سکھلاتے؛ لہٰذا اس کا سلام نہ ہونا راجح ہے۔ (رد المحتار: ۹/۵۹۶)

لیکن علامہ عینیؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی نے آغاز ہی میں لاعلمی کی وجہ سے "علیکم السلام" کہہ دیا تو اگر چہ ایسا کرنا مکروہ ہے؛ لیکن اُسے جواب دے دینا چاہیے، اِس رائے کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے، اور عدمِ جواز کی رائے کو "قیل" سے بیان کیا ہے۔ (عمدۃ القاری: ۱۵/۳۴۶)(۱)

مسئلہ: اگر صورتِ مذکورہ میں کوئی واو کا اضافہ کر کے وعلیکم السلام کے ذریعہ سلام کرے تو جواب کا مستحق نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اِس لفظ میں ابتداءً سلام بننے کی صلاحیت ہی نہیں؛ لہٰذا یہ سلام ہی نہیں ہے۔ (رد المحتار: ۹/۵۹۶)

اس کی مزید تفصیل ''رموزِ سلام'' کے تحت آئے گی ان شاء اللہ۔

سلام کے جواب میں علیك السلام یا علیکم السلام کہنا — ایک علمی بحث

"السلام علیکم" کا مسنون جواب وعلیکم السلام یا وعلیك السلام ہے؛ جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے اور یہی لوگوں میں رائج ہے؛ لیکن فقہاء نے اِس موقع پر یہ بھی گفتگو کی ہے کہ اگر کسی نے جواب میں بغیر واو کے علیکم السلام کہہ دیا تو یہ جوابِ سلام ہوگا یا نہیں؟ یہ ایک علمی بحث ہے، شائقینِ علم وفن کے لیے سپردِ قرطاس کی جا رہی ہے۔

---

(۱) چناں چہ ترمذی کی روایت میں حضور ﷺ کا بعد میں جواب دینا ثابت ہے۔ (رقم الحدیث: ۲۷۲۱)

اِس سلسلے میں دو رائے ہیں: پہلی رائے یہ ہے کہ "علیکم السلام" بحذف الواو سلام کا جواب نہیں بن سکتا، اور نہ ہی اس سے جوابِ سلام کا فریضہ ساقط ہوگا. اِس رائے کی بنیاد تین دلائل پر ہے(۱) اِس طرح جواب دینا مسنون جوابِ سلام کے خلاف ہے(۲) ایسی صورت میں یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ علیکم السلام کہنے والے نے سلام کا جواب دیا ہے یا خود ہی سلام کیا ہے؛ کیوں کہ اس صیغے میں سلام اور جوابِ سلام: دونوں کی گنجائش ہے: (۳) تیسری دلیل وہ حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: إذا سلَّم علیکم أهل الکتاب، فقولوا: "وعلیکم" یعنی اہل کتاب تمہیں سلام کردیں تو جواب میں "وعلیکم" کہہ دیا کرو(۱) طرزِ استدلال یوں ہے کہ حضور ﷺ نے جب اُن اہل کتاب کے سلام کے جواب میں "وعلیکم" (باثباتِ الواو) کہنے کا حکم دیا ہے جو کبھی السلام علیکم کے بجائے السام علیکم (تم پر موت ہو) بھی کہہ دیا کرتے تھے تو مسلمان کے سلام کے جواب میں تو وعلیکم السلام کہنا بدرجہ اولیٰ لازم اور ضروری ہوگا۔

دوسری رائے اِس سلسلے میں یہ ہے کہ جیسے وعلیکم السلام (واو کے ساتھ) صحیح ہے، ویسے ہی علیکم السلام (بلاواو) بھی درست ہے، دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے: هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَاماً قَالَ سَلَامٌ (الذاریات:۳۴) قال سلام کا مطلب ہے سلامٌ علیکم، دیکھیے سلام کے جواب میں وَسَلام نہیں ہے؛ بلکہ صرف سلامٌ ہے، دوسری دلیل خلقِ آدم کا قصہ ہے، حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرشتوں کو سلام کیا تو فرشتوں نے کہا: السلام علیك ورحمة الله (۲) دیکھیے یہاں واو نہیں ہے، تیسری یہ ہے کہ قرآن میں ہے وَإِذَا حُيِّيْتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّواْ بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا (النساء:۸۶) اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جواب دینے والا دو باتوں کا مُکلّف ہے: یا تو جواب بالمثل دے یا اُس

(۱) مسلم:۲۱۶۳، باب النهي عن ابتداء أهل الکتاب

(۲) بخاری:۳۳۲۶، باب خلق آدم

سے اچھا جواب دے، پہلا عدل ہے، دوسرا افضل ہے اب جواب دینے والے نے علیکم السلام کہہ دیا تو یہ جواب بالمثل اور عدل ہے؛ لہٰذا صحیح ہے (خلاصہ زاد المعاد: ۲/۳۸۵)

فیصلہ: علامہ ابن قیمؒ نے اِن دونوں رایوں کو ذکر کرنے کے بعد یہ بحث ذکر کی ہے کہ یہودیوں کے سلام کے جواب میں احادیث میں وعلیکم ہے یا صرف علیکم ہے؟ روایتیں دونوں طرح کی ہیں، ابن القیم کا رجحان اِس جانب ہے کہ اثباتِ واو، والی روایتیں صواب اور احسن ہیں؛ غالباً اِس سے یہی ثابت کرنا ہے کہ السلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السلام کہنا زیادہ بہتر اور سنت کے قریب ہے؛ تاہم جائز(۱) وعلیکم السلام بھی ہے؛ کیوں کہ ایسی بحث جب اہل کتاب کے جواب کے سلسلے میں کی جاسکتی ہے تو یہی حکم مسلمان کے سلام کے جواب کا بھی ہونا چاہیے، اس کی مزید تفصیل ''غیر مسلم کو سلام کرنے کا مسئلہ'' کے تحت آئے گی۔

ایک ناقص رائے

مذکورہ بالا دونوں آراء اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں، دونوں کے دلائل ہیں؛ لیکن اگر مولف راقم الحروف سے پوچھا جائے کہ زیادہ صحیح رائے کون سی ہے؟ تو مولف عرض کرے گا کہ پہلی رائے زیادہ صحیح ہے اور اس کے دلائل ذرا مضبوط ہیں؛ کیوں کہ دوسری رائے والوں کی پہلی دلیل آیتِ قرآنی ہے، اُس کے بارے میں یہ عرض کیا جاسکتا ہے: کہ اُس میں صرف مہمانوں کی آمد کے وقت سلام اور جوابِ سلام کی حکایت ہے، الفاظِ سلام اور جوابِ سلام کے طریقہ کو بتانا مقصود نہیں ہے؛ غالباً اِسی وجہ سے سلام کے ساتھ علیك یا علیکم کا تذکرہ ضروری نہیں سمجھا گیا؛ کیوں کہ حکایتِ واقعہ میں یہ گنجائش ہوتی ہے کہ اصل واقعہ کی جگہ اُس کا اہم جُزذِکر کردیا جائے (۲) اور خلق آدم کے

---

(۱) قال النووي: وأما صفة الرد فالأفضل والأكمل أن يقول: وعليكم السلام ورحمة الله وبركاته؛ فيأتي بالواو؛ فلو حذفها جاز، وكان تاركا للأفضل، عمدۃ القاری: ۱۵/۳۴۶، نقلاعن شرح النووی۔

(۲) جیسے کوئی شخص کسی کا سلام پہنچاتا ہے تو وہ یوں کہتا ہے: فلاں نے آپ کو سلام کہا ہے، سلام کے تمام الفاظ استعمال نہیں کرتا؛ پھر بھی اِس سے پورا سلام مراد ہوتا ہے۔

قصے میں تو ایک احتمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے جواب نہیں دیا تھا؛ بلکہ حضرت آدم کو دیکھ کر خود ہی سلام کرنے کا ارادہ کیا تھا، مرقاۃ المفاتیح میں ملا علی قاری نے اِس قول کی صراحت کی ہے۔(۴۷/۵)

رہ گئی تیسری دلیل تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ جواب بالمثل کا یہ بالکل ادنی درجہ ہے؛ ورنہ جواب بالمثل کا مطلب یہ ہے کہ سلام کرنے والے کے جواب میں کم ازکم "وعلیکم السلام" کہنا ضروری ہے، اوراگر جواب بالمثل کا مطلب یہ ہو کہ "علیکم السلام" کہہ دو تو وعلیکم السلام (بالواو) فحیوا بأحسن منها کا مصداق بن سکتا ہے کہ اس میں ''واو'' کا اضافہ ہے؛ حالاں کہ اس کا کوئی قائل نہیں۔

چند مسائل

۱- سلام کے جواب کا افضل اوراعلیٰ درجہ "وعلیکم السلام ورحمة الله وبركاته" ہے اورصرف "وعلیکم السلام" کہنا بھی جائز ہے۔(عمدۃ القاری:۳۴۶/۱۵)

۲- کسی نے سلام کے جواب میں صرف "علیکم" کہا تو یہ سلام کا جواب نہیں سمجھا جائے گا۔(حوالہ سابق)

۳- کسی نے سلام کے جواب میں صرف "وعلیکم" کہا تو دونوں قول ہیں: جواب ہوجائے گا، دوسرا قول یہ ہے کہ کافی نہیں ہوگا۔(ایضا)

شریعت میں الفاظ بھی مقصود ہیں

حضرت جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں "عليك السلام" کہنے کی ممانعت آئی ہے؛ اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ سلام میں الفاظِ منصوصہ مسنونہ کی پیروی ضروری ہے۔

اِس اِجمال کی تفصیل یہ ہے کہ الفاظِ شرعیہ میں اپنی طرف سے اضافہ، کمی اور ردّ و بدل جائز نہیں؛ بلکہ اِس میں نص کی اِتباع ضروری ہے، بطور دلیل کے کچھ روایات پڑھیے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضور ﷺ نے فرمایا:

جب تم اپنی خواب گاہ میں آؤ تو اِس طرح وضو کرو، جس طرح نماز کے لیے کیا جاتا ہے، پھر اپنی دائیں کروٹ پر لیٹ جاؤ اور یہ دعا پڑھو:

اللهم أسْلَمتُ وَجْهِي إليك، وفَوَّضتُ أَمْرِي إليك، وأَلْجأتُ ظَهْري إلَيك، رَغْبَةً ورَهْبَةً إلَيك، لا مَلْجَأ ولا مَنْجیٰ مِنْكَ إلاَّ إلَيكَ. آمَنْتُ بكتابك الذي أنْزَلتَ وبِنَبِيِّكَ الذي أرْسَلْتَ.

اگر تم اُسی رات فوت ہوئے تو مسلمان ہوتے ہوئے فوت ہوگے؛ لہٰذا تم اِن کو اپنے آخری کلمات بناؤ، میں نے کہا: میں تو وَبِرَسُولك الذي أرسلتَ یاد کرتا ہوں (بخاری کی دوسری روایت میں ہے: کہ میں نے یہ کلمات رسول اللہ ﷺ کے سامنے دُہرائے، جب میں نے وَبِرَسُولك پڑھا) تو آپ نے فرمایا: نہیں وبِنَبِيِّك الذي أرسلتَ پڑھو۔

(بخاری، رقم: ۵۹۵۲، الدعوات)

دیکھیے رسول اور نبی میں عام علماء کے نزدیک تَرادُف ہے یا بعض کے نزدیک رسول خاص ہے، یعنی معنی میں اعلیٰ ہے نبی سے؛ لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے حضرت براء کو اِس طرح پڑھنے سے منع فرمادیا۔

حضرت نافعؒ کہتے ہیں: ایک شخص نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پہلو میں چھینک ماری اور کہا:

الحمد لله والسلام على رسول الله، تو ابن عمرؓ نے کہا میں بھی الحمد لله والسلام على رسول الله کہہ سکتا ہوں؛ لیکن یہ طریقہ نہیں ہے (کہ الحمد لله کے ساتھ والسلام کو ملایا جائے) ہمیں رسول اللہ ﷺ نے اِس موقع پر یہ تعلیم دی ہے کہ ہم الحمد لله على كل حال کہیں۔ (ترمذی، رقم: ۲۷۳۸)

اِن نُصوص سے یہ بات نہایت وضاحت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے کہ الفاظِ شرعیہ کی پیروی ضروری ہے، اِس کے اندر کمی بیشی جائز نہیں؛ لہٰذا اسلام اور جوابِ سلام کے وہی الفاظ معتبر

ہوں گے، جوقرآن وسنت سے ثابت ہیں، اور اگر سلام کے الفاظ بالکلیہ ترک کر دیے جائیں اور اُن کی جگہ دوسرے الفاظ: عربی یا علاقائی زبانوں کے اختیار کیے جائیں تو وہ اسلامی تحیہ نہیں ہوگا، اسلامی سلام وہی ہے جو نبی کریم ﷺ کا بتایا ہوا ہے اور عربی میں ہے؛ ہاں اگر اسلامی سلام کے بعد، علاقائی کلماتِ ملاقات بولے جائیں، جیسا کہ بولا جاتا ہے تو اِس میں کوئی حرج نہیں۔

مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

> اس حدیث سے (۱) ایک اور بنیادی بات معلوم ہوئی، جس سے آج کل لوگ بڑی غفلت برتتے ہیں، وہ یہ کہ احادیث سے معنی، مفہوم اور روح تو مقصود ہے ہی؛ لیکن شریعت میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے الفاظ بھی مقصود ہیں، دیکھیے "السلام علیکم" اور "علیکم السلام" دونوں کے معنی تو ایک ہی ہیں یعنی تم پر سلامتی ہو؛ لیکن حضور اقدس ﷺ نے حضرت جابر بن سُلیم رضی اللہ عنہ کو پہلی ملاقات ہی میں اِس امر پر تنبیہ فرمائی کہ سلام کرنے کا سنت طریقہ اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ "السلام علیکم" کہو، ایسا کیوں کیا؟ اِس لیے کہ اس کے ذریعہ آپ نے امت کو یہ سبق دے دیا کہ "شریعت" اپنی مرضی سے راستہ بنا کر چلنے کا نام نہیں ہے؛ بلکہ "شریعت" اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کا نام ہے۔
>
> آج کل لوگوں کی زبانوں پر اکثر یہ رہتا ہے کہ شریعت کی روح دیکھنی چاہیے، ظاہر اور الفاظ کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے، معلوم نہیں لوگ روح کس طرح دیکھتے ہیں، اُن کے پاس کون سی ایسی

---

(۱) اس سے مراد وہ روایت ہے، جس میں ہے کہ حضرت جابر بن سُلیمؓ نے ابتداء حضور ﷺ کو یوں سلام کیا تھا: علیك السلام یا رسول الله! تو آپ نے منع فرما دیا تھا، دیکھیے ابوداؤد، رقم: ۵۲۰۹۔

خوردبین ہے جس میں اُن کو روح نظر آجاتی ہے؛ حالاں کہ شریعت میں روح کے ساتھ ظاہر بھی مطلوب اور مقصود ہے، سلام ہی کو لے لیں کہ آپ ملاقات کے وقت "السلام علیکم" کے بجائے اردو میں یہ کہہ دیں "سلامتی ہو تم پر" دیکھیے معنی اور مفہوم تو اِس کے وہی ہیں جو "السلام علیکم" کے ہیں؛ لیکن وہ برکت، وہ نور اور اتباعِ سنت کا اجر وثواب، اِس میں حاصل نہیں ہوگا، جو "السلام علیکم" میں حاصل ہوتا ہے۔ (اصلاحی خطبات: ۱۸۶/۶)

دکتور وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

ویکره تغییر صیغة السلام المشروعة هکذا بمثل قول بعضهم: "سلام من الله" فذلك بدعة منکرة. صیغہ سلام کی تبدیلی مکروہ ہے مثلاً: کچھ لوگوں کا سلام من الله کہنا بدعت اور منکر ہے۔ (الفقه الإسلامي ۲۶۸۵/۴)

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

الفاظِ سلام: (۱) مسنون: سلامٌ یا السلامُ کا لفظ علیك یا علیکم کے ساتھ کہے (۲) جائز: صرف سلام یا تسلیم؛ اس لیے کہ یہ لفظ قرآن میں مذکور؛ مگر آں حضرت ﷺ سے غیر ماثور ہے؛ پس صرف سلام یا تسلیم پر اکتفا کرنے والا ثوابِ سنت سے محروم رہے گا (۳) حرام: وہ لفظ جس میں تعظیم ممنوعہ نکلے جیسے بندگی (۴) بدعت یا مشابہت بہ کفار: پس جو لفظ بنفسہ گناہ کے معنوں میں شامل نہیں، بدعت ضالہ ہیں جیسے کورنش، مجرا، آداب، صبحك الله، مساك الله جیسا کہ ابوداؤد نے عمران

بن حصینؓ سے روایت کی اور جو لفظ کفار کی پیروی سے اختیار کیے

جائیں تو یہ گناہ بالائے گناہ ہے۔(فتاویٰ رحیمیہ:۱۰/۱۳۱، کتاب الحظر والاباحۃ)

مسنون سلام "السلام علیکم" سے ہی ادا ہوگا

آداب عرض یا اِسی قسم کے دوسرے الفاظ، شرعی اسلامی تحیہ کے قائم مقام نہیں ہوں گے، اور سنتِ سلام ادا نہ ہوگی۔(کفایت المفتی:۹/۹۰)

خط وکتابت کرتے وقت سلام مسنون لکھنا

خط وکتابت میں بھی السلام علیکم لکھنا چاہیے، زبان سے السلام علیکم کہہ کر ''سلام مسنون'' لکھ دیا تو بھی حرج نہیں ہے، حاصل یہ کہ سلام مسنون لکھ سکتے ہیں(۱)؛ مگر السلام علیکم لکھنا زیادہ بہتر ہے۔(فتاویٰ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند: ۵۸۷۵)

صباح الخیر کہنا

ابتداءِ سلام میں صباح الخیر یا مساء الخیر کہنا اسلامی سلام نہیں ہے، اسی طرح مرحبا وغیرہ کہنے کا حکم ہے، ہاں السلام علیکم کے بعد یہ کلمات کہہ سکتے ہیں۔

لا یقوم مقام السلام غیرہ من صیغ التحیة کصباح الخیر أو مرحبا أو غیر ذلك. (نزهة المتقین:۱/۵۷۶)

ایک حجام اور رئیس کی حکایت

کسی قصبہ میں ایک حجام نے ایک رئیس صاحب کو "السلام علیکم" کہہ دیا تھا، تو رئیس صاحب نے اٹھ کر ایک چپت رسید کیا اور کہا کہ: تو بھی اِس قابل ہوگیا ہے کہ ہم کو "السلام علیکم" کہے، ''حضرت سلامت'' کہا کر، جب نماز کا وقت ہوا تو اُس نے نماز پڑھی اور ختم نماز پر

(۱) لیکن ''سلام مسنون'' لکھا ہوا ہو تو اس کا جواب واجب نہ ہوگا؛ بل کہ جواب اُسی وقت واجب ہوگا جب اصل صیغۂ سلام لکھا ہوا ہو اور شاید سلام مسنون اسی لیے لکھنے کا رواج ہوا کہ پڑھنے والے کے ذمہ جواب دینا واجب نہ رہے، گویا سہولت کی بات ہے۔

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کے بجائے یوں پکار کر کہا: ''حضرت سلامت ورحمۃ اللہ''لوگوں نے پوچھا یہ کیا حرکت ہے؟ کہنے لگا آج میں نے فلاں صاحب کو"السلام علیکم" کہا تھا تو ایک چپت لگا، مجھے ڈر ہوا کہ نماز میں فرشتوں کو بھی سلام کیا جاتا ہے،اور اُن میں حضرت عزرائیلؑ بھی ہیں؛ اگر کبھی وہ خفا ہو گئے تو میرا دم ہی نکال دیں گے۔ (تسہیل المواعظ :۲/۱۰۰،اہتمام دین کی ضرورت)

دوسری جگہ حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

خیر اگر کوئی سلام کے لفظ سے بہت ہی بُرا مانے تو اُس کو''حضرت سلامت''یا''تسلیم''یا تسلیمات کہنے تک گنجائش معلوم ہوتی ہے۔(۱)(فروع الایمان مع اصلاحی نصاب:۴۲۱)

سلام کی جگہ "یا مُرشِدَ اللہ" کہنا

اور لفظ "یا مرشد اللہ" وغیرہ جُہلا کے ایجاد کیے ہوئے ہیں، کہ سلام کی جگہ اِس کو بولتے ہیں؛ لہٰذا بدعت ہے مع ہٰذا اِس کے بعض معنی مُوہِم کفر کے ہیں، مرشد اللہ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ تم اللہ کے مرشد ہو (معاذ اللہ)؛ اگر چہ دوسرے معنی درست بھی اِس کے ہیں، سو جو کلمہ ایسا ہو اُس کے معنی اچھے اور برے دونوں ہو سکتے ہیں، اُس کو بولنا منع ہے(۲)(فتاویٰ رشیدیہ،ص:۱۵۰)

سلام اور جوابِ سلام میں جہر اور سنانا ضروری ہے

سلام چاہے ابتداءً ہو یا جواباً ہو: بہر حال ایک دوسرے کو سنانا ضروری ہے،بغیر سنائے نہ تو سلام،سلام ہوگا اور نہ ہی جواب، جواب ہوگا،سلام ایک مبارک اور پاکیزہ تحفہ ہے، جہر کے بغیر اِس کا مقصد حاصل نہیں ہوگا،حضور ﷺ اور صحابۂ کرام کا یہی معمول تھا کہ سلام اور جوابِ سلام میں جہر کرتے تھے؛ لیکن یہ بلند آواز معتدل ہو،آواز اِتنی تیز نہ ہو کہ سننے والے کو دِقّت اور تنگی محسوس ہو اور نہ ہی آواز اتنی پست ہو کہ سلام کرنے والے یا سننے والے سن ہی نہ سکیں۔

---

(۱) یہ گنجائش اور جواز کی بات ہے؛ورنہ سنت تو السلام علیکم سے ہی ادا ہوگا۔مولف۔

(۲) یہ مسئلہ حضرت گنگوہیؒ کے ملفوظات میں ہے،ممکن ہے کسی علاقہ میں کسی دور میں سلام کی جگہ "یا مرشد اللہ" بولنے کا رواج رہا ہو،حضرتؒ نے اُس کو منع کیا ہے۔مولف۔

دلائل: حافظ ابن حجرؒ نے حضور ﷺ کے ارشاد أفشوا السلام بینکم (اپنے درمیان سلام کو رواج دو) کی شرح میں لکھا ہے:

۱ — الإفشاء، الإظهار والمراد نَشْرُ السلام بين الناس؛ ليُحْيُوا سنته.

افشاء، اظہار کو کہتے ہیں: اور مقصد اِس سے لوگوں کے درمیان سلام کو پھیلانا ہے؛ تاکہ لوگ آپ کی سنت کو زندہ کریں۔ (فتح الباری:۱۱/۲۰)

۲ — علامہ نوویؒ کے حوالے سے علامہ عینیؒ نے لکھا ہے:

وأقل السلام ابتداءً ورداً أن يُسمِعَ صاحبه، ولا يجزئه دون ذلك.

سلام اور جوابِ سلام میں کم از کم درجہ یہ ہے کہ مُتعَلِّقہ شخص کو سنایا جائے، اور اس سے کم سلام کافی نہیں۔ (عمدۃ القاری:۱۵/۳۴۶)

علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں:

۳— فكذلك إذا أجاب بجوابٍ لم يُسمَعْ منه، فليس بجوابٍ. اگر کوئی جواب دے اور سنائے نہ، تو وہ جوابِ سلام نہیں ہے۔ (الجامع لأحکام القرآن:۵/۳۰۳)

ایک شبہ اور اس کا جواب

سوال (۳۵۷) سلام کا جواب اگر آہستہ دیا کہ مسلّم نے نہ سنا، تو جواب ادا ہوگا یا اِسماع بھی ضروری ہے، بعض صحابہؓ نے (۱) آں حضرت ﷺ کے سلام کا جواب نہایت آہستہ سے دیا کہ بوجہ عدم سماع، تکرارِ سلام کی نوبت آئی، آخر حضور واپس ہوئے تھے؛ گو علت یہاں استماعِ کلام وتحصیل برکت ہے، مگر بظاہر شبہ جواز کا معلوم ہوتا ہے۔

(۱) حضرت سعد بن عبادہؓ کے واقعہ کی جانب اشارہ ہے (الأدب المفرد:۱۰۰۸) ''سلامتی کی دعا لینے کا شوق'' کے تحت گذرا ہے، مولف۔

الجواب: اِعلام ضروری ہے، اگر قریب ہوتو اِسماع سے اور اگر بعید یا اَصَمّ (بہرہ) ہوتو اشارہ سے مع تلفُّظ بلسان کے اور صحابی کا یہ فعل عارض سے تھا فلا یقاس علیه غیره. (امداد الفتاویٰ:۴/۲۷۶)

ایک مبنی بر حکمت رائے

مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہ لکھتے ہیں: میں نے حضرت تھانویؒ کی کسی کتاب میں دیکھا تھا، کہ سلام کا جواب دینا واجب تو ہے؛ لیکن جواب کو سنانا مستحب ہے؛ کیوں کہ ایسی صورت اُس شخص کے لیے ہے جو جواب سنانے سے عاجز ہو یا جواب سنانا مشکل ہو تو اُسے ترکِ واجب کا گناہ نہ ہو، اُس کے لیے آسانی رہے گی؛ لیکن یہ بات فقہاء کی کتابوں میں مجھے نہیں ملی۔

قال العبد الضعيف عفا الله عنه:

وقد رأيت في بعض كتب شيخ مشائخنا الإمام محمد أشرف علي التهانوي رحمه الله تعالى أن رد السلام واجب، وإسماعه مستحب وفيه سعة لمن يشكل عليه الإسماع، ولكني لم أجده في كتب الفقهاء القدامى.

(تکملہ:۴/۲۴۵)

سلام کرنے کا لب ولہجہ اور انداز

حضرت تھانویؒ کے افادات بنام ''اسلامی تہذیب'' میں ہے:

۱- شریعت نے صیغۂ سلام یعنی السلام علیکم کے لفظ میں چھوٹے بڑے میں کچھ تفریق وتفصیل نہیں رکھی ، ہاں لہجہ میں فرق ہونا چاہیے؛ کیوں کہ یہ عظمت وادب میں داخل ہے، جس کی شریعت میں تعلیم ہے۔

۲- چھوٹے بڑوں کو نیازمندی کے لہجہ میں سلام کریں اور بڑے اُن کو حقیر نہ سمجھیں۔

۳- باپ کو بیٹا ایسے لہجہ میں سلام کرے کہ سلام کے لہجہ سے معلوم ہو جائے کہ سلام کرنے والا بیٹا ہے، اِس میں کون سے حرج اور کون سی تحقیر کی بات ہے۔

۴- بعض لوگ کچھ ایسی ادا سے اور ایسے لب ولہجہ سے سلام کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا محبت ٹپکی پڑتی ہے، بعض اوقات کسی کے فقط سلام کرنے سے عمر بھر کے لیے محبت ہوگئی۔(اسلامی تہذیب:۵۸)

گونگے کا سلام اور جوابِ سلام

(۱) اگر کسی نے گونگے کو سلام کیا تو وہ اشارے سے جواب دے دے، فرض ساقط ہو جائے گا۔(عمدۃ القاری:۱۵/۳۴۶)

(۲) اگر گونگے نے اشارے سے کسی کو سلام کیا تو اُسے جواب دینا چاہیے؛ کیوں کہ اشارہ گونگے کے حق میں بہت سے احکام میں تلفظ کے قائم مقام ہے۔(ایضا)

بہرے کو سلام کرنا

اگر کوئی ایسے شخص کو سلام کرے جو بہرہ ہے تو سلام کرنے والے کو چاہیے کہ تلفظ کے ساتھ ساتھ اشارہ بھی کرے؛ تا کہ وہ سمجھ جائے کہ مجھے سلام کیا جارہا ہے، ورنہ مستحقِ جواب نہیں ہوگا اور اگر بہرے نے کسی کو سلام کیا تو جواب میں تلفظ کے ساتھ ساتھ اشارہ بھی ضروری ہے۔(ایضا)

ہاتھ یا سَر کے اشارے سے سلام کرنا

حدیث میں ہے: تسليم اليهود، الإشارة بالأصابع، وتسليم النصارىٰ، الإشارة بالأكف، یعنی یہودیوں کا سلام کرنا، انگلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنے اور عیسائیوں کا ہتھیلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔(ترمذی:۲۶۹۵، کراھیۃ إشارۃ الید)

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

لا تُسلموا تسليم اليهود، فإن تسليمهم بالرؤوس والأكف والإشارة، یہودیوں کی طرح سلام نہ کرو، اُن کا سلام سر، ہاتھ اور اشارے سے ہوتا ہے۔(عمل الیوم واللیلۃ للنسائی، رقم:۳۴۰)

ایک دوسری روایت میں ہے:

تسليم الرجل بأصبع واحدةٍ يُشير بها، فعلُ اليهود، کہ آدمی کا اشارہ کرکے ایک انگلی سے سلام کرنا، یہودی فعل ہے۔(الترھیب:۴۳۵/۳)

شارحینِ حدیث نے اِن جیسی احادیث سے یہ مسئلہ ثابت کیا ہے: کہ سر، ہاتھ یا جسم کے دوسرے اعضاء سے اشارہ کرکے، الفاظ بولے بغیر سلام کرنا یا جواب دینا جائز نہیں؛ بلکہ یہودیوں اور مُتکبِّر لوگوں کا کام ہے۔

مظاہر حق جدید میں ہے:

> چناں چہ آں حضرت ﷺ کو، گویا مُکاشفہ ہوا کہ میری امت کے کچھ لوگ بے راہ روی کا شکار ہوکر، سلام کرنے کا وہ طریقہ اختیار کریں گے، جو یہودیوں، عیسائیوں اور دوسری غیر اقوام کا ہے جیسے انگلیوں یا ہتھیلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنا، ہاتھ جوڑ لینا، کمر یا سر کو جھکانا اور صرف سلام کرنے پر اکتفا کر لینا وغیرہ وغیرہ؛ لٰہذا آپ ﷺ نے پوری امت کو مخاطب کرتے ہوئے، اِس بارے میں تنبیہ بیان فرمائی اور یہ وعید بیان کی کہ جو شخص سلام کے اِن رسم ورواج کو اپنائے گا جو اسلامی شریعت اور ہماری سنت کے خلاف ہیں، تو اُس کو سمجھ لینا چاہیے کہ اُس کا شمار، ہماری امت کے لوگوں میں نہیں ہوگا۔(مظاہر حق:۳۴۷/۵)

حدیث کا ضُعف اور اس کا جواب

اوپر سنن ترمذی کی جو روایت ذکر کی گئی ہے، اُس کے بارے میں امام ترمذیؒ نے کہا ہے: إسناده ضعيف کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے، یعنی قابلِ استدلال نہیں؛ لہٰذا محض اشارے سے سلام کے عدمِ جواز پر استدلال درست نہیں، ملاعلی قاریؒ نے اِس کا جواب دیا ہے: کہ محض کسی حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ سے حکم بھی بدل جائے یہ ضروری نہیں ہے؛ نیز یہ حدیث دوسری صحیح سند سے مروی ہے مثلاً: عمل الیوم واللیلہ والی روایت، حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے: وسنده جيد. (فتح الباری:۱۱/۱۹)

علاوہ ازیں صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ سلام باللفظ مسنون ہے اور اِسی طرح اُس کا جواب بھی زبان سے دینا واجب ہے؛ لہٰذا محض اِس حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اشارے سے سلام کے عدمِ جواز کا حکم نہیں بدلے گا۔ (مرقاۃ:۹/۵۷)

تعارُض اور اُس کا حل

محض اشاروں سے سلام کے جواز کے سلسلے میں حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کی ایک روایت پیش کی جاسکتی ہے کہ حضور ﷺ ایک روز مسجد سے گذرے اور وہاں عورتوں کی ایک جماعت (دینی تعلیم کے حصول کے لیے) موجود تھی، تو آں جناب نے اپنے ہاتھ کے اشارہ سے سلام کیا اور امام ترمذیؒ نے اِس حدیث کے بارے میں "هذا حديث حسنٌ" کہا ہے۔

علامہ نوویؒ نے اِس حدیث کے بارے میں کہا ہے: کہ اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے لفظ، اشارہ دونوں کو جمع کیا تھا، صرف اشارے سے سلام نہیں کیا تھا، اور اِس کی تائید اِس سے ہوتی ہے کہ ابوداوٗدؒ نے بھی اِس روایت کو نقل کیا ہے اور اُس میں فأهوى بيده (اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا) کے بعد فَسَلّم علينا کے الفاظ زائد ہیں، اگر صرف ہاتھ سے اشارہ کیا تھا تو فَسَلَّم علينا کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔ (فتح الباری:۱۱/۱۸، مرقاۃ:۹/۵۷)

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: کہ اگر مان لیا جائے کہ حضورﷺ نے زبان سے نہیں؛ بلکہ محض اشارے سے سلام کیا تھا، تب بھی مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا؛ کیوں کہ یہ آپ کی خصوصیات میں سے ہے؛ لہٰذا آپ کو سلام کرنے، نہ کرنے اور اشارہ سے سلام کرنے نہ کرنے؛ ہر طرح کا اختیار رہے، ثانیاً کبھی اشارہ سے بغیر سلام کے قصد کے، محض تواضُع کو مراد لیا جاتا ہے، ثالثاً اشارہ سے سلام کرنا، عورتوں کے حوالے سے، بیانِ جواز پر محمول ہے، مَردوں کا یہ مسئلہ نہیں ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح: ۹/۵۷)

فائدہ: ملا علی قاریؒ نے مذکورہ حدیث کی جو تاویلات پیش کی ہیں، اُن سے اُن ساری روایتوں کا جواب بن جاتا ہے، جس میں کچھ صحابہ کرام کا اشارے سے سلام کرنا مروی ہے، ایسی روایات کے لیے دیکھیے امام بخاریؒ کی الأدب المفرد (باب من سلم إشارة) لیکن امام بخاریؒ نے ایسی روایتوں کو ذکر کرنے کے بعد آخری روایت عطا بن ابی رباحؒ کی نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں: کانوا یکرھون التسلیمَ بالید، وقال: کان یکرہ التسلیم بالید (الأدب المفرد: رقم: ۱۰۴۰)

یعنی اکثر صحابۂ کرامؓ ہاتھ کے اشارے سے سلام کرنے کو ناپسند کرتے تھے، اور خود حضرت عطا بھی اِسے ناپسند کرتے تھے۔

مولف عرض گزار ہے کہ امام بخاریؒ نے اس آخری روایت سے اِس جانب اشارہ کیا ہے: کہ محض ہاتھوں کے اشارہ سے سلام، کچھ صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے؛ لیکن اکثر صحابہ کرامؓ زبان سے سلام کرتے تھے اور یہی معمول بہا ہے۔

چند مسائل

مسئلہ: سلام کے ساتھ ہاتھ اٹھانے کی بھی گنجائش ہے؛ اگر چہ ضرورت نہیں۔ (محمودیہ: ۹/۷۳)

مسئلہ: لفظ اور اشارہ کا جمع کر لینا جیسا کہ ہمارے بلاد میں معمول ہے، اگر چہ اولی نہ ہو؛ مگر جائز ہے؛ خصوصاً جب کہ یہ اشارہ علامتِ تعظیم وتوقیر، عرفاً قرار پا چکا ہے۔ (فتاوی رحیمیہ: ۱۰/۱۳۱)

مسئلہ: قرآن مجید میں ہے کہ جب تم کو کوئی سلام کرے تو اُس سے اچھا جواب دو یا ویسا ہی لوٹا دو،

اِس سے معلوم ہوا کہ سلام کے جواب میں سر ہلا دینا یا ہاتھ اٹھا دینا(۱) کافی نہیں۔

(فروع الایمان مع اصلاحی نصاب:۴۲۱)

مسئلہ: جب بُعد (دوری) یا کسی اور وجہ سے آوازِ سلام سمجھ میں نہ آسکے تو ہاتھ سے اِعلام و اِعلان مباح ہے۔ (فتاوی رحیمیہ:۱۰/۱۳۱)

یعنی عام حالات میں صرف ہاتھ سے یا سر سے سلام کرنا جائز نہیں؛ بلکہ مجبوری کی حالت میں ہاتھ سے اشارہ کرسکتا ہے؛ لیکن لفظِ سلام اور جواب سلام کے الفاظ اور اشارہ دونوں کو جمع کرے، اور گونگا کا مسئلہ الگ ہے وہ ہاتھ کے اشارے سے ہی سلام یا سلام کا جواب دے گا، اُس کے حق میں، اِشارہ تلفظ کے درجہ میں ہے۔

سلام کے جواب میں صرف سر ہلانا، بدمذاقی ہے

حضرت تھانویؒ کے مواعظ میں ہے:

بعض لوگ جو سلام کے جواب میں، سر ہلاتے ہیں اور زبان سے "وعلیکم السلام" نہیں کہتے ہیں وہ بدمذاق ہیں کہ ٹکا سی زبان نہیں ہلاتے اور دھڑا سا سر ہلا دیتے ہیں، ممکن ہے کوئی معقولی اِس کی توجیہ کرے کہ فعل بسیط، فعل مرکب سے آسان ہوتا ہے اور سر کا ہلانا اضافہ اور فعل بسیط ہے، اور زبان کا چلانا فعل مرکب ہے؛ کیوں کہ الفاظ کو مخارج سے خاص ہیئت وترکیب کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے۔

سو جواب اِس کا یہ ہے کہ اس لحاظ سے؛ اگرچہ سر ہلانا سہل ہے؛ مگر جس غرض سے سلام کرتے ہیں اُس غرض وغایت کے لحاظ سے زبان ہی کا فعل آسان ہے؛ کیوں کہ سر ہلانے سے وہ غرض حاصل نہیں ہوتی، سلام سے مقصود دعا ہے اور وہ بدونِ کلام وتکلم کے حاصل نہیں ہوتی تو جو لوگ سلام وجوابِ سلام میں سر ہلاتے ہیں ان کو غایات ومقاصد سے دلچسپی نہیں اور یہی بدمذاقی کی علامت ہے۔ (خطبات حکیم الامت:۲۸/۱۲۳، اصلاح ظاہر)

---

(۱) معلوم ہوا کہ سلام کے موقع پر صرف ہاتھ اٹھا دینا کافی نہیں ہے، شہر حیدرآباد میں، دیکھا جاتا ہے کہ سلام کرنے والا، سلام کرتے وقت، اپنا ہاتھ مخصوص انداز میں اپنے چہرے یا سینہ تک لے جاتا ہے اور بعض لوگ ہاتھ کو حرکت بھی دیتے ہیں، یہ طریقہ، اسلامی طریقہ نہیں ہے، اور جواب دینے والا بھی بعض دفعہ ایسے ہی کرتا ہے، یہ بھی زائد چیز ہے، مولف.

کون سلام میں پہل کرے؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

سوار، پیدل چلنے والے کو سلام کرے، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑے لوگ زیادہ کو۔

دوسری روایت میں ہے:

چھوٹا بڑے کو سلام کرے، گذرنے والا بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑے زیادہ کو۔ (بخاری، رقم: ۵۸۷۹، ۵۸۸۰)

اِن دو احادیث میں اِس کا بیان ہے کہ سلام میں پہل کون کرے؟ اور کس کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ سامنے والے کو پہلے سلام کرے، ترتیب وار مسائل درج ذیل ہیں، اور شارحینِ حدیث نے ابتداء کی اس ترتیب میں جو حکمتیں بیان کی ہیں وہ بھی یہیں لکھی جائیں گی۔

۱- سوار، پیدل چلنے والے کو سلام کرے

یہ حکم استحباب کے طور پر ہے، اور تواضُع و خاکساری کی جانب متوجہ کرنے کے لیے ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ نے اُسے سواری کی نعمت عطا فرمائی ہے، تو اُس کا حق ہے کہ تواضع اختیار کرے؛ اگر پیدل چلنے والے کو حکم ہوتا کہ سوار کو پہلے سلام کرے تو سوار میں، تکبُّر و گھمنڈ پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ (شرح ابن بطال: ۱۱/۹)

اس بنا پر جو شخص کسی گاڑی، سائیکل، گھوڑے اور ہاتھی وغیرہ پر سوار ہے تو پیدل چلنے والے؛ بلکہ بیٹھے ہوئے لوگوں کو پہلے سلام کرے؛ کیوں کہ والمارُّ علی القاعد کے الفاظ میں "المارُّ (گذرنے والا) پیدل چلنے والے اور کسی سواری پر سوار سب کو شامل ہے؛ بلکہ امام بخاریؒ نے الأدب المفرد میں باب تسلیم الراکب علی القاعد کا باب باندھا ہے، اُس میں فَضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے یُسلّم الفارسُ علی القاعدِ کہ گھوڑسوار بیٹھے ہوئے کو سلام کرے۔ (الأدب المفرد: ۱۳۱؍۹)

۲- گذرنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے

اس کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ بیٹھے ہوئے شخص کا ہر گذرنے والے کی طرف، بار بار متوجہ ہونا اور سلام کرنا مشکل ہے؛ جب کہ گذرنے والے کو ایسی مشکل نہیں، امام بخاریؒ نے الادب میں فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے جس میں ہے يُسلّم الفارس الماشي، والماشي على القائم (رقم:۹۳۱) گھوڑسوار پیدل چلنے والے کو سلام کرے اور پیدل چلنے والا کھڑے ہوئے کو۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: اگر "قائم" کو مستقرٌ (قرار پکڑنے والا) کے معنی میں لے لیا جائے تو پھر کھڑے ہوئے ٹیک لگائے ہوئے اور لیٹے ہوئے سب کو شامل ہوگا۔ (فتح الباری:۱۱/۲۱)

۳- تھوڑے، زیادہ لوگوں کو سلام کریں

یہ حکم اِس حکمت کے پیش نظر دیا گیا ہے کہ زیادہ لوگوں کا تھوڑے لوگوں پر زیادہ حق ہے اور اس لیے بھی کہ زیادہ لوگ تھوڑے لوگوں کو یا اکیلے کو پہلے سلام کریں گے تو اُن میں خود بینی اور تکبر پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، نیز کم لوگوں کا سلام کرنا آسان ہے بہ نسبت زیادہ لوگوں کے۔

لأن للكثير مَزِية: ولأن توجه الأمر بالسلام إلى القليل أخف وأسهل من توجه إلى الكثير. (تکملہ فتح الملہم:۴/۲۴۳)

۴- چھوٹا بڑے کو سلام کرے

چھوٹے کو سلام میں پہل کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ بڑے کا حق، چھوٹے پر زیادہ ہے؛ کیوں کہ چھوٹے کو حکم ہے کہ بڑے کی عزت کرے اور اُس کے ساتھ باادب رہے؛ لہٰذا جو عمر یا رتبہ میں چھوٹا ہو وہ بڑے کو سلام کرے مثلاً: باپ بیٹا، استاذ شاگرد، وغیرہ: لہٰذا بیٹا، باپ کو اور شاگرد، استاذ کو سلام کرے۔ (حاشیہ الطیبی:۹/۸)

بازار اور شارع عام کا حکم

اگر کوئی بازار یا عام سڑک یا چورستے یا پھر ایسی جگہ سے گذر رہا ہے؛ جہاں لوگوں کی

آمد ورفت بکثرت رہتی ہے تو وہاں کچھ لوگوں کو سلام کرلینا کافی ہے؛ کیوں کہ ایسی جگہوں میں ہر شخص کو سلام کریں گے تو تو اپنا کام صحیح طور پر، بروقت انجام نہیں دے سکیں گے (یہی حکم شاپنگ مال، بڑی دوکانیں، فلیٹ فارم، بینک اور بس اسٹاپ وغیرہ کا ہوگا) (حاشیۃ الطیبی: ۹/۹)

ملحوظہ: پیدل چلنے والا، بیٹھے ہوئے کو سلام کرے، یہ استحبابی حکم ہے؛ لیکن اگر پیدل چلنے والوں کی تعداد زیادہ ہے اور بیٹھے ہوئے لوگوں کی تعداد کم ہے تو یہاں کیا حکم ہوگا؟ کیوں کہ یہاں استحباب کی دونوں جہتیں ہیں؛ تعداد کے پیشِ نظر قاعدین کو سلام کرنا چاہیے؛ جب کہ حالت کے مدِ نظر پیدل چلنے والوں کو سلام کرنا چاہیے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ ایسی صورت میں دونوں جہتیں ساقط اور کالعدم سمجھی جائیں گی اور اِس کا حکم ایک ساتھ دو ملنے والے اَفراد کے حکم کی طرح ہوگا؛ لہٰذا ہر ایک ابتداء کی کوشش کرے اور کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ پیدل چلنے والے کے لیے اِس صورت میں بھی سلام کرنا افضل اور مستحب ہے۔ (اوجز المسالک: ۱۵۴/۱۷)

درس گاہ یا مجلس جیسی جگہوں میں آنے والا ہی سلام کرے

اگر کوئی کسی مجلس یا درس گاہ یا ایسی جگہ میں جائے؛ جہاں پہلے سے لوگ موجود ہیں یا انتظار کررہے ہیں، خواہ وہ بیٹھے ہوئے ہوں یا کھڑے ہوں، آنے والے ہی کو سلام کرنا چاہیے، آنے والا چھوٹا ہو یا بڑا، کم ہوں یا زیادہ، استاذ ہو یا شاگرد وغیرہ (حاشیۃ الطیبی: ۸/۹)

اور ایسی جگہوں میں ایک سلام کافی ہے؛ ہر ایک کو الگ الگ سلام کرنا ضروری نہیں ہے۔ (الأذکار: ۲۹۴) (۱)

فائدہ: سلام میں پہل کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اِس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر چھوٹا یا گذرنے والا، سلام نہ کرے تو بڑا یا بیٹھا ہوا بھی خاموش رہے؛ بلکہ یہ حکم استحبابی ہے، افضلیت پر محمول ہے؛ لہٰذا ایسی صورت میں بڑے کو سلام کردینا چاہیے؛ تاکہ چھوٹے کو تنبیہ ہو۔ (أوجز: ۱۶۶/۱۷)

(۱) عموماً ناواقفیت کی وجہ سے لوگ سب کو الگ الگ سلام کرتے ہیں، اصلاح کرنی چاہیے۔ مولف.

اِسی طرح اگر ابتداءً ہی بڑے نے سلام کر دیا یا پیدل چلنے والے نے سوار کو سلام کر دیا تو یہ مکروہ نہیں ہے؛ چناں چہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اپنے پہرے داروں کے پاس آتے تھے تو ازخود سلام کرتے تھے اور اُن کی طرف سے تاکید تھی کہ جب وہ آئیں تو وہ لوگ سلام نہ کریں اور نہ ہی کھڑے ہوں ولا یبدؤوہ بالسلام ویقول: إنما السلام عليَّ.
(شرح السنۃ: ۱۲/۲۶۲)

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

جو شخص کسی کے پاس جائے، اُس کو چاہیے کہ سلام کرے اور جس کے پاس جائے وہ سلام کا جواب دے؛ لیکن اُس نے سلام نہیں کیا اور وہ خاموش کھڑا ہو گیا اور جس کے پاس گیا تھا اُس نے سلام کر لیا اور اس کی بڑائی کا لحاظ کر لیا تب بھی گناہ نہیں؛ بلکہ اس کو بہت ثواب ملے گا۔ (۹/۶۳)

دونوں ایک رُتبے کے ہوں تب؟

جب دونوں چلنے والے برابر درجے کے ہوں مثلاً عمر میں برابر ہوں یا حالت میں برابر ہوں مثلاً دونوں سوار ہیں یا دونوں پیدل ہیں، تو ایسی صورت میں ہر ایک کو سلام میں پہل کی کوشش کرنی چاہیے، اور جو پہلے سلام کرے گا، اُسے افضل قرار دیا جائے گا، حدیث میں ہے: لوگوں میں اللہ سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو سلام میں پہل کرے۔ (ترمذی، رقم: ۲۶۹۴)

رات کو آنے والا سلام کیسے کرے؟

حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کہ حضور ﷺ رات کو تشریف لاتے تو سلام اِس طرح کرتے کہ سویا ہوا بیدار نہ ہو جائے، اور بیدار سلام سُن لے۔ (الأدب المفرد: رقم: ۹۶۵)

تشریح: علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

اِس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ (۱) ایسی جگہ جہاں کچھ لوگ بیدار ہوں اور کچھ

لوگ سوئے ہوئے ہوں یا آرام کر رہے ہوں تو وہاں سلام کرنا چاہیے (۲) ایسے موقع پر سلام شائستگی کے ساتھ کرنا چاہیے کہ کسی کو خلل نہ ہو اور مقصد بھی حاصل ہو جائے، ورنہ سلام بجائے امن وسلامتی کے خلل ودشواری کا سبب بن جائے گا، جو موضوعِ سلام کے خلاف ہے۔ (تحفۃ الأحوذی: ۷/۴۱۸)

اِس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلام کرنے والے کو، ہمیشہ اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ اُس کے سلام سے کسی طرح کی کوئی اذیت، بندگانِ خدا کو نہ پہنچے اور اذیت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

مذکورہ حدیث اور ہم مسلمان

اِس حدیث سے اِس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اسلام کے پیغمبر نے کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کی تعلیم دی ہے اور اُسے بَرت کر دکھایا ہے، آپ نے سونے والے کی اتنی رعایت کی، حضرت تھانویؒ نے اس حدیث کو ذکر کر کے لکھا ہے:

> حالاں کہ یہ (نبی کریم ﷺ) وہ ذات ہے کہ اگر آپ قتل بھی کر دیتے تو صحابہ کرام کو انکار نہ ہوتا؛ بلکہ آپ کے ہاتھ سے خوشی خوشی جان دینا، اُن کے نزدیک ایک فخر تھا؛ مگر پھر بھی آپ صحابہ رضی اللہ عنھم کی نیند کی اتنی رعایت فرماتے تھے؛ مگر یہاں یہ حالت ہے کہ ہر وقت سلام اور ہر وقت مصافحہ، چاہے کسی کو تکلیف ہوتی ہو؛ چناں چہ میرے یہاں اِس قسم کی باتوں پر روک ٹوک اور انتظام بہت ہے جس پر عنایت فرماؤں نے، مجھے بہت کچھ خطاب دے رکھے ہیں، ایک صاحب نے تو میرے منہ پر کہا: کہ ہم کو یہ طریقہ پسند نہیں، انگریزوں کا سا قانون، ہر بات میں انتظام ہر بات میں انتظام؛ افسوس گویا اسلام میں انتظام ہی نہیں، بس اسلام تو ان کے نزدیک بے انتظامی کا نام ہے؛ حالاں کہ اسلام سے زیادہ انتظام کسی نے بھی نہیں کیا، ہر کام کا وقت مقرر ہے۔ (اشرف الجواب: ۴/۲۵۷)

مولف عرض گزار ہے کہ حضرت تھانویؒ کی یہ بات نہایت قیمتی ہے اور اسلامی زندگی کے ہر میدان میں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے، ہمارا کوئی طرزِ عمل، منظّم اور مُرتّب نہیں؛ حتی کہ سلام ومصافحہ بھی، اوپر کا اقتباس بیچ سے لیا گیا ہے، اِس سے پہلے اور بعد میں بڑا دلچسپ اور دلنشیں مضمون ہے، پڑھنا چاہیے، عنوان ہے ''غیر قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے'' جی تو چاہ رہا ہے کہ پورا مضمون نقل کر دیا جائے؛ لیکن خوفِ طوالت ایک مجبوری ہے؛ البتہ یہ بات ضرور لکھنا چاہیے:

سبحان اللہ کیسی ذرا ذرا سی باتوں کی رعایت فرمائی ہے اور یہ معجزہ ہے حضور ﷺ کا کہ باوجود اتنے مشاغل کثیرہ کے پھر بھی آپ نے مُعاشرت کے دقیق سے دقیق اُمور کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا، کیا بدون نبوت کے ایسا ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ (اشرف الجواب: ۴/۴۵۷)

پیچھے سے اچانک سلام کر دینا

اگر کوئی شخص ٹہلتے ہوئے قرآن کی تلاوت کر رہا ہو اور اد و وظائف میں مشغول ہو یا تسبیح پڑھ رہا ہو تو پیچھے سے اچانک سلام نہیں کرنا چاہیے، خلل تو ہوتا ہی ہے، بعض دفعہ انسان گھبرا بھی جاتا ہے، مولف نے اپنے کئی اساتذہ کو ایسے سلام کرنے والے کو تنبیہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، مذکورہ حدیث کی روشنی میں یہ ممانعت، بالکل صحیح ہے۔

اپنے گھر میں آنے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتاً فَسَلِّمُوا عَلَى أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً. (النور: ۶۱)

جب تم اپنے گھروں میں داخل ہونے لگو، تو اپنے لوگوں کو (یعنی وہاں جو ہوں اُن کو) سلام کر لیا کرو (جو کہ) دعا کے طور پر (ہے) اور جو خدا کی طرف سے متعین ہے۔

اِس آیت میں گھریلو معاشرت او رطرزِ معاشرت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ

آمد ورفت پر اہل خانہ کو سلام کرنا چاہیے، محبت وتعلق میں کمی ہو تو اضافہ ہوتا ہے، اور محبت وتعلق پہلے سے ہو تو اُس میں دوام اور پائیداری پیدا ہوتی ہے؛ لہٰذا گھر میں داخل ہونے کا ادب یہی ہے کہ جب گھر میں داخل ہو تو گھر میں جو لوگ ہوں، اُن کو سلام کرنا چاہیے، حضور ﷺ کا ایسا ہی معمول تھا اور جس وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس فرشتوں کی یا حضرت جبرئیلؑ کی آمد ہوتی تھی تو وہ بھی آپ کی خدمت عالیہ میں سلام کرکے آداب بجالاتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ولیمے والی حدیث میں بیان کرتے ہیں:

چناں چہ رسول اللہ ﷺ نکلے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کمرے کی جانب تشریف لے گئے، تو کہا: السلام عليكم أهل البيت ورحمة الله (یعنی سلام کیا) انہوں نے وعليك السلام ورحمة لله سے جواب دیا۔ (مسلم: ۱۴۲۸، النکاح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: کہ حضور ﷺ نے فرمایا: بیٹے! جب تم اپنے گھر والوں سے ملو تو سلام کرلیا کرو، وہ سلام تم پر اور تمہارے گھر والوں پر خیر وبھلائی کا سبب ہوگا۔

(ترمذی: ۲۶۹۸)

الفقہ الاسلامی میں ہے:

جب کوئی اپنے گھر میں جائے تو گھر میں اپنا دایاں پاؤں رکھے اور یہ دعا پڑھے اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْئَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلَجِ، وخَيْرَ الْمَخْرَجِ بِاسْمِ اللهِ وَلَجنا، باسمِ اللهِ خَرَجْنَا، وعَلَى اللهِ رَبَّنَا تَوَكَّلْنَا، پھر گھر والوں کو سلام کرے۔ (۲۶۸۶/۴)

اِس سلسلے کی مزید تفصیلات پیچھے گذر چکی ہیں۔

دوسرے کے گھر میں آنے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سِوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو، جب تک

اجازت حاصل نہ کرلو (اور اجازت لینے سے پہلے) اُن کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو۔ (النور:۲۷)

علامہ قرطبیؒ کی رائے کے مطابق آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ پہلے اجازت حاصل کرو، اور جب گھر میں جاؤ تو سلام کرو، اور علامہ ماوردی نے یہ تفصیل کی ہے: اگر اجازت لینے سے پہلے گھر کے کسی آدمی پر نظر پڑ جائے تو پہلے سلام کرے پھر اجازت طلب کرے؛ ورنہ پہلے اجازت لے اور جب گھر میں جائے تو سلام کرے؛ مگر عام روایاتِ حدیث سے جو طریقہ مسنون معلوم ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ پہلے باہر سے سلام کرے "السلام علیکم" اِس کے بعد اپنا نام لے کر کہے کہ: فلاں شخص ملنا چاہتا ہے، امام بخاریؒ نے الأدب المفرد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے: کہ انہوں نے فرمایا: کہ جو شخص سلام سے پہلے استئذان کرے اُس کو اجازت نہ دو؛ الغرض آیتِ قرآنی میں جو سلام کرنے کا تذکرہ ہے وہ سلام برائے اجازت ہے، جو باہر سے کیا جاتا ہے؛ تاکہ اندر موجود شخص متوجہ ہو جائے، گھر میں داخل ہونے کے وقت حسبِ معمول دوبارہ سلام کرے۔ (معارف القرآن ۶/۳۷۶)

تنبیہ: اس زمانے میں بعض دشواریاں یوں بھی پیش آتی ہیں کہ عموماً مخاطب، جس سے اجازت لیتا ہے وہ دروازے سے دور ہے، وہاں تک سلام کی آواز پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے؛ ایسی جگہوں پر زور سے سلام کرنے کے بجائے، دروازے پر لگی ہوئی بیل بجادیں، جیسا کہ عموماً ایسے گھروں میں ہوتا ہے، اِس کے علاوہ اور طریقہ جو اُس علاقے میں رائج ہو اُس کا استعمال کرسکتا ہے؛ ایسی جگہوں میں سلام برائے اجازت کا ترک کردینا جائز ہے۔ (ایضا)

بغیر سلام کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت مانگنا

اگر کوئی شخص بغیر سلام کیے گھر میں داخل ہونے کی اجازت مانگے تو اجازت نہ دینا جائز ہے؛ کیوں کہ بغیر سلام کے استئذان، مسنون استئذان نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا: "أَ أَلِجُ" کیا اندر آسکتا ہوں؟ اور سلام نہیں کیا، حضور ﷺ نے چھوٹی بچی سے کہا جاؤ اُس سے کہو کہ وہ یوں کہے: السلام علیکم أدخل؛

کیوں کہ اس نے اجازت اچھے طریقے سے نہیں لی ہے۔ (الأدب المفرد، رقم الحدیث: ۱۰۱۸)

تشریح: اِس حوالے سے مسلمانوں میں عموماً غفلت پائی جاتی ہے، لوگ اجازت کے وقت سلام نہیں کرتے ہیں، اجازت لینے کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ پہلے السلام علیکم کہے، اِس کے بعد کہے: کیا میں اندر آ سکتا ہوں، اگر کوئی آدمی بغیر سلام کیے اجازت چاہے تو اُس کو اجازت نہیں دینی چاہیے؛ بلکہ اُسے بتانا چاہیے کہ پہلے سلام کرو جو ایک دعائیہ کلمہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی شعار اور اسلامی تہذیب بھی ہے اور اسلامی اخوت اور للّٰہی رشتہ کا اظہار بھی ہے۔

اجنبی شخص کے لیے صراحۃً اجازت ضروری ہے

اجنبی شخص جس سے ملنا جلنا نہیں ہوتا، اُس کا حکم یہ ہے کہ وہ صراحۃً اجازت لیے بغیر گھر میں داخل نہ ہو، حضرت کلدہ بن حنبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کہ (ان کے اخیافی بھائی) صفوان ابن امیہ نے اُن کو دودھ، ہرنی کا بچہ اور چھوٹی ککڑیاں دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادیٔ مکہ کے بالائی حصہ میں قیام فرما تھے، کلدہ کہتے ہیں: میں یہ چیزیں لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا، میں نے سلام کیا نہ حاضری کی اجازت چاہی، آپ نے فرمایا: واپس جاؤ اور کہو: السلام علیکم أ أدخلُ، السلام علیکم کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ (مشکوٰۃ، حدیث: ۴۶۷۱، الأدب المفرد: ۱۰۱۷)

جس دروازے پر پردہ نہ ہو وہاں اجازت کیسے لے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی دروازے پر پہنچتے تھے تو دروازے کے سامنے کھڑے نہیں ہوتے تھے؛ بلکہ دائیں بائیں کھڑے ہوتے تھے اور فرماتے: "السلام علیکم" (۱) اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں دروازوں پر پردے نہیں ہوتے تھے؛ پس اگر پردہ پڑا ہوا ہو یا کواڑ بند ہوں تو سامنے کھڑا ہونا جائز ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ: ۵/۵۵۷)

---

(۱) مشکوٰۃ، حدیث: ۴۶۷۳

اجازت لیتے وقت اپنا نام بتائیے

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، میں نے دروازہ کھٹکھٹایا آپ نے پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا: ''میں'' آپ نے فرمایا: ''میں میں'' (کیا ہے؟) گویا آپ نے اِس کو بُرا جانا۔ (بخاری: ۶۲۵۰)

اِس سے معلوم ہوا کہ اندر سے جب اجازت طلب کرنے والے کے بارے میں پوچھا جائے، تو وہ یہ نہ کہے کہ ''میں'' ہوں یا ''ہم ہیں''؛ بلکہ اپنا نام یا جس سے شہرت ہے وہ بتائے؛ کیوں کہ ''میں'' کہنے میں ایک تو جواب ادھورا رہ جاتا ہے، دوسرے اَنانیت اور تکبر کا شائبہ محسوس ہوتا ہے، اور اپنا نام وغیرہ بتانا، اپنی زبانی اپنا متواضعانہ تعارف ہوگا، دروازہ کھٹکھٹانا اور اِسی طرح گھنٹی بجادینا بھی اجازت طلب کرنے کے مفہوم میں داخل ہیں، پھر جب صاحبِ خانہ دروازے پر آئے تو پہلے اُسے سلام کیا جائے، پھر گفتگو کی جائے اور مقصدِ ملاقات بتایا جائے۔

اجازت طلب کرتے وقت کتنی مرتبہ سلام کیا جائے؟

آنے والے کو چاہیے کہ وہ اجازت طلب کرتے وقت مناسب وقفے کے ساتھ تین مرتبہ سلام کرے، اگر اجازت مل جائے تو اندر آئے؛ ورنہ دل میں کینہ وحسد اور دماغ میں شک وشبہ کے بغیر لوٹ جائے، حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

جب تم میں سے کوئی شخص تین مرتبہ اجازت طلب کرے، پھر اُسے اجازت نہ ملے تو وہ واپس لوٹ جائے۔ (ابوداؤد، رقم: ۵۱۸۰)

لَوٹنے کی وجہ: تین مرتبہ استئذان سے تقریباً یہ بات متعین ہوجاتی ہے کہ آواز سن لی گئی ہے؛ مگر صاحبِ خانہ یا تو ایسی حالت میں ہے کہ جواب نہیں دے سکتا مثلاً: نماز پڑھ رہا ہے یا بیت الخلاء میں ہے یا غسل کررہا ہے یا پھر اُس کو اِس وقت ملنا منظور نہیں؛ پس ایسی حالت میں جمے رہنا اور مسلسل دستک دیتے رہنا مصلحت کے خلاف ہے؛ بلکہ باعثِ ایذا ہے، جس سے بچنا واجب ہے۔
(معارف القرآن: ۶/۳۹۲)

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

جب کوئی دوسرے کے گھر آئے تو اُسے داخل ہونے کے لیے تین مرتبہ اجازت مانگنا چاہیے، ہر بار یوں کہے: السلام علیکم، کیا اندر آسکتا ہوں؟ اور ہر مرتبہ اتنی دیر رکے کہ کھانا کھانے والا کھانے سے، وضو کرنے والا وضو سے اور نماز پڑھنے والا چار رکعت نماز پڑھ کر فارغ ہوجائے، پھر اگر اجازت ملے تو داخل ہو، ورنہ حِقد وعداوت کا خیال بھی نہ لائے اور واپس چلا جائے، اور جس نے کسی کو بلانے کے لیے بھیجا ہو جب وہ آئے تو اجازت ضروری نہیں ہے۔ (ردالمحتار:۹/۵۹۲)

خالی گھر میں داخل ہوتو سلام کیسے کرے؟

اگر کوئی ایسے گھر میں یا ایسی جگہ میں آئے، جہاں کوئی شخص موجود نہیں ہے تو یوں سلام کرنا چاہیے: السلامُ عَلَینَا وعَلیٰ عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ؛ کیوں کہ وہاں فرشتے اور نیک قسم کے جن ہوتے ہیں، یہ سلام انہیں کو ہوگا؛ اور حقیقت میں یہ ایک دعا ہے، جیسا کہ تشہد میں ہے، یہ سلام تحیہ نہیں ہے؛ اِسی لیے اِس میں لفظِ خطاب نہیں ہے(۱) اور اگر ایسے گھر میں جانے کی نوبت آئی، جہاں سب غیر مسلم ہیں تو وہاں بھی السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین کہہ سکتے ہیں۔ (أوجز:۱۷/۲۰۶)

چھُپ کر مت بیٹھیے

کسی کے پاس جاؤ تو سلام سے یا کلام سے، یا روبرو بیٹھنے سے؛ غرض کسی طرح سے اُس کو اپنے آنے کی خبر دو اور بدون اطلاع کے آڑ میں ایسی جگہ مت بیٹھو کہ اُس کو تمہارے آنے کی خبر نہ ہو؛ کیوں کہ شاید وہ کوئی ایسی بات کرنا چاہے جس پر تم کو مُطّلع نہ کرنا چاہے، تو بدون اُس کی رضا کے اُس کے راز پر مُطَّلع ہونا بری بات ہے۔ (آداب المعاشرت:۴۶۷، مع اصلاحی نصاب)

---

(۱) ردالمحتار:۹/۵۹۷

پانچواں باب

المُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ المُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِه ويَدِه

(بخاري، رقم:۱۰)

ممنوعاتِ سلام

(پہلی فصل)

ایسی جگہیں جہاں سلام کرنا منع ہے یا مکروہ ونا جائز ہے

عبادت ومعاشرت کسی کی تکلیف کا ذریعہ نہ بنے

بوقتِ ملاقات ایک دوسرے کو سلام کرنا باہمی الفت ومحبت کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شرعی تقاضہ بھی ہے؛ اور شرعی چیزوں میں دوسروں کی راحت واطمینان کا بہت خیال رکھا گیا ہے، اسلام نے ہر اُس چیز پر پابندی لگائی ہے، جو کسی کی تکلیف اور خلل کا ذریعہ بنے، شارع نے اپنے قول وفعل سے اِس کا اہتمام فرمایا ہے کہ کسی شخص کی کوئی عبادت، معاملہ اور معاشرت، کوئی حرکت وسکون یا کوئی بھی حالت کسی کی تکلیف، وحشت، اِنقباض، تکدُّر اور خلل کا ذریعہ نہ بنے؛ بالخصوص بابِ معاشرت کے تحت جتنے احکام آتے ہیں، آپ اُن کا بغور جائزہ لیں گے تو ایک بات جو بنیادی طور سے معلوم ہوگی، وہ یہ کہ اپنے فعل سے خواہ وہ جائز ہو یا مستحب یا پھر فرض وواجب، کسی کو تکلیف نہیں ہونی چاہیے، اور تکلیف کا مفہوم بہت وسیع ہے، تکلیف کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا ہے کہ قصداً کسی کا جانی ومالی نقصان کردیا جائے؛ بلکہ تکلیف کے مفہوم میں خلل، انقباض اور وحشت وخوف بھی داخل ہے، اِس سلسلے میں حضرت تھانویؒ کی ''آداب المعاشرت'' کا مطالعہ ہر مسلمان شخص کو کرنا چاہیے، حضرت نے بڑی حکیمانہ بحث کی ہے۔

سلام کی کثرت واشاعت کی شریعت نے ترغیب دی ہے، اس میں تکرار کو محمود قرار دیا گیا ہے؛ لیکن چند مواقع ایسے ہیں جہاں شریعت نے سلام کرنے سے منع کردیا ہے، اور کچھ مواقع ایسے ہیں جہاں فقہاء نے سلام کرنے سے منع کیا ہے اور دونوں کی مشترکہ علت وہی ہے ''کسی کو تکلیف نہ پہنچے''

فقہاءِ احناف نے جن مواقع پر سلام سے منع کیا ہے، اُن کے پیشِ نظر جو علت ہے (جو بہت اہم ہے) اُس کو سامنے رکھا جائے تو فقہاء احناف کی علمی گہرائی وگیرائی کا اندازہ ہوتا ہے، یہ علت جن حضرات سے مخفی رہی یا وہ سطحی علم کے مالک ہیں، انہوں نے فقہاء احناف پر اعتراض کیا ہے کہ دیکھیے شریعت نے اِفشاءِ سلام کا حکم دیا ہے اور یہ لوگ (فقہاء احناف) منع کرتے ہیں؛ نمونہ دیکھنا ہو تو ''سلام کے احکام وفضائل'' نامی کتاب کا مطالعہ کریں، مولفِ کتاب نے اپنی کتاب کے دوسرے حصے کو صرف احناف پر بیجا اعتراضات کے لیے ہی خاص کیا ہے، کاش وہ اس دقیق علت کو جو بابِ معاشرت کی روح ہے، سمجھتے۔

چوں کہ اب ایسے مواقع کا تذکرہ کرنا مقصود ہے، جہاں سلام کرنا مکروہ وممنوع ہے؛ اِس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت تھانویؒ کی بات جو حکمت سے پُر ہے اور جو ایک اصول کی حیثیت رکھتی ہے، اور جس سے بابِ معاشرت کے بے شمار مسائل حل ہوتے ہیں، یہاں نقل کر دی جائے؛ تاکہ اُس کی روشنی میں ممنوعات سلام کا سمجھنا آسان ہو، مولف راقم الحروف کا جی تو یہ چاہتا ہے کہ ازاول تا آخر پوری بحث نقل کر دی جائے؛ لیکن طوالت کا خوف، مانع ہے، اختصار پیش ہے۔

> حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں جگہ فراخ کرو، تو جگہ کو فراخ کر دیا کرو اور تم سے کہا جائے کہ کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو جایا کرو۔ (مجادلہ:۱۱) اور ارشاد ہے: کہ دوسرے کے گھر میں (گو وہ مردانہ ہو؛ مگر خلوت گاہ ہو) بے اجازت لیے مت جایا کرو۔ (نور: ۲۷) دیکھیے اس میں اپنے جلیسوں کی راحت کی رعایت کا کس طرح حکم فرمایا ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

> حضرت سعید بن مسیّب سے مرسلاً مروی ہے کہ: عیادت میں بیمار کے پاس زیادہ نہ بیٹھے، تھوڑا بیٹھ کر ہی جلد اٹھ کھڑا ہو (ابوداؤد) اِس حدیث میں کس قدر دقیق رعایت ہے، اِس امر کی کہ کسی کی

گرانی کا سبب بھی نہ بنے؛ کیوں کہ بعض اوقات کسی کے بیٹھنے سے مریض کو کروٹ بدلنے میں یا پاؤں پھیلانے میں یا بات چیت کرنے میں، ایک گونہ تکلُّف ہوتا ہے، جس کے بیٹھنے سے اُس کو راحت ہو وہ اِس سے مستثنیٰ ہے...........

اور سنن نسائی میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ شب برأت کو حضورﷺ بستر پر سے آہستہ سے اٹھے اور اِس خیال سے کہ حضرت عائشہ سوتی ہوں گی، بے چین نہ ہوں، آہستہ سے نعل مبارک پہنے اور آہستہ سے کواڑ کھولے اور آہستہ سے باہر تشریف لے گئے اور آہستہ سے کواڑ بند کیے، اس میں سونے والے کی کس قدر رعایت ہے کہ ایسی آواز یا کھڑکا بھی نہ کیا جائے جس سے سونے والا دفعتاً جاگ اٹھے اور پریشان ہو۔

اور صحیح مسلم میں حضرت مقداد بن اسودؓ سے ایک طویل قصے میں مروی ہے: کہ ہم رسول اللہﷺ کے مہمان تھے اور آپ ہی کے یہاں مقیم تھے، بعد عشاء اگر لیٹ رہتے، حضور اقدسﷺ دیر میں تشریف لاتے تو؛ چوں کہ مہمانوں کے سونے اور جاگنے دونوں کا احتمال ہوتا تھا؛ اس لیے سلام تو کرتے تھے کہ شاید جاگتے ہوں اور ایسا آہستہ سلام کرتے کہ اگر جاگتے ہوں تو سُن لیں اور اگر سوتے ہوں تو آنکھ نہ کھلے، اِس سے بھی وہی اہتمام معلوم ہوا جو اس سے پہلی حدیث میں معلوم ہوا تھا اور بکثرت حدیثیں اِس باب کی موجود ہیں، روایات فقہیہ میں ایسے شخص کو جو طعام وغیرہ یا درس یا اوراد میں مشغول ہو سلام نہ کرنا مُصَرَّح ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بلا ضرورت کسی مشغولِ شغلِ ضروری کے قلب کو

منتشر کرنا شرعاً ناپسند ہے، اسی طرح گندہ ذہنی کے مرض میں جو شخص مبتلا ہو اُس کو مسجد میں نہ آنے دینا بھی فقہاء نے نقل کیا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی اذیت کے اَسباب کا اِنسداد نہایت ضروری ہے، اِن دلائل میں مجموعی طور پر نظر کرنے سے بدلالت واضحہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے نہایت درجہ پر اس کا خاص طور سے اہتمام کیا ہے کہ کسی شخص کی کوئی حرکت، کوئی حالت، دوسرے شخص کے لیے ادنیٰ درجہ میں بھی کسی قسم کی تکلیف واذیت یا ثقل وگرانی، یا ضیق وتنگی یا تکدر واِنقباض یا کراہت وناگواری یا تشویش وپریشانی یا توحُّش وخلجان کا سبب ومُوجِب نہ ہو، اور شارع علیہ السلام نے اپنے قول اور اپنے فعل ہی سے صرف اس کے اہتمام کرنے پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ خدام کے قلتِ اِعتنا (لاپرواہی) کے موقع پر ان آداب کے عمل کرنے پر بھی مجبور فرمایا اور ان سے کام لے کر بھی بتلایا ہے؛ چناں چہ ایک صحابی ایک ہدیہ لے کر آپ کی خدمت میں بدون سلام اور بدون استئذان داخل ہوگئے، آپ نے فرمایا باہر واپس جاؤ، ''السلام علیکم کیا میں حاضر ہوں'' کہہ کر پھر آؤ اور فی الحقیقت حسنِ اخلاق مع الناس کا راس واَساس ایک امر ہے کہ کسی سے کسی کو کلفت وایذا نہ پہنچے جس کو حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت جامع الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (بخاری، رقم:۱۰) اور جس امر سے اذیت ہو گو وہ صورت خدمتِ مالی ہو یا جانی ہو یا ادب وتعظیم ہو جو عرف میں حُسن خلق سمجھا جاتا ہے؛ مگر اس حالت میں وہ سب سوءِ خُلق میں داخل ہے؛

کیوں کہ راحت، کہ جانِ خُلق ہے مقدم ہے، خدمت پر کہ پوستِ خُلق ہے اور قِشر بلا لُب (چھلکا بغیر مغز کے) کا بے کار ہونا ظاہر ہے......(آداب المعاشرت در اصلاحی نصاب، ص:۴۶۴)

ایک اصولی بات

حضرتؒ کے افادات میں ہے:

فقہاء نے لکھا ہے کہ جس وقت کوئی دوسری طرف مشغول ہو تو اُس وقت سلام نہ کرے اور مشغولی کی تین صورتیں لکھی ہیں: یا تو معصیت میں مشغول ہو یا اطاعت (عبادت) میں یا کسی حاجتِ طبعیہ میں، تینوں صورتوں میں منع کیا ہے: اول میں اہانت کے لیے، دوسری اور تیسری صورت میں حرج کی وجہ سے۔ (اسلامی تہذیب:۶۴)

اِس تفصیل کو ذہن میں رکھ کر ذیل کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں:

مسجد میں سلام کرنا

مسجد حق تعالیٰ کی عبادت کی جگہ ہے، مُناجات ویکسوئی کا مقام ہے، دل دنیا سے کاٹ کر، اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ کرنے کا خصوصی مرکز ہے؛ لہٰذا ایسا کوئی طریقہ جو یکسوئی اور مناجات میں خلل کا ذریعہ ہو اُسے ممنوع ہونا چاہیے، ایسا عمل جو نمازیوں کے بے قراری اور بے توجہی کا سبب ہو اُسے مکروہ ہونا چاہیے؛ چناں چہ فقہاء احناف نے اِسی علت کے پیشِ نظر کہا: کہ مسجد میں بلند آواز سے سلام کرنا مکروہ ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

جو لوگ مسجد میں پڑھنے، تسبیح وذکر کرنے کے لیے یا نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوں، وہ ملاقات کرنے والوں کے لیے نہیں بیٹھے ہیں؛ اس لیے یہ سلام کرنے کا موقع نہیں ہے؛ چناں چہ انہیں سلام نہ کیا جائے، اور اگر آنے والے نے سلام کردیا

تو اُس کے سلام کا جواب نہ دینا درست ہے۔ (ہندیہ: ۳۲۵/۵)

اور سلام کا یہ مکروہ ہونا اُس وقت ہے؛ جب کہ سارے لوگ نماز میں مشغول ہیں؛ لیکن اگر کچھ لوگ تو سُنن ونوافل وغیرہ میں مشغول ہیں اور کچھ لوگ جماعت کے انتظار میں بیٹھے ہیں تو سلام کرنے اور نہ کرنے: دونوں کا اختیار ہے، اگر سلام نہ کرے تو تارکِ سنت نہیں کہلائے گا۔

إن دخل مسجداً وبعض القوم في الصلاة وبعضهم لم يكونوا فيها، يُسلم و إن لم يسلم لم يكن تاركا للسنة. (ردالمحتار: ۹/۵۹۲)

ترمذی نے باب: کیف السلام کا باندھا ہے اور اُس باب میں حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کی ہے، جس کا مضمون ہے کہ حضور ﷺ رات کو گھر تشریف لائے تو اس طرح سلام کیا کہ سونے والے بیدار نہ ہوجائیں۔ (رقم: ۲۷۲۱) اس باب کی تشریح میں مفتی سعید احمد صاحب لکھتے ہیں:

> یہی حکم اُس وقت ہے؛ جب کہ کوئی نماز پڑھ رہا ہو اور کوئی خالی ہو تو اِس طرح سلام کرے کہ نمازی کو تشویش نہ ہو۔ (تحفۃ الالمعی: ۶/۴۹۴)

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

> جب لوگ سنن ونوافل یا اذکار میں مشغول ہوں تو جاتے وقت سلام کرنا مکروہ ہے، لوگوں کو خلل ہوگا۔ (محمودیہ: ۹/۸۰)

مسجد میں کوئی نہ ہو تو؟

لیکن اگر مسجد میں کوئی نہیں ہے، تو داخل ہوتے وقت السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین کہہ سکتے ہیں؛ کیوں کہ رہائشی گھروں میں یہ حکم ہے کہ وہاں اگر کوئی نہیں ہے تب مذکورہ الفاظ میں سلام کرے، تو خدا کے گھر میں یہ حکم بدرجہ اولیٰ ہوگا؛ کیوں کہ مساجد میں فرشتوں کا ہونا ظاہر واغلب ہے۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

ولو دخل ولم یر أحدا یقول: السلام علینا وعلی عباد

اللہ الصالحین؛ فیکون مسلما علی الملائکۃ الذین معہ وصالحي الجن الحاضرین وغیرھم. (ردالمحتار:۹/۵۹۷)

خلاصۂ کلام

مسجد میں سلام کرنا مطلقاً منع نہیں ہے؛ بلکہ اُس صورت میں منع ہے جب اُن لوگوں کو مخاطب بنا کر سلام کیا جائے جو کہ قرآن کی تلاوت یا تسبیح میں مشغول ہیں، یا نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

مسجد سے نکلتے وقت، جبکہ کوئی نہ ہو سلام کرنا؟

مسجد میں داخل ہوتے وقت سلام کرنا ثابت ہے؛ لیکن مسجد سے نکلتے وقت السلام علینا الخ کہنا کسی کتاب میں ثابت نہیں۔ (محمودیہ:۹/۷۹)

انفرادی طور سے سلام کرنا

جب علت یہ ہے کہ نمازی کو خلل نہ ہو، ایسی صورت میں اگر یہ علت نہ پائی جائے تو سلام کر سکتے ہیں، مثلاً: مسجد کے دروازے سے صف تک پہنچنے کے دوران، انفرادی طور سے کسی سے ملاقات ہو جائے تو آہستہ سے سلام ومصافحہ میں کوئی حرج نہیں، یا مسجد میں داخل ہوئے، وضو خانے میں کسی کو سلام کر لیا تو یہ مکروہ نہیں ہے۔ (مولف)

مسجد میں داخل ہو یا نکلے تو حضور ﷺ پر سلام پڑھنا چاہیے

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہوا کرے تو نبی کریم ﷺ پر سلام بھیجا کرے پھر یوں کہا کرے: اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ (اے میرے اللہ میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے) اور جب مسجد سے نکلا کرے تب بھی نبی کریم ﷺ پر سلام بھیجا کرے اور یوں کہا کرے: اللھم افتح لي أبواب فضلك (اے اللہ میرے لیے اپنے فضل (روزی) کے دروازے کھول دے) (ابوداؤد، رقم:۴۶۵، باب فیما یقولہ الرجل عند دخولہ المسجد)

معلوم ہوا کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت اور مسجد سے نکلتے وقت حضور ﷺ پر سلام بھی بھیجنا چاہیے، اور سلام یوں بھیجے السلام علی رسول اللہ.

زادالسعید میں ہے:

مسجد میں جانے اور اُس سے باہر آنے کے وقت حدیث شریف
میں یہ پڑھنا آیا ہے: بسم الله والسلام علی رسول الله.

(ص:۵۵۸،اصلاحی نصاب)

کیا سلام ومصافحہ کر لینے سے تحیۃ المسجد فوت ہو جاتا ہے؟

حافظ ابن قیمؒ نے اور اُن کی تقلید میں دوسرے لوگوں نے یہ بات کہی ہے: کہ مسجد میں داخل ہونے والے کے لیے مستحب یہ ہے کہ پہلے تحیۃ المسجد پڑھے، پھر اہلِ مسجد کو سلام کرے؛ کیوں کہ تحیۃ المسجد خالق کا حق ہے، اور سلام مخلوق کا حق ہے؛ لہٰذا اِس موقع پر اللہ کا حق مقدم ہوگا اور اُس کی دلیل میں حدیث مسیئ فی الصلاۃ پیش کی ہے کہ حضور ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک دیہاتی قسم کا آدمی مسجد میں داخل ہوا، اُس نے نماز پڑھی پھر وہ آیا اور حضور ﷺ کو سلام کیا، حضور نے کہا "وعلیك" جاؤ پھر سے نماز پڑھو (ترمذی، رقم:۳۰۳)

ابن قیمؒ لکھتے ہیں: کہ آپ نے نماز کا انکار کیا، لیکن سلام میں تاخیر پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔

(زادالمعاد:۲/۳۷۷)

لیکن یہ رائے جمہور کی رائے کے خلاف ہے اور محلِ نظر ہے؛ کیوں کہ دوسری احادیث میں اس کے علاوہ صورتیں ثابت ہیں، مثلاً موطا میں باب جامع السلام رقم الحدیث: ۱۷۳۰ کے تحت تین آدمیوں کا تذکرہ ہے کہ وہ مجلس میں آئے اور آکر دونوں نے سلام کیا، اسی طرح بخاری ومسلم وغیرہ میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ غزوہ تبوک سے واپس ہوئے تو مسجد میں آکر دو رکعتیں پڑھنے کے بعد بیٹھ گئے، لوگ آتے گئے فجئته فلما سلَّمتُ علیه تَبَسَّم تبسُّمَ المغْضَب، پھر میں آیا، میں نے حضور ﷺ کو سلام کیا، تو غصہ والی مسکراہٹ ظاہر فرمائی۔ (بخاری، رقم:۴۴۱۸)

اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں داخل ہونے والے کی ملاقات اگر لوگوں سے ہو جاتی ہے، تو یہ اُن کو سلام کر سکتا ہے (بشرطیکہ لوگوں کو خلل نہ ہو) پھر تحیۃ المسجد پڑھنا چاہے تو پڑھ

سکتا ہے، اور اگر لوگوں سے سامنا نہ ہو اور لوگ کسی کونے میں یا دوسری طرف بیٹھے ہوں تو اپنی نماز (خواہ تحیۃ المسجد ہو یا کوئی اور نماز) پڑھے پھر ضرورت ہو تو جا کر اُن سے ملاقات کرے، نیز فقہاء نے یہ تو لکھا ہے کہ زیادہ دیر بیٹھنے کی وجہ سے تحیۃ المسجد فوت ہو جاتا ہے، یہ کسی نے نہیں لکھا ہے کہ سلام کرنے سے تحیۃ المسجد فوت ہو جاتا ہے۔

بندوں کا رب المسجد کو سلام کرنے کا طریقہ

مسجد میں داخل ہونے کے بعد اگر کوئی مانع نہ ہو تو بیٹھنے سے پہلے تحیۃ المسجد کی دو رکعت پڑھنی چاہیے، یہ بندوں کا رب المسجد کو سلام کرنے کا طریقہ ہے۔(۱) (تحفۃ الالمعی: ۱۳۳/۲)

---

(۱) تحیۃ المسجد سے متعلق چند مسائل: جو شخص مسجد میں پہنچ کر بیٹھ جائے، پھر کھڑا ہو، اور دو رکعت پڑھے تو یہ بھی تحیۃ المسجد ہے، بیٹھنے کی وجہ سے تحیۃ المسجد فوت نہیں ہوتا؛ البتہ زیادہ دیر تک بیٹھنے سے تحیۃ المسجد کا وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور تھوڑے اور زیادہ وقت کی تعیین، رائے مبتلی بہ پر چھوڑ دی گئی ہے، صحیح ابن حبان میں حضرت ابوذر ؓ کی یہ حدیث ہے کہ ایک مرتبہ وہ تحیۃ المسجد پڑھے بغیر بیٹھ گئے آں حضور ﷺ نے دریافت فرمایا أرکعت رکعتین کیا تم نے تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھ لیں؟ حضرت ابوذر نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا قم فارکعهما اٹھو اور دو رکعتیں پڑھو، صحیح ابن حبان میں اس حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے، بیٹھنے سے تحیۃ المسجد کا وقت فوت نہیں ہوتا۔ (تحفۃ الالمعی: ۱۳۲/۲)

اور جو شخص عصر یا فجر کے بعد یا اوقات ثلاثہ ممنوعہ میں مسجد پہنچے تو وہ تحیۃ المسجد نہ پڑھے، اس طرح اگر جماعت شروع ہو گئی ہو یا شروع ہونے والی ہو تو بھی تحیۃ المسجد نہ پڑھے۔ (ایضا)

جو شخص خطبہ جمعہ کے دوران آئے وہ تحیۃ المسجد نہ پڑھے، خطبہ سننا ضروری ہے۔ (تحفۃ الالمعی: ۳۷۸/۲)

نوٹ: حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ صاحب نے تحیۃ المسجد کی تین حکمتیں لکھی ہیں: إنما شرع ذلك: لأن ترك الصلاة — إذا حل بالمكان المُعدّ لها — ترة وحسرة وفيه ضبط الرغبة في الصلاة بأمر محسوس، وفيه تعظيم المسجد.

رحمۃ اللہ الواسعہ میں اِس کی شرح میں ہے:

پہلی وجہ: یہ ہے کہ مسجد میں پہنچ کر بھی - جو کہ خاص نماز ہی کے لیے تیار کی گئی ہے - نماز میں مشغول نہ ہونا محرومی اور افسوس کی بات ہے۔

دوسری وجہ: مسجد میں آدمی فرض نماز ادا کرنے کے لیے پہنچتا ہے اور تحیۃ المسجد ایک محسوس چیز کے ذریعہ فرض کی رغبت متعین کرنے کے لیے مشروع کی گئی ہے، یعنی دو رکعتیں پڑھنے سے فرض کی رغبت محسوس ہو کر سامنے آجائے گی۔

تیسری وجہ: یہ ہے کہ یہ مسجد کے احترام کے لیے ہے، مسجد کو اللہ تعالیٰ سے ایک خاص نسبت ہے اور اِسی وجہ سے اِس کو خانہ خدا کہتے ہیں، پس اِس کا یہ حق ہے کہ اس کا احترام کیا جائے اور تحیۃ المسجد اسی حق کی ادائیگی کے لیے ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ: ۳۵۳/۳)

نوٹ: غالباً اسی تیسری وجہ سے مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری زید مجدہ نے یہ تعبیر نکالی ہے کہ تحیۃ المسجد، رب المسجد کو بندوں کی طرف سے سلام ہے، یہ ایک دل کو لگنے والی اچھی تعبیر ہے، فجزاه الله وحفظه، مولف۔

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی مسجد میں آئے تو چاہیے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھے۔ (ترمذی، رقم: ۳۲۶)

قضائے حاجت میں مشغول شخص کو سلام کرنا

سلام اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، اللہ کا نام پاک ہے؛ لہٰذا پیشاب، پاخانے اور گندی جگہوں میں سلام کرنا فقہاء احناف کے نزدیک مکروہ ہے؛ لہٰذا پیشاب و پاخانہ میں مشغول شخص کو سلام کرنا مکروہ ہے؛ اور اگر کسی نے سلام کر دیا تو زبان سے جواب دینا ضروری نہیں ہے۔

کراہت کے دلائل: حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے: کہ نبی کریم ﷺ پیشاب کر رہے تھے، (اسی دوران) ایک آدمی آپ کے پاس سے گذرا فسلّم علیہ اُس نے آپ کو سلام کیا، حضور ﷺ نے (فراغت کے بعد) اُس سے کہا: جب تم مجھے اِس طرح کی حالت میں دیکھو تو سلام مت کیا کرو فإنك إن فعلتَ ذاك لم أرد عليك اگر تم نے (آئندہ) ایسا کیا تو میں جواب نہیں دوں گا۔ (ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۵۲)

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: کہ ایک شخص کا گذر حضور ﷺ کے پاس سے ہوا آپ اُس وقت پیشاب کر رہے تھے، اُس شخص نے سلام کیا، حضور ﷺ نے جواب نہیں دیا۔ (مسلم، رقم: ۸۲۳، باب التیمم)

معلوم ہوا کہ قضاء حاجت میں مشغول شخص کو سلام کرنا جائز نہیں ہے، اور سلام کا جواب دینا بھی ضروری نہیں ہے اور جواب نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قضاء حاجت کے وقت عام گفتگو مکروہ ہے؛ بلکہ ایک حدیث میں اسے اللہ کی ناراضگی کا سبب بتایا گیا ہے۔(۱) تو سلام جو خدا کا نام اور اس کا ذکر ہے وہ تو بدرجہ اولیٰ مکروہ ہوگا۔ (بذل المجهود: ۱/۲۲۱)

البتہ ایسے وقت میں کوئی سلام کا جواب اپنے دل میں دے دے تو کوئی حرج نہیں، زبان سے منع ہے۔ (ہندیہ: ۵/۳۶۶)

---

(۱) ابوداؤد، رقم: ۱۵.

کیا بے وضو سلام کا جواب دینا مکروہ ہے؟

احناف کے نزدیک حالتِ حدث میں یعنی بے وضو سلام کرنا یا سلام کا جواب دینا مکروہ نہیں ہے؛ لیکن اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں، کچھ سے جواز اور کچھ سے عدمِ جواز معلوم ہوتا ہے۔

حضور ﷺ استنجے سے فارغ ہو کر بیر جَمَل کی طرف سے آرہے تھے، آپ مدینے کی ایک گلی سے گذر رہے تھے کہ ایک شخص نے سلام کیا، آپ نے جواب نہیں دیا، جب وہ شخص نظروں سے اوجھل ہونے کے قریب ہو گیا تو آپ نے تیمّم کر کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: أما إنه لم يمنعني أن أرد عليك إلا أني كنت لست بطاهر یعنی بے وضو ہونے کی وجہ سے میں نے جواب نہیں دیا۔ (طحاوی:۱/۶۸)

حضرت مہاجر بن قنفذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کہ وہ حضور ﷺ کے پاس آئے جب کہ آپ پیشاب کر رہے تھے تو انہوں نے سلام کیا تو آپ نے جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ وضو فرمایا، پھر آپ نے (اُن کے طِیبِ خاطر کے لیے) معذرت کی؛ کہ میں نے پسند نہیں کیا کہ میں بلا وضو (بلا طہارت) اللہ کا ذکر کروں۔ (ابوداؤد، رقم:۱۷)

ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ بلا وضو سلام کا جواب نہیں دینا چاہیے؛ کیوں کہ یہ سلام ایک ذکر ہے اور ذکر باوضو ہونا چاہیے، بہ ظاہر یہ حدیثیں اصل مسئلہ کے خلاف ہیں؛ لیکن دوسری طرف ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بے وضو اللہ کا ذکر جائز ہے؛ لہٰذا سلام وجوابِ سلام بھی جائز ہونا چاہیے، مثلاً: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: كان يذكر الله على كل أحيانه (ابوداؤد: رقم ۱۸)

اس حدیث کی شرح میں بذل نامی کتاب میں ہے: المراد من عموم الأحيان حالة الطهر والحدث، سواء كان الحدث أصغر أو أكبر إلا أن الأكبر يحجزه عن قراءة القرآن وأما الحدث الأصغر فلا يمنعه عن تلاوة القرآن وغيرها من الأذكار. (بذل المجهود:۱/۲۲۷)

مطلب یہ ہوا کہ حضور ﷺ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے تھے، اِس کے عموم میں بے وضو ہونے کی حالت بھی داخل ہے؛ ان کے علاوہ اور بھی حدیثیں ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا وضو ذکر جائز ہے؛ لہٰذا روایتوں میں تطبیق ضروری ہے۔

تطبیق اور حل: عام حالات میں تو آپ بے وضو اللہ کا ذکر کرتے تھے؛ حتیٰ کہ افضل الذکر قرآن کی تلاوت بھی کرتے تھے؛ البتہ جنابت کی حالت میں تلاوت نہیں کرتے تھے، اور سلام بھی ایک ذکر ہے؛ پس سلام کا جواب بھی بے وضو دیتے ہوں گے اور اوپر والی روایتوں کی جہاں تک بات ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ بے وضو جواب نہیں دینا چاہیے، تو اِس کی توجیہ یہ ہے کہ حضور ﷺ پر اس موقع پر خاص حالت طاری تھی، جس کی وجہ سے آپ نے بے وضو اللہ کا ذکر نا پسند کیا، سلام کا جواب بھی نہیں دیا؛ کیوں کہ سلام اللہ کی صفت ہے؛ پس وہ بھی ذکر ہے۔

(۲) یا یہ کہ یہ استحباب اور افضلیت پر محمول ہے کہ اگر کوئی سلام کا جواب وضو یا تیمّم کر کے دے تو افضل ہے؛ کیوں کہ سلام ایک ایسا ذکر ہے جو کسی وقت کے ساتھ مختص نہیں ہے؛ لہٰذا اگر جواب کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو جوابِ سلام کو تھوڑی دیر مؤخر کر سکتے ہیں؛ تا کہ افضل طریقے سے جواب دیا جا سکے؛ ہاں اگر جواب کے فوت ہونے کا امکان ہو مثلاً: سلام کرنے والا کہیں جا رہا ہے یا کسی اور کام میں مشغول ہونے والا ہے تو بے وضو جواب دینا ضروری ہے۔

(۳) تیسری بات یہ حضرت مہاجر بن قنفذ رضی اللہ عنہ کی روایت اور اس جیسی دوسری روایتیں جزئی واقعات ہیں، اُن میں عموم نہیں ہے، اِسی لیے حضور ﷺ نے "کَرِهْتُ" فرمایا ہے، اگر بے وضو ذکر نہ کرنے اور سلام کا جواب نہ دینے کا دائمی معمول ہوتا تو آپ "أَکْرَہُ" فرماتے،

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: بذل المجھود: ۱/۲۲۵، معارف السنن: ۱/۳۲۱، تحفۃ الألمعی: ۱/۳۵۱، الأذکار للنووي: ۲۸۷۔

پیشاب سے فارغ ہو کر ڈھیلا وغیرہ استعمال کرتے وقت سلام کرنا

مسئلہ: جو شخص پیشاب سے فارغ ہو کر ڈھیلا، پتھر اور اینٹ وغیرہ سے استنجاء کر رہا ہو تو اسے سلام

کرنا درست ہے یا نہیں اور اگر کوئی سلام کردے تو جواب دے سکتا ہے یا نہیں؟ مولانا یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں: فلم يثبت فيه من القدماء شيء کہ یہ مسئلہ متقدمین کی کتابوں میں نہیں ہے؛ البتہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں: کہ جواب دے سکتا ہے اور مظاہر علوم کے بانی شیخ محمد مظہر نانوتویؒ منع کرتے تھے۔ (معارف السنن: ۱/۳۱۷)

مفتی سعید احمد پالن پوری دامت برکاتہم لکھتے ہیں: ہم حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے ساتھ ہیں؛ کیوں کہ جب ستر کھلا ہوا نہیں ہے تو جواب دینے میں کوئی حرج نہیں۔ (تحفۃ الالمعی: ۱/۳۵۲)

تطبیق کی صورت: اور تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جس وقت قطرہ آرہا ہے اس وقت جواب نہ دے، اور جب محض احتیاط کے لیے ڈھیلا رکھا ہے تو جواب دے دے۔ (محمودیہ: ۹/۸۲)

امداد الفتاویٰ میں ہے: سوال: استنجا کرتے وقت سلام کرنے یا سلام کا جواب دینے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: فقہاء نے پیشاب کرتے وقت سلام کرنے کو مکروہ لکھا ہے، استنجا کرتے وقت اگر تقاطرِ بول یعنی پیشاب کے قطرے گرتے ہوں تو اس حکم کی رو سے اس وقت بھی سلام مکروہ ہے اور اگر تقاطر بول نہ ہو تو پھر بھی بے ادبی سے خالی نہیں؛ اِس لیے ایسے مواقع پر سلام کرنے سے اجتناب کیا جائے اور اگر کوئی سلام کرے تو استنجا کے بعد جواب دے؛ کیوں کہ سلام کے جواب میں تاخیر جائز ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ۱/۸۹، کتاب الطہارۃ)

لیکن دوسری جگہ حضرت نے مطلقاً جائز لکھا ہے:

سوال: (۳۶۱) استبراء کرتے وقت سلام کا جواب دینا یا خود سلام کرنا چاہیے یا نہیں، حدیث شریف میں تو إذا يبول (۱) کا لفظ آیا ہے پھر لوگ استنجاء کرتے وقت سلام کا جواب کیوں نہیں دیتے، آیا یہ اُن کی غلط فہمی ہے یا کچھ اصل بھی ہے، علاوہ بریں حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے

---

(۱) غالباً اس حدیث کی جانب اشارہ ہے: عن ابن عمر قال: مرّ رجل على النبي صلى الله عليه وسلم وهو يبول، فسلم عليه فلم يرد عليه. مسلم، رقم: ۸۲۳، المصنّف: ۶/۱۳۹

کہ حائضہ بھی سلام کرتیں اور سلام کا جواب دیتی تھیں، اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقاطر مانع تحیت (سلام کو روکنے والا) نہیں۔

الجواب: في الدر المختار: أول باب مفسدات الصلاة: سلامك مكروه على من ستسمع إلى قوله فهذا ختام والزيادة تنفع. اِن اَبیات میں مواضع کراہت سلام کو شمار کیا ہے؛ مگر اس میں یہ حالت معدود نہیں اور تامُّل سے اور بھی کوئی دلیل منع کی نہیں؛ پس ظاہراً یہ بلا سند محض رسم پڑ گئی ہے۔ والله تعالیٰ أعلم وعلمه أتم (امداد الفتاوی:۴/۲۷۹)

وضو کرنے والے کو سلام کرنا

بعض فقہاء حنابلہ کے نزدیک وضو کرنے والے کو سلام کرنا مکروہ ہے۔(۱)؛ لیکن فقہاء احناف کہتے ہیں: کہ وضو کرنے والے کو سلام کرنا جائز ہے، کراہت کی کوئی وجہ نہیں۔

مفتی محمود صاحبؒ لکھتے ہیں:

”وضو کرنے والے کو سلام کرنا درست ہے، وضو کے دوران بعض غیر منقول دعائیں، فقہاء کرام نے ذکر کی ہیں؛ اگر کوئی وہ دعائیں دورانِ وضو پڑھ رہا ہے تو سلام نہ کرے؛ لیکن عموماً لوگ دعائیں نہیں پڑھتے ؛ اِس لیے سلام کر سکتے ہیں“ (فتاوی محمودیہ:۹/۷۵)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

وضو کے درمیان سلام کرنے یا اس کے جواب دینے کی ممانعت، حدیث وفقہ کی کتابوں میں مجھے صراحتاً نہیں مل سکی، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی رکاوٹ بھی پیدا نہیں ہوتی؛ اس لیے اسے ممنوع نہیں ہونا چاہیے۔ (کتاب الفتاوی:۶/۱۱۸)

---

(۱) الآداب الشرعیۃ لابن مفلح:۱/۳۳۵.

غسل کرنے والے کو سلام کرنا

بہتر تو یہ ہے کہ غسل کرنے والا کسی کو سلام نہ کرے اور نہ ہی کوئی اُسے سلام کرے اور اگر کسی نے غسل کرنے والے کو سلام کر ہی دیا تو جوابِ سلام واجب تو نہیں ہے؛ لیکن جواب دے دے تو برا بھی نہیں؛ ہاں کوئی ننگے غسل کر رہا ہے تو سلام و جوابِ سلام دونوں منع ہیں۔

دکتور وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: ویکرہ السلام في الحمام (الفقہ الإسلامي: ۲۶۸۵/۴)

عموماً فقہاء نے یہی لکھا ہے کہ غسل کرنے والے کو سلام کرنا مکروہ ہے، ان سب کے برخلاف ایک روایت یہ ہے۔

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: میں فتح مکہ کے دن آپ کے پاس گئی، میں نے آپ کو نہاتے ہوئے پایا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کپڑے سے آپ کو چھپائے ہوئے تھیں، ام ہانی کہتی ہیں: میں نے سلام کیا، آپ نے پوچھا (ظاہر ہے پہلے جواب دیا ہوگا) من ھذہ؟ کون ہے؟ میں نے عرض کیا: میں ام ہانی ہوں، آپ نے فرمایا: مرحباً بأم ھاني ام ہانی کو میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ (ترمذی: ۲۷۳۶)

مفتی شبیر احمد قاسمی صاحب نے اِس واقعہ کی روشنی میں کراہت ہی کو ثابت کیا ہے؛ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

> فتح مکہ کے موقع پر آپ غسل فرما رہے تھے، اُسی موقع پر حضرت ام ہانیؓ نے آپ کو باہر سے سلام کیا، اِس پر حضور ﷺ کی طرف سے مرحباً بأم ھانی کے الفاظ کہنا واضح ہے؛ مگر آپ کی طرف سے سلام کے جواب کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، آپ نے سلام کا جواب دیا تھا یا نہیں؟ اور اگر دیا تھا تو تعارف اور موانست سے پہلے دیا تھا یا بعد میں؟ اس کا کوئی تذکرہ نہیں؛ بلکہ حقیقت اور صحیح بات یہ ہے کہ جب کوئی آدمی غسل کرنے لگے تو اس دوران باہر سے سلام کرنا ممنوع ہے اور اگر کوئی سلام کرے گا تو مستحقِ جواب نہیں ہوتا، اور حضرت ام ہانی کو

سلام کے آداب اور ضابطہ معلوم نہیں تھا اور سلام کے مسائل اور طریقہ
سب اُس وقت اُن کے لیے بالکل نئے تھے، اُن کو معلوم نہیں تھا کہ
غسل کے وقت سلام کرنا ممنوع ہے؛ حالاں کہ غسل کرتے وقت
سلام شرعاً ممنوع ہے اور اُس سلام کا جواب بھی نہیں دینا چاہیے۔
(انوارِ رحمت، ص:۱۲۶)

لیکن مولف کے نزدیک یہ تفصیل و تطبیق بہتر معلوم ہوتی ہے کہ غسل کرنے والے کو سلام کرنا اس وقت مکروہ ہونا چاہیے جب وہ ننگے غسل کر رہا ہو، عضوِ مخصوص پر کپڑا نہ ہو، اور اگر وہ پردے سے غسل کر رہا ہے تو ضرورۃً سلام کرنا جائز ہونا چاہیے اور غسل کرنے والا جواب بھی دے سکتا ہے، علامہ ابن نجیمؒ نے لکھا ہے: جو شخص غسل کر رہا ہو اور مخصوص اعضاء کھلے ہوئے ہوں تو اُسے سلام کرنا مکروہ ہے۔

ويكره أن يسلم على من هو في الخلاء ولا يرد عليه السلام
وكذا في الحمام إن كان مكشوف العورة. (البحر الرائق:۲۳۶/۸)

معلوم ہوا کہ جسم پر کپڑے ہوں تو سلام اور جوابِ سلام میں کوئی حرج نہیں ہے، حضرت ام ہانیؓ کے واقعہ کی روشنی میں یہی قول مناسب معلوم ہوتا ہے، اور حضور ﷺ کے جسم پر کپڑوں کا ہونا واضح اور ظاہر ہے؛ اِسی لیے حضرت ام ہانیؓ نے سلام کیا؛ مزید براں یہ کہ حضور ﷺ نے ام ہانیؓ کے طرزِ عمل پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔

کیا نمازی کو سلام کرنا صحیح ہے؟

اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے تو اُسے سلام نہ کیا جائے، اسے سلام کرنا فقہاءِ احناف کے نزدیک مکروہ تنزیہی ہے؛ کیوں کہ نماز اللہ تعالیٰ سے قرب کا ذریعہ ہے اور حدیث میں ہے کہ انسان نماز اس طرح پڑھے جیسے وہ خدا کو دیکھ رہا ہے یا کم از کم ایسے پڑھے کہ اس کا خیال یہ ہو کہ اگرچہ وہ خدا کو نہیں دیکھ رہا ہے؛ لیکن خدا اُسے دیکھ رہا ہے یعنی اِستغراقی کیفیت نماز میں مطلوب ہے، اب اگر جیسے عام لوگوں کو سلام کرنا مشروع ہے، ویسے ہی نمازی کو سلام کرنے کا حکم دے دیا جائے تو اس کی وجہ سے نمازی کو خلل ہو سکتا ہے، اس کے استغراق وانہاک کی کیفیت ختم ہو سکتی ہے، خشوع

وخضوع متأثر ہوسکتا ہے، ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

كراهة ابتداء السلام على المصلي؛ لكونه ربما شغل بذلك فكره واستدعى منه الرد وهو ممنوع منه.(۱)
(فتح الباری:۳/۱۱۳)

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ میں نبی کریم ﷺ کو سلام کیا کرتا تھا، جب کہ آپ نماز میں ہوتے تھے؛ چناں چہ جب ہم (حبشہ سے) واپس آئے تو میں نے حضور ﷺ کو سلام کیا تو آپ نے جواب نہیں دیا اور فرمایا إن في الصلاة شغلا. (بخاری، رقم:۱۲۱۶)

إن في الصلاة شغلا کی شرح میں ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

کہ بے شک نماز میں ہونا سلام کرنے سے مانع ہے اور علامہ طیبیؒ کے حوالے سے لکھا ہے: کہ مطلب یہ ہے کہ نماز کی مشغولیت تو قرأت قرآن، تسبیح اور دعا ہے، کلام وگفتگو نہیں، یا اِس کا مطلب یہ ہے کہ نماز ایک بہت ہی عظیم الشان مصروفیت ومشغولیت ہے؛ کیوں کہ یہ مُناجات مع اللہ کا ذریعہ اور استغراق فی اللہ کا سبب ہے؛ لہٰذا کسی اور چیز کی مشغولیت اچھی بات نہیں ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح:۳/۵)

بخاری کی مذکورہ حدیث نقل کرکے شارح بخاری علامہ عینی حنفیؒ نے لکھا ہے:

وفيه: كراهة السلام على المصلي یعنی اس حدیث سے فائدے کے طور پر معلوم ہوا کہ نمازی کو سلام کرنا مکروہ ہے۔ (عمدۃ القاری:۵/۶۲۴)

اور علامہ نوویؒ نے بھی نمازی کو سلام کرنا مکروہ لکھا ہے۔ (الأذکار:۲۸۷)

اور امام مالکؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ (فتح الباری:۳/۱۱۳)

البتہ امام احمدؒ اور جمہور کی رائے ابن حجرؒ نے عدم کراہت کی نقل کی ہے۔ (ایضا)

---

(۱) شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی صاحبؒ، ابن حجرؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں: أن المستغرق في العبادة يسقط عنه الرد، جب جواب ساقط ہوجاتا ہے تو سلام نہ کرنا بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگا، اوجز:۱۷/۱۹۲

کیا نمازی اشارے سے سلام کا جواب دے سکتا ہے؟

نمازی کو سلام کرنا مکروہ ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص نمازی کو سلام کر ہی دے تو کیا وہ جواب دے سکتا ہے؟ اِس پر تو ائمہ کا تقریباً اتفاق ہے کہ نماز میں سلام کا جواب الفاظ کے ساتھ دینا جائز نہیں؛ بلکہ اگر کوئی نماز میں وعلیکم السلام کے ذریعہ جواب دے تو نماز فاسد ہو جائے گی(۱) پھر اس پر بھی اتفاق ہے کہ اشارے سے سلام کا جواب دینا مفسدِ صلاۃ نہیں ہے یعنی وہ اشارہ سمجھ لیا جائے یا نہ سمجھا جائے اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی؛ کیوں کہ یہ عمل قلیل ہے۔

مذاہب ائمہ کی تحقیق

اشارے سے جواب دینے کے سلسلے میں ائمہ کے اقوال میں بڑا اختلاف ہے: علامہ عینیؒ نے ابن بطالؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے: کہ حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ تینوں کے نزدیک اشارے سے سلام کا جواب دینا مکروہ ہے، اور امام مالکؒ کے دو قول ہیں: ایک قول کراہت کا ہے (عمدۃ القاری:۵/۶۲۲)

جب کہ علامہ نوویؒ نے الاذکار میں اور ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں اشارے سے جواب دینے کو مستحب لکھا ہے۔ (الأذکار ۲۸۸/زاد المعاد ۳۸۳)

نیز اعلاء السنن میں ہے کہ اشارے سے سلام کا جواب دینا مستحب ہے وبه قال الشافعي ومالك وأحمد وأبو ثور. (اعلاء السنن:۵/۴۱)

مولانا عبدالحیؒ صاحبؒ نے التعلیق الممجد میں امام شافعیؒ کا مذہب استحباب رد ہی لکھا ہے اور امام احمدؒ کا یہ لکھا ہے: کہ ان کے نزدیک فرض ونفل میں فرق ہے، یعنی فرض میں مکروہ اور نفل میں

---

(۱) ایک مسئلہ: ایک شخص نماز میں کسی کا نام لے کر اس کو سلام کرتا ہے؛ لیکن وہ آدمی سامنے نہیں ہے، نہ اسے کچھ پتہ ہے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، دورِ اول میں لوگ التحیات میں احباب واعزہ کا نام لے کر، اُن پر سلام بھیجتے تھے اور قرآن کریم میں ہے: سلٰمٌ علٰی إل یاسن، سلام علی موسی وهارون؛ مگر وہاں کوئی مخاطب نہیں ہوتا؛ اس لیے یہ کلام الناس نہیں؛ پس نماز فاسد نہ ہوگی، کلام الناس ہونے کے لیے ضروری ہے کہ کسی سے خطاب ہو، تو نماز فاسد ہوگی، اور نبی علیہ ﷺ نے قنوت نازلہ میں کفار کے قبائل کے نام لیے ہیں اور کمزور مسلمانوں کے نام لے کر ان کی نجات کے لیے دعا کی ہے؛ پس معلوم ہوا کہ یہ کلام الناس نہیں، تحفۃ القاری:۳/۵۲۳، در شرحِ حدیثِ بخاری، رقم:۱۲۰۲۔

جائز ہے اور حنفیہ کا مذہب یہ لکھا: کہ بعض ان میں کراہت کے قائل ہیں اور بعض حنفیہ کہتے ہیں: لا بأس یعنی کوئی حرج نہیں (التعلیق المجد)

خلاصہ: امام صاحب کے یہاں اشارے سے جواب دینا مکروہ ہے اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز ہے اور یہی قرینِ قیاس بھی ہے کہ جب ان کے نزدیک نمازی کو سلام کرنا جائز ہے تو جواب بھی جائز ہونا چاہیے، اور ہمارے نزدیک جب سلام کرنا ہی مکروہ ہے تو اشارے سے جواب دینا بھی مکروہ ہوگا۔

دلائل: حنفیہ کا مستدل اس سلسلے میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی وہ روایت ہے جو پیچھے گذری ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں نماز کے اندر اس طرح کی حرکات جائز تھیں، بعد میں اس واقعہ سے منسوخ ہوگئیں اور امام طحاوی کا رجحان یہ ہے کہ کلام فی الصلاۃ کے نسخ کے ساتھ، اشارے سے سلام کا جواب دینا بھی منسوخ ہوگیا۔ (درس ترمذی:۱۳۸/۲)

ائمہ ثلاثہ کا مستدل بہت سی روایتیں ہیں مثلاً: ترمذی نے باب ماجاء في الإشارة في الصلاة کے تحت دو روایتیں ذکر کی ہیں، تفصیل کے لیے اعلاء السنن دیکھیں، حنفیہ نے ان سب روایات کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ: یہ ممکن ہے کہ اشارہ سے مراد سلام سے منع کرنا ہو۔

خلاصہ بحث: عموماً احناف کی کتابوں میں اشارے سے سلام کے جواب کو مکروہ لکھا ہے؛ لیکن بعض فقہاء احناف مثلاً: ابن ہمامؒ، علامہ حلبیؒ اور ابن نجیمؒ وغیرہ نے عدم کراہت کا قول بھی اختیار کیا ہے۔

ذكر ابن نجيم نقلا عن العلامة الحلبي: وفعله عليه الصلاة والسلام لها؛ إنما كان تعليما للجواز فلا يوصف بالكراهة.

آپ ﷺ کا اشارے سے جواب دینا جواز کی تعلیم کے لیے تھا؛ لہٰذا اس فعل کو مکروہ نہیں کہا جائے گا۔ البحر الرائق:۱۰۹/۲، مزید تفصیل کے لیے فتح القدیر:۴۲۳/۱ اور شامی:۳۷۴/۲ کا مطالعہ کریں، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اشارے سے سلام کے جواب دینے کے سلسلے میں دونوں طرح کے اقوال ہیں، اس باب میں مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کی رائے یہ ہے:

البتہ فرض نماز میں مجبوری کے بغیر کوئی اشارہ نہیں کرنا چاہیے؛ کیوں کہ وہ بارگاہ خداوندی کی خاص ملاقات ہے اور نوافل چوں کہ پرائیویٹ ملاقات ہیں؛ اس لیے ان میں اشارہ کرنے کی گنجائش ہے۔ (تحفۃ الالمعی :۲/۱۹۵)

اذان، تکبیر یا جماعت کے وقت سلام کرنا

بقول علامہ شامیؒ کے: جو شخص اذان دے رہا ہو یا اقامت کہہ رہا ہو، اُسے سلام کرنا مکروہ ہے، اِسی طرح اگر کسی نے اِن اوقات میں سلام کردیا تو جواب دینا بھی مکروہ ہے۔ (ردالمختار:۲/۳۷۴)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

اذان واقامت کی حالت میں سلام کا جواب دینا مکروہ ہے اور فراغت کے بعد جواب دینا صحیح قول کے مطابق واجب نہیں ہے۔

(ہندیہ:۱/۵۵)

اذان یا تکبیر یا جماعت ہورہی ہو تو اُس وقت مسجد میں داخل ہونے والے کو چاہیے کہ سلام نہ کرے؛ لیکن اگر وہ سلام کرے تو جو شخص فارغ ہو یعنی اذان یا تکبیر نہیں کہہ رہا ہے اور جماعت یا نماز نہیں پڑھ رہا ہے وہ جواب دے دے۔ (کفایت المفتی:۹/۹۲)

جوابِ اذان کے وقت سلام کا حکم

جب اذان ہوتی ہے تو کلماتِ اذان سن کر جواب دینا چاہیے، اگر کوئی کلماتِ اذان سن کر جواب دے رہا ہو اور حالت وقرائن سے جواب دینا معلوم ہو تو ایسے شخص کو سلام کرنا چاہیے یا نہیں؟ مفتی محمود صاحبؒ لکھتے ہیں:

اذان کے وقت سلام کا جواب دینا واجب نہیں؛ کیوں کہ جوابِ اذان ذکر ہے اور ذکر ودعا وتسبیح وغیرہ کی حالت میں اگر سلام کیا

جائے تو اُس کا جواب واجب نہیں ہوتا؛ لیکن جوابِ اذان سے
فارغ ہوکر سلام کا جواب دینا مناسب ہے اور جو شخص جوابِ اذان
میں مشغول ہو اُس کو سلام کرنا مکروہ ہے۔ (محمودیہ:۱۹/۷۴)

تلاوت کرنے والے کو سلام کرنا

تلاوت، درحقیقت کلامِ خداوندی کا پڑھنا ہے، قرآن میں تدبُّر، بالخصوص مضامینِ آخرت، دعوتی پہلو، اُمَمِ سابقہ کے واقعات اور انجام، خدا کی وحدانیت اور مقصد تخلیقِ بنی آدم کے مضامین میں غور وفکر کرنا مطلوب ومقصود ہے؛ اگر کوئی قرآن کی تلاوت ایسی استغراقی کیفیت کے ساتھ کررہا ہو یا ایسی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کررہا ہے اور احوال وقرائن اُس پر دال ہوں، تو ایسے شخص کو سلام کرنا مکروہ ہے، فقہاء نے بوقتِ تلاوت، سلام کو مکروہ لکھا ہے، اِس کا مصداق ومطلب یہی ہے، اور اگر احوال وقرائن سے معلوم ہوجائے کہ اس شخص کے اندر وہ کیفیت نہیں ہے یا اُس کو سلام کرنے سے اُس کا کوئی حرج نہیں ہوگا تو سلام کرسکتے ہیں۔

ویکرہ السلام عند قراءۃ القرآن جھراً. (عالمگیری:۵/۳۲۵)

ویکرہ علی تالٍ للقرآن. (الفقہ الإسلامي:۴/۲۶۸۵)

اور اگر کسی نے سلام کرہی دیا تو تلاوت کرنے والا جواب دے یا نہ دے، اس سلسلے میں فقہاء کہتے ہیں: کہ جواب دے دے چاہے تلاوت سے فراغت کے بعد یا آیت مکمل ہونے کے بعد۔ (ردالمحتار:۹/۵۹۵)(۱)

چناں چہ ایک روایت میں ہے:

حضرت عقبہ ابن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم مسجد میں بیٹھے

(۱) اور اب اگر دوبارہ تلاوت شروع کرے تو صرف أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھ کر تلاوت شروع کرنی چاہیے؛ لیکن لوگ اِس مسئلے سے غافل ہیں؛ بالخصوص عورتیں بہت کوتاہی کرتی ہیں، دورانِ تلاوت، سلام کا جواب یا کسی سے گفتگو کرنے کے بعد دوبارہ تلاوت شروع کرنے سے پہلے أعوذ باللہ نہیں پڑھتیں، اِصلاح کرنی چاہیے، مرقاۃ:۹/۵۸.

قرآن پڑھ رہے تھے، رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس آئے، فَسلَّم علینا فرَدَدْنا علیه السلامَ آپ نے ہمیں سلام کیا، ہم نے آپ کو سلام کا جواب دیا۔ (السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۸/۵)

حضرت تھانویؒ کی اصولی بات

ادب: جب کسی کے پاس ملنے یا کچھ کہنے جاؤ اور اُس کو کسی شُغل کی وجہ سے فرصت نہ ہو مثلاً: قرآن مجید کی تلاوت کررہا ہے، یا وظیفہ پڑھ رہا ہے یا قصداً مقامِ خلوت میں بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے یا سونے کے لیے آمادہ ہے یا قرائن سے اور کوئی ایسی حالت معلوم ہو، جس سے غالباً اس شخص کی طرف متوجہ ہونے سے اس کا حرج ہوگا یا اس کو گرانی و پریشانی ہوگی، ایسے وقت میں اُس سے کلام وسلام مت کرو یا تو چلے جاؤ اور اگر بہت ہی ضرورت کی بات ہو تو مخاطب سے پہلے پوچھ لو کہ کچھ کہنا چاہتا ہوں، پھر اجازت کے بعد کہہ دے اس سے تنگی نہیں ہوتی اور یا فرصت کا انتظار کرو، جب اس کو فارغ دیکھو مل لو۔ (آداب المعاشرت دراصلاحی نصاب: ۴۶۶)

ذکر کرنے والے کو سلام کرنا

ذکر ایک ایسی عبادت ہے جس سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے، لسان ذاکر اور قلبِ شاکر، فلاحِ دارین کا سبب ہیں؛ لیکن ذکر کی یہ خاصیت من کل الوجوہ اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب زبان وقلب، بوقتِ ذکر ایک دوسرے سے مربوط ہوں، اور اس ارتباط کے لیے استغراقی کیفیت نہایت ضروری چیز ہے، اب اگر کوئی ایسی استغراقی کیفیت کے ساتھ مصروفِ ذکر ہو، تو اسے سلام کرکے خواہ مخواہ توجہ دوسری جانب مبذول کرانا، مکروہ ہے، بعض ذاکرین آنکھ بند کرکے ذکر کرتے ہیں، بعض کے اذکار عددی ہوتے ہیں، اگر انہیں سلام کریں گے تو ڈرنے اور عدد بھول جانے کا خطرہ ہے، اس لیے انہیں سلام نہ کرنا مناسب ہے۔ (۱)

---

(۱) عبادت خواہ وہ ذکر ہو یا قرآن کی تلاوت یا نماز وغیرہ ان اوقات میں سلام کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص حاکم کے پاس بیٹھا ہو، اُس سے باتیں کررہا ہو اور ایک شخص اُس کو اپنی طرف مشغول کررہا ہو تو کیا یہ خلافِ ادب نہ ہوگا، اسلامی تہذیب: ۶۲.

ويكره السلام......على ذاكر الله تعالٰى. (الفقہ الإسلامي:۴/۲۶۸۵)

فيكره السلام على مشتغل بذكر الله تعالىٰ بأي وجه كان. (ردالمحتار:۱/۶۱۶، باب مايفسد الصلاة)

اور ایسے ذاکرین کو کوئی سلام کر ہی دے تو اگر خلل نہ ہو تو جواب دے سکتے ہیں، اگر جواب نہ دیں تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

حكي عن الشيخ الإمام الجليل أبي بكر محمد بن الفضل البخاري أنه كان يقول فيمن جلس للذكر أي ذكر كان: فدخل عليه داخل وسلّم عليه، وسعه أن لا يرد، كذا في المحيط. (ہندیہ:۵/۳۲۶)

کھانا کھانے والے کو سلام کرنا

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: يكره على عاجز عن الرد حقيقة كآكل، ظاهره أن ذلك مخصوص بحال وضع اللقمة في الفم، وأما قبلُ وبعدُ: فلا يكره لعدم العجز. (ردالمحتار:۹/۵۹۵)

جو شخص سلام کا جواب دینے پر حقیقتاً قادر نہ ہو اُسے سلام کرنا مکروہ ہے، مثلاً کھانا کھانے والا؛ لیکن یہ کراہت خاص ہے اِس صورت کے ساتھ کہ لقمہ منھ میں ہو؛ اگر لقمہ منھ میں نہیں ہے تو سلام کرنا مکروہ نہیں ہے۔

کھانا کھانے والے کو سلام کرنا فی نفسہ مکروہ نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کوئی قباحت ہے، کراہت کی علت اور وجہ یہاں بھی وہی ہے جو ماقبل میں گذری ہے؛ یعنی کسی کو خلل اور تکدّر نہ ہو؛ اس سلسلے میں فقہاء نے جتنی صورتیں لکھی ہیں ان کو اسی نقطہ نگاہ سے دیکھنا چاہیے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ عموماً اس موقع پر لوگوں میں سلام وجواب کا رواج ہے، اور رواج کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں کو، کوئی تکلیف نہیں ہوتی؛ اگر کہیں احوال وقرائن سے معلوم ہو کہ کھانا کھانے والے کو سلام کریں گے تو اُسے ذہنی اذیت ہوگی تو اب سلام کرنا مکروہ ہوگا، فقہاء کا بیان کردہ یہ مسئلہ درحقیقت باب

معاشرت کا ایک ادبی پہلو ہے، جس نے اسے سمجھا، اس نے صحیح سمجھا اور جس نے اس علت کو نہیں سمجھا، اس نے اس مسئلہ کا مذاق اڑایا؛ علم الگ چیز ہے اور تحقیقی علم الگ چیز ہے۔

فتاویٰ عالمگیری کا ایک مسئلہ

مَرّ علی قوم یأکلون؛ إن کان محتاجا وعرف أنهم یدعونه، سلَّم وإلا فَلَا کذا في الوجیز للکردري.

کسی کا ایسے لوگوں پر گذر ہو، جو کھانا کھا رہے ہوں اگر اسے کھانے کی شدید حاجت ہو اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ لوگ بلالیں گے تو سلام کرے ورنہ نہیں۔ (ہندیہ ۵/۳۲۵)

اس مسئلہ کو بھی بابِ معاشرت سے جوڑ کر دیکھنا چاہیے، سطحی طور سے مسئلہ کو دیکھیں گے تو عجیب وغریب لگے گا؛ کہ بھوکا ہے تو سلام کرے اور بھوکا نہیں ہے تو سلام نہ کرے؛ لیکن اگر مسئلہ کے دوسرے پہلو پر غور کریں تو فقہاء کی ذہانت کی داد دیں گے، اسلامی معاشرہ میں مل جل کر رہنا، ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونا، ایک دوسرے کی دل جوئی کرنا، ایک دوسرے پر احسان کرنا، ایک دوسرے کی جانی اور مالی مدد کرنا وغیرہ جیسی صفات کی بڑی اہمیت ہے، اِس مسئلہ کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔

ایک شخص جس کے گھر میں فاقہ ہے، شدید بھوک کا احساس ہے، لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا اُس کی غیرت وحمیت کے خلاف ہے، اس کا گذر کچھ ایسے مخلص اور نیک مسلمانوں کے پاس سے ہوا، جو کھانا کھا رہے ہیں جن کے بارے میں یہ قرائن واَحوال سے معلوم ہے کہ یہ لوگ یوثرون علی أنفسهم کے مصداق ہیں، دوسروں کو کھلا کر انہیں بہت سکون ملتا ہے، ایسے لوگوں کو سلام کرنے کا حکم ہے؛ تاکہ ان کی توجہ اِس غریب کی جانب ہو اور یہ لوگ اُسے بھی شریکِ طعام کرلیں، بتایئے اِس میں کیا قباحت ہے۔

اور اگر گذرنے والا بھوکا نہیں ہے یا بھوکا ہے؛ لیکن احوال وقرائن سے معلوم ہے کہ کھانا کھانے والے صرف اپنی سوچتے ہیں، انہیں اپنے پیٹ کی فکر ہے، یا کھانا اتنی کم مقدار میں ہے کہ

کسی ایک کا ہی پیٹ بھر سکتا ہے، تو ان صورتوں میں سلام نہ کرنا ایک اخلاقی فریضہ ہے، گذرنے والا بھوکا نہیں ہے، اس نے سلام کیا، اب خواہ مخواہ کھانا کھانے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے گا، وہ لوگ اسے کھانے پر بلائیں گے، یہ انکار کرے گا اِس بنا پر کہ اُسے کھانے کی ضرورت نہیں، وہ اِصرار کریں گے اس بنا پر کہ اسے شریکِ طعام کرنا ایک اخلاقی بات ہے، اب خواہ مخواہ ایک الجھن پیدا ہوگی؛ لہٰذا اسلام ہی نہ کرے، بلکہ انتظار کرے؛ جب وہ کھانے سے فارغ ہو جائیں تو مل لے۔

اگر وہ بھوکا ہے؛ لیکن اُسے معلوم ہے کہ یہ لوگ اُسے بلائیں گے نہیں، یا کھانا بہت کم مقدار میں ہے، پہلی صورت میں سلام کرنا، اس کی بے عزتی اور غیرت کا مذاق اڑانے کے مترادف ہوگا، خواہ مخواہ اس کی مفلسی اور بے بسی و بے کسی، دوسروں کے سامنے رسوا ہوگی، اور دوسری صورت میں دونوں بھوکے رہ جائیں گے، نیز ایثار کا حکم تو دونوں کو ہے، ایثار یہی گذرنے والا ہی کیوں نہ اختیار کرلے۔

موجودہ معاشرہ کے اعتبار سے، اس مسئلے کی نوعیت کو سمجھنا ذرا مشکل ہے، اولاً ایثار وخلوص کا فقدان ہے، ثانیاً لوگ اپنے گھروں میں کھانا کھاتے ہیں، ثالثاً دینی علم کی کمی ہے اور پچھلے زمانوں میں عموماً یہ سب باتیں نہیں تھیں اور غالباً یہ فقہی مسئلہ، سفر کا ہے، جس میں کوئی مسافر کبھی اس صورت حال سے دوچار ہو جاتا تھا، بتایئے فقہاء کا بیان کردہ یہ جزئیہ عقل وشرع کے خلاف ہے یا عین موافق ہے، کسی بھی مسئلہ کے ایک پہلو کو نہیں؛ بلکہ تمام پہلوؤں کو دیکھنا چاہیے۔

مولف نے قصداً اس تفصیل کو ذکر کیا ہے؛ کیوں کہ ہمارے کچھ بھائیوں نے فقہاء احناف کے بیان کردہ اس جزئیہ پر بہت واویلا مچایا ہے، کاش انہیں اس تفصیل سے اطمینان ہو جائے۔

مسئلہ: جہاں بے تکلف دوست واحباب کھانا کھا رہے ہوں یا گھر کے افراد کھانا کھا رہے ہوں، یا رتبے اور عمر میں چھوٹے کھانا کھا رہے ہوں، ایسی جگہوں میں یہ تفصیل نہیں ہے؛ بلکہ سلام کر سکتے ہیں، کوئی حرج نہیں۔

دعاؤں میں مشغول شخص کو سلام کرنا

سلام کرنا مسنون عمل ہے؛ لیکن اگر سلام کرنے سے کسی کی دل جمعی اور توجہ اِلی اللہ میں فرق آجائے، تو سلام نہ کرنا بہتر ہے؛ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے دعا کررہا ہے، انہماک واستغراق کی کیفیت طاری ہے، جو دعا میں مطلوب ہے، دل خدا کی جانب مائل ہے، دنیا ومافیہا سے بے خبر ہے، ایسے شخص کو سلام نہ کرنا بہتر ہے۔ علامہ شامیؒ نے اس کی تصریح کی ہے، علامہ نوویؒ نے لکھا ہے:

أما إذا كان مشتغلاً بالدعاء، مستغرقا فيه، مُجمع القلب عليه......والأظهر عندي في هذا: أنه يكره السلام عليه؛ لأنه يتنكد به. (الأذکار:۲۸۷)

تلبیہ پڑھنے والے کو سلام کرنا

جن مواقع پر سلام کرنا مکروہ ہے، اُن میں سے ایک موقع یہ بھی ہے کہ جو حاجی، حج یا عمرہ کا تلبیہ (اللهم لبيك، اللهم لبيك، لا شريك لك لبيك الخ پڑھنے میں مشغول ہے تو اسے سلام کرنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ سلام کرنے سے اس کی توجہ، اللہ کی جانب سے ہٹ جائے گی، نیز جواب دے گا تو تلبیہ موقوف کرنا پڑے گا، اور یہ مکروہ ہے۔ (الأذکار:۲۸۷)

قاضی، مفتی، امیر اور افسر کو سلام کرنا

اسلامی مملکت میں قاضی، مفتی، حاکم اور افسران کو بڑی اہمیت حاصل ہے، ان کی وجہ سے نظامِ مملکتِ اسلامی، چست ودرست رہتا ہے، ان کی غفلت وسستی، قوم کو ہلاک وبرباد کردیتی ہے، اور آج بھی جہاں اسلامی حکومتیں نہیں ہیں، وہاں حاکم وافسران تو نہیں ہیں؛ لیکن قاضی ومفتی ہر جگہ ہوتے ہیں، فقہاء نے اُن کے کام کی اہمیت ونزاکت کو دیکھتے ہوئے سلام وجوابِ سلام کے مسائل لکھے ہیں۔

جب قاضی دارالقضاء میں اپنی جگہ فیصلے کے نمٹارے کے لیے بیٹھ جائے اور قضا سے متعلق کاموں میں مصروف ہوجائے تو اب وہ نہ کسی کو سلام کرے اور نہ ہی کسی کے سلام کا جواب

دے، یہاں بھی سلام و جوابِ سلام کی کراہت لغیرہ ہے، کہ کام اور یکسوئی میں خلل نہ ہو، ظاہر سی بات ہے کہ اگر وہ سلام و جوابِ سلام میں مصروف ہوگا تو سلام کے بعد مصافحہ اور خیر خیریت کی بھی نوبت آتی ہے، اس میں وقت لگے گا، نیز کبھی سلام و جوابِ سلام کی وجہ سے کسی ایک جانب جھکاؤ کی تہمت لگ جاتی ہے، غیر جانب داری کا الزام لگ جاتا ہے؛ کیوں کہ سلام ومصافحہ مسکراہٹ وبشاشت کے ساتھ کرنا چاہیے اور بسا اوقات مسکرانا باعثِ الزام ہوجاتا ہے؛ اسی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ قاضی کی توجہ دونوں فریق کی طرف برابر ہونی چاہیے، ہاں اگر ایسی کیفیت نہیں ہے، یا سلام ومصافحہ عرفاً الزام وتہمت کا سبب نہیں سمجھا جاتا، لوگوں کے دلوں میں اِس موقع پر اس کا خیال بھی نہیں آتا، تو سلام و جوابِ سلام میں کوئی حرج نہیں؛ بشرطیکہ قضا کے کاموں میں خلل نہ ہو۔

وإذا جلس القاضي ناحية من المسجد للحكم، لا يسلم على الخصوم، ولا يسلمون عليه؛ لأنه جلس للحكم، والسلام تحية الزائرين: فينبغي أن يشتغل بما جلس لأجله، وإن سلموا لا يجب عليه الرد. (ردالمحتار:۹/۵۹۵)

ہاں جب قاضی دارالقضا میں آرہا ہے، اور دارالقضا میں پہلے سے کچھ لوگ موجود ہیں، دارالقضا کے ملازم ہوں یا فریقین ہوں، اس وقت قاضی سلام کرتے ہوئے داخل ہوگا، اور یہ سلام مسنون ہے، اس کی ممانعت نہیں ہے، حضرت شریح قاضی تھے، ان کا طرزِ عمل یہی تھا۔

ويسلم على الخصوم، إذا دخلوا المحكمة؛ لأن السلام من سنة الإسلام، وكان شريح يسلم على الخصوم؛ لكن لا يخص أحد الخصمين بالتسليم عليه دون الآخر، وهذا قبل جلوسه في مجلس الحكم. (بدائع الصنائع:۵/۴۵۱)

یہی مسئلہ اور یہی حکم مفتی کے بارے میں ہے، وہ دارالافتاء آرہا ہے تو بیٹھنے سے پہلے دارالافتاء میں موجود لوگوں کو سلام کرسکتا ہے، فتویٰ نویسی میں مشغول ہوگیا، اب سلام و جوابِ سلام کو ترک کردے؛ تاکہ افتاء کا کام نہ رکے۔

رہ گئے حکمراں اور افسران، اگر یہ لوگ رعیت وعوام کے معاملات کی دیکھ ریکھ اور لوگوں

سے ملاقات کے لیے کہیں بیٹھیں تو لوگ انہیں سلام کر سکتے ہیں، اور یہ لوگ بھی سلام کر سکتے ہیں، جواب دے سکتے ہیں؛ کیوں کہ وہ زیارت وملاقات کے لیے بیٹھے ہیں، اور ایسے وقت میں سلام مسنون ہے، اور یہی لوگ اگر فیصلہ کرنے کے لئے کہیں بیٹھیں تو اب سلام وجواب مکروہ ہوگا اور اگر قاضی زیارت وملاقات کے لیے بیٹھے تو سلام وجواب مکروہ نہیں ہوگا۔ (بدائع الصنائع: ۵/۴۵۱)

اور مکروہ ہونے کا مطلب یہاں یہ نہیں ہے کہ اگر قاضی، مفتی وغیرہ کو کوئی سلام کر دے تو قصداً وہ جواب نہیں دیں گے؛ بلکہ اگر وہ جواب دے دیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ (ایضا)

خطبہ جمعہ سے پہلے خطیب سلام کرے یا نہ کرے؟

ملا علی قاریؒ نے، علامہ نوویؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ: امام یا خطیب خطبہ شروع کرنے سے پہلے یا دورانِ خطبہ سلام نہ کرے؛ کیوں کہ اگر سلام کرے گا تو حاضرینِ جمعہ کو جواب دینا پڑے گا؛ حالاں کہ اُس وقت انہیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اس وقت کا فریضہ خطبۂ جمعہ کو بغور سننا ہے، اور اگر امام یا خطیب نے ممانعت کے باوجود سلام کر ہی دیا تو کیا حاضرین پر جواب دینا ضروری ہے یا نہیں؟ اِس سلسلے میں دو رائے ہیں: جن حضرات کے نزدیک خطبہ جمعہ بغور سننا واجب ہے، اُن کے نزدیک سلام کا جواب دینا ضروری نہیں ہے، اور جن حضرات کے نزدیک اِنصات (خاموش رہنا) سنت ہے، اُن کی رائے کے مطابق حاضرین جمعہ میں سے کوئی ایک آدمی جواب دے سکتا ہے، ملا علی قاریؒ نے اِس کے بعد لکھا ہے:

> المعتد في مذهبنا: أن الإنصات واجب؛ فلا يجوز السلام، ولا يستحق الرد بلا كلام.
>
> یعنی فقہ حنفی میں خطبہ بغور سننا واجب ہے؛ لہٰذا خطیب کا سلام کرنا بے محل ہے؛ لہٰذا جواب دینا ضروری نہیں ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح: ۹/۵۸)

اور جب خطیب کے لیے یہ مسئلہ ہے تو دورانِ خطبہ کوئی شخص مسجد میں آئے تو وہ بھی خطیب کو سلام نہ کرے۔

وعظ وتقریر کے دوران سلام اور جوابِ سلام

وعظ وتقریر قوم کی اصلاح کے لیے ہوتی ہے؛ وہاں بھی اِنہماک ضروری ہے؛ لٰہذا دورانِ تقریر کوئی آئے تو اُسے سلام نہیں کرنا چاہیے؛ تا کہ مقرر اور واعظ اور خود سامعین کی توجہ اِدھر اُدھر نہ ہو، مضمون کا سلسلہ نہ ٹوٹے، ہاں اگر احوال وقرائن سے معلوم ہوجائے کہ سلام کرنے سے کچھ حرج نہ ہوگا تو سلام کرسکتا ہے؛ مثلاً واعظ سے ہی بہت اہم کام ہو، اُسے کچھ بتانا ہو۔

اسی طرح جہاں سامعین کا مجمع، واعظ کے انتظار میں بیٹھا ہو اور واعظ کہیں سے وعظ کے لیے آئے تو وعظ سے پہلے سامعین کو سلام کرسکتا ہے، اور اگر واعظ پہلے سے مجمع میں موجود ہے؛ لوگوں سے تعارف ہوچکا ہے تو اب سلام کرنا بے محل ہے۔

ويكره السلام.........على خطيب وواعظ، وعلى من يستمع للمذكورين.

(الفقہ الإسلامي: ۲۶۸۵/۴)

وعظ وتقریر اور کسی امر کی عام اشاعت اور اعلان سے قبل سلام حضور اکرم ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین وسلف صالحین سے ثابت نہیں، حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام سے خطبات ماثورہ ثابت ہیں، مگر اِن سے قبل سلام کہیں منقول نہیں۔ (احسن الفتاوی: ۱۳۸/۸)

دینی تعلیم، درس وتدریس کے وقت سلام کرنا

جو لوگ علمی مذاکرہ کر رہے ہوں یعنی مسائل کی گفتگو کرتے ہوں، پڑھتے پڑھاتے ہوں، یا ان میں ایک علمی گفتگو کر رہا ہو، اور باقی سن رہے ہوں، تو ان کو سلام نہ کرے، اگر کرے گا تو گنہ گار ہوگا اور اسی طرح تکبیر اور اذان کے وقت بھی (موذن یا غیر موذن کو) سلام کرنا مکروہ ہے، اور صحیح یہ ہے کہ اِن تینوں صورتوں میں جواب نہ دے۔ (اشاعتِ بہشتی زیور: ۷۴۷، گیارہواں حصہ)

ويكره السلام...... عند مذاكرة العلم وعند الأذان والإقامة، والصحيح أنه لا يرد في هذه المواضع كلها. (ہندیہ: ۳۲۵/۵)

وقد جَعَل ﷺ إفشاء السلام على كل انسان من الإسلام إلا القاضي وقت

القضاء أو المدرس وقت درسِه أو القارئ وقت قراء ته أو المصلي وقت صلاته.
(حاشیۃ الترغیب: ۴۳۲/۳)

سائل کے سلام کا جواب دینا

السائل إذا سَلَّم لا يجب رد سلامه، كذا في الخلاصة، السائل إذا أتى باب دار إنسانٍ فقال: السلام عليكم لا يجب رد السلام عليه. (ہندیہ: ۳۲۵/۵)

سلام کرنا بے شک کارِثواب ہے؛ لیکن اگر اس کا استعمال غلط جگہ ہو تو اب یہ کارِ ثواب نہیں ہوگا، عام حالات میں کوئی سائل، فقیر اور محتاج کسی کو سلام کرے تو جواب دینا واجب ہے؛ لیکن اگر وہ اپنی غربت ومحتاجگی کے اظہار کے لیے سلام کرے یا یہ سوچ کر سلام کرے کہ سلام کریں گے تو ہوسکتا ہے کچھ مل جائے گا، اب سلام کرنا بے محل ہو گیا؛ لہٰذا ایسے سلام کا جواب واجب نہیں ہے، الأمور بمقاصدها فقہ کا مشہور قاعدہ ہے، فقہ حنفی کے اِس مسئلے کو اِسی قاعدے سے جوڑ کر دیکھنا چاہیے، اِس کی بہت سی مثالیں ہیں، تفصیل کے لیے ابن نجیم کی الأشباہ والنظائر دیکھیں۔

مفتی سعید احمد صاحب لکھتے ہیں:

> سلام کا جواب دینا واجب ہے؛ مگر فقہ میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ سائل کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں؛ اِس لیے کہ اُس کا سلام بھی سوال ہے؛ مگر پیشہ ور فقیر کو بھی جھڑکنا نہیں چاہیے، دینا نہ ہو تو خوب صورت طریقہ سے ٹال دے، ارشادِ پاک: أما السائل فلا تنهر میں وہ بھی شامل ہے۔ (تحفۃ الالمعی: ۵۹۰/۲)

خرید وفروخت کے وقت سلام کرنا

آپسی لین دین، خرید وفروخت کے وقت سلام کرنا جائز ہے، اور سلام کا جواب دینا واجب ہے؛ کیوں کہ یہ کوئی ایسی مصروفیت نہیں کہ سلام یا جوابِ سلام سے کوئی حرج یا دشواری پیدا

ہو جائے۔(مرقاۃ:۹/۵۸)

لیکن اگر کوئی دوکان دار ایسا ہے، جو لوگوں کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے سلام کرتا ہے تو ایسے سلام کا جواب واجب نہ ہوگا، الأمور بمقاصدها.

سوئے ہوئے یا اونگھنے والے کو سلام کرنا

اگر کوئی شخص سو چکا ہے یا وہ سونے کے قریب ہے مثلاً اونگھ رہا ہے اور آنے والے کو اِس کا علم بھی ہے، تو سلام کرنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ سلام کرنے کی وجہ سے نیند میں خلل ہوگا، کیا پتہ دوبارہ اُسے نیند آئے یا نہ آئے، ملا علی قاریؒ نے سلام کے مواضعِ کراہت میں نائم اور ناعس کو بھی شمار کیا ہے۔

ومنها إذا كان نائما أو ناعساً. (مرقاۃ:۹/۵۸)

اور جہاں کچھ لوگ سوئے ہیں اور کچھ جگ رہے ہیں تو ایسی جگہ آہستہ سے سلام کر سکتا ہے، جیسا کہ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کی روایت میں گذرا ہے۔

برہنہ شخص کو سلام کرنا

اسلام میں سترِ عورت کی بڑی اہمیت ہے، اعضاءِ مخصوصہ کا عام حالات میں کھولنا گناہ ہے اور الحمد للہ مسلمان سترِ عورت کی پابندی کرتے ہیں؛ اگر کوئی اعضاءِ مخصوصہ کو کھلا رکھے یا جہاں تک جسم کے حصے کو چھپانا ضروری ہے، اُس کو کھولے تو اس نے ایک گناہ کا کام کیا؛ لہٰذا ایسے شخص کو سلام کرنا مکروہ ہے، شامی میں ہے:

ستر کھلے ہوئے شخص کو سلام کرنا مکروہ ہے، ظاہر یہ ہے کہ ستر کھولنا کسی ضرورت کے تحت کیوں نہ ہو۔(ردالمحتار:۱/۴۵۶)

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

گھٹنے کھلے ہوئے شخص کو سلام کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جواب لکھا ہے:

حنفیہ کے نزدیک گھٹنا عورت میں داخل ہے؛ لہٰذا جو شخص گھٹنا کھولے ہوئے ہو، وہ کاشفِ عورت ہوا، اور کاشف عورت کو سلام کرنا مکروہ ہے۔ (محمودیہ:۱۹/۸۴)

ننگے سر کو سلام کرنا

سوال: رکن الدین نامی کتاب میں ایک مسئلہ لکھا ہے کہ ننگے سر آدمی کو سلام کرنا مکروہ ہے، تو کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب: ننگے بدن کو سلام کرنا تو مکروہ ہے، ننگے سر آدمی کو سلام کرنے کی کراہیت فقہ کی معتبر کتابوں میں نہیں ملی، اب رکن الدین (۱) کے مصنف نے کس کتاب کے حوالے سے لکھا ہے معلوم نہیں۔ (فتاوی ریاض العلوم:۱/۵۵۹)

عورتوں کو سلام کرنا- جائز وناجائز کا معیار

مسئلہ: اگر محرم رشتہ دار مثلاً: ماں، بہن، خالہ، پھوپھی، ساس وغیرہ یا اپنی بیوی، بیٹی اور پوتی وغیرہ سے ملاقات ہو تو انہیں سلام کرنا جائز ہے، اسی طرح مذکورہ عورتوں کا اپنے محرم رشتہ دار مرد کو سلام کرنا جائز ہے۔ (طیبی:۹/۹)

مسئلہ: بیوی کو سلام کرنا اور خط میں لکھنا بالکل درست ہے، کوئی شبہ نہ کریں؛ بلکہ شوہر جب مکان میں آوے تو وہ خود سلام کرے، اس کا انتظار نہ کرے کہ بیوی سلام کرے گی تو جواب دوں گا۔ (محمودیہ:۱۹/۸۶)

مسئلہ: غیر محرم اور اجنبی لڑکیوں اور عورتوں کو سلام نہیں کرنا چاہیے، اور اگر کسی نے سلام کر دیا تو ان مذکورہ عورتوں کو جواب نہیں دینا چاہیے؛ البتہ دل میں جواب دینے کی گنجائش ہے؛ اِسی طرح اِن عورتوں کو، اجنبی اور غیر محرم مَردوں اور لڑکوں کو سلام نہیں کرنا چاہیے، اور اگر یہ عورتیں سلام کر دیں تو

(۱) کتاب "رکن الدین" میں بہت سے مسائل ایسے ہیں جو قرآن وحدیث وآثار صحابہ سے ثابت نہیں، وہ محض بدعت ہیں؛ اس لئے اس (کتاب) سے اجتناب کرنا چاہیے، محمودیہ:۴/۱۲۰۔

دل میں جواب دے، زبان سے جواب دینا مکروہ ہے۔ (عالمگیری:۳۲۶/۵)

مسئلہ: اگر کوئی بوڑھی عورت، کسی اجنبی مرد کو سلام کر دے، تو زبان سے جواب دینا جائز ہے۔

(طیبی:۹/۹)

عورتوں کے مجمع کو سلام کرنا

اگر کہیں عورتوں کا مجمع ہے مثلاً: جلسے جلوس یا کسی تقریب میں شرعی پردے کے ساتھ عورتیں موجود ہیں تو مرد انہیں سلام کرسکتا ہے۔ (ایضا)

ایک اصولی بحث

یاد رکھنا چاہیے کہ ہر وہ جگہ جہاں فتنۂ نفس کا خطرہ ہو یا ایک جائز کام کسی ناجائز کام کا سبب ہوسکتا ہو، شریعت نے ایسی جگہوں پر پابندی لگائی ہے کہ ایسا کام ہی نہ کیا جائے؛ تاکہ فتنہ یا اندیشۂ فتنہ کا دروازہ مسدود ہوجائے، اور پاک وصاف اسلامی معاشرہ وجود میں آئے، دیکھیے سلام فی نفسہ ثواب کا کام ہے؛ لیکن جہاں فتنہ کا اندیشہ ہے؛ شریعت نے منع کر دیا اور جہاں فتنہ یا فتنہ کا اندیشہ نہ ہو وہاں جائز رکھا، وأصل هذا أن السلام شعار الإسلام شرع إفشاءه عند لقاء كل مسلم ممن عرفت وممن لم تعرف إلا أن يمنع منه ما يُخَاف من الفتنة والتعريض للفسوق كما منع من الروية بمثل ذلك وأمر بالحجاب. (المنتقی:۲۸۰/۷)

امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں باب تسليم النساء على الرجال اور باب التسليم على النساء کے تحت دو روایتیں ذکر کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے حضور ﷺ عورتوں کو سلام کیا کرتے تھے، اور عورتیں حضور ﷺ کو سلام کرتی تھیں دیکھیے الأدب المفرد، رقم الحدیث: ۹۸۱-۹۸۴۔ اِسی طرح ایک حدیث حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کہ حضور ﷺ ایک مرتبہ عورتوں کے پاس سے گذرے تو انہیں سلام کیا (مصنف ابن ابی شیبہ:۲۵۷۸۱)

صاحب اوجزؒ نے علامہ حلیمیؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ:

كان النبي ﷺ للعصمة مأمونا من الفتنة، فمن وثق من نفسه بالسلام فليسلم، وإلا فالصمت أسلم.

(أوجز المسالک:۱۷۹/۱۷)

اس کی مزید تفصیل مظاہر حق جدید میں ہے۔

یہ بات آں حضرت ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ خاص تھی؛ کیوں کہ کسی فتنہ وشر میں آں حضرت ﷺ کے مبتلا ہونے کا کوئی خوف وخطرہ نہ تھا؛ اِس لیے آپ کے لیے عورتوں کو بھی سلام کرنا روا تھا؛ لیکن آپ کے علاوہ کسی دوسرے مسلمان کے لیے یہ مکروہ ہے کہ وہ اجنبی عورت کو سلام کرے؛ ہاں اگر کوئی عورت اتنی عمر رسیدہ ہو کہ اس کے تئیں کسی فتنہ وشر میں مبتلا ہونے کا کوئی خوف نہ ہو اور نہ اُس کو سلام کرنا دوسروں کی نظروں میں کسی بدگمانی کا سبب بن سکتا ہو تو اُس کو سلام کرنا جائز ہوگا۔ (مظاہر:۳۴۶/۵)

اوپر جو کچھ تحریر کیا گیا وہ جمہور کی رائے کے مطابق ہے؛ البتہ کچھ لوگوں نے یہ کہا ہے کہ مَردوں کا عورتوں کو اور عورتوں کا مردوں کو سلام کرنا بالکلیہ درست نہیں ہے، اِس کے بارے میں علامہ نوویؒ نے لکھا ہے کہ "وهو غلط" کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ (شرح النووی:۱۴۹/۱۴)

اور کچھ لوگوں نے جن کو اپنی تحقیق اور اپنے علم پر بڑا ناز ہے، اِس کے برعکس یہ کہا ہے: کہ بالکلیہ مَردوں کا عورتوں کو، اور عورتوں کا مَردوں کو سلام کرنا جائز ہے؛ کیوں کہ یہ ایک شرعی ضرورت ہے، باقی إنما الأعمال بالنيات اور ما يلفظ من قول إلا لديه رقيب عتيد (ق:۱۸)

یہ بات بالکل بے بنیاد ہے، اور بے بنیادی کی وجہ خود ان کا بیان کردہ یہ مسئلہ ہے کہ اجنبی غیر محارم عورتوں سے مصافحہ کرنا ناجائز ہے، کوئی اُن سے پوچھے کہ إنما الأعمال بالنيات کا کیا ہوا؟ ہم صاف اور پاک جذبے سے مصافحہ کر رہے ہیں، پھر کیوں ناجائز ہے، کیا مصافحہ شرعی ضرورت نہیں ہے؟ مصافحہ سے تو کینے کی صفائی ہوتی ہے، اس غلط مسئلے کے لئے دیکھیے: "سلام کے

احکام وفضائل“

امرد کے سلام اور جوابِ سلام کا مسئلہ

اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو امرد، سلام کر سکتا ہے، اِسی طرح شہوت یا کسی قسم کا فتنہ نہ ہو تو جواب بھی دے سکتے ہیں۔(محمودیہ:۱۹/۸۷)

خط یا میسیج وغیرہ کے ذریعہ عورتوں کو سلام کرنا

غیر محرم مرد کے لیے کسی جوان یا درمیانی عمر کی عورت کو سلام کرنا ممنوع ہے، اسی طرح خطوں میں لکھ کر بھیجنا، یا کسی کے ذریعہ سے کہلا بھیجنا اور اِسی طرح نامحرم عورتوں کے لیے مردوں کو سلام کرنا بھی ممنوع ہے؛ اِس لیے کہ اِن صورتوں میں سخت فتنہ کا اندیشہ ہے اور فتنہ کا سبب بھی فتنہ ہوتا ہے؛ ہاں اگر کسی بڈھی عورت کو یا بڈھے مرد کو سلام کیا جائے تو مضائقہ نہیں؛ مگر غیر محارم سے ایسے تعلقات رکھنا، ایسی حالت میں بھی بہتر نہیں؛ ہاں جہاں کوئی خصوصیت اِس کی مُقتضِی ہو اور احتمال فتنہ کا نہ ہو تو وہ اور بات ہے۔(اشاعتی بہشتی زیور کامل:۱۱/۷۴۷)

ٹی وی اور ریڈیو کی نیوز پر عورت کے سلام کا جواب دینا

ٹی وی اور ریڈیو پر خبروں سے پہلے نیوز ریڈر (خواتین) سلام کرتی ہیں، اس کا جواب دینا چاہیے یا نہیں؟ مولانا یوسف لدھیانویؒ لکھتے:

> میرے نزدیک تو عورتوں کا ٹی وی اور ریڈیو پر آنا ہی شرعاً گناہ ہے؛
> کیوں کہ بے پردگی اور بے حیائی ہے، اُن کے سلام کا جواب بھی
> نامحرموں کے لیے ناروا ہے۔(آپ کے مسائل:۷/۲۶۷)

بچوں کو سلام کرنا اور جواب دینا

علامہ طیبیؒ لکھتے ہیں: کہ جیسے تمام لوگوں کو سلام کرنا مستحب ہے، ویسے ہی ہوشیار کم عمر بچوں کو سلام کرنا مستحب ہے۔(طیبی:۹/۹)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کہ وہ بچوں کے پاس سے گذرے تو اُن کو سلام کیا اور فرمایا: رسول اللہ ﷺ کا یہی عمل تھا۔ (بخاری: ۶۲۴۷)

اور جب سلام کرنا مستحب ہے تو بچے اگر سلام کریں تو اُن کے سلام کا جواب گو واجب نہ ہو؛ لیکن مستحب ہوگا، اور علامہ شامیؒ نے جو لکھا ہے:

رد السلام واجب إلا على ☆ من في الصلاة أو بأكل شغلا
أو سلَّم الطفل أو السكران ☆ أو شابة يُخشى افتنان

سلام کا جواب دینا واجب ہے؛ مگر اس شخص پر جواب دینا واجب نہیں جو نماز میں ہے یا کھانے میں مشغول ہے، یا بچہ سلام کرے، یا مدہوش یا جوان عورت جس کے فتنہ کا خوف ہو۔

(ردالمختار: ۱/۴۵۷)

اس میں بھی وجوب کی نفی ہے، استحباب کی نہیں؛ کیوں کہ اِلا کے ذریعہ وجوب کا استثناء کیا گیا ہے اور استحباب اور عدم وجوب میں کوئی منافات نہیں۔

اور عالمگیری کی عبارت:

اختلف المشائخ في التسليم على الصبيان قال بعضهم: لا يسلّم عليهم

بچوں کو سلام کرنے کے بارے میں مشائخ کا اختلاف ہے، بعض نے کہا: ان کو سلام نہیں کیا جائے گا۔ (ہندیہ: ۵/۳۲۵)

قال بعضهم لا يسلم عليهم، یہ دلیل ہے کہ کچھ فقہاء جواز کے قائل ہیں، اور لا يُسلم کا مطلب یہاں بھی یہ لیا جاسکتا ہے کہ بچوں کو سلام کرنا یا جواب دینا واجب نہیں ہے، اس کی مزید تفصیل ''رموزِ سلام'' کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔

مجلس میں سے کسی کو خاص کر کے سلام کرنا مکروہ ہے

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب الأدب المفرد میں باب باندھا ہے: باب من كره

تسلیم الخاصة کسی کو خاص کر کے سلام کرنے کو، جس نے ناپسند کیا اور اس کے تحت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ ایک شخص نے آکر حضرت کو مجمع میں سے خاص کر کے کہا: عليكم السلام يا أبا عبد الرحمن (ابوعبدالرحمٰن حضرت کی کنیت ہے) حضرت نے فرمایا: اللہ نے سچ فرمایا اور اس کے رسول نے ٹھیک پہنچایا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بين يدي الساعة تسليم الخاصة کہ قربِ قیامت میں سلام میں لوگوں کی تخصیص کی جائے گی۔

(الأدب المفرد: ۱۰۴۹)

اس سے معلوم ہوا کہ مجلس میں ایک یا دو آدمیوں کو خاص کر کے سلام کرنا مکروہ ہے؛ بلکہ سلام کو عام رکھنا چاہیے۔

حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

اگر کوئی شخص چند لوگوں میں کسی کا نام لے کر اُس کو سلام کرے مثلاً یوں کہے: السلام عليك يا زيد، تو جس کو سلام کیا ہے، اُس کے سوا کوئی اور جواب دے دے تو وہ جواب سمجھا جائے گا، اور جس کو سلام کیا ہے، اُس کے ذمے جواب فرض باقی رہے گا؛ اگر جواب نہ دے گا تو گنہ گار ہوگا؛ مگر اِس طرح سلام کرنا خلافِ سنت ہے، سنت کا یہ طریقہ ہے کہ جماعت میں کسی کو خاص نہ کرے اور السلام عليكم کہے۔ (بہشتی زیور کامل: ۱۱/۴۷)

مرقاۃ المفاتیح اور حاشیۃ الطیبی میں ہے:

اگر کوئی شخص کچھ لوگوں سے ملے اور چند لوگوں کو سلام کرے اور کچھ لوگوں کو نہ کرے تو یہ مکروہ ہے؛ کیوں کہ سلام کا مقصد الفت وموانست ومحبت کو رواج دینا ہے اور مذکورہ صورت میں جبکہ کچھ لوگوں کو سلام نہیں کیا گیا تو یہ آپسی نفرت ودشمنی کا سبب ہونے کے ساتھ ساتھ، فتنہ وفساد کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے۔ (حاشیۃ الطیبی: ۹/۸)

غیر مشروع امر کے مرتکب کو سلام نہ کرنا یا اُس کے سلام کا جواب نہ دینا

سلام کرنا اسلامی تہذیب کا اٹوٹ حصہ ہے، سرکار دو عالم ﷺ کی سنت مبارکہ ہے اور سلام کا جواب دینا بھی سنت مبارکہ ہے؛ لیکن اگر کوئی خلافِ شرع کام کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کو راہِ راست پر لانے کے لئے ترکِ سلام کی گنجائش ہے، اسی طرح اگر ایسا شخص سلام کرے تو جواب نہ دینا بھی جائز ہے؛ تاکہ اُسے تنبیہ ہو اور آئندہ ایسے کام سے توبہ کرلے؛ چناں چہ بڑے بزرگوں کا اصلاحی طریقہ ایسا رہا ہے، سرکارِ دو عالم کی سیرت میں اس حوالے سے بھی ہمیں روشنی ملتی ہے، ابن قیمؒ نے اس عنوان کے تحت تین روایتیں ذکر کی ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ۹ھ میں پیش آنے والے غزوہ تبوک میں تین صحابہ کرام نے شرکت نہیں فرمائی تھی؛ جبکہ حضور ﷺ کی طرف سے سارے صحابہ کو جانے کا حکم تھا، حضرت ہلال بن امیہ، مُرارہ ابن ربیع کے ساتھ حضرت کعب ابن مالک رضی اللہ عنہم بھی پیچھے رہ گئے تھے، غزوے سے واپسی پر ان لوگوں سے باز پرس ہوئی اور حضور ﷺ اور دیگر صحابہ کرام نے حضرت کعب سے قطع تعلق کرلیا کہ دیکھیں خدا کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؛ بعد میں ان لوگوں کی توبہ قبول ہوئی اور قرآن میں اس کے متعلق آیتیں اتریں، اُسی وقت کا واقعہ ہے کہ حضرت کعب حضور ﷺ کو سلام کرتے تھے؛ لیکن آپ جواب نہیں دیتے تھے، روایت کے الفاظ ہیں: وكان كعب يُسلّم عليه، ولا يدري هل حرّك شفتيه بردّ السلام عليه أم لا. (مسلم:۲۷۶۹)

(۲) حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ خشکی کی وجہ سے پھٹ گئے تھے، گھر والوں نے خلوق نامی خوشبوان کے ہاتھوں میں مل دی جس میں زعفران کی آمیزش ہوتی ہے (اسی وجہ سے مَردوں کو اُس کا لگانا منع ہے) انہوں نے اُسی حالت میں نبی کریم ﷺ کو سلام کیا تو آپ نے جواب نہیں دیا؛ بلکہ اُن سے کہا جاؤ اسے دھوڈالو۔ (ابوداؤد:۴۱۷۶)

(۳) ایک مرتبہ حضرت صَفیہ رضی اللہ عنہا کا اونٹ بیمار ہوگیا تو آپ ﷺ نے حضرت زینب بنت جحشؓ سے کہا: انہیں کوئی سواری دے دو تو حضرت زینبؓ کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا،

أنــا أعــطي تــلك اليهــودية؟ کہ کیا میں اس یہودیہ کو دے سکتی ہوں (یعنی نہیں دوں گی) تو آپ ﷺ ناراض ہوئے اور اُن سے دوڈھائی مہینے گفتگو نہیں فرمائی۔(ابوداؤد: ۴۶۰۲)(۱)

حضرت صفیہؓ یہودی قبیلہ بنو قریظہ کے سردار حُیَيّ ابن اخطب کی بیٹی تھیں، فتح خیبر کے بعد آپ نے اُن سے نکاح فرمایا؛ چوں کہ اب وہ مسلمان ہوچکی تھیں، حضرت زینبؓ نے انہیں یہودیہ کہا جو غیر مشروع تھا تو آپ نے تنبیہ کے لئے دو مہینہ تک اُن سے گفتگو نہیں فرمائی، ابن قیمؒ نے اس روایت کو ذکر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ زجر و تنبیہ کے لئے آپ سے ابتداءً سلام نہ کرنا بھی ثابت ہے؛ کیوں کہ گفتگو کا ترک، سلام کے ترک کو لازم ہے۔(زادالمعاد: ۲/ ۳۹۱، بذل المجهود: ۱۳/ ۱۲)

مسئلہ: اوپر کی روایتوں سے معلوم ہوا کہ ادب وتہذیب سکھلانے کے لیے اور خلاف شرع کام سے روکنے کے لیے بڑے، چھوٹوں کو سلام نہ کریں یا جواب نہ دیں تو اِس کی گنجائش ہے، یہ اصلاح کا ایک طریقہ ہے، ایک روایت پڑھیے، آپ نے سلام کا جواب نہیں دیا تو فوری اصلاح ہوگئی۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ ایک صاحب، حضور ﷺ کے پاس بحرین سے آئے، اُن کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی تھی اور جسم پر ریشمی جبہ تھا، روایت کے الفاظ ہیں: فسلم عــليه فلم يرد کہ انہوں نے سلام کیا، آپ نے جواب نہیں دیا (کیوں کہ یہ دونوں چیزیں مردوں کے لیے ناجائز ہیں) وہ صاحب بڑے غمگین ہوئے اور اپنی اہلیہ سے واقعہ بتایا انہوں نے کہا: جواب نہ دینے کا سبب انگوٹھی اور جبہ کا استعمال ہے، اُن صاحب نے فوراً اِن دونوں چیزوں کو اتار دیا اور دوبارہ آکر سلام کیا تو آپ نے جواب دیا۔(الأدب المفرد، حدیث: ۹۵۹، باب ترک السلام علی المتخلق)

امام بخاریؒ نے اس سلسلے میں پورا ایک باب ہی قائم کیا ہے، بـاب من لم يسلم على مـن اقتـرف ذنبـا ولـم يـردّ سـلامه حتى تتبين توبته جس سے مذکورہ مسئلہ کی مزید وضاحت ہوتی ہے، باب کے تحت حضرت کعب والی روایت ذکر کی ہے، اس کی شرح میں ابن بطالؒ لکھتے ہیں:

قــال الـمهـلـب: تـرك السـلام على أهل المعاصي بمعنى

---

(۱) ان دونوں روایتوں کو ابوداؤد نے باب ترك السلام على أهل الأهواء کے تحت ذکر کیا ہے۔

التأديب لهم سنة ماضية بحديث كعب بن مالك وأصحابه: الثلاثة الذين خلفوا وبذلك قال كثير من أهل العلم في أهل البدع لا يسلم عليهم؛ أدبا لهم.
(شرح ابن بطال: ۳۷/۷)

مسئلہ: اگر ایسا شخص جو خلاف شرع کام کا مرتکب تھا، جس کی وجہ سے اس سے سلام وجوابِ سلام بند تھا، راہِ راست پر آ گیا اور پچھلی حرکتوں سے ندامت کا اظہار کر کے، آئندہ کی زندگی میں گناہوں سے تائب ہو گیا تو اب اُس سے سلام کلام شروع کر دینا چاہیے۔ (عمدۃ القاری: ۳۷۰/۱۵)

اشکال: کچھ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں: کہ افشاءِ سلام کی روایتیں بالکل عام ہیں مثلاً: أفشوا السلام بينكم. و أفشوا السلام تدخلوا الجنان (۱)؛ لہٰذا سلام سب کو کرنا چاہیے، نیک ہو یا بد، علامہ عینیؒ اِس کے جواب میں لکھتے ہیں: قد خص به هذا العموم عند الجمهور یعنی بے شک افشاءِ سلام کی روایتیں عام ہیں؛ لیکن عام مخصوص منہ البعض ہیں، حضرت کعب ابن مالکؓ وغیرہ کی روایتوں سے تخصیص کی گئی ہے۔ (عمدۃ القاری: ۳۷۱/۱۵)

ابن حجرؒ نے کہا: کہ جو لوگ بالکل عموم کے قائل ہیں كأنه لم يطلع على دليل الخصوص کہ ایسا لگتا ہے انہیں دلیلِ تخصیص پر اطلاع نہ ہو سکی۔ (فتح الباری: ۵۰/۱۳)

تنبیہ: اگر غیر مشروع امر کے مرتکب شخص کو سلام نہ کرنے کی وجہ سے، اپنا کوئی دینی یا دنیاوی نقصان ہے یا وہ شخص سلام کرنے پر مجبور کرتا ہے، تو اپنی جان اور مال کی حفاظت کی خاطر سلام کرنا جائز ہے، اور نیت یہ کرے کہ سلام، اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور خدا کا نام لینا کارِ ثواب ہے۔
(الأذکار: ۲۹۳)

مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہ لکھتے ہیں:

سلام، تحیہ ہے جس سے اکرام وتعظیم کے ساتھ دعا مقصود ہے، فاسق معلن اَحکامِ شرع کا اکرام نہیں کرتا، جس کی وجہ سے وہ خود بھی مستحقِ اکرام نہیں ہے؛ اس لیے اس کو (فاسق وفاجر) کو سلام کرنا

---

(۱) الأدب المفرد، رقم: ۹۱۵-۹۱۶۔

مکروہ ہے، ولا یسلم علی الفاسق المعلن؛ لیکن بسا اوقات یہ ترکِ سلام بغض ودشمنی کا باعث بن جاتا ہے، جس کی وجہ سے بہت سے اَحکام کی خلاف ورزی؛ بلکہ ہتک ہوتی ہے، نیز اُس کے فسق کی وجہ سے اُس کے ایمان سے صَرفِ نظر ہو کر اس کی بے توقیری بھی بعض دفعہ پیدا ہو جاتی ہے، ایسی حالت میں بہ حیثیت مومن اس کو سلام کیا جاوے تو اس سے تعلیماتِ اسلام کی اشاعت بھی ہوتی ہے، محبت اور الفت بھی پیدا ہوتی ہے؛ جس کی بنا پر ایسے لوگ اسلام کے احکام کو سننے کی لیے بھی آمادہ ہوتے ہیں، بغض اور دشمنی سے تحفظ رہتا ہے اور اپنی بڑائی بھی پیدا نہیں ہوتی۔ (فتاوی محمودیہ:۱۹/۹۵)

اس سلسلے میں ابن تیمیہؒ کی تحقیق بھی اچھی تحقیق ہے: جس کا خلاصہ یہ ہے:

فاسق، مبتلائے معصیت اور مبتدع کو سلام نہ کرنا یا اس کے سلام کا جواب نہ دینا ''ہجر'' اور ''زجر'' کے قبیل سے ہے، اور یہ ہجر وزجر کسی صاحبِ ریاست مثلاً: والدین، استاذ، امیر اور حاکم کی طرف سے ہو تو جہاں پر اِس سے اُن لوگوں کی اصلاح کی توقع ہو تو اس پر عمل ہونا چاہیے، جیسا کہ صحابہ کرام نے عمل کر کے دکھایا، اور اگر صاحبِ ریاست نہیں ہے تو پھر چوں کہ ترکِ سلام وجوابِ سلام سے مقصودِ اصلی حاصل نہیں ہوتا اور دیگر مفاسد کے پیدا ہونے کا احتمال ہے تو پھر اصل پر عمل ہونا چاہیے، انہیں سلام کرنا اور اُن کے سلام کا جواب دینا چاہیے۔ (مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ:۲۸/۲۰۴)

شرابی مسلمان کو سلام کرنا

شراب پینا اسلام میں حرام ہے، شاربِ خمر کے بارے میں بڑی سخت وعیدیں وارد ہوئی

ہیں، اسلام اور شُربِ خمر میں منافات ہے؛ لیکن اگر کوئی مسلمان شخص غیروں کی غلط تہذیب و ماحول اور شیطانی دباؤ میں آکر شراب پینے لگے، تو فقہاء اسے کافر نہیں کہتے؛ تاہم فاسق، اُسے کہا جاتا ہے، ایسا شخص کسی کو سلام کرے تو اس کا جواب دینا کیسا ہے؟ نیز ایسے شرابی کو سلام کر سکتے ہیں یا نہیں؟ زجر و تنبیہ کا تقاضہ تو یہی ہے کہ اسے سلام نہ کیا جائے اور نہ جواب دیا جائے، حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لا تسلموا علی شَرَبَۃ الخمر. شرابی کو سلام مت کرو۔

(الأدب المفرد، رقم:۹۵۴)

اور سلام کی یہ ممانعت اس بنیاد پر ہے کہ اس مسلمان شرابی کو یہ احساس ہو کہ میرے اس برے فعل کی وجہ سے، میرے دوسرے بھائی مجھے سلام نہیں کر رہے ہیں؛ اس کے دل کو ٹھیس پہنچے اور وہ راہِ راست پر آجائے؛ لیکن اس نسخہ کی اثر اندازی کا مدار ''حساس دل'' پر ہے، اور یہ چیز اب خال خال ملے گی، اب تو ترکِ سلام کی وجہ سے کبھی عداوت و جھگڑے کی نوبت آجاتی ہے؛ بالخصوص ملک ہندوستان کا مسئلہ بڑا عجیب وغریب ہے؛ اِس لیے ایسے مسلمان شرابی کے سلسلے میں دونوں پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

جہاں تک سلام کرنے کی بات ہے تو جو شخص علانیہ شراب پیتا ہو اور اپنی اس برائی کو چھپاتا نہ ہو تو اسے واقعی سلام نہ کرنا چاہیے، فقہاء نے لکھا ہے: کہ جو شخص علانیہ فسق کے کام کرتا ہو اسے سلام کرنا مکروہ ہے، ویکرہ السلام علی الفاس لو معلناً؛ البتہ اگر یہ اندیشہ ہو کہ ترکِ سلام کی وجہ سے عداوت بڑھ جائے گی اور اصلاح کا راستہ مسدود ہو جائے گا، اور سلام کا تعلق رکھنے کی وجہ سے موانست بڑھے گی یا شراب چھوڑنے کی دعوت دینے کا موقع باقی رہے گا، تو بہتر ہے کہ اسے سلام کرے؛ کیوں کہ اصل مقصد اصلاح ہے؛ نہ کہ

اہانت، اور نہی عن المنکر ہے نہ کہ ضِد وعناد۔ (کتاب الفتاوی:۶/۱۲۲)

بدعتی اور فاسق کو سلام کرنا

بدعتی اور علانیہ فسق میں مبتلا شخص کو سلام کرنا جائز نہیں، ڈاڑھی ایک مشت سے کم کرنا، ٹخنے ڈھانکنا، ٹی وی دیکھنا، تصویریں بنانا، رکھنا، عورتوں کا شریعت کے مطابق پردہ نہ کرنا، حرام کھانا، بینک انشورنس وغیرہ سودی اداروں کی ملازمت، غیبت کرنا یہ سب علانیہ بغاوتیں ہیں جو شخص ان کا ارتکاب کرتا رہتا ہے جب تک وہ ان گناہوں سے توبہ کا اعلان نہ کرے اسے سلام کرنا جائز نہیں؛ البتہ اگر کسی فاسق سے تعارف اور جان پہچان ہے تو سلام کرنا جائز ہے؛ اِس لیے کہ ایسی صورت میں سلام نہ کرنے میں کبر کا گمان ہوسکتا ہے، نیز اسے دین اور دین داروں سے مزید مُتنفّر کرنے کا باعث ہے، جواب دینا بہرحال ضروری ہے۔ (احسن الفتاوی:۸/۱۳۵)

تاش کھیلنے والے کو سلام کرنا

چوسر وغیرہ کھیلنے والوں کو سلام کرنے کی امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے ممانعت فرمائی ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کہ ان کو سلام کرلیا جاوے اِس نیت سے کہ جتنی دیر بھی اُن کی توجہ اِس معصیت (کھیل) سے ہٹ کر دوسری طرف منتقل ہوجائے، اچھا ہے۔

ویسلم علی قوم في معصیة وعلی من یلعب بالشطرنج، ناویاً أن یشغلهم عما هم فیه عند أبي حنیفة رحمه الله تعالیٰ، وکره عندهما تحقیرا لهم (شامی:۹/۵۹۵، محمودیہ:۱۹/۱۰۹)

قال یزید بن أبي حبیب: لو مررتُ علی قوم یلعبون بالشطرنج ما سلمتُ علیهم، وکان سعید بن جبیر إذا مرَّ علی أصحاب النرد لم یُسلم علیهم.

(شرح ابن بطال:۷/۳۷)

مظلوم ظالم کے سلام کا جواب دے

سوال (۹۱۶۷) اگر ظالم اپنے مظلوم کو سلام کرے اور مظلوم بوجہ اپنے رنج وغصہ ونفرت کے جواب نہ دے، کیا مظلوم شرعاً گنہ گار ہے اور کیا مظلوم پر ظالم بد بخت کے سلام کا جواب دینا شرعاً واجب ہے اور کیا شریعت اجازت دیتی ہے کہ مظلوم اپنے ظالم کے سلام کو جوتی سے ٹھکرا دے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

سلام شعائر اسلام اور حقِ مسلم ہے اور جواب دینا واجب ہے، مظلوم کو چاہیے کہ جوابِ سلام کو ترک کر کے اپنے ذخیرہ آخرت کو نقصان نہ پہنچائے اور ترکِ واجب کا وبال اپنے سر نہ رکھے اور اُس کو بد بخت یا کم بخت یا اور کوئی ایسا کلمہ نہ کہے جس سے انتقام ہو جائے، ممکن ہے کہ جلے ہوئے دل سے نکلا ہوا کوئی کلمہ اتنا سخت ہو کہ ظالم کے ظلم کے مساوی ہو جائے یا اُس سے بھی بڑھ جائے وہاں ہر چیز کا وزن ہوگا پھر سنت اور شعار اور حق مسلم کو جوتی سے ٹھکرا دینا، نہایت خطرناک ہے اِس کا تو کبھی تصور بھی ذہن میں نہیں آنا چاہیے۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔ (محمودیہ: ۱۹/۱۰۹)

فاسق کو سلام کرنے یا نہ کرنے کا معیار

جو شخص مبتلائے فسق ہو اور اُس کو سلام کرنے یا اُس کی دعوت قبول کرنے سے اُس کی اصلاح کی توقع ہو تو اُس کو سلام بھی کیا جائے اور دعوت بھی قبول کی جائے؛ بشرطیکہ وہ حرام مال سے نہ کھلائے، اگر ترکِ سلام یا ترکِ دعوت سے اصلاح کی توقع ہو تو ترک کر دیں، بقصدِ تعظیمِ فسق، سلام کرنا جائز نہیں ہے؛ لیکن جب اس میں ایمان بھی موجود ہے تو اکرام مسلم لازم ہے۔ (محمودیہ: ۱۹/۱۰۳)

مسلمان کو نامناسب الفاظ کے ذریعہ مخاطب بنا کر سلام کا جواب نہ دینا

بعض دفعہ آپسی رنجش اور ذاتی معاملات کی وجہ سے کوئی کسی سے غصہ ہوتا ہے تو یہ کہہ کر: یہ منافق ہے، کافر ہے، حرامی ہے وغیرہ اس کے سلام کا جواب نہیں دیتا یہ درست نہیں ہے، مفتی محمود الحسن صاحبؒ لکھتے ہیں:

سلام کا جواب دینا حق مسلم ہے، جو کہ واجب ہے۔(۱) اور مسلمان کو منافق کہنے سے تعزیر کا حکم ہے۔(۲) اگر طبیعت میں کسی مسلمان سے ذاتی معاملات کی بنا پر غصہ ہو تو تین روز سے زیادہ سلام کلام بند نہیں کرنا چاہیے، حدیث شریف میں ممانعت آئی ہے؛ لہٰذا غصہ ختم کر کے حضور کے ارشاد پر عمل کرنا چاہیے اور جوابِ سلام نہ دینے کی معذرت بھی کرے، یہی شریفانہ طریقہ ہے۔ (محمودیہ:۱۹/۱۰۴، بحذفٍ)

ڈاڑھی منڈانے والے کو سلام کرنا اور اس کے سلام کا جواب دینا، عصرِ حاضر کے تناظر میں

ڈاڑھی منڈانے والے یا ڈاڑھی کتروانے والے کو سلام کرنا یا اُن کے سلام کا جواب دینا جائز ہے یا نہیں؟ اِس سلسلے میں فقہاء کا اصول، یہ ہے کہ فاسق یعنی جو علی الاعلان گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہو اُسے سلام کرنا مکروہ ہے۔ ویکرہ السلام علی الفاسق لو معلنا (۳) اور افشاءِ سلام کی روایتوں سے جو عموم معلوم ہوتا ہے کہ سلام سب کو کرنا چاہیے، اِس کے بارے میں محدثین کی رائے یہ ہے: کہ بعض صورتیں اِس عموم میں داخل نہیں ہیں مثلاً: کافر کو ابتداءً سلام کرنا، اسی طرح فاسق وفاجر کو سلام کرنا اس عموم سے خارج ہے، دیکھیے: عمدۃ القاری:۱۵/۳۵۵، ردالمحتار:۹/۵۹۱۔

اب یہ طے کرنا ہے کہ ڈاڑھی مونڈنے یا کتروانے والے لوگ فاسق معلن میں داخل ہیں یا نہیں؟ کیوں کہ یہ مسئلہ صراحۃً محدثین وفقہاء نے بیان نہیں کیا ہے، اگر یہ لوگ فاسق معلن کی تعریف میں داخل ہیں تو انہیں فقہاء کی صراحت کے مطابق سلام کرنا یا ان کے سلام کا جواب دینا مکروہ ہوگا ورنہ نہیں۔

احادیث اور فقہی عبارتوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو خلاصہ یہی نکلتا ہے، جو مفتی

(۱) مشکوۃ،ص:۳۹۷. (۲) درمختار:۴/۶۹، کتاب الحدود۔سعیدیہ.. (۳) الدر مع الرد:۹/۵۹۵.

محمود الحسن صاحبؒ نے لکھا ہے: ڈاڑھی منڈانا حرام ہے، ایک مشت کے پہنچنے سے پہلے کترانا یا کترا کر ایک مشت سے کم کرالینا کسی کے نزدیک بھی مباح نہیں، اس منڈانے اور کترنے میں غیر قوموں کے ساتھ تشبہ ہے، ایسے شخص کی امامت مکروہ تحریمی ہے، ایسا شخص مقبول الشہادۃ اور عادل نہیں، و أما الأخذ منها وهي دون ذلك كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال، فلم يُبِحْه أحدٌ، وأخذ كلها فعل يهود الهند ومجوس الأعاجم "فتح" (۱) يحرم على الرجل قطع لحيته. (۲) (محمودیہ:۱۹/۱۰۶)

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

جو لوگ ڈاڑھی منڈاتے ہیں یا مونڈی ہوئی کے مثل کترواتے ہیں

وہ فاسق کی تعریف میں شامل ہیں۔ (کفایت المفتی:۹/۹۱)

حدیث میں ڈاڑھی بڑھانے کو امور فطرت میں سے شمار کیا گیا ہے، دیکھیے: مشکوۃ، باب السواک حدیث:۳۷۹ اس کے تحت ملاعلی قاریؒ لکھتے ہیں:

وقص اللحية من صنع الأعاجم وهو اليوم شعار كثير من المشركين كالأفرنج والهنود. (مرقاۃ:۲/۹۱)

حاصل یہ کہ ڈاڑھی سے مردانہ ہیئت کی تکمیل ہوتی ہے اور ڈاڑھی مونڈنا مجوسیوں کا طریقہ تھا اور اب تو تمام غیر مسلموں کا طریقہ ہے؛ پس ڈاڑھی رکھنے سے اُن سے مشابہت ختم ہوتی ہے، اور ڈاڑھی مونڈنا اللہ کی بناوٹ کو بدلنا ہے جو اِغواءِ شیطانی کا نتیجہ ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ:۴/۲۴۴)

ان تصریحات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ڈاڑھی مونڈنے یا کترنے والے لوگ سخت گناہوں کے مرتکب ہیں، بقول مفتی کفایت اللہ صاحبؒ: فاسق کی تعریف میں داخل ہیں؛ لہٰذا ضابطہ شرعی کے مطابق انہیں سلام کرنا اور اُن کے سلام کا جواب دینا مکروہ ہوگا۔

لیکن ملک ہندوستان میں عموماً دینی تعلیم سے غفلت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے لوگ

---

(۱) الدر المختار:۲/۱۱۴۔ (۲) الدر:۵/۲۱۶۔

ڈاڑھی نہیں رکھتے ہیں، اب ان کا کیا حکم ہوگا، انہیں بہ اتفاق فقہاء کافر تو نہیں کہا جائے گا، اب اگر سلام کلام بھی بند کر دیا جائے تو دعوت وتبلیغ کا دروازہ بھی بند ہو جائے گا، آپسی رنجش بھی بڑھے گی اور بجائے اتحاد کے اختلاف وانتشار پیدا ہوگا؛ لہٰذا ایسے لوگوں کو سلام کرنا چاہیے، عجب نہیں کہ سلام کرنا آپسی محبت کا ذریعہ بنے گا، پھر انہیں اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے کا موقع ملے گا؛ چناں چہ مفتی محمود الحسن صاحبؒ کی بات مبنی بر حکمت ہے:

> لیکن بسا اوقات یہ ترکِ سلام بغض ودشمنی کا باعث بن جاتا ہے، جس کی جہ سے بہت سے احکام کی خلاف ورزی؛ بلکہ ہتک ہوتی ہے، نیز اس کے فسق کی وجہ سے اس کے ایمان سے صرفِ نظر ہو کر اس کی بے توقیری بھی بعض دفعہ پیدا ہو جاتی ہے، ایسی حالت میں بحیثیت مومن اس کو سلام کیا جاوے تو اس سے تعلیماتِ اسلام کی اشاعت بھی ہوتی ہے، محبت والفت بھی پیدا ہوتی ہے، جس کی بنا پر ایسے لوگ اسلام کے احکام کو سننے کے لیے بھی آمادہ ہوتے ہیں، بغض اور دشمنی سے تحفظ رہتا ہے اور اپنی بڑائی بھی پیدا نہیں ہوتی۔
>
> (محمودیہ: ۵/۱۹)

شیعوں کے سلام کا جواب

شیعہ اگر اہل السنۃ والجماعۃ کو السلام علیکم کہیں تو انہیں وعلیکم السلام کے ذریعہ جواب دے سکتے ہیں یا نہیں اس میں تفصیل ہے۔

(۱) جو شیعہ فاسق ہیں کافر نہیں ہیں، اُن کے سلام کا جواب شریعت کے موافق "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" دینا چاہیے اور جو شیعہ کافر ہیں اُن کے جواب میں صرف وعلیکم کہہ دینا چاہیے۔

(۲) جو شیعہ صحابہ یا دیگر اکابر پر سب وشتم نہیں کرتے اور بھی کفریات نہیں کرتے تو اُن

کے سلام کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمة الله وبرکاته کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔(۱)(محمودیہ:۱۹/۹۹)

قادیانی کو سلام کرنا اور جواب دینا

قادیانی نے نُصوص قطعیہ کے خلاف اپنا عقیدہ اپنی کتابوں میں لکھا ہے؛ اس لیے وہ اسلام سے خارج ومرتد ہیں، جو مسلمان قادیانی مذہب اختیار کرلے اُس کا بھی وہی حکم ہے، اس کو سلام کرنا اور اُس کے سلام کا جواب دینا اور اس کی دعوت قبول کرنا اور اس کی دعوت کرنا جائز نہیں، تمام کفار کے ساتھ جو معاملہ کیا جاتا ہے مرتد کا معاملہ اُس سے مختلف ہے، اور اگر یہ لوگ سلام کردیں تو جواب میں فقط وعلیکم یا هداك الله کہہ دینا چاہیے۔(محمودیہ:۱۹/۱۰۰)

غیر مقلدین کے سلام کا مسئلہ

غیر مقلدین کو سلام کرنا اور اُن کے سلام کا جواب دینا جائز ہے، محض غیر مقلد ہونے کی وجہ سے اُن کا کوئی جداگانہ حکم نہیں ہے۔ (کفایت المفتی:۹/۹۱)

بریلوی حضرات کو سلام کرنا

سوال: بریلویوں کو سلام کرنا کیسا ہے؟

جواب: جائز ہے۔(دارالافتاء دارالعلوم دیوبند:۱۱۶۳۳)

فرقہ خاکساری کے ساتھ سلام وکلام

عنایت اللہ مشرقی بانی خاکسار نے اپنی تحریرات ''تذکرہ''، ''قول فیصل'' وغیرہ میں عقائد اسلام کا استہزاء کیا ہے اور سخت ترین توہین کرکے بنیادی چیزوں کا انکار کردیا ہے؛ اس لیے علماء اسلام کے فتوی کے مطابق کافر ہے، ایسے لوگوں کے ساتھ بلا ضرورت میل جول، سلام کلام محبت کا تعلق رکھنا ناجائز ہے؛ اس لیے کہ اُن کے عقائد دوسروں میں بھی سرایت کریں گے؛ لہٰذا ان سے بالکل علحدہ رہنا چاہیے، جو شخص بلا ضرورت شرعیہ اُن سے تعلق رکھے وہ گناہ گار ہوگا، اس کا اسلام

---

(۱) شیعہ کو ابتداءً سلام کرنے کے سلسلے میں اسی تفصیل کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔

خطرے میں ہے؛ تاہم اس کو کافر کہنا درست نہیں۔(محمودیہ:۱۹/۱۰۱)

اگر سلام کرنے سے منع کردے؟

اگر کوئی کسی کو منع کردے کہ مجھے سلام مت کرو، تمہارے سلام سے مجھے تکلیف ہوتی ہے، تو پھر سلام نہ کرے۔(محمودیہ:۱۹/۹۰)

ناراضگی کی وجہ سے ترکِ سلام

تعلق رکھنے میں اگر فتنہ ہو تو زیادہ میل جول نہ رکھا جائے؛ مگر سلام نہ ترک کیا جائے؛ اگر ایک اُن میں سے سلام کرتا ہے تو وہ بریٔ الذمہ ہو جائے گا، دوسرا اگر جواب نہیں دے گا تو وہ ذمہ دار رہے گا۔(محمودیہ:۱۹/۸۹)

ٹیپ رکارڈ، ریڈیو وغیرہ سے کیا گیا سلام

اگر ٹیپ رکارڈ میں کسی کے سلام کی آواز کو محفوظ کرلیا گیا ہو تو اس سلام کا جواب دینا ضروری نہیں ہے، اور یہی حکم اُس وقت ہوگا جب سلام کو کسی بھی آلہ میں محفوظ کرلیا جائے۔(۱) اور اگر آواز رکارڈ نہ ہو مثلاً: ریڈیو سے براہِ راست کوئی سلام کرے اور اصل آواز سنائی دے یا ٹی وی میں براہِ راست کوئی پروگرام Live کیا جائے اور اس میں کوئی سلام کرے تو احتیاط یہ ہے کہ سلام کا جواب دیا جائے۔(محمودیہ:۱۹/۸۴)

مزید وضاحت: اگر کیسٹ، سی ڈی یا میموری وغیرہ میں سلام ریکارڈ کیا گیا ہو تو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی کے پاس کوئی پیغام ریکارڈ کر کے بھیجا جائے اور سلام میں اُس کو مخاطب بنایا گیا ہو، ایسی صورت میں جس کے نام پیغام ہے اور جس کو مخاطب بنایا گیا ہے اُسے سلام کا جواب دینا چاہیے، یہی حکم (VOICE SMS) کا ہوگا، اور اُسے خط والے مسئلہ پر قیاس کیا جائے گا، اور

(۱) آج کل گھروں میں ایک بیل لگائی جاتی ہے، بٹن دبانے پر آواز آتی ہے، "السلام علیکم" برائے مہربانی دروازہ کھولیے، اس سلام کا جواب واجب نہیں ہے، اسی طرح موبائل میں "السلام علیکم" کی رنگ ٹون لگادی جائے تو اس کا جواب واجب نہیں ہے۔مولف.

اگر وہ کیسٹ وغیرہ کوئی قاصد لایا ہے اور پیغام سنتے وقت وہ بھی موجود ہے تو جواب میں اُسے بھی شریک کرنا چاہیے، جیسے قاصد کا مسئلہ ہے، یعنی وعلیہ وعلیکم السلام کہنا چاہیے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی خاص شخص کو مخاطب نہ بنایا گیا ہو، جیسے کسی مقرر کی تقریر ہو اور اُس میں سامعین کو سلام کیا گیا ہو، تو ایسے خطاب کو بہت سے لوگ سن چکے ہوتے ہیں، اور آئندہ بھی سنیں گے، جہاں وہ تقریر ہوئی ہے وہاں مجمع میں سے اگر ایک شخص نے بھی جواب دے دیا ہو جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، تو یہ سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا، آئندہ سننے والے کے ذمہ جواب دینا واجب نہیں ہے، یہی حکم اُن تقریروں کے شروع میں کیے ہوئے سلام کا ہوگا جو تقریریں (YOUTUBE یا WHATSAPP) پر ایک دوسرے کو بھیجی جاتی ہیں، پھر سنی جاتی ہیں۔ (مولف)

سلام کے وقت جھکنا ممنوع ہے

حضرت انسؓ سے مروی ہے: کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کوئی جب اپنے مسلمان بھائی یا اپنے دوست سے ملاقات کرے تو کیا وہ جھک جائے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، اُس شخص نے کہا: کہ کیا اُس سے گلے ملے اور اُس کو بوسہ دے آپ نے فرمایا نہیں: (کیوں کہ اس میں فساد کا اندیشہ ہے) اس نے کہا، تو کیا اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے مصافحہ کرے، آپ نے فرمایا: ہاں۔ (ترمذی، رقم: ۲۷۲۹، باب ماجاء فی المصافحۃ)

تشریح: اِس حدیث سے معلوم ہوا: کہ سلام کرتے وقت جھکنا منع ہے، ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: فإنه في معنى الركوع وهو كالسجود من عبادة الله تعالى '(۱) یعنی جھکنا رکوع کے مشابہ ہے اور رکوع، سجدہ کی طرح ہوتا ہے، جس طرح غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنا حرام ہے، رکوع کرنا بھی حرام ہے؛ لہٰذا صرف جھکنا یا سلام کے ساتھ جھکنا جس طرح کورنش بجالاتے ہیں ممنوع ہے۔

مظاہر حق میں ہے:

> اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام کے وقت جھکنا، جیسا کہ کچھ لوگوں کا معمول ہے اور بعض جگہوں پر اس کا رواج ہے، خلافِ سنت ہے،

(۱) مرقاۃ: ۹/۷۶۔

اور آں حضرت نے اِس کو اِس بنا پر پسند نہیں فرمایا کہ یہ چیز رکوع کے حکم میں ہے اور رکوع اللہ کی عبادت ہے۔

یحییٰ نے محی السنہؒ سے نقل کیا ہے: کہ سلام کے وقت پیٹھ جھکانا مکروہ ہے؛ کیوں کہ اِس کی ممانعت میں صحیح حدیث منقول ہے اور اگر چہ بعض اہل علم وصلاح نے اِس کو اختیار کیا ہے؛ لیکن اُن کا یہ فعل ہرگز قابل اعتبار واعتماد نہیں ہے۔ (مظاہر حق: ۵/۳۷۰)

جھنڈے اور پرچم کو سلام کرنا

جھنڈے اور پرچم کسی بھی قوم اور ملک کی شناخت اور یونیفارم کی حیثیت رکھتے ہیں، اُن کا لہرانا جائز ہے؛ لیکن اِس موقع سے کوئی ایسا عمل کرنا جس سے جھنڈے کی غیر معمولی تعظیم ظاہر ہوتی ہو مثلا: دونوں ہاتھ جوڑنا، یا جھکنا، یا سجدہ کرنا جائز نہیں؛ اسلامی نقطہ نظر سے کسی بھی مخلوق کے ساتھ اِس طرح کا برتاؤ روا نہیں، حضور ﷺ نے کسی کے سامنے جھکنے سے منع فرمایا ہے، روایت ابھی اوپر گذری ہے؛ چناں چہ اسکولوں، کالجوں اور سرکاری اداروں میں ملکی جھنڈے کو سلام کیا جاتا ہے؛ بالخصوص اِس ملک کی آزادی کے دن ترانہ خوانی اور پرچم کشائی ہوتی ہے، پھر موجودین جھنڈے کو سلام کرتے ہیں، شرعی طور سے یہ درست نہیں ہے، مولانا یوسف لدھیانویؒ لکھتے ہیں:

پرچم کو سلام کرنا غیر شرعی رسم ہے، اِس کو تبدیل کرنا چاہیے؛ وطن سے محبت تو ایمان کی علامت ہے؛ مگر اظہارِ محبت کا یہ طریقہ کفار کی ایجاد ہے، مسلمانوں کو کفار کی تقلید روا نہیں۔ (آپ کے مسائل: ۷/۲۶۸)

اِس سے ملتا جلتا ایک سوال اور اُس کا جواب امداد الفتاویٰ: ۴/۲۶۴ پر درج ہے، اہل علم دیکھ سکتے ہیں۔

جوڈو کراٹے سینٹر کا سلام میں جھکنے کا قانون خلاف شرع ہے

جوڈو کراٹے کی جہاں ٹریننگ ہوتی ہے وہاں جوڈو کراٹے سیکھنے والے اسٹوڈنٹ جب

اپنے Sir کے سامنے آتے ہیں تو اُن کے سامنے ہاتھ کھُلے چھوڑتے ہوئے اِس قدر جھکتے ہیں جیسے نماز میں رکوع کی حالت ہوتی ہے، اسی طرح کراٹے کے اختتام پر جھکنے کا قانون ہوتا ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے یہ امر ناجائز ہے، اگر جوڈو کراٹے سیکھنے والے لڑکے، مسلمان ہوں تو اِن کے لیے شرعاً اِس طرح جھکنا ناجائز ہوگا۔

حدیث میں ہے: ایک صاحب نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا اپنے دوست سے ملے تو اس کی اجازت ہے کہ اس کے سامنے جھکے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔

(ترمذی، رقم: ۲۷۲۹، باب ماجاء فی المصافحۃ)

ممانعت کی وجہ کیا ہے؟ فإنه في معنى الركوع وهو كالسجود من عبادة الله سبحانه. (۱) یعنی جھکنا رکوع کے مشابہ ہے اور یہ سجدہ کی طرح ہے اور جیسے غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنا حرام ہے، رکوع کرنا بھی حرام ہے؛ لہٰذا صرف جھکنا یا سلام کے ساتھ جھکنا جس طرح کورنش بجالاتے ہیں ممنوع ہے۔

مولانا یوسف صاحب لدھیانویؒ لکھتے ہیں:

> مجوسیوں کے یہاں یہی طریقہ تھا کہ وہ بادشاہوں، امیروں اور افسروں کے سامنے جھکتے تھے، اسلام میں اِس فعل کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، ٹریننگ کا مذکورہ اصول اسلامی احکام کے منافی ہے۔
>
> (آپ کے مسائل: ۲۶۶/۷)

لہٰذا مسلم بچوں کو اِس سے پرہیز کرنا چاہیے اور سینٹر کے ذمہ داروں کو اسلامی احکام سے رُوشناس کرانا چاہیے، ان شاء اللہ وہ مان جائیں گے، اگر نہ مانیں تو مسلم بچوں کو انکار کرنا چاہیے؛ کیوں کہ خدا کی ناراضی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

مجلس کا ایک ادب

اگر مجلس میں کوئی خاص گفتگو ہو رہی ہو تو نئے آنے والے کو چاہیے کہ خواہ مخواہ سلام کر کے

---

(۱) تحفۃ الاحوذی: ۴۲۶/۷.

اپنی طرف متوجہ کر کے سلسلہ گفتگو میں مزاحم نہ ہو؛ بلکہ چاہیے کہ چپکے سے نظر بچا کر بیٹھ جائے، پھر موقع سے سلام وغیرہ کر سکتا ہے۔ (آداب المعاشرت در اصلاحی نصاب: ۴۷۱)

سلام صاف الفاظ میں کیجیے

جب سلام کیا جائے تو صاف الفاظ سے سلام کرنا چاہیے، الفاظ بگاڑ کر مسخ کر کے سلام نہیں کرنا چاہیے، بعض لوگ اس طرح سلام کرتے ہیں کہ جس کی وجہ سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا الفاظ کہے؟ اُسے پوری طرح واضح کر کے السلام علیکم کہنا چاہیے۔ (اصلاحی خطبات: ۶/۱۶۱)

اہل السنۃ والجماعۃ اور اہل بدعت کی مخلوط مجلس میں سلام

اگر کوئی مسلمان شخص کا گذر ایسی جگہ سے ہو؛ جہاں اہل السنۃ والجماعۃ اور اہل بدعت: دونوں موجود ہیں تو سلام عمومی الفاظ کے ساتھ ہی کرے یعنی السلام علیکم کہے؛ البتہ نیت یہ کرے کہ وہ اہل السُّنۃ کو سلام کرر ہا ہے، یہی حکم اُس وقت ہے جب مجلس میں اچھے برے، انصاف پسند اور ظالم اور محبوب ومبغوض دونوں طرح کے لوگ موجود ہوں۔ (فتح الباری: ۱۱/۴۸)

دیوار یا پردہ کے پیچھے سے کوئی سلام کرے تو؟

اگر کوئی شخص کسی کو پردے یا دیوار کے پیچھے سے آواز دیتے ہوئے کہے: السلام علیکم اگر آواز سنائی دے تو سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ (الأذکار: ۲۸۲)

ریڈیو پر سلام کا جواب واجب نہیں

بلا ضرورت خبریں سننا ہی جائز نہیں؛ اِس لیے ریڈیو پر سلام سننے اور اُس کا جواب دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؛ اگر کسی ضرورت واقعیہ سے خبریں سن رہا ہے اور ریڈیو پر سلام سن لیا، تو اس کا جواب دینا جائز نہیں؛ اس لیے کہ یہ سلام سنت کے خلاف اور بے موقع ہے، وعظ وتقریر اور کسی امر کی عام اشاعت اور اعلان سے قبل سلام، حضور اکرم ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم وتابعین

اور سلف صالحین سے ثابت نہیں۔(احسن الفتاویٰ:۱۳۸/۸)

تنبیہ: پیچھے مفتی محمود صاحبؒ کا ایک فتویٰ اِس تعلق سے گذرا ہے، کچھ شرطوں کے ساتھ انہوں نے جواب دینے کو احوط بتایا ہے۔ دیکھیے: ''ٹیپ رکارڈ، ریڈیو وغیرہ سے کیا گیا سلام، ص:۱۹۷''

تحیہ کے طور پر سجدہ ناجائز ہے

امام جصاصؒ نے لکھا ہے:

> کہ انبیاءِ سابقین کی شریعت میں بڑوں کی تعظیم اور تحیہ کے لیے سجدہ مباح تھا، شریعت محمدیہ میں منسوخ ہو گیا، اور بڑوں کی تعظیم کے لیے صرف سلام ومصافحہ کی اجازت دی گئی ہے، رکوع سجدہ اور بہ ہیئت نماز ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کو ناجائز قرار دے دیا گیا۔
>
> (أحکام القرآن:۴۷/۱)

ناپاک شخص کا سلام کرنا

جب آدمی کو غسل کی ضرورت ہو تو اس حالت میں قرآن مجید پڑھنے، قرآن مجید چھونے اور مسجد میں داخل ہونے کی ممانعت ہے؛ چوں کہ نماز بھی قرآن ہی سے متعلق ہے؛ اِس لیے اس حالت میں نماز بھی ادا نہیں کی جاسکتی، باقی دوسرے اذکار پڑھنے کی، قرآن وحدیث میں کہیں ممانعت وارد نہیں ہوئی ہے؛ اِس لیے اس حالت میں قرآن کی آیات لکھے ہوئے کاغذ کا جیب میں رکھنا، سلام، اللہ اکبر کہنا...... جائز ہے۔(کتاب الفتاویٰ:۶۶/۲)

جو شخص سلام کا جواب نہیں دیتا اُسے سلام کرنا چاہیے یا نہیں؟

سلام کرنا سنت ہے؛ لیکن جواب دینا واجب ہے، کوئی شخص اگر سلام کا جواب نہیں دیتا تو وہ ایک واجب کا تارک ہوتا ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہے جو سلام کا جواب ہی نہیں دیتا تو اُسے سلام کرنا چاہیے یا نہیں؟ اِس سلسلے میں مسئلہ یہ ہے کہ ایسے شخص کو سلام کرنا چاہیے، ہوسکتا ہے وہ

جواب دیتا ہو لیکن آہستہ، اور اگر جواب نہیں دیتا ہے تو جواب نہ دینے کی کوئی خاص وجہ ہوگی اگر ایسا ہے تو پہلی فرصت میں اس کی طرف توجہ دے مثلاً: باپ بیٹے سے یا استاذ شاگرد سے کسی دینی معاملہ کی وجہ سے ناراض ہے اور بیٹا یا شاگرد اسے سلام کرتے ہیں؛ لیکن وہ لوگ جواب نہیں دیتے، تو بیٹے اور شاگرد کو ناراضگی دور کرنی چاہیے، اُن کا جواب نہ دینا ادب وتہذیب سکھانے کے لیے ہے؛ اگر یہ سب باتیں نہیں ہیں پھر بھی سلام کرنا چاہیے، کم از کم فرشتے تو جواب دیں گے؛ الادب المفرد کی ایک روایت پڑھیے:

> حضرت عبداللہ بن الصامتؒ نے حضرت ابوذرؓ سے کہا: کہ میرا گذر حضرت عبدالرحمٰن بن ام الحکم کے پاس سے ہوا تو میں نے سلام کیا؛ لیکن انہوں نے جواب نہیں دیا، حضرت ابوذرؓ نے کہا: بھتیجے! انہوں نے جواب نہیں دیا تو کیا ہوا، تمہیں تو اُس نے جواب دیا ہے جو اُن سے بہتر ہے یعنی تمہارے دائیں جانب رہنے والے فرشتے نے تمہیں جواب دیا ہے۔ (الأدب المفرد، رقم:۹۷۴، باب من لم یرد السلام)
>
> اور جو لوگ بلا وجہ سلام کا جواب نہیں دیتے، انہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پڑھنی چاہیے کہ دھوکے میں رہنے والا ہی سلام کا جواب نہیں دیتا، حضورﷺ کا ارشاد ہے: ومن لم یجب السلام فلیس منا کہ جو شخص بلا وجہ سلام کا جواب نہیں دیتا وہ ہمارے طریقہ سے ہٹا ہوا ہے۔ (عمل الیوم لابن السنی، رقم:۲۱۱)

مسئلہ: لیکن اگر کوئی بدنصیب ایسا ہے جو سلام کرنے سے غصہ اور ناراض ہوتا ہے، لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو ایسے شخص کو سلام نہ کرنا ہی بہتر ہے، سلام کر کے فتنہ کو دعوت دینا بہر حال درست نہیں۔

علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں: من خاف من مکالمة أحد، وصلته ما یفسد علیه

الدين، أو يدخل مضرة في دنياه، يجوزله مجانبته و البعد عنه، ورب هجر حسن، خير من مخالطة موذية. (بذل المجهود:۱۳/۳۲۰)

غالب گمان ہو کہ جواب نہیں دے گا تو؟

اگر کسی کے بارے میں یہ خیال ہو کہ اُسے سلام کریں گے تو یہ جواب نہیں دے گا؛ کیوں کہ متکبر معلوم ہوتا ہے یا لا پرواہ معلوم ہوتا ہے؛ لہٰذا اُسے سلام کر کے کیا فائدہ، علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: کہ ایسا خیال درست نہیں؛ بلکہ ایسے شخص کو بھی سلام کرنا چاہیے، خیال غلط بھی ہو سکتا ہے، اور مومن کے ساتھ تو حسن ظن کا حکم ہے۔ (عمدۃ القاری:۱۵/۳۵۵)

دو مسلمان میں بات چیت بند ہو تو سلام کر کے بات چیت شروع کرنا

سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں، ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان بھائی سے ترکِ تعلقات، ترکِ تکلم جائز نہیں ہے؛ بالخصوص جب کہ بات چیت بند کرنے کا سبب کوئی دینی یا اصلاحی سبب نہ ہو؛ بلکہ اخوت و محبت اور ادائے حقوق میں کوتاہی کی وجہ سے ہو تو اس سلسلے میں احادیث میں وعید آئی ہے؛ لہٰذا اگر بلا سببِ شرعی بات چیت بند ہو تو پہلی فرصت میں اس سے ملاقات کر کے سلام و کلام شروع کر دے، فرمان نبوی ہے:

کسی مومن کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے مومن سے تین دنوں سے زیادہ بات چیت بند رکھے؛ چناں چہ اگر تین دن گذر گئے تو اس سے ملاقات کر کے اُسے سلام کرنا چاہیے، اگر وہ سلام کا جواب دیتا ہے تو دونوں بات چیت شروع کرنے کے ثواب میں شریک ہوں گے اور اگر اُس نے جواب نہیں دیا تو گناہوں میں گرفتار ہوگا۔ (ابوداؤد:۴۹۱۲، باب فی ھجرۃ الرجل أخاہ)

تشریح: معلوم ہوا کہ سلام از سرنو بات چیت کا بہترین ذریعہ ہے، اور پہلا مومن اگر اقدام کرتا ہے تو دوسرے مومن پر لازم ہے کہ وہ اُس کا استقبال کرے، گلے لگائے اور سلام کا جواب دے، اس سے محبت میں پختگی پیدا ہوگی جو سلام کا عین مقصد ہے؛ اگر خدانخواستہ اس نے سلام کا جواب

نہیں دیا تو نہ صرف یہ کہ دنیا میں مزید عداوت ودشمنی کا سبب ہوگا؛ بلکہ آخرت میں خسارہ ونقصان اٹھانا پڑے گا، یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام میں محبت والفت اور اتحاد واتفاق کی بڑی اہمیت ہے۔

سلام کا جواب نہ دینے پر ٹوکنا مستحب ہے

اگر کوئی شخص سلام کا جواب نہ دے تو اُسے ٹوکنا مستحب ہے، اگر سلام کرنے والا بڑا ہے یا دونوں میں دوستانہ تعلقات ہیں تو جواب نہ دینے والے سے کہہ سکتے ہیں کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے، جواب نہ دینے سے گناہ ہوگا اور سمجھانا پرسکون اور لطیف انداز میں ہو، ہنگامہ اور لڑائی جھگڑے کے انداز میں نہ ہو، ان شاء اللہ اثر ہوگا۔ (الأذکار: ۲۹۵)

(دوسری فصل)

غیر مسلموں کو سلام کرنا یا اُن کے سلام کا جواب دینا

اسلامی سلام "السلام علیکم" آپس میں موانست، اظہارِ محبت اور ادائے حقِ محبت واخوت کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عبادت بھی ہے، نیز اسے اسلامی شعار کا درجہ حاصل ہے؛ لہٰذا اس سلام کے تبادلہ کے مستحقِ اولین وہی لوگ ہو سکتے ہیں، جنہیں ایمان کی دولت ملی ہو، اور جو لوگ ایمان جیسی بنیادی دولت سے ہی محروم ہیں، وہ اس کے مستحق نہیں ہو سکتے۔(۱)

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہودیوں اور عیسائیوں کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو اور جب تم راستے میں ان سے ملو تو تنگ ترین راستے پر چلے جانے پر مجبور کرو۔(ترمذی:۱۵۹۵)

صاحبِ مظاہرِ حق اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

> سلام میں پہل کرنا، درحقیقت اسلامی تہذیب کا بخشا ہوا ایک اعزاز ہے، جس کے مستحق وہی لوگ ہو سکتے ہیں، جو اسلامی تہذیب کے پیرو ہوں اور مسلمان ہیں، اس اعزاز کا استحقاق اُن لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکتا، جو دین کے دشمن اور خدا کے باغی ہیں؛ اِسی طرح اُن باغیوں اور دشمنوں کے ساتھ سلام اور اِس جیسی دوسری چیزوں کے ذریعہ الفت ومحبت کے مَراسم کو قائم کرنا بھی جائز نہیں ہے۔(۳۴۰/۵)

---

(۱) قرآن کریم میں ہے: قال سلام عليك سأستغفر لك ربي (مریم:۴۷) اِس سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ ابتداءً ایک مسلمان غیر مسلم کو سلام کر سکتا ہے؛ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے والد کو سلام کیا؛ لیکن یہ استدلال درست نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ سلامِ تحیہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ سلامِ مُسالمت ومتارکت ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے ''سلام کی قسمیں''، ص:۵۵

بلکہ علامہ نوویؒ نے یہاں تک لکھا ہے کہ:

> اسلامی سلطنت میں رہنے والے کسی مسلمان نے کسی اجنبی کو سلام کیا اور پھر معلوم ہوا کہ وہ غیر مسلم ہے، تو اِس صورت میں مستحب یہ ہے کہ اپنے سلام کو واپس کرنے کا مطالبہ کرے، یوں کہے:
>
> استرجعتُ سلامي میرا اسلام واپس کرو. (اوجز:۱۸۹/۱۷)

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غیر مسلم اِس دعائیہ جملے کے مستحق نہیں ہیں؛ اسی لیے حدیث کے آخری ٹکڑے ’’کہ انہیں تنگ ترین راستے پر چلنے پر مجبور کرو‘‘ کا مطلب ابن حجرؒ نے، علامہ قرطبیؒ کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ: ’جب راستہ تنگ ہو تو ان کے اکرام میں الگ مت ہو؛ بلکہ چلتے رہو، انہیں ہٹنے پر مجبور کرو؛ تاکہ اُن کا اعزاز نہ ہو۔ (فتح الباری:۴۹/۱۳)

اس کی مزید وضاحت حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی مایہ ناز تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے، جس کی تشریح اُس کتاب کے محقق شارح مفتی سعید احمد صاحب نے اپنے الفاظ میں یوں کی ہے:

> نبی ﷺ کے مقاصد میں سے ایک مقصد ملتِ اسلامیہ کی شان بلند کرنا، اور اس کو سب ملتوں سے اعلیٰ واعظم بنانا ہے، اور یہ مقصد اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب مسلمانوں کے لیے غیر مسلموں پر قدرت وغلبہ ہو، مذکورہ حکم (غیر مسلموں کو سلام میں پہل نہ کرنا) اسی نقطہ نظر سے دیا گیا ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعۃ:۵۴۸/۵)

ان تصریحات کا حاصل یہ ہوا: کہ مذہبی امور، اہل مذہب کے ساتھ خاص رہنے چاہئیں، مذہب واعتقاد میں ہم غیر اقوام کو شریک نہیں کر سکتے، اور کیسے کر سکتے ہیں، ہم خدا کے حامی ہیں، وہ خدا کے باغی ہیں۔

ایک مرکزی نقطہ: مذکورہ حکم وہاں ہوگا جہاں اسلام کو غلبہ حاصل ہو، اسلامی مملکت ہو، وہاں کے

رہنے والے غیر مسلم، (مشرکین، یہود اور نصاریٰ وغیرہ) مسلمانوں کے ماتحت ہوں، اپنے ملک ہندوستان کا مسئلہ الگ ہے؛ اِس لیے یہاں درجِ ذیل نکتہ یاد رکھنا چاہیے:

مسلمان اور غیر اقوام کے تعلقات کی دو نوعتیں ہیں: ایک مذہبی و اعتقادی، دوسرے سماجی و اقتصادی۔

مذہبی اور اعتقادی حیثیت سے ایک مسلمان اور غیر مسلمان کے مابین تعلقات، اسلام کو پسند نہیں، ایمان و کفر کی دیوار جو ایک مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان حائل ہے، مذہبی اور اعتقادی معاملات میں اُس دیوار کا نہ صرف حائل رہنا ضروری ہے؛ بلکہ اس دیوار کا سدِ سکندری سے زیادہ مضبوط ہونا ضروری ہے؛ اِس لیے مذہبی، اسلامی اور تہذیبی اعتبار سے مسلمانوں کو، غیر مسلموں سے دور رہنا چاہیے، ورنہ اصل سرمایہ اور پونجی کے ضیاع کا خطرہ ہر وقت رہے گا، فقہاء مذہبی و اعتقادی تعلقات کو ''مُوَالات'' کہتے ہیں، جس کا مطلب ہے: غیر مسلموں سے ایسا تعلق کہ انسان اُن کا اثر قبول کرنے لگے، یہ ممنوع ہے اور یہی مطلب ہے قرآن کی اِس آیت کا

لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ أَوْلِيَاء . (الممتحنۃ:۱)

میرے اور اپنے دشمن کو دوست مت بناؤ۔

البتہ سماجی یا اقتصادی اعتبار سے، علاقہ اور زبان کے اِتحاد کے اعتبار سے، مسلمان کا غیر مسلموں کے ساتھ رہنا، بات چیت کرنا، صاحب سلامت کرنا، اُن کی مدد کر دینا اور اُن کے غم میں شریک ہو جانا وغیرہ جسے اردو میں ''حسنِ سلوک'' اور اصطلاحِ فقہ میں ''مواسات'' کہتے ہیں، جائز ہے، اِس اعتبار سے غیر مسلموں کے ساتھ برادرانہ تعلقات رکھنا اور انسانی بھائی چارہ کی بنیاد پر انہیں عزت واحترام کا مقام دینا جائز ہے، حضور ﷺ کا غیر مسلموں کی مہمان نوازی، ممانعت سے پہلے منافقین کی نمازہ جنازہ تک پڑھنا، یہودیوں کے ساتھ حسن سلوک، یہودی بچے کی عیادت، غزوہ بدر کے قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک، اِس دوسری قسم کے تعلقات کی بنیاد پر تھا۔

ملک ہندوستان میں مسلمان اور غیر مسلم عموماً باہم مل کر رہتے ہیں، مسلمانوں کو اِس

مرکزی نقطہ اور تعلقات کی دونوں قسموں کو ہر وقت، ہر جگہ ملحوظ رکھنا چاہیے، اور اِس فرق سے حدیث وفقہ کے بہت سارے مسائل حل ہو جائیں گے، دیکھیے: نمستے اور نمشکار یا ہاتھ جوڑنا، پاؤں چھونا غیر مسلموں کا اعتقادی مسئلہ ہے، ہمارے لیے ایسا کرنا ناجائز ہوگا، السلام علیکم کہنا اسلامی عقیدہ ہے، ہم غیر مسلموں کے ساتھ اس کلمہ کا تبادلہ بلاضرورت نہیں کر سکتے، اداب عرض ہے، سلام اور گڈ مارننگ وغیرہ سماجی تعلقات کے دائرے میں آتے ہیں، اِن کا تبادلہ جائز ہوگا۔

عالمگیری میں ہے:

> ذمی کافروں کو سلام کرنے کے سلسلے میں مشائخ کا اختلاف ہے، بعض نے کہا ہے کہ سلام کر سکتا ہے، اور بعض نے کہا: اگر کوئی ضرورت پیش نہ آئے تو سلام نہ کرے اور اگر کوئی ضرورت پیش آئے تو سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (ہندیہ: ۳۲۵/۵)

یہ ضرورت وحاجت والی قید آپ فقہاء احناف کی کتابوں میں دیکھ سکتے ہیں؛ اس ''ضرورت وحاجت'' کا مطلب یہی ہے کہ سماجی واقتصادی ضرورت کے تحت اُن سے سلام ودعا کا تعلق رکھ سکتے ہیں۔

ابن حجرؒ کی بات کا خلاصہ پڑھیے:

اوپر جو تفصیل آئی کہ غیر مسلموں کو سلام نہ کیا جائے، یہ اُس وقت ہے جب ابتداءً کوئی مسلمان بلاضرورت سلام کرے؛ لیکن اگر کوئی ملکی یا ملی مصلحت وضرورت ہو یا غیر مسلموں سے دوستانہ تعلقات ہوں یا مُجاوَرت وپڑوس کا رشتہ ہو یا کوئی انسانی واخلاقی تعلقات ہوں؛ تو ایسی صورتوں میں "السلام علیکم" کے علاوہ دوسرے عمومی الفاظ کہہ سکتے ہیں، جس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو مثلاً: السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین کہہ سکتے ہیں، آپ نے ہرقل نامی بادشاہ کو خط میں سلامٌ علی من اتبع الھدی لکھا تھا؛ چناں چہ ابن ابی شیبہ(۱) میں ہے:

(۱) یہ حدیث اصل کتاب میں یوں ہے: إذا دخلت بیتا فیہ المشرکون فقل: السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین، مصنف ابن أبي شیبۃ: ۲۵۹۸۹.

إذا سلمت على المشركين، فقل: السلام علينا وعلى عباد الله الصالحين؛ اِس کا فائدہ یہ ہوگا کہ (سماجی) تعلقات برقرار رہیں گے۔

ابن حجرؒ نے آگے ایک روایت نقل کی ہے: حضرت علقمہؒ کہتے ہیں: کہ میں حضرت ابن مسعودؓ کے ساتھ سواری پر پیچھے بیٹھا ہوا تھا، راستے میں ایک دہقانی ہمارے ساتھ ہوگیا، جب اُس کا اصل راستہ آگیا تو وہ ادھر کو چلا گیا؛ چناں چہ ابن مسعودؓ نے اس کے پیچھے نگاہ دوڑائی اور کہا: السلام علیکم میں نے پوچھا: کیا آپ انہیں ابتداءً سلام کرنا مکروہ نہیں سمجھتے، انہوں نے کہا: کیوں نہیں مکروہ سمجھتا ہوں ولكن حق الصحبة؛ لیکن یہ حق رفاقت ہے۔(۱)(فتح الباری:۱۳/ ۵۱)

کیا یہود ونصاریٰ کو سلام نہ کرنے کا حکم وقتی تھا؟ ایک تحقیق

امام ترمذیؒ نے لا تبدأوا اليهود والنصارىٰ بالسلام والی روایت سنن ترمذی میں نقل کی ہے: (دیکھیے حدیث: ۱۵۹۵) اِس حدیث کی تشریح اوپر گذری، امام ترمذیؒ نے پہلے ٹکڑے کی وجہ یہ لکھی ہے: قال بعض أهل العلم: إنما معنى الكراهة: لأنه يكون تعظيما لهم، وإنما أمر المسلمون بتذليلهم. یعنی ممانعت کی وجہ صرف یہ ہے کہ سلام میں پہل کرنے میں ان کی تعظیم ہے اور مسلمانوں کو اُن کی تذلیل کا حکم دیا گیا ہے، اور دوسرے ٹکڑے یعنی اُن کو دائیں بائیں ہٹنے پر مجبور کرو، اس کی بھی یہی وجہ بتائی ہے کہ اگر اُن کو راستہ دیں گے تو اس میں اُن کی تعظیم ہوگی، عموماً دوسرے شارحین نے بھی مذکورہ حدیث کی یہی وجہ لکھی ہے، حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب نے اِس علت اور وجہ پر ایک سوال اٹھایا ہے وہ لکھتے ہیں:

یہ وجہ غور طلب ہے کہ قرآن وحدیث میں کہیں غیر مسلم شہریوں کو ذلیل کرنے کا حکم نہیں؛ ایسی صورت میں کوئی غیر مسلم کسی مسلم ملک کا شہری بن کر نہیں رہ سکتا۔(تحفۃ الالمعی: ۴/ ۵۴۷)

اب سوال یہ ہے کہ ممانعت کی اصل وجہ کیا ہے؟ اِس سلسلے میں انہوں نے لطیف انداز میں گفتگو کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

---

(۱) تفصیلی روایت کے لیے امام بیہقیؒ کی شعب الإیمان، رقم الحدیث: ۸۹۱۰ اور المصنف: ۶/ ۱۵۴ دیکھیں.

مدینہ منورہ اور اُس کے قرب وجوار میں یہودی آباد تھے،وہ مسلمانوں کوسلام کیا کرتے تھے؛ مگر وہ یہ حرکت کرتے تھے کہ السلام علیکم کے بجائے السام علیکم کہتے تھے،جس کے معنی ہیں: تم مرو، جب نبی ﷺ کواس حرکت کا علم ہواتو آپ نے صحابہ سے فرمایا: یہود السام علیکم کہتے ہیں،پس تم جواب میں علیکم کہو یعنی ہم نہیں تم مرو؛ چناں چہ یہودیوں نے یہ حرکت چھوڑ دی۔

اور اِس حدیث میں نبی ﷺ نے مسلمانوں کو دو حکم اور دیے ہیں، ایک اُن کوسلام کرنے میں پہل نہ کی جائے ،دوسرا جب آمنا سامنا ہوتو اُن کودائیں بائیں ہٹنے پر مجبور کیا جائے ،یہ دونوں حکم آپ نے مسلمانوں کے احساسِ کمتری کوختم کرنے کے لیے دیئے تھے۔

اِس کی تفصیل یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جو یہودی آباد تھے وہ مذہب، سیاست، تعلیم، کاروبار اور مال ودولت میں مشرکین سے آگے تھے، اور مشرکین اُن کو اپنے سے برتر سمجھتے تھے، پھر جب اسلام کا زمانہ آیا تو مشرکین مسلمان ہو گئے؛ مگر اصلی یہود عام طور پر مسلمان نہیں ہوئے، صرف وہ عرب جو یہودی بن گئے تھے، مسلمان ہوئے، اُن مسلمانوں کے دلوں میں پہلے سے یہودیوں کی عظمت جاگزیں تھی، وہ اب بھی یہودیوں کو اپنے سے افضل سمجھتے تھے، اِس احساسِ کمتری کوختم کرنے کے لیے نبی ﷺ نے مذکورہ دونوں حکم دیے ہیں؛ پس یہ وقتی احکام تھے (احساس کمتری ختم کرنے کی ایک تدبیر تھی) اور اُن کی سیاسی مصلحت تھی، اب

اہلِ کتاب کو ابتداءً سلام بھی کر سکتے ہیں، اور اُن کے سلام کا جواب بھی دے سکتے ہیں (۱) اِسی طرح مسلمان بھی راستہ سے ہٹ سکتا ہے۔(تحفۃ الالمعی:۵۳۶/۴)

غیر مسلم کو نمشکار کرنا اور ہاتھ جوڑنا

نمستے اور نمشکار غیر اسلامی اور مشرکانہ عقیدہ پر مبنی تعبیرات ہیں؛ اس لیے مسلمانوں کے لیے ایسے الفاظ کا کہنا قطعاً درست نہیں، ہاتھ جوڑنا بھی غیر اسلامی طریقہ ہے، زبان سے آداب وغیرہ کہہ دینا درست ہے؛ بوقتِ ضرورت سلام بھی کیا جاسکتا ہے؛ لیکن سلام میں کفر وشرک سے سلامتی کا معنی ذہن میں رکھا جائے تو بہتر ہے۔(کفایت المفتی:۳۴۶/۱)

نمستے، پرنام یا ست شری اکال کہنا

مذکورہ کلمات غیر مسلموں کے یہاں مذہبی شعار کے طور پر استعمال ہوتے ہیں؛ اس لیے مسلمان کے لیے اِن کا استعمال ممنوع ہے: لقوله عليه السلام: من تشبه بقوم فهو منهم اِن کلمات کے بجائے ''آداب عرض'' کہہ لینے کی گنجائش ہے۔(فتاویٰ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند:۹۲۸۳)

اسکول، کالج میں مسلم بچے سلام کیسے کریں؟

اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے والے مسلم بچے کافی تعداد میں ہوتے ہیں، اور ان کے اساتذہ غیر مسلم بھی ہوتے ہیں، اسی طرح بہت سے مسلم بچے کوچنگ کرتے ہیں، بہت سے ٹیوشن پڑھتے ہیں اور وہاں غیر مسلم ٹیچرس ہوتے ہیں، وہاں بھی مسلمان بچوں کے لیے اپنے Sir کو السلام علیکم کہنا درست نہیں اور نہ ہی نمستے اور پرنام کہنا جائز ہے، حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

مسلمانوں کے بچے سرکاری اسکولوں میں پڑھتے ہیں، اُن کو بھی

---

(۱) لیکن واقعی وہ اہلِ کتاب (یہودی وعیسائی) ہوں، آج کل کے اکثر اہلِ کتاب دہریہ قسم کے ہیں؛ اس لیے اُن کا حکم مشرکین وکفار جیسا ہونا چاہیے۔

انگریزی یا ہندوانہ طریق سے سلام نہ کرنا چاہیے؛ بلکہ شرعی طریقے
پر استاذوں وغیرہ کو سلام کرنا چاہیے؛ اگر استاذ کافر ہو تو اُس کو
صرف سلام یا السلام علی من اتبع الھدیٰ کہنا چاہیے، کافروں
کے لیے السلام علیکم کے الفاظ نہ استعمال کرنا چاہیے۔

(بہشتی زیور کامل: ۳۶۴)

غیر مسلم بھائیوں کو کس طرح سلام کرنا چاہیے؟

سوال: (۲۰۷) میرے غیر مسلم دوست بھی ہیں، غیر مسلم دوست کو کس طرح سلام کرنا چاہیے؟

جواب: سلام کے جو الفاظ ہم ایک دوسرے کو کہتے ہیں یعنی "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" یہ اصل میں مسلمانوں کو کہنے کے لیے ہیں، اس میں مخاطب کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جاتی ہے، جو لوگ اللہ کے وجود ہی کو نہ مانتے ہوں یا اس طرح نہ مانتے ہوں جس طرح ماننے کا حق ہے، اور خدا کے بارے میں اُن کا عقیدہ ہی مختلف ہو، اُن کو اِس طرح کی دعا دینا ایک بے معنی بات ہوگی؛ اِس لیے غیر مسلم بھائیوں کے لیے محبت اور احترام کا کوئی مناسب لفظ استعمال کرنا چاہیے، جیسے آداب، گڈ مارننگ وغیرہ اور اگر وہ خود سلام کریں تو اس کے جواب میں صرف "وعلیکم" کہنے پر اِکتفاء کرنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح جواب دینے کی تلقین فرمائی ہے۔ (کتاب الفتاوی: ۶/ ۱۱۸)

غیر مسلم بچوں کو سلام کرنا

سوال: غیر مسلم بچوں کو سلام کرنا کیسا ہے؟ کیوں کہ وہ ابھی اسلامی فطرت پر ہیں۔

جواب: السلام علی من اتبع الھدیٰ کے الفاظ سے کر لینا بہتر ہے۔

(دار الافتاء دار العلوم دیو بند: ۱۰۵۵۱)

رام رام کہنا: رام رام کہنا سلام شرعی کی جگہ گناہ ہے کہ یہ کفار کا شعار ہے۔ (کفایت المفتی: ۹/ ۹۴)

اگر غیر مسلم، مسلمان کو السلام علیکم کہہ دے تو؟

حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے: کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تمہیں اہل کتاب سلام کریں تو جواب میں "وعلیکم" کہو۔ (بخاری:۶۲۵۸)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تمہیں یہود سلام کرتے ہیں تو اُن کا ہر ایک آدمی السام علیك (تم مرجاؤ) کہتا ہے تو تم جواب میں وعلیك کہو۔ (بخاری:۶۲۵۶)

معلوم ہوا کہ اگر وہ (اہل کتاب، کفار ومشرکین) خود پہل کریں اور السلام علیکم یا السلام علیك کہیں تو اس کے جواب میں صرف "وعلیکم" یا "وعلیك" کہہ دیا جائے، اور بغیر واو کے بھی (۱) صرف "علیکم" یا "علیك" کہہ سکتے ہیں اور علماء نے لکھا ہے: کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ غیر مسلم کے جواب میں "هداك الله" (اللہ تجھے ہدایت دے) کہا جائے۔ (مظاہر حق:۳۴۰/۵)

اگر غیر مسلم، مسلم کو نمستے کہے

اگر کوئی غیر مسلم، نمستے کہے تو جواب میں نمستے نہ کہا جائے؛ بلکہ "هداك الله" اور "سلام" کہہ دیا جائے، فقط "سلام" کہہ دینا بھی درست ہے۔ (محمودیہ:۹۳/۱۹)

لا مذہب کو سلام کرنا

لا مذہب جیسے کمیونسٹ سوشلسٹ، دہریہ وغیرہ کو سلام کرنا مکروہ ہے، یہی حکم مرتد کا بھی ہے۔ (اہمیت سلام وملاقات:۳۸)

کافر کو سلام کہلوانا

اگر کوئی غیر مسلم اپنے مسلمان دوست یا بزنس پارٹنر سے کہے مثلاً زید کو نمستے، جے رام جی کہہ دینا تو زید سے یہ جملے کہنا جائز نہیں؛ بلکہ وہ اُس سے کہے گا: کہ فلاں نے تمہیں سلام

---

(۱) احادیث میں "وعلیکم" اور "علیکم" دونوں طرح منقول ہے؛ اس لیے دونوں طرح کہنا صحیح ہے، روایة الحذف أحسن معنیً، والإثبات أصح وأشهر. أوجز:۱۸۶/۱۹، زاد المعاد:۳۸۶/۲.

کہا ہے؛ کیوں کہ نمستے، ہندو مذہب کا شعار ہے، نیز اس کے معنی بندگی کے بھی آتے ہیں، اور جے رام (۱) یہ عجم کے ایک باطل پیغمبر کا نام ہے۔ (محمودیہ: ۹۱/۱۹)

ہدایت کی امید پر سلام کر سکتے ہیں

جب کوئی خاص ضرورت نہ ہو تو کافروں کو نہ سلام کرے اور اسی طرح فاسقوں کو بھی، اور جب کوئی حاجت ضروری ہو تو مضائقہ نہیں، اور اگر اُس کے سلام اور کلام کرنے سے ان کی ہدایت پر آنے کی امید ہو تو بھی سلام کرے۔ (بہشتی زیور کامل: ۱۱/۷۴۷)

مسلم اور غیر مسلم کی مخلوط مجلس میں کیسے سلام کرے؟

موجودہ دور میں؛ خصوصاً ہمارے ہندوستان میں اکثر جگہیں ایسی ہیں، جہاں مسلم و غیر مسلم سب مل کر کام کرتے ہیں، مثلاً: سرکاری و غیر سرکاری آفس، کارخانے اور اسکول و کالج وغیرہ تو وہاں ایک دین دار مسلمان کیا کرے؟

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

اگر کوئی مسلمان کسی ایسی جماعت کے پاس سے گذرے یا کسی ایسی مجلس میں پہنچے، جس میں مسلمان بھی ہوں اور غیر مسلم بھی اور مسلمان خواہ ایک ہی ہو یا کئی ہوں، تو مسنون یہ ہے کہ مسلمانوں کا قصد کر کے پوری جماعت کو سلام کرے۔ (۲) نیز علماء نے لکھا ہے: کہ اس صورت میں چاہے تو السلام علیکم کہے: اور نیت یہ رکھے کہ اس سلام کے اصل مخاطب مسلمان ہیں اور چاہے یوں کہے

---

(۱) جو چیزیں دوسری قوموں کی مذہبی وضع ہیں، ان کو اختیار کرنا کفر ہوگا، جیسے صلیب لٹکانا، سر پر چوٹی رکھ لینا......یا جے پکارنا، حیاۃ المسلمین: ۲۴۵.

(۲) بخاری میں حضرت اسامہ بن زیدؓ سے مروی ہے: أن النبي ﷺ مَرَّ في مجلسٍ فيه أخلاط من المسلمين والمشركين وعَبَدَةِ الأوثان واليهود......فسلَّم عليهم النبي ﷺ. بخاری: ۶۲۵۴.

السلام علی من اتبع الھدی (اس پر سلامتی ہو جس نے راہ

ہدایت کی پیروی کی)(مظاہر حق:۵/۳۴۳)

آفس میں غیر مسلم کو گڈ مارننگ کہنا

سوال: کیا آفس میں کافر آدمی کو گڈ مارننگ کہا جا سکتا ہے؟

جواب: کبھی ضرورتاً کہہ دیا تو گنجائش ہے، غیروں کا شعار ہے؛ اس لیے بچنا بہتر ہے۔(فتاویٰ دار الافتاء دار العلوم دیو بند: ۸۵۴۸)

تبلیغ اسلام کے وقت کافر کو سلام کرنے کا طریقہ

جو شخص مسلمان نہیں ہے، اُس کو اسلام کی دعوت ایک نہایت بلیغ انداز میں دینے کے لیے اور اُن کو تبلیغی خطوط میں لکھنے کے لیے یا ان لوگوں سے دعوت وتبلیغ کے عنوان سے ملاقات کی صورت میں جو الفاظ نصوص شرعیہ سے ثابت ہیں وہ السلام علی من اتبع الھدی کا جملہ ہے، جو حقیقت میں ایک مُقیَّد سلام ہے، اور اُس میں دعوت کے ساتھ وعدہ اور وعید دونوں ہیں: کہ جو ہدایت کا تابع ہے وہ تو اللہ کے عذاب سے محفوظ ہے، اُس کے لیے دعاءِ سلامتی ہے، اور جس میں ہدایت کی صفت نہیں وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ نہیں اور نہ ہی اس کے لیے سلامتی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما الصلاۃ والسلام کا فرعون کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے سلسلے میں میں اُن دونوں کا قول نقل فرمایا ہے:

قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ وَالسَّلَامُ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى. (طٰہٰ:۴۷)

اور رسول اللہ ﷺ نے شاہِ روم، ہرقل کو خط میں لکھا تھا:

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم: من محمد عبد اللّٰہ ورسولہ إلی هرقل عظیم الروم، سلام علی من اتبع الھدی.(بخاری:۷)

اور یہ سلام، سلامِ تحیہ اور معروف سلام نہیں ہے؛ ورنہ تو حضور ﷺ نے کفار کو ابتداءً

سلام کرنے سے منع کیا ہے، اِس لفظ میں تمام کفار ومشرکین کو دعوتِ اسلام دینے کا ایک لطیف طریقہ ہے۔

لفظِ سلام کے علاوہ دوسرے الفاظ سے غیر مسلموں کو دعا دے سکتے ہیں یا نہیں؟

کسی مصلحت وضرورت اور سماجی واخلاقی ضرورت کے تحت غیر مسلموں کو دعا دے سکتے ہیں، اگر کوئی ضرورت اِس بات کی متقاضی نہیں ہے تو کچھ نہ کہے؛ کیوں کہ وہ خدا کے باغی ہیں، عزت واحترام کے جملے کے بھی مستحق نہیں؛ لیکن دعوت وتبلیغ کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے، بوقتِ ضرورت دعائیہ جملے کہہ سکتے ہیں، حضور ﷺ سے منقول ہے:

کہ آپ ﷺ کو پیاس لگی، ایک یہودی نے آپ کو پانی پلایا تو آپ نے اس کو یہ دعا دی جمَّلك الله (۱) (الأذکار: ۳۶۲)

ایک یہودی نے آپ ﷺ سے دعا کی درخواست کی، تو آپ نے اُسے پوری دعا دی:

كَثَّرَ اللهُ مَالَكَ وَوَلَدَك وأَصَحَّ جسمَك و أطَالَ عُمرَك اللہ مال واولاد میں برکت دے اور جسم وجان میں بھی برکت دے۔ (ابن ابی شیبہ: ۶/ ۱۵۰)

یہ سب دعائیں دنیاوی فائدے کے لیے ہیں؛ لہٰذا ایسی دعائیں دے سکتے ہیں، نیز ہدایت کی دعا بھی دے سکتے ہیں، مثلاً: هداك الله؛ لیکن مغفرت کی دعا دینا جائز نہیں مثلاً یوں کہنا: غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ. اللہ تمہیں معاف کرے وغیرہ۔

ولا يدعو له بالمغفرة، ولو دعا بالهدى جاز؛ لأنه عليه الصلاة والسلام قال: اللهم اهد قومي؛ فإنهم لا يعلمون. (تبیین الحقائق: ۶/ ۳۰)

ولا بأس بالدعاء بما يصلحه في دنياه. (التفسیرات الأحمدیۃ: ۲۷۲)

---

(۱) المصنف میں روایت اس طرح ہے: عن قتادة أن يهوديا حلب للنبي ﷺ ناقة فقال: اللهم جمّله، فأسود شعره. یعنی اللہ اچھا رکھے؛ چناں چہ اس دعا کے نتیجہ میں اس کے سفید بال سیاہ ہوگئے۔ المصنف: ۶/ ۱۵۰۔

طولِ عمر کی دعا کا مطلب

درازئ عمر کی دعا مثلاً: جیتے رہو، اللہ عمر دراز کرے کا مطلب فقہاء نے یہ لکھا ہے: کہ وہ لوگ زیادہ دنوں تک زندہ رہیں گے، تو ٹیکس ادا کریں گے؛ اس لیے مسلمانوں کو فائدہ ہوگا؛ لیکن اب جزیہ اور ٹیکس غیر مسلم نہیں دیتے اور نہ ہی ایسا نظام ہے؛ لہٰذا درازئ عمر کی دعا نہ دے، فقہاء نے منع لکھا ہے۔

ولو دعا له بطول العمر قيل: لا يجوز؛ لأنه فيه التمادي على الكفر، وقيل: يجوز؛ لأن في طول عمره، نفعاً للمسلمين بأداء الجزية؛ فيكون دعاء لهم. (تبیین الحقائق:۶/۳۰)

حضرت تھانویؒ کا طرزِ عمل

حضرتؒ کے افادات بنام ''اسلامی تہذیب'' میں ہے:

جب کوئی غیر مسلم سلام کرتا ہے تو میں ''جناب'' کہہ دیتا ہوں، دل میں یہ سمجھ لیتا ہوں کہ جنابت سے مشتق ہے، جس کا مطلب ہے کہ ناپاک؛ کیوں کہ وہ کافی غسل نہیں کرتے۔

اور کبھی ''سلام'' کہہ دیتا ہوں تو یہ ارادہ ہوتا ہے کہ اللہ تم کو کفر سے سلامتی بخشے، ......اور اگر غیر مسلم کے سلام کے جواب میں اشارہ ہی کردے تو تب بھی کافی ہے۔ (اسلامی تہذیب:۶۶)

ایک ہندوڈاکیہ کا سلام کرنا - ایک لطیفہ

حکیم اختر صاحبؒ نقل فرماتے ہیں: کہ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس، ایک ہندوڈاکیہ آتا تھا اور سلام کرتا تھا کہ مولوی صاحب آداب عرض، تو حضرت فرماتے تھے آ......داب، اور میرے کان میں فرماتے تھے: کہ میں یہ نیت کرتا ہوں کہ آ اور میرا پَیر داب، فرمایا: کہ یہ اس لیے کرتا ہوں کہ کسی کافر کا اکرام لازم نہ آئے۔ (عنایات ربانی:۵۳)

کافر سلام کہلوائے تو جواب کیسے دے؟

اگر کوئی غیر مسلم شخص کسی مسلمان کے ذریعہ مثلا: بکر کو سلام کہلائے تو بکر کو جواب میں وعلیکم السلام وھداہ اللہ الإسلام کہنا چاہیے۔(محمودیہ:۱۹/۹۷)

اگر غیر مسلم نے کسی مسلمان کو جے رام جی یا نمستے کہہ دیا اور مسلمان نے آداب کہہ دیا تو؟

اگر کوئی غیر مسلم اپنے مسلم دوست وغیرہ کو غیر اسلامی الفاظ میں سلام کرے مثلا: جے رام، جے رام جی یا نمستے وغیرہ اور مسلمان ''آداب'' یا ''آداب عرض ہے'' کہہ دے یا صرف ہاتھ اٹھادے تو گنجائش ہے، لیکن بہتر ہے کہ ھَدَاکَ اللّٰہُ الإِسْلَامَ کہے۔(محمودیہ:۱۹/۹۸)

سلام کے بعد دعائیہ جملے کا استعمال

سلام سے پہلے دعائیہ جملے کا استعمال کرنا درست نہیں ہے، اور سلام کے بعد دعائیہ جملے استعمال کرنا یا لکھنا جائز ہے۔(مرقاۃ:۹/۶۰)

سلام واستقبال کے غیر شرعی طریقے

سلامی اور استقبال کے جو نت نئے خود ساختہ طریقے اپنائے جاتے ہیں، اُن کا اسلام اور اسلامی تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں ہے، جیسے اعلیٰ سیاسی عہدیداران اور افسران کے لیے جھنڈے لہرانا، شمع روشن کروانا، توپ چھوڑ کر یا پٹاخے، گولہ بارود چھوڑ کر یہ معنی لینا، کھڑے ہو کر اور ہاتھ جوڑ کر سلام وادب کی رسمی روایت کو زندہ کرنے سے کوئی سلام کا فائدہ اور نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔

(اہمیت سلام وملاقات:۳۹)

(تیسری فصل)

غائبانہ سلام وجوابِ سلام — ثبوت وطریقہ

جولوگ موجود ہیں اور جن سے ملاقات ہوتی ہے، انہیں سلام کرنا مسنون ہے اور جواب دینا واجب ہے، ایسے ہی جولوگ موجودنہیں ہیں، کسی دوسرے ملک یا شہر میں ہیں، اُن کے پاس کسی کو کام سے بھیجا جائے تو ان صورتوں میں بھی سلام کہلوانا چاہیے۔

ويستحب أن يرسل بالسلام إلى من غاب عنه. (الأذکار:۲۸۳)

لہٰذا بھیجنے والا اپنے وکیل، قاصد، خادم یا جو بھی ہو اُس سے کہے: کہ فلاں کو میرا اسلام عرض کرنا، پھر ضرورت کا اظہار کرنا؛ اس سلسلے میں بھی ہمیں احادیث سے رہ نمائی ملتی ہے؛ جس سے اہمیتِ سلام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اور غائبانہ سلام، اسلامی فقہ کا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا صدور اور ثبوت خود خالق کائنات سے بھی ہے، فرشتوں سے بھی ہے اور سرکار دو عالم ﷺ سے بھی ہے، ذیل میں ایسی روایات ذکر کی جارہی ہیں۔

(۱) خالقِ کائنات کا محسنِ کائنات کو سلام کہلوانا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: قریش نے حضور ﷺ سے کہا: آپ اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ صفا پہاڑ کو سونا بنا دے؟ پس اگر ایسا ہوگیا تو ہم آپ کی پیروی کرلیں گے، حضور ﷺ نے رب سے دعا کی؛ چناں چہ حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے اور کہا: إن ربك يقرئك السلام کہ آپ کے رب نے آپ کو سلام کہا ہے، اور فرمایا ہے کہ: آپ جیسا چاہتے

ہیں ویسا ہوسکتا ہے، اس کے بعد ان میں سے جو کفر کرے گا، اسے میں ایسا عذاب دوں گا کہ ایسا عذاب کسی کو نہیں دیا، اور اگر آپ چاہیں تو میں اُن کے لیے توبہ ورحمت کے دروازے کھلے رکھوں، آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے، توبہ ورحمت کا دروازہ ہی کھلا رکھیے۔ (المعجم الکبیر، رقم: ۱۲۷۳۶)

(۲) خالق کائنات کا حضرت خدیجہؓ کو سلام کہلوانا

حضرت جبرئیلؑ نے حضور ﷺ سے کہا: کہ خدیجہ بنت خویلدؓ کو اُن کے رب کا سلام عرض کیجیے، انہیں جنت میں ایک گھر کی خوش خبری سنائیے۔ (بخاری: ۳۸۲۰)

(۳) محسن کائنات کا سلام کہلوانا

حضرت انسؓ سے مروی ہے: کہ قبیلہ اسلم کی ایک نوجوان نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرا غزوے میں جانے کا ارادہ ہے؛ لیکن میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے، آپ نے فرمایا: فلاں انصاری کے پاس چلے جاؤ (وہ انتظام کردیں گے)؛ کیوں کہ انہوں نے تیاری کی تھی؛ لیکن بیمار ہوگئے ہیں، اُن سے کہنا: إن رسول الله يقرئك السلام (کہ اللہ کے رسول نے آپ کو سلام کہا ہے، اور فرمایا ہے کہ آپ مجھے اپنا تیار شدہ سامان دے دیجیے۔ (شرح السنۃ: ۳۳۰۹)

(۴) امین الملائکہؑ کا سلام کہلوانا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: مجھ سے آپ ﷺ نے فرمایا: کہ حضرت جبرئیلؑ تمہیں سلام کہہ رہے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: وعليه السلام ورحمة الله (۱) (الأدب المفرد: ۱۰۴۹)

(۵) صحابیؓ کا حضور ﷺ کو سلام کہلوانا

حضرت غالبؒ سے مروی ہے: کہ ہم حضرت حسن بصریؒ کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص آیا اور بیان کیا کہ مجھ سے میرے باپ نے اور اُن سے اُن کے باپ (یعنی

---

(۱) اور بخاری کی روایت میں "وبرکاتہ" کا اضافہ بھی ہے، بخاری، رقم: ۳۷۶۸.

میرے دادا نے) بیان کیا: کہ مجھ کو میرے والد نے حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجتے ہوئے کہا: تم حضور ﷺ کے پاس جاؤ اور خدمت میں (میرا) سلام عرض کرو؛ چناں چہ میں آں جناب کے پاس آیا اور کہا: میرے والد آپ کو سلام عرض کر رہے ہیں، آپ نے (جواب میں کہا) عليك وعلى أبيك السلام. (ابوداؤد، رقم:۵۲۳۱)

(۶) صحابیؓ کا دوسرے صحابیؓ کو سلام کہلوانا

حضرت ابو قلابہؒ سے مروی ہے: کہ ایک صاحب حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: حضرت ابو درداءؓ نے آپ کو سلام کہا ہے إن أبا الدرداء يقرء عليك السلام (جواب دینے کے بعد) حضرت سلمان فارسیؓ نے پوچھا کب آنا ہوا؟ اُن صاحب نے کہا: تین دن ہوئے، آپ نے فرمایا: اگر تم نے یہ سلام نہ پہنچایا ہوتا تو تمہارے پاس یہ امانت رہتا(۱) (شرح السنۃ:۱۲/۲۶۸)

(۷) حضرت خضرؑ کا حضور ﷺ کو سلام کہلوانا

نزھۃ البساتین میں حضرت ابراہیم خواصؒ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ مجھ کو سفر میں پیاس معلوم ہوئی اور شدتِ پیاس سے بے ہوش ہو کر گر پڑا، کسی نے میرے منھ پر پانی چھڑکا، میں نے آنکھیں کھولیں، تو ایک مرد حسین، خوبرو کو گھوڑے پر سوار دیکھا، اُس نے مجھ کو پانی پلایا اور کہا: میرے ساتھ رہو، تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ اُس جوان نے مجھ سے کہا: تم کیا دیکھتے ہو؟ میں نے کہا: یہ مدینہ ہے، اُس نے کہا: اتر جاؤ، میرا اسلام رسولِ خدا ﷺ سے کہنا، اور عرض کرنا آپ کا بھائی خضر، آپ کو سلام کہتا ہے۔ (فضائل درود شریف:۱۱۲)

(۸) حضور ﷺ کی جانب سے سلام کا تحفہ

ابن عبد اللہ المکیؒ نے بیان کیا: کہ میں نے ابو الفضل القدمائیؒ سے سنا کہ خراسان سے ایک شخص آیا اُس نے کہا: میں نے خواب میں رسول پاک ﷺ کی زیارت کی، اُس وقت میں

(۱) یعنی سلام کا پہنچانا ایسے ہی ضروری ہے جیسے امانت کا صاحب امانت تک۔

مسجدِ نبوی میں تھا، آپ نے فرمایا: جب تم ہمدان جاؤ تو ابو الفضل بن زیرکؒ کو میرا اسلام پہنچا دینا، میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول! یہ کس وجہ سے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ہر جمعہ کو مجھ پر سو مرتبہ یا اس سے زائد یہ درود پڑھتا ہے۔

اللهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ النَّبي الأُمِّيِّ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ جَزَى اللهُ مُحَمَّدا ﷺ عَنّاً مَا هُو أهلُه.

(القول البدیع: ۱/۱۶۶، الباب الرابع: فی تبلیغہ)

(۹) حضرت ابراہیمؑ کا امت محمدیہ کو سلام کہلوانا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شبِ معراج میں میری ملاقات حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام سے ہوئی تو آپ نے فرمایا: اے محمد! اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہنا اور انھیں بتلانا کہ جنت کی زمین زرخیز ہے، اس کا پانی شیریں ہے؛ مگر وہ چٹیل ہے، اور اُس کے پودے سبحان اللہ ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر ہیں۔ (ترمذی، رقم الحدیث: ۳۴۶۴)

حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کے سلام کا جواب ہمیں بھی ایک مرتبہ دے دینا چاہیے اور جو کام بتایا ہے وہ کام کرنا چاہیے، یعنی یہ اذکار کر کے اپنی جنت میں زیادہ سے زیادہ پودے لگانا چاہیے۔

حضرت حکیم الامتؒ اس حدیث کی روشنی میں لکھتے ہیں:

> شب معراج میں حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام نے ہمارے حضور ﷺ سے فرمایا تھا: کہ اپنی امت کو ہمارا سلام کہیے گا، اس لیے امت کو حکم ہوا کہ صلاۃ ابراہیم کو نماز میں داخل کریں اور خارجِ نماز بھی پڑھا کریں۔ (زاد السعید: ۵۶۰)

(۱۰) حضرت ابو ہریرہؓ کا حضرت عیسیٰؑ کو سلام کہلوانا

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ

والسلام حاکمِ عادل اور منصف امام کی حیثیت سے نازل ہوں گے......اور میری قبر پر آئیں گے اور مجھے سلام کریں گے اور میں اُن کے سلام کا جواب دوں گا، حضرت ابو ہریرہؓ نے (شاگردوں سے) فرمایا: اے میرے بھتیجو! اگر تم حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کو دیکھو تو کہنا: ابو ہریرہؓ آپ کو سلام عرض کرتے ہیں۔ (المستدرک للحاکم، رقم:۴۱۶۲)

کوئی سلام پہنچائے تو جواب کیسے دے؟

جب کوئی شخص کسی کا سلام پہنچائے تو وہ شخص مُبَلِّغ (پہنچانے والا) کو جواب سلام میں شریک کرے، اور یوں کہے: عليك وعليه السلام؛ چناں چہ آپ ﷺ کا یہی معمول تھا، ایک صاحب نے اپنے والد کا سلام پہنچایا تو آپ نے یوں جواب دیا: عليك وعليه السلام.

(ابوداؤد:۵۲۳۱، فی الأدب)

ويستحب أن يرد على المُبلغ أيضا: فيقول: وعليك وعليه السلام.

(ردالمحتار:۹/۵۹۵)

جواب فی الفور دینا چاہیے

ملاقات کے وقت سلام کا جواب دینا واجب ہے اور یہ جواب فوراً دینا ضروری ہے اور جواب میں بلا وجہ تاخیر مکروہ تحریمی ہے، ایسے ہی اگر غیر موجود شخص کا کوئی سلام لائے یا خط و درخواست یا کسی بھی چیز میں سلام لکھ کر کوئی بھیجے تو فی الفور جواب دینا واجب ہے۔

(شامی:۹/۵۹۳، عمدۃ القاری:۱۵/۳۴۶)

تکملہ فتح الملہم میں ہے:

ولو أتاه سلام من غائب مع رسول أو في ورقة وجب الرد على الفور.

(تکملہ:۴/۲۴۶)

لیکن اِس موقع پر بہت کوتاہی ہوتی ہے، ایسے سلام کا جواب نہیں دیا جاتا اور اگر جواب دیا گیا تو صرف وعليكم السلام، اِصلاح کی ضرورت ہے، ایسے سلام کا پورا جواب وعليك

وعلیه السلام ہے،اور اگر سلام ،عورت نے عورت کا ،کسی عورت کو یا مرد کو پہنچایا ہوتو جواب یوں دے علیكِ وعلیها السلام.

سلام کا پہنچانا ضروری ہے

اگر کسی نے دوسرے شخص سے کہا: کہ فلاں کی خدمت میں میرا اسلام عرض کر دینا اور اس شخص نے کہا ٹھیک ہے پہنچادوں گا،تو اِرسالِ سلام واجب ہے؛ کیوں کہ قبولیت کے بعد یہ ایک امانت ہے،جس کا پہنچانا واجب ہے،ورنہ یہ ودیعت ہے، پہنچانا واجب تو نہیں ؛لیکن پہنچادے تو احسان ہوگا۔(ردالمختار:۹/۵۹۵)

مذکورہ صورت میں چوں کہ غفلت،سہو یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے سلام پہنچانا مشکل ہو جاتا ہے؛اس لیے مناسب ہے کہ کہنے والا یوں کہے: میرا اسلام کہہ دینا ''اگر یاد رہے'' ''اگر ممکن ہو'' ''بشرطِ سہولت''اگر یہ شخص نہ کہہ سکے تو دوسرا شخص ہی یہ کہہ دے کہ ان شاءاللہ''اگر یاد رہا'' ''ممکن ہوا'' تو عرض کردوں گا،ایسی صورت میں دونوں کے لیے سہولت رہے گی۔

تحریری سلام کے جواب کا حکم

اگر سلام تحریری شکل میں ہو مثلاً: خط،درخواست،تعزیت نامہ،میسیج یا اس جیسی کسی چیز میں ہوتو پڑھتے وقت سلام کا جواب دینا ضروری ہے،چاہے زبان سے یا لکھ کر؛ کیوں کہ غائب کا خط وتحریر،حاضر شخص کی موجودگی کے حکم میں ہے۔

إذا كتب لك رجل بالسلام في كتاب ووصل إليك، وجب عليك الرد باللفظ أو بالمراسلة؛ لأن الكتاب من الغائب بمنزلة الخطاب من الحاضر، والناس عنه غافلون. (ردالمختار:۹/۵۹۶)

اور خط ودرخواست کے سلام کا جواب بھی فی الفور دینا ضروری ہے؛عموماً اِس سلسلے میں کوتاہی ہوتی ہے لوگ خط یا درخواست پڑھ لیتے ہیں ؛لیکن سلام کا جواب نہیں دیتے،اوپر آپ پڑھ

ہی چکے والناس غافلون عنہ کہ لوگوں میں اِس حوالے سے غفلت پائی جاتی ہے، خط یا درخواست وغیرہ میں سلام آئے تو دو باتیں ضروری ہیں: جواب دینا اور فی الفور دینا۔

ولو أتاه سلام من غائب مع رسول أو في ورقة وجب الرد على الفور.

(تکملہ فتح الملہم: ۲۴۶/۴)

ہاں اگر جواب تحریری شکل میں دینا ہو تو فی الفور جواب دینا ضروری نہیں؛ بلکہ جوابی خط میں وعلیکم السلام لکھ سکتا ہے۔اور احسن الفتاوی میں ہے:

> زبانی یا بذریعہ خط جواب دینا واجب ہے، بہتر ہے کہ فوراً زبان سے جواب دے دیا جائے؛ کیوں کہ ممکن ہے خط کے جواب کا موقع نہ ملے تو واجب فوت ہونے کا گناہ ہوگا، خط کا جواب دینے کا ارادہ نہ ہو یا خط قابلِ جواب نہ ہو تو فوراً زبان سے جواب دینا واجب ہے۔(احسن الفتاوی: ۱۳۴/۸)

جوابی سلام میں کیا لکھے؟

حضرت تھانویؒ سے دریافت کیا گیا کہ خطوں کے اندر جو سلام لکھا ہوا آتا ہے مثلاً لکھتے ہیں السلام علیکم اس کے جواب میں وعلیکم السلام لکھنا چاہیے یا السلام علیکم لکھ دینا کافی ہے؟ فرمایا: فقہاء نے دونوں کافی لکھا ہے۔(اسلامی تہذیب: ۵۶)

تحریری سلام کے جواب کا حکم: غفلت اور اصلاح

اگر کسی کے پاس کسی شخص کا خط آئے اور اس خط میں "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" لکھا ہو تو اس کی بارے میں بعض علماء نے فرمایا: کہ اُس سلام کا تحریری جواب دینا چوں کہ واجب ہے؛ اِس لیے خط کا جواب دینا بھی واجب ہے، اگر خط کے ذریعہ اس کے سلام کا جواب اور اُس کے خط کا جواب نہیں دیں گے تو ایسا ہوگا کہ جیسے کوئی شخص آپ کو سلام کرے اور آپ

جواب نہ دیں؛ لیکن بعض دوسرے علماء نے فرمایا: کہ اُس خط کا جواب دینا واجب نہیں ہے(۱)؛ اِس لیے کہ خط کا جواب دینے میں پیسے خرچ ہوتے ہیں اور کسی انسان کے حالات بعض اوقات اس کے متحمل نہیں ہوتے کہ وہ پیسے خرچ کرے (یا پیسے ہیں؛ لیکن ڈاکخانہ آنے جانے کا چکر بھی ایک مسئلہ ہے، مولف)؛ اِس لیے اس خط کا جواب دینا واجب تو نہیں ہے؛ لیکن مستحب ضرور ہے؛ البتہ جس وقت خط کے اندر سلام کے الفاظ پڑھے، اُس وقت زبان سے اُس سلام کا جواب دینا واجب ہے اور اگر خط پڑھتے وقت بھی زبان سے سلام کا جواب نہ دیا اور نہ خط کا جواب دیا تو اِس صورت میں ترکِ واجب کا گناہ ہوگا، اِس میں ہم سے کتنی کوتاہی ہوتی ہے کہ خط آتے ہیں اور پڑھ کر اُس کو ویسے ہی ڈال دیتے ہیں نہ زبانی جواب دیتے ہیں نہ تحریری جواب دیتے ہیں اور مفت میں ترکِ واجب کا گناہ اپنے نامہ اعمال میں لکھوا لیتے ہیں، یہ سب ناواقفیت کی وجہ سے کر لیتے ہیں؛ اِس لیے جب بھی خط آئے تو فوراً زبانی سلام کا جواب دے دینا چاہیے۔ (اصلاحی خطبات:۱۶۵)

یہی حکم ای میل، فیس بک، ٹوئٹر، واٹس اپ اور میسیج و درخواست کا ہونا چاہیے۔ مولف

فأما إبلاغه إلى المرسل: فليس بواجب كما نقلت عن الشيخ التهانوي، وحينئذٍ لا يجب جواب الرسالة البريدية، ولاسيما إذا كان يحتاج إلى بذل مالٍ.
(تکملہ فتح الملہم :۲۴۶/۴)

بچوں کے لکھے ہوئے سلام کا حکم

حضرت تھانویؒ کے افادات میں ہے:

بعض بچوں کی طرف سے خطوں میں جو سلام لکھا ہوا آتا ہے تو عام طور سے عادت یہ ہے کہ اُس سلام کے جواب میں صرف دعا لکھ

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: إني لأرى جواب الكتاب عليّ حقا كرد السلام یعنی میں اپنے اوپر خط کے جواب کو ایسے ہی ضروری سمجھتا ہوں جیسے سلام کا جواب: المصنف:۲۲۱، مولف عرض گزار ہے: کہ اول الذکر رائے کی دلیل ابن عباسؓ کا یہ قول ہے، ثانی الذکر رائے کے قائلین اسے استحباب کی تاکید پر محمول کریں گے۔

دیتے ہیں؛ مگر میرے نزدیک اس سے جواب ادا نہیں ہوتا؛ اس
لیے سلام اور دعا دونوں لکھتا ہوں؛ لیکن اگر وہ سلام بچے نے نہ
لکھوایا ہو یا کسی بڑے نے اُس کی طرف منسوب کردیا ہو تو اس کا
جواب ہی واجب نہیں۔ (اسلامی تہذیب: ۵۷)

سلام پہنچانے کی درخواست ہر ایک سے مت کیجیے

جیسے زبانی سلام کہلوایا جاتا ہے، ویسے ہی کبھی خطوط وغیرہ میں لکھا جاتا ہے کہ فلاں فلاں کو میرا اسلام کہہ دیجیے گا، یہ بھی ایک اچھی چیز ہے اور تعلقات میں مضبوطی کا سبب ہے؛ لیکن مندرجہ ذیل ادب پیش نظر رہے، جو آدابِ خط و کتابت کا ایک ادب ہے۔

کثیر المشاغل مکتوب الیہ کو پیام وسلام پہنچانے سے معاف رکھے، اسی طرح اپنے معظّم کو بھی تکلیف نہ دے، خود اُن لوگوں کو براہ راست جو لکھنا ہے لکھ دے، اور جو کام مکتوب الیہ کے لیے مناسب نہ ہو، اُس کی فرمائش لکھنا تو اور بھی بے تمیزی ہے۔ (آداب المعاشرت در اصلاحی نصاب: ۴۸۹)

مسلم اور غیر مسلم کو خط میں سلام لکھنے کا طریقہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اس سلسلے میں یہ تھا کہ اگر مکتوب الیہ مسلمان ہوتا تو سلام کا مخاطب، خاص طور پر اُس کو بنایا جاتا، یعنی السلام علیکم جیسے الفاظ ہوتے، اور اگر مکتوب الیہ مسلمان نہ ہوتا تو پھر علی العموم سلام کے الفاظ ہوتے یعنی یوں لکھتے: سَلاَمٌ عَلىٰ مَنِ اتَّبَعَ الهُدیٰ، سلام کے بعد اصل مضمون ہوتا؛ چناں چہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل (شاہ روم) کو جو مکتوب ارسال کیا تھا، اُس میں سلام اِسی طرح تھا۔ (مظاہر حق ۵/۳۵۱)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اُن کے بیٹے کی تعزیت میں آپ نے جو خط بھیجا تھا تو ابتدائی الفاظ یوں تھے:

بسم الله الرحمن الرحيم من محمد رسول الله إلى معاذ

بن جبل، سلام علیك الخ.(۱)(رواہ الحاکم، رقم:۵۱۹۳)

خط یا درخواست وغیرہ کے اخیر میں سلام لکھنا

کسی کو کوئی خط لکھا جائے یا کوئی درخواست لکھی جائے یا کسی تحریری شکل میں سفارش کی جائے تو جیسے شروع میں سلام لکھنا روایات سے ثابت ہے؛ اُسی طرح اخیر میں بھی سلام لکھنا چاہیے؛ جیسا کہ عموماً ہمارے دیار میں رواج ہے،لوگ اخیر میں "فقط والسلام" لکھتے ہیں،اور والسلام علیکم بھی لکھ سکتے ہیں،امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں باب باندھا ہے: باب من کتب آخر الکتاب، السلام علیکم ورحمة الله یعنی یہ باب اُس شخص کے بارے میں ہے،جس نے خط کے اخیر میں السلام علیکم لکھا،اس کے بعد صحابیِ رسول حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا ایک خط نقل کیا ہے،جو انہوں نے عبداللہ بن معاویہ کو لکھا ہے،خط کے اخیر میں عبارت یوں ہے۔

ونسئل الله الهدى والحفظ والتثبت في أمرنا كله، ونعوذ بالله أن نضل أو نجهل أو نكلف ما ليس لنا بعلم –

والسلام عليك أمير المؤمنين ورحمة الله وبركاته ومغفرته.(الأدب:۱۰۶۱)

ایسا ہی ایک خط شرح السنہ میں منقول ہے جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے زُعَماءِ فارس رستم ومہران کو لکھا ہے،جس خط کا اختتام سلام پر ہے،خط پڑھیے۔

بسم الله الرحمن الرحيم من خالد بن الوليد إلى رستم ومهران في ملأ فارس: سلام على من اتبع الهدى أما بعد! فإنا ندعوكم إلى الإسلام؛ فإن أبيتم فأعطوا الجزية من يد وأنتم صاغرون؛ فإنَّ معي قوماً يحبون القتل في سبيل الله كما يحب فارس الخمر والسلام على من اتبع الهدى.(شرح السنة،رقم الحدیث:۲۶۶۸)

(۱) یہ روایت حاکم کی ہے،ملاعلی قاریؒ نے بھی حاکمؒ کے حوالے سے اپنی کتاب میں یہ تعزیت نامہ نقل کیا ہے،جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضور ﷺ کا تعزیت نامہ ہے؛ لیکن محققین نے لکھا ہے: کہ یہ آپ کا تعزیت نامہ نہیں ہے؛ کیوں کہ حضرت معاذؓ کے صاحب زادے کی وفات،آں جناب کی وفات سے دو سال بعد ہوئی ہے،یہ کسی صحابی کا خطِ تعزیت ہے،راوی کو وہم ہوا ہے۔فإن وفاة ابن معاذ بعد وفاة رسول الله ﷺ بسنتين؛ وإنما كتب إليه بعض الصحابة، فتوهم الراوي؛ فنسبها إلى النبي ﷺ: كنز العمال:۱۵/۷۴۷، رقم الحديث: ۴۳۹۶۳.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خالد ابن ولید کی طرف سے رستم ومہران کے نام جو زعماء ایران میں سے ہیں، اُس شخص پر سلامتی ہو جو حق وہدایت کی پیروی کرے بعد ازاں! واضح ہو کہ ہم تمہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اگر تم اسلام قبول نہیں کرتے ہو تو ذلت وخواری کے ساتھ جزیہ ادا کرو اور اگر تم اِس سے انکار کروگے تو تمہیں آگاہ ہو جانا چاہیے کہ ہلاکت وپشیمانی تمہارا مقدر بن چکی ہے؛ کیوں کہ بلا شبہ میرے ساتھ ایسے لوگ ہیں جو راہِ خدا میں قتل ہو جانے کو اس طرح پسند کرتے ہیں جس طرح ایران کے لوگ شراب پسند کرتے ہیں۔

والسلام علی من اتبع الهدی

صلہ رحمی سلام وتحیہ سے بھی کر سکتے ہیں

صلہ رحمی یعنی رشتہ داری اور تعلقات کی استواری: قرآن وحدیث میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے، اور قطع رحمی کی بڑی شدید قباحت بیان کی گئی ہے، جو لوگ دور دراز علاقوں میں رہتے ہیں تو اُن کے ساتھ صلہ رحمی کا طریقہ یہ ہے کہ سلام وتحیہ لکھ کر یا کسی کے ذریعہ بھیجے یا موبائل سے دعا وسلام کرے اور نزدیک ہوں تو ملاقات کرے، کچھ تحفے تحائف بھی پیش کرے۔

وصلة الرحم واجبة ولو كانت بسلام وتحية وهدية. (ردالمحتار:۹/۵۹۰)

بار بار آنے جانے اور بار بار ملاقات ہو جانے کا حکم

عام طور سے کسی چیز میں تکرار کو پسند نہیں کیا جاتا؛ لیکن سلام میں تکرار محمود اور مطلوب ہے؛ چناں چہ حدیث نبوی ہے:

جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی سے ملے تو اُسے سلام کرے (ایک بار سلام کرنے کے بعد) اگر دونوں کے درمیان کوئی درخت یا دیوار یا پتھر حائل ہو جائے اور پھر اس سے ملاقات ہو تو

اسے (دوبارہ) سلام کرے۔ (ابوداؤد، رقم:۵۲۰۰)

صحابہ کرامؓ اِس فرمان نبوی پر عمل کیا کرتے تھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرامؓ باہم مل کر چلتے تھے، پھر جب اُن کے سامنے کوئی درخت یا ٹیلہ آتا تو وہ دائیں بائیں جدا ہو جاتے تھے، پھر اُس کی دوسری طرف ملتے تو ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے۔

(عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی، رقم:۲۳۵)

یہ حکم وجوبی ہے یا استحبابی؟

صاحبِ مظاہر حق کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلام کا حکم استحبابی ہے، اور یہی قرینِ قیاس بھی ہے، اگر اس موقع پر وجوب کا حکم لگایا جائے تو حرج ظاہر ہے؛ بالخصوص اُن مواقع پر جہاں ایک دوسرے سے ملاقات بار بار ہوتی ہو، اوپر والی حدیث کی شرح کے ذیل میں صاحب مظاہر لکھتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ اتنے معمولی وقفہ کی جدائی ومُفارَقت کے بعد بھی سلام کرنا مستحب ہے؛ چہ جائے کہ زیادہ عرصہ کے بعد ملاقات ہو؛ گویا یہ حدیث سلام کے استحباب اور ہر موقع پر اس ادب کے ملحوظ رکھنے کو مبالغہ کے طور پر بیان کرتی ہے۔ (مظاہر حق:۳۴۸/۵)

بار بار آتے جاتے تکرار سلام

سوال: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

إذا لقي أحدكم أخاه فيسلم عليه؛ فإن حالت بينهما شجرة أو جدار أو حجر ثم لقيه فيسلم عليه. (مشکوۃ:۳۹۹/۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی مرتبہ بھی کوئی دیوار وغیرہ حائل ہو، پھر آمنا سامنا ہو تو ہر

مرتبہ سلام کہنا چاہیے، کیا یہ درست ہے؟ بینوا وتوجروا.

الجواب باسم ملهم الصواب

یہ حکم اَحیاناً پیش آنے والی صورت پر محمول ہے، جہاں بار بار یہ صورت پیش آتی ہو مثلاً: کوئی مخدوم کے کمرے میں بار بار آتا جاتا رہتا ہے تو اس میں تکرارِ سلام و جواب میں حرج ظاہر ہے؛ اس لیے یہ صورت حدیث سے مستثنیٰ ہے۔(احسن الفتاوی:۸/۵۴۳)

گھر سے باہر جاتے وقت گھر والوں کو سلام کرنا چاہیے

حضرت قتادہ کہتے ہیں: کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم گھر میں جاؤ تو اپنے گھر والوں کو سلام کرو، اور جب گھر سے باہر نکلو تو اپنے گھر والوں کو سلام کے ذریعہ رخصت کرو۔

(شعب الایمان مرسلاً:۸۸۴۵)

یعنی گھر سے باہر جاتے وقت اپنے اہل وعیال: ماں، باپ، بیوی وغیرہ کو سلام کے ذریعہ الوداع کہو، حدیث کے الفاظ عام ہیں؛ لہٰذا یہ رخصتی سلام اُس وقت بھی مسنون ہوگا جب کہ دور کا سفر ہو اور اُس وقت بھی جب شہر ہی میں کسی کام سے باہر جارہے ہوں؛ عموماً لوگ جب دور دراز کے سفر پر جاتے ہیں تو اُس وقت وداعی سلام کرتے ہیں؛ لیکن جب گھر سے نکل کر قریب کسی جگہ جاتے ہیں مثلاً: دوکان یا گھریلو اشیاء کی خریداری کے لیے بازار جاتے ہیں تو عموماً اُس وقت سلام کرنے میں سستی اور غفلت پائی جاتی ہے، حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوا کہ اُس وقت بھی سلام کرنا چاہیے، اور جسے سلام کیا جائے اُسے جواب دینا چاہیے۔

وداعی سلام کی مصلحتیں

(۱) جب انسان رخصت ہوتے وقت اپنے اہل وعیال کو سلام کرتا ہے تو گویا وہ سلام کے خیر و برکت کو اپنے اہل وعیال کے پاس امانت رکھتا ہے، جسے وہ آخرت میں واپس لے گا۔(۱)

(مظاہر حق:۵/۳۴۸)

(۱) یہ مطلب شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے بیان کیا ہے۔

(۲) علامہ طیبیؒ لکھتے ہیں: انسان بوقتِ رخصت، سلام کر کے اپنے گھر والوں کے پاس سلام کو بطور ودیعت وامانت کے رکھ دیتا ہے کہ واپس لوٹ کر آؤں گا تو اپنی ودیعت وامانت کو واپس لوں گا؛ جیسا کہ امانتیں واپس لی جاتی ہیں، گویا اُس وقت سلام کرنا، اِس امر کی نیک فالی لینے کے مرادف ہے کہ گھر سے رخصت ہونے والا سلامتی کے ساتھ لوٹ کر آئے گا، اور اُس کو دوبارہ سلام کرنے کا موقع نصیب ہوگا۔ (شرح الطیبی: ۹/۲۰، فیض القدیر: ۱/۳۴۱)

مجلس سے واپس ہوتے وقت سلام کرنا

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے: کہ تم میں سے کوئی جب کسی مجلس میں پہنچے تو چاہیے کہ سلام کرے، پھر اگر بیٹھنا چاہے تو بیٹھ جائے، نیز جب (مجلس سے) چلنے کے لیے کھڑا ہو تو اس وقت بھی سلام کرے؛ کیوں کہ پہلا سلام کرنا، دوسرا سلام کرنے سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ (ابوداؤد: ۵۲۰۸)

یعنی جیسے مجلس میں آتے وقت سلام کرنا مسنون ہے؛ ویسے ہی جب وہاں سے جانے کا ارادہ ہو، خواہ مجلس میں بیٹھا تھا یا بیٹھا نہیں تھا، تو لوگوں کو سلام کرے؛ کیوں کہ جتنی اہمیت پہلے سلام کی ہے، اتنی ہی سلامِ رخصت کی ہے۔

عام طور پر یہ سنت معاشرے میں متروک ہے، آتے وقت تو سلام کر لیتے ہیں؛ لیکن جاتے وقت بھول جاتے ہیں، اور کچھ نئی تہذیب کے دل دادہ جاتے وقت ''فی امان اللہ''، ''اللہ حافظ'' اور ''خدا حافظ'' کے الفاظ کہہ کر رخصت ہوتے ہیں، اور کچھ لوگ کہتے ہیں ''اچھا تب چلتے ہیں'' یہ سب الفاظ مسنون سلام کے قائم مقام نہیں ہو سکتے۔

سلامِ رخصت کی مصلحتیں

(۱) جس نے پہلا سلام کیا ہے؛ گویا وہ یہ ضمانت لے رہا ہے کہ میری طرف سے مخاطب شرور وفتن اور فتنہ وفساد سے محفوظ ہے؛ اب جب کہ وہ جا رہا ہے تو اُسے سلام کرنے کی تاکید کی گئی؛ تاکہ اب وہ دوبارہ اِس بات کی ضمانت دے کہ اُس کی عدم موجودگی میں بھی مخاطب اُس کے شرو

فساد سے مامون ہے، اُسے میری طرف سے کوئی اندیشہ نہیں کرنا چاہیے۔(شرح الطیبی:۲۵/۹)

(۲) سلام کر کے جانے سے ناراض ہوکر، ناگواری سے چل دینے اور کسی ضرورت کے لیے جانے اور پھر ایسی ہی صُحبت (رفاقت) کے لیے لوٹنے کے درمیان امتیاز ہوتا ہے؛ اگر سلام کر کے گیا ہے تو خوش گیا ہے، ورنہ دوسری بات کا اندیشہ ہے۔

(۳) سلام کر کے رخصت ہوگا تو صاحبِ مجلس کو اُس سے کوئی بات کہنی ہوگی تو کہہ سکے گا اور چپکے سے چلا گیا تو بات رہ جائے گی۔

(۴) ایک جانا، کھسک جانا ہے، جس کی سورۃ النور آیت:۶۳ میں برائی آئی ہے؛ پس جو سلام کر کے جائے وہ اس عیب سے محفوظ رہے گا۔(حجۃ اللہ البالغۃ:۱۹۸/۲، اشرفیہ، رحمۃ اللہ الواسعۃ:۵۴۹/۲)

سلامِ رخصت کا جواب واجب ہے یا مستحب؟

ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ: ہمارے بعض محققین شراح نے کہا ہے: کہ اِس رخصتی سلام کا جواب واجب نہیں؛ بلکہ مستحب ہے؛ کیوں کہ یہ سلام اصل میں دعا اور وداع ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں وإذا حييتم بتحية فحيوا بأحسن منها آیا ہے اور بوقت رخصت جو سلام ہے وہ تحیہ نہیں ہے؛ بلکہ رخصت کی اطلاع واجازت ہے؛ لہٰذا آیت سے جو سلام کے جواب کا وجوب معلوم ہو رہا ہے اُس کے تحت یہ داخل ہی نہیں ہے، آگے ملا علی قاریؒ نے (حدیث نمبر: ۴۶۶۰) کے تحت علامہ نوویؒ کی عبارت نقل کی ہے، اُس میں قاضی حسینؒ اور ابوسعید المتولیؒ سے یہی بات نقل کی گئی ہے۔

علامہ نوویؒ کی نقل کردہ عبارت ہی میں آگے ہے: کہ استحباب والی رائے کا علامہ شاشیؒ نے انکار کیا ہے اور کہا ہے: جیسے ملاقات کے وقت سلام کا جواب واجب ہے ویسے ہی رخصت ہوتے وقت بھی سلام کا جواب دینا واجب ہے، وهذا هو الصحيح یعنی یہی وجوب کا قول صحیح ہے۔(مرقاۃ المفاتیح:۶۳/۹، حاشیۃ الطیبی:۲۵/۹)

مجلس سے جاتے وقت خدا حافظ کہنا

مجلس جاتے وقت اگر خدا حافظ کہنے کو ثابت وضروری نہ سمجھا جائے اور التزام کے بغیر کہا جائے تو مضائقہ نہیں، کہنا جائز ہے؛ البتہ بہتر ومسنون طریقہ یہ ہے کہ رخصت کرتے وقت رسول اللہ ﷺ جو دعا پڑھا کرتے تھے وہی دعا پڑھی جائے، وہ دعا یہ ہے: أستودع الله دينك وأمانتك وآخر عملك، ترجمہ: میں تمھارا دین، تمھاری امانت اور تمھارے آخری عمل کو اللہ کے حوالہ کرتا ہوں۔ (دارالافتاء دارالعلوم دیوبند:۱۳۶۷۹)

جماعت کی طرف سے ایک کا سلام کرنا اور ایک کا جواب دینا کافی ہے

حضرت علیؓ سے مروی ہے: کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (گذرنے والی) جماعت میں سے اگر کوئی ایک سلام کرے تو پوری جماعت کی طرف سے کافی ہے اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی ایک جواب دے دے تو سب کی طرف سے کافی ہے۔ (مشکوۃ، حدیث:۴۶۴۸)

تشریح: جماعت معنی کے لحاظ سے ایک فرد ہے یعنی وہ فرد حکمی ہے اور سلام وجواب کا مقصد، وحشت دور کرنا اور باہم الفت پیدا کرنا ہے اور یہ مقصد ایک کے سلام کرنے اور ایک کے جواب دینے سے حاصل ہو جاتا ہے؛ اس لئے اس کو کافی قرار دیا گیا۔(۱)؛ تاہم سب کا سلام کرنا اور سب کا جواب دینا افضل ہے۔ (عالمگیری:۳۲۵/۵)

(۲) سلام شریعت کا شعار ہے اور ایسی چیزوں میں جماعت کی طرف سے ایک آدمی نیابت کرسکتا ہے۔

ومن جهة المعنى: أن هذا سلام هو شعار الشرع فناب فيه الواحد عن الجماعة. (المنتقى:۲۸۰/۷)

○❖○

(۱) حجۃ اللہ البالغہ:۱۹۷/۲.

(چوتھی فصل)

موبائل اور ٹیلیفون پر سلام وجوابِ سلام

آج موبائل فون، ایک ضرورت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر انسان کی زندگی کا حصہ بن گئے ہیں، اِس کے ذریعہ، متکلم ومخاطب دور ہوتے ہوئے بھی براہِ راست ہم کلام ہو سکتے ہیں، ایک دوسری کی آواز سن سکتے ہیں؛ بلکہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی سکتے ہیں؛ لہٰذا اس موقع پر بھی سلام کرنا چاہیے۔

فون ملانے والا آنے والے کے حکم میں ہے، جس طرح آنے والے کی ذمہ داری ہے کہ جب وہ کسی گھر یا مجلس میں جائے تو آغاز السلام علیکم سے کرے، اِسی طرح فون کرنے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ گفتگو کا آغاز واختتام السلام علیکم سے کرے یعنی بیل اور گھنٹی بجنے کے بعد رابطہ ہونے پر سب سے پہلے السلام علیکم کہے پھر گفتگو کرے، حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں: حضور ﷺ نے فرمایا: جب کوئی شخص مجلس میں آئے تو چاہیے کہ سلام کرے۔ (ترمذی، رقم: ۲۷۰۷، الاستیذان)

إذا أتى الرجل باب دار انسان يجب أن يستأذن قبل السلام ثم إذا دخل يسلم أولاً ثم يتكلم، وإن كان في الفضاء يسلم أولاً ثم يتكلم. (ہندیہ: ۳۲۶/۵)

مفتی شبیر احمد قاسمی صاحب انوارِ رحمت میں لکھتے ہیں:

حضرت سید الکونین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ جب دو آدمی ملاقات کریں تو اُن دونوں میں سے زیادہ پسندیدہ، اور اللہ سے زیادہ قریب وہی شخص ہوگا جو سلام میں پہل کرے گا۔

اور سلام میں دو ثواب الگ الگ ملتے ہیں۔

(۱) سلام میں پہل کرنے کا ثواب، صرف پہل کرنے کی وجہ سے الگ سے ایک امتیازی ثواب اللہ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُس کو اپنے سے زیادہ قریب کرلیتا ہے، اور اللہ کے نزدیک زیادہ مقبول اور محبوب شخص شمار ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا ثواب نفسِ سلام کا ہے کہ صرف سلام کرنے کا مستقل ثواب ملتا ہے، جو ثواب سلام کرنے والے کو ملتا ہے وہی ثواب سلام کا جواب دینے والے کو بھی ملتا ہے؛ مگر فرق اتنا ہے کہ جواب دینے والے کو صرف سلام کا ثواب ملتا ہے اور سلام میں پہل کرنے والے کو سلام کا بھی ثواب ملتا ہے، اور ساتھ ساتھ سلام میں پہل کرنے کا ثواب بھی الگ سے ملتا ہے، یہی حال ٹیلیفون میں سلام کا ہے کہ جو شخص ٹیلیفوں میں سلام میں پہل کرے گا اُس کو سلام کا ثواب بھی ملے گا اور سلام میں پہل کرنے کا ثواب بھی ملے گا۔

(انوارِ رحمت، ص:۱۰۶)

ایک ضروری تنبیہ

ہم مسلمانوں میں بے توجہی یا دینی علم سے ناواقفیت کے سبب، ایک کوتاہی پائی جاتی ہے کہ جب کسی کا فون آیا یا کسی نے فون کیا تو مزاج بنا ہوا ہے کہ اکثر لوگ اور کچھ پڑھے لکھے لوگ سب سے پہلے Hello کا لفظ بولتے ہیں؛ حالاں کہ شریعت میں اولاً سلام کی تعلیم دی گئی ہے؛ یہ حکم موبائل کے ذریعہ باہم گفتگو پر بھی صادق آتا ہے؛ اس لیے ہم مسلمانوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اس کا خیال رکھیں، اور جب کہیں سے فون آئے اور پہلے سے معلوم ہے کہ فلاں صاحب کا فون ہے، تو تھوڑی دیر خاموش رہیں کہ دوسری جانب سے سلام آجائے، یا خود ہی سلام کریں، اور اگر نمبر نیا ہے اور کس کا نمبر ہے معلوم نہیں تو فون رسیو کرنے کے بعد ضرورۃً ''جی'' ''فرمائیں،'' ''کون صاحب'' ''جی جناب'' جیسے الفاظ استعمال کریں؛ کیوں کہ معلوم نہیں کہ فون کرنے والا مسلمان ہے

یا غیر مسلم، یا پھر مسلمان سمجھ کر سلام ہی کر دے اور اگر فون کرنے والا غیر مسلم ہے، پہلے سے معلوم ہے تو Hello جیسے الفاظ سے آغاز کر سکتے ہیں۔

مولف کی یہ بات ممکن ہے ایک مخصوص طبقے پر گراں گذرے؛ لیکن مولف کا مقصد زبان کی مخالفت نہیں؛ بلکہ انگریزی تہذیب وکلچر کی مخالفت ہے؛ کیوں کہ ہم مسلمانوں کی اپنی ایک مستقل تہذیب ہے، مستقل سماج ہے، مستقل کلچر وثقافت ہے اور مستقل تعلیم واخلاق ہیں، ہمیں اپنی تہذیب کی اشاعت اور اسے بروئے کار لانے کی تگ ودو میں لگنا چاہیے، نہ یہ کہ ہم غیروں کی تہذیب سے متأثر ہوں، اسلام جذب کا قائل ہے، انجذاب کا نہیں۔

شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کا وہ اقتباس جو پیچھے گذرا ہے ایک بار اور پڑھیں:

جو قوم اور ملک اپنے یونیفارم کی محافظ نہیں، وہ بہت جلد دوسری قوموں میں منجذب ہوگئی، مسلمان جب سے ہندوستان میں ہیں؛ اگر اپنا یونیفارم باقی نہ رکھتے تو کب کے مٹ چکے ہوتے، انہوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ کرتہ، پائجامہ، عبا، قبا اور دستار محفوظ رکھا؛ بلکہ مذہب اور اسماء الرجال، تہذیب وکلچر، رسم ورواج اور زبان وعمارت وغیرہ جملہ اشیاء محفوظ رکھا؛ اس لیے ان کی مستقل ہستی ہندوستان میں قائم رہی، اور جب تک اس کی مراعات ہوتی رہیں گی، رہے گی؛ لہٰذا ایک محمدی کو حسبِ اقتضاء فطرت اور عقل، لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آقا کا سارنگ ڈھنگ، چال چلن، صورت وسیرت، فیشن وکلچر وغیرہ بنائے اور اپنے محبوب آقا کے دشمنوں کے فیشن سے پرہیز کرے۔ (خلاصہ مکتوبات شیخ الاسلام: ۱۳۰/۲)

موبائل پر آخر میں سلام

اسی طرح ایک غلط طریقہ یہ بھی چل پڑا ہے کہ فون بند کرتے ہوئے لوگ خدا حافظ،

O.K، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے رکھتے ہیں جیسے الفاظ کہتے ہیں، نہیں کہتے ہیں تو السلام علیکم یاد رکھیں ایک میں سنت کا ثواب ہے، ایک میں سنت سے محرومی ہے؛ لہٰذا ٹیلیفون رکھتے وقت گفتگو کا اختتام السلام علیکم پر ہونا چاہیے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جب کوئی شخص مجلس میں آئے تو سلام کرے، اگر بیٹھنے کی ضرورت ہوتو بیٹھ جائے ، اب اگر جانے لگے تو دوبارہ سلام کرے؛ کیوں کہ پہلی مرتبہ سلام کرنا ، دوسری مرتبہ سلام کرنے سے بہتر نہیں (یعنی دونوں وقت مسنون ہے) (ترمذی، رقم: ۲۷۰۷، باب التسلیم عند القیام)

معلوم ہوا کہ آپس کی ملاقات کے وقت سلام کرنا اور جاتے وقت سلام کرنا مسنون ہے؛ اسی طرح موبائل سے ملاقات کے وقت بھی سلام کرنا اور موبائل بند کرتے وقت رخصتی کا سلام کرنا مسنون ہوگا۔

موبائل کی ٹون میں "السلام علیکم" سیٹ کرنا

یہ تو ظاہر ہے موبائل میں رنگ ٹون کے لیے جو "السلام علیکم" کی آواز بھری جاتی ہے، اُس کا جواب واجب نہیں ہے؛ لیکن ایسی ٹون استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں، اِس سلسلے میں مناسب اور مبنی بر احتیاط بات یہی ہے کہ ایسی رنگ ٹون استعمال نہ کریں؛ کیوں کہ السلام علیکم جہاں ایک طرف باہمی الفت ومحبت کو رواج دینے کا ذریعہ ہے، وہیں دوسری طرف اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، اور اللہ کا مبارک نام دنیوی غرض پوری کرنے کے لیے استعمال کرنا ایمانی غیرت کے خلاف ہے اور اللہ کے نام کے ذریعہ کال آنے کی اطلاع پانا یا اطلاع دینا ایک دنیاوی مقصد ہے۔

إن السلام من أسماء الله تعالىٰ وضعه في الأرض؛ فأفشوا السلام بينكم. (الادب المفرد، رقم: ۹۲۵)

بار بار کال آنے پر سلام کا حکم

ایک بار دعا و سلام اور گفتگو کے بعد موبائل رکھ دیا جائے یا کٹ جائے، ایک آدھ منٹ میں اُسی شخص کی دوبارہ سہ بارہ کال آنے پر دوبارہ سلام کر سکتے ہیں؛ لیکن اگر حرج معلوم ہو تو ترک بھی کر سکتے ہیں، جیسے کوئی شاگرد یا خادم بار بار استاذ یا مخدوم کے پاس آتا جاتا ہے تو عزیمت کا تقاضہ یہی ہے کہ سلام کرے؛ لیکن رخصت اِس بات کی ہے کہ سلام ترک کر دے۔ (ماخوذ از: احسن الفتاویٰ: ۱۴۳/۸)

موبائل پر غیر محرم لڑکی یا عورت ہو تو؟

اگر بے خبری میں موبائل پر غیر محرم عورت نے سلام کر دیا یا فون کرنے والے نے سلام کر دیا یا سلام کا جواب دے دیا تو اس میں کوئی قباحت کی بات نہیں؛ کیوں کہ اس میں کوئی فتنہ و فساد کا خوف نہیں؛ البتہ سلام و دعا کے بعد جب غیر محرم ہونا معلوم ہو جائے اور گفتگو کے دوران ہیجان پیدا ہو جائے یا پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو گفتگو کرنا ممنوع ہے۔ (ماخوذ از: انوارِ رحمت، ص: ۱۱۱)

موبائل پر غیر مسلم ہو تو؟

جو حکم براہ راست ملاقات کا ہے، وہی حکم موبائل سے گفتگو کا ہے، لہٰذا اگر موبائل پر غیر مسلم سے گفتگو ہو رہی ہے تو انہیں السلام علیکم کے ذریعہ سلام نہیں کرنا چاہیے؛ بلکہ آداب، گڈ مارننگ جیسے الفاظ بول سکتے ہیں، اور وہ غیر مسلم سلام کرے تو جواب میں یا تو صرف علیکم کہہ دیا جائے یا هداك الله کہہ دے یا خاموش رہے۔

اور اگر بے خبری میں کسی نے فون آنے پر سلام کر دیا اور بعد میں معلوم ہوا کہ وہ غیر مسلم ہے، تو اِس میں کوئی حرج نہیں؛ اگر چہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اپنا سلام واپس لے لے؛ لیکن یہ حکم وہاں ہے جہاں مسلمانوں کا غلبہ ہو، تفصیل کے لیے ”غیر مسلم کو سلام“ کے عنوان سے جو باتیں گذری ہیں اُن کا مطالعہ کیا جائے۔

(پانچویں فصل)

قبرستان میں جاتے وقت سلام کرنا — ثبوت اور طریقہ

تمام علماء کے نزدیک قبروں کی زیارت مستحب ہے؛ کیوں کہ قبروں پر جانے سے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے، موت یاد آتی ہے، دنیا کی بے ثباتی پر یقین میں پختگی پیدا ہوتی ہے، دینی اخوت ومحبت اور انس ومہربانی کا تعلق صرف زندگی تک محدود نہ رہے؛ بلکہ مرنے کے بعد بھی اس کا اظہار ہونا چاہیے؛ لہٰذا زیارت قبور کو مستحب قرار دیا گیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہاں جاکر مُردوں کے لیے رحمت ومغفرت کی دعا کا موقع ملتا ہے، جو مُردوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ سے کم نہیں؛ چناں چہ سرکارِ دو عالم ﷺ کا جنت البقیع تشریف لے جانا اور وہاں کے مُردوں پر سلام پیش کرنا حدیث سے ثابت ہے۔

اس لیے شریعت نے قبروں پر جانے کے کچھ اداب واحکام بتائے ہیں، اُن میں سرِ فہرست ادب وحکم یہ ہے کہ قبرستان میں داخل ہونے کے بعد، مُردوں کو سلام کرے؛ کیوں کہ میت کی زیارت، اُس کی زندگی میں ملاقات کی طرح ہے، جیسے زندگی میں بوقتِ ملاقات، سلام کیا جاتا ہے، مرنے کے بعد بھی ویسے ہی سلام کرنا چاہیے؛ چناں چہ حضور ﷺ سے سلام کے کئی طریقے مروی ہیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے: کہ جب آپ قبرستان تشریف لے جاتے تو یہ دعا پڑھتے۔

السلامُ علَیکُم دارَ قَومٍ مُؤمِنِیْنَ وَإنَّا إنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ.

(ابوداؤد، رقم: ۳۲۳۷)

(۲) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ مدینے کے قبرستان سے گذرے تو آپ قبروں کی طرف روئے مبارک کر کے متوجہ ہوئے اور فرمایا:
"السلام عليكم يَا أهلَ القُبُوْرِ، يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكم وَأَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْأَثَرِ. (ترمذی:۱۰۵۹، مایقول الرجل إذا دخل المقابر)

فائدہ: معلوم ہوا کہ جیسے زندوں کو السلام علیکم کہا جاتا ہے، ویسے ہی مُردوں کو مخاطب کر کے السلام علیکم کہنا چاہیے؛ البتہ کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ السلام علیکم زندوں کو کہا جائے اور مُردوں کو علیکم السلام کے ذریعہ سلام کیا جائے؛ کیوں کہ وہ مخاطب بنائے جانے کے اہل نہیں ہیں، ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: اس دلیل کا بُطلان بالکل ظاہر ہے؛ کیوں کہ مخاطب ہونے کے اعتبار سے علیکم کی تقدیم وتاخیر کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں ہے۔

مفتی سعید احمد صاحب زیدہ مجدہ لکھتے ہیں:

> اَموات کی زیارت پر اَحیاء (زندوں) کی زیارت کے احکام جاری کیے گئے ہیں؛ پس جس طرح زندوں سے ملاقات ہوتی ہے تو اُن کی طرف منہ کر کے سب سے پہلے سلام کیا جاتا ہے، اُسی طرح اَموات کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ :۳/۶۹۵)

کیا مُردے سلام سنتے ہیں اور اُس کا جواب دیتے ہیں؟

چند روایتیں پڑھیے:

(۱) کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو اپنے اس مسلمان بھائی کی قبر کے پاس سے گذرے، جس سے دنیا میں شناسائی تھی پھر اُسے سلام کرے؛ مگر اللہ تعالیٰ اُس کی روح لوٹا دیتے ہیں تو وہ سلام کا جواب دیتا ہے۔

(۲) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی زیارت کرتا ہے اور

وہاں بیٹھتا ہے تو مُردہ اُس سے اُنسیّت حاصل کرتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ واپس آ جائے۔

(۳) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: کہ جب کوئی شخص کسی ایسی قبر کے پاس سے گذرتا ہے جس کو وہ پہچانتا ہے اور سلام کرتا تو مردہ جواب دیتا ہے۔

(۴)...... حضرت ابورزینؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا مردے سلام سنتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں سنتے ہیں؛ لیکن ایسا جواب نہیں دے سکتے کہ تم سن سکو۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے (شرح الصدور للسیوطی: ۳/۱۷۷، باب زیارۃ القبور)

نتیجہ: اِن تمام روایتوں سے معلوم ہوا کہ مُردوں کو سلام کرنا مشروع ہے، اور وہ سلام سنتے ہیں جواب دیتے ہیں؛ اگر وہ سلام نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے، تو انہیں سلام کرنے کا حکم ہی نہیں دیا جاتا، یہ الگ بات ہے کہ مُردوں کا جواب عموماً انسان سنتا نہیں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۳/۴۴۰)

مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

> آثار اور اربابِ کشف سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے؛ اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ برزخ میں لوگوں کے احوال مختلف ہوتے ہیں؛ کچھ مُردے ہر سلام وکلام کو سنتے ہیں کچھ مردے، بلا تعیینِ وقت، صرف سلام سنتے ہیں، کچھ مُردے سلام صرف شبِ جمعہ اور اُس کی صبح میں سنتے ہیں، کچھ مردے جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کو سلام سنتے ہیں، اِسی طرح جوابِ سلام کے سلسلے میں بھی فرق ہے، کچھ مردے جواب اِس طرح دیتے ہیں کہ سلام کرنے والا سن لیتا ہے، اور کچھ مردوں کے جواب، زندہ شخص نہیں سن پاتا ہے۔ (احکام القرآن: ۳/۱۷۱)

اِس کی مزید تفصیل اُن کی کتاب معارف القرآن میں ہے:

> اِس سے بھی یہ ثابت ہوا کہ جب کوئی شخص اپنے مردہ مسلمان بھائی

کی قبر پر جا کر سلام کرتا ہے تو وہ مردہ اُس کے سلام کو سنتا ہے اور جواب دیتا ہے، اور اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس وقت اُس کی روح اِس دنیا میں واپس بھیج دیتے ہیں، اِس سے دو باتیں ثابت ہوئیں: اول یہ کہ مردے سن سکتے ہیں، دوسرے یہ کہ اُن کا سننا اور ہمارا سنانا ہمارے اختیار میں نہیں؛ البتہ اللہ تعالیٰ جب چاہیں سنادیں، جب نہ چاہیں نہ سنائیں، مسلمان کے سلام کرنے کے وقت تو اِس حدیث نے بتلادیا: کہ حق تعالیٰ مردہ کی روح واپس لاکر اُس کو سلام کا جواب دینے کی بھی قدرت دیتے ہیں، باقی حالات وکلمات کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ مردہ اُن کو سنے گا یا نہیں؛ اِسی لیے امام غزالیؒ اور علامہ سُبکیؒ وغیرہ کی تحقیق یہ ہے کہ: اتنی بات تو احادیث صحیحہ اور قرآن کی آیت مذکورہ سے ثابت ہے کہ بعض اوقات میں مردے زندوں کا کلام سنتے ہیں؛ لیکن یہ ثابت نہیں کہ ہر مردہ ہر حال میں ہر شخص کے کلام کو ضرور سنتا ہے، اِسی طرح آیات وروایات کی تطبیق بھی ہوجاتی ہے، ہوسکتا ہے کہ مردے ایک وقت میں اَحیاء کے کلام کو سن سکیں دوسرے وقت نہ سن سکیں، یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کے کلام کو سنیں بعض کے کلام کو نہ سنیں، یا بعض مردے سنیں بعض نہ سنیں؛ کیوں کہ سورۂ نمل، سورۂ روم، سورۂ فاطر کی آیات سے بھی یہ ثابت ہے کہ مردوں کو سنانا ہمارے اختیار میں نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں سنادیتے ہیں؛ اِس لئے جن مواقع میں حدیث کی روایات صحیحہ سے سننا ثابت ہے، وہاں سننے پر عقیدہ رکھا جائے اور جہاں ثابت نہیں

وہاں دونوں احتمال ہیں؛اس لئے نہ قطعی اِثبات کی گنجائش ہے،نہ
قطعی نفی کی۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (معارف القرآن:۶/۵۹۱)

اِس بحث کی مزید تفصیل کے لیے،احکام القرآن للعثمانی،تفسیر ابن کثیر،الحاوی للفتاوی للسیوطی،مرقاۃ المفاتیح للقاری کا مطالعہ کریں۔

بقیع غرقد جنت البقیع کا مسنون سلام

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: کہ آپ ﷺ بقیع تشریف لے جاتے تو یہ سلام پیش فرماتے: السلام عليكم دارَ قومٍ مومنين وأتاكم ما تُوعَدُونَ غداً مُؤَجَّلون وإنا إن شاء الله بكم لاحقون، اللهم اغفر لأهل بقيع الغرقد.

السلام علیکم اے مومن قوم کے باشندے،تمہارے پاس وہ آ گیا جس کا تم سے کل کے لئے وعدہ تھا،جس کا وقت مُقرَّر تھا (یعنی موت) ان شاء اللہ ہم بھی تم سے ملنے والے ہیں،اے اللہ!بقیع غرقد والوں کی مغفرت فرما۔(الأذکار:۱۹۴،مسلم،رقم:۹۰۴،فی الجنائز)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:السنن الکبری۔

چھٹا باب

فَتَأَمَّلْ كَيْفَ تَضَمَّنَ اسْمُهُ السَّلَامُ كُلَّ مَا نَزَهَ عَنْهُ تَبَارَكَ وتعالىٰ وكَمْ مِمَّن حَفِظَ هذا الإسمَ لا يَدْرِيْ مَا تَضَمَّنَهُ مِنْ هٰذِهِ الأسرارِ والمَعَانِي.

(بدائع الفوائد ۲/۱۳۷)

رُموزِ سلام

رُموزِ سلام

اسلام نام ہے خدا کے حکم کے سامنے بلا چوں چرا سرِ تسلیم خم کردینے کا، اللہ نے اپنے بندوں کو جن احکام کا پابند بنایا ہے، اُن کا مدار نصوص پر ہے، احکام ومسائل کے مصالح اور اَسرار ورموز کا جاننا ضروری نہیں ہے؛ لیکن بقول حضرت تھانویؒ: یہ ضرور ہے کہ بعض طبائع کے لیے اُن کا معلوم ہوجانا احکامِ شرعیہ میں مزید اطمینان پیدا ہونے کے لیے ایک درجہ معین ضرور ہے؛ گو اہل یقینِ راسخ کو اس کی ضرورت نہیں۔

ذیل میں موضوع کی مناسبت سے صرف سلام کے رموز واشارات اور اسرار ومصالح سپردِ قرطاس کیے جارہے ہیں امید کہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔(۱)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں آداب الصحبة کا عنوان قائم کیا ہے اور آداب میں پہلا ادب تحیہ یعنی سلام کو بیان کیا ہے، اُس کی کامیاب شرح رحمۃ اللہ الواسعہ سے پوری بحث نقل کی جاتی ہے۔

افرادِ انسانی میں حاجتوں کا پیش آنا، اور اُن حاجتوں میں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا: ایسے چند آداب کا متقاضی ہے، جن کو لوگ باہم برتیں اور زندگی کو خوشگوار بنائیں، اُن آداب میں سے بیشتر ایسے امور ہیں جن کے اصول پر عرب وعجم کا اتفاق ہے؛ اگرچہ صورتوں اور شکلوں میں اختلاف ہے، اُن آداب سے بحث کرنا اور صالح وفاسد کے درمیان امتیاز کرنا نبی ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے۔

---

(۱) مکمل احکامِ اسلام کے اسرار ورموز کے لیے عربی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغہ اور امام غزالیؒ کی احیاء العلوم، اور اردو میں حضرت تھانویؒ کی احکامِ اسلام عقل کی نظر میں اور مفتی سعید احمد صاحب کی رحمۃ اللہ الواسعہ کا مطالعہ معلومات میں ترقی کا سبب ہوگا۔

دعا و سلام

لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ آپس میں خوشی کا اظہار کریں، ایک دوسرے پر لطف و مہربانی کریں، چھوٹا بڑے کی برتری پہچانے، بڑا چھوٹے پر مہربانی کرے، اور ہم زمانہ لوگوں میں بھائی چارہ قائم ہو، اگر یہ باتیں نہیں ہوں گی تو رفاقت کچھ سودمند نہیں ہوگی اور اِس کا خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

پھر ضروری ہے کہ جذبۂ خیر سگالی و خیر اندیشی کے اظہار کے لیے اور مخاطب کو مانوس و مسرور کرنے کے لیے کوئی خاص لفظ متعین کیا جائے، ورنہ وہ جذبہ ایک مخفی چیز ہوگا، جس کو قرائن ہی سے پہچانا جاسکے گا، اولِ وہلہ میں اُس کا پتہ نہیں چلے گا؛ چناں چہ دنیا کی تمام متمدن اَقوام نے اپنی صواب دید کے مطابق تحیہ کا طریقہ متعین کیا ہے، جو بعد میں اُن کی ملت کا شعار بن گیا اور اہل ملت کی اس سے پہچان ہونے لگی، مثلاً: زمانۂ جاہلیت میں عرب بوقتِ ملاقات کہتے تھے: أنعم الله بك عينا: اللہ آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کرے اور أنعِم صباحاً صبح بخیر اور مجوسی کہا کرتے تھے: ہزار سال بزی: ہزار سال جیو!

اور قانونِ اسلام کا تقاضہ یہ تھا کہ اِس سلسلے میں انبیاء اور فرشتوں کی سنت اپنائی جائے اور کوئی ایسا کلمہ متعین کیا جائے جو ذکر اور دعا ہو اور وہ دنیوی زندگی پر مطمئن کرنے والا نہ ہو، یعنی اس میں درازیٔ عمر اور دولت کی فراوانی کی دعا نہ ہو، نہ کوئی ایسا طریقہ ہو جس میں تعظیم میں اتنا مبالغہ ہو کہ اُس کی حدود، شرک سے مل جائیں مثلاً سجدہ کرنا یا زمین چومنا، ایسا تحیہ سلام ہی ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ: ۲/۱۹۶، اشرفیہ دیوبند، رحمۃ اللہ الواسعہ: ۵/۵۴۲)

جنت کی اضافت، سلام کی طرف

اس اضافت کے سلسلے میں تین اقوال ہیں: (۱) أحدها أنها إضافة إلى مالكها السلام سبحانه یعنی سلام اللہ کا نام ہے اور جنت اللہ نے بنائی ہے تو جنت کی اضافت، جنت کے مالک کی طرف ہوئی (۲) الثاني أنها إضافة إلي تحية أهلها؛ فإن تحيتهم فيها

سلام یعنی جنت کی اضافت اہلِ جنت کے تحیہ یعنی سلام کی جانب ہے؛ کیوں کہ اہل جنت کا جنت میں تحیہ، سلام ہی ہوگا (۳) الثالث أنها إضافة إلى معنی السلامة أي دار السلامة من کل آفة ونقص وشر، یعنی جنت کی اضافت سلام کے مفہوم ومعانی کی جانب ہے اور مطلب یہ ہوا کہ جنت ہر قسم کے عیوب وآفات سے محفوظ ہے، ان تینوں آراء میں سے کون سی رائے راجح ہے، اس سلسلے میں ابن قیمؒ لکھتے ہیں: والثلاثة متلازمة وإن کان الثالث أظهرها یعنی پہلی رائے کمزور ہے اس معنی کر کہ ایسی صورت میں اللہ کے ناموں میں سے اور ناموں کی طرف بھی جنت کی اضافت جائز ہوتی اور دار اللہ، دار الرحمان وغیرہ بھی کہنا صحیح ہوتا؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے اور جہاں قرآن میں جنت کی اضافت کی گئی ہے تو وہ اضافت جنت کی صفت یا اہلِ جنت کی طرف ہے مثلاً: دار القرار، دار الخلد، جنة المأوی، دار المتقین وغیرہ، اِسی طرح دوسری رائے بھی کمزور ہے، جس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ جنت کی اضافت ایسی چیز کی طرف ہونی چاہیے جو جنت کے ساتھ ہی خاص ہو مثلاً خُلد، قرار اور بقاء وغیرہ؛ حالاں کہ سلام، یہ ایسا تحیہ ہے جو دنیا وآخرت دونوں کے درمیان مشترک ہے، دوسری بات یہ کہ جنت میں ایسا تحیہ ہونا چاہیے جو تحیہ سلام سے زیادہ جامع اور مکمل ہو، اُسے صفتِ دوام وبقاء حاصل ہو؛ کیوں کہ جنت کی چیزیں دائمی ہوں گی اور تحیہ تو جنت میں صرف زیارت وملاقات کے وقت ہی ہوگا، یعنی سلام سے تو صرف ملاقات وغیرہ کریں گے۔

رہ گئی تیسری رائے تو زیادہ ظاہر ہے؛ کیوں کہ ہر قسم کے عیوب ونقائص اور شرور وفتن سے سلامتی، جنت کے اعلیٰ اوصاف میں سے ہے، اور دائمی ہے اور اُس سلامتی کے بغیر وہاں کی کوئی نعمت تام نہیں ہوسکتی؛ اس لیے یہ تیسری رائے اظہر ہے۔ (بدائع الفوائد: ۲/۱۴۴)

السلام علیکم جملہ خبریہ ہے یا انشائیہ؟

فإذا قال: سلام علیکم تضمن الإخبار بحصول السلامة، والإنشاء للدعاء بها وإرادتها وتمنیها، یعنی السلام علیکم جملہ خبریہ اور انشائیہ دونوں ہوسکتا ہے، اگر السلام

علیکم کے ذریعہ حصولِ سلامتی کی خبر اور اطلاع دی جارہی ہے کہ تمہیں سلامتی حاصل ہوچکی ہے تو یہ خبر یہ ہے اور اگر اِس سے مقصود سلامتی کی دعا اور اُس کی تمنا ہے کہ اللہ تمہیں سلامت رکھیں تو انشائیہ ہے۔ (بدائع الفوائد: ۲/۱۴۰)

بوقت ملاقات "السلام علیکم" ہی کیوں؟

اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں عربوں میں سلام ودعا کے لیے أنعم صباحا یا صبحك الله بخير، مساك الله بخير جیسے الفاظ رائج تھے، یہ اور دوسری قوموں میں جو دعا وسلام کے الفاظ تھے وہ سب وقتی اور عارضی دعا پر مشتمل تھے، اور سب کا مقصود، حیات اور بقاءِ حیات کی دعا تھی؛ اسی لیے ایسی دعاؤں کو تحیہ کہا گیا؛ کیوں کہ تحیہ، حیات بمعنی زندگی سے مشتق ہے، اور موجودہ دور میں Good Night, Good Morning وغیرہ بھی وقتی دعا کے لیے ہیں، جامعیت اِن میں مفقود ہے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہلِ اسلام کے لیے جب تحیہ کا انتخاب کیا تو السلام علیکم کا انتخاب کیا جو تمام تحیات وادعیہ سے زیادہ جامع اور پائیدار ہے؛ کیوں کہ سلام کا مطلب سلامتی کی دعا ہے اور سلامتی ایک ایسی چیز ہے کہ اُس کے بغیر حیات اور بقاءحیات اور زندگی کی ساری تگ ودَو بیکار ہے، سلامتی ہے تو زندگی خوش گوار ہے؛ کیوں کہ انسانی زندگی کا بنیادی مقصد دو چیزیں ہیں: شرور ومضرت سے سلامتی اور ہر طرح کی منفعت اور خیر وبھلائی کا حصول، اور اِن دونوں میں شرور سے سلامتی اور حفاظت اصل ہے، قاعدہ ہے دفعِ مضرت، جلبِ منفعت پر مُقَدَّم ہے، السلامة من الشر مقدمة على حصول الخير؛ یہی وجہ ہے کہ انسان کی اولین ترجیح، سلامتی ہوتی ہے اور انسان ہی کیا، ہر جاندار پہلے سلامتی کی فکر کرتا ہے پھر خیر وبھلائی کے لیے کوشاں ہوتا ہے، لهذا إنما يهتم الإنسان؛ بل كل حيوان بسلامته أولاً ثم غنيمته ثانياً؛ علاوہ ازیں اگر کسی کو سلامتی حاصل ہوگئی تو ضمناً خیر ومنفعت بھی حاصل ہوجائے گی اور اگر سلامتی حاصل نہیں ہوئی تو ہلاکت وبربادی اور نقصان وضعیفی مُقَدَّر رہوگی؛ الغرض السلام علیکم سلامتی کی دعا، ہر طرح کی برائیوں سے نجات اور ہر قسم کی بھلائیوں کے حصول پر مشتمل ہے اور یہ

وقتی اور عارضی نہیں ہے؛ بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے؛ اِسی لیے جملہ اسمیہ کا انتخاب کیا گیا ہے؛ کیوں کہ عربی گرامر میں جملہ اسمیہ، دوام واستمرار کے لیے ہوتا ہے، سچ ہے اللہ الملك القدوس السلام کا ہر فعل مبنی بر حکمت ہوتا ہے، ایسی حکمت اور ایسے رموز واشارات کیا کسی انسانی دعا وسلام میں بھی ہیں؟ فللہ الحمد. پھر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ السلام ''اللہ'' کا نام بھی ہے تو دعا سلامتی کے ساتھ ساتھ ذکرِ خداوندی بھی ہے۔ (بدائع الفوائد بحذف واضافۃ: ۲/۱۴۵)

جوابِ سلام میں ''السلام'' کے معرفہ لانے کی وجہ: ایک علمی بحث

مسنون سلام ابتداءً السلام علیکم ہے اور سلامٌ علیکم بھی جائز ہے، یعنی ابتداءً سلام کرنے میں سلام کو معرفہ اور نکرہ دونوں طرح لا سکتے ہیں؛ لیکن دونوں صورتوں میں جواب کے وقت وعلیکم السلام کہا جاتا ہے، جواب میں سلام کو نکرہ نہیں استعمال کر سکتے، یعنی وعلیکم سلامٌ نہیں کہہ سکتے، اِس کی حکمت اور وجہ کیا ہے؟ ابن قیمؒ نے اِس سلسلے میں بڑی اچھی اور حکیمانہ گفتگو کی ہے، اہلِ علم کے لیے پیش ہے۔

جہاں سلام اور جوابِ سلام دونوں معرفہ ہوں وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے؛ لیکن جہاں سلام، سلامٌ علیکم سے ہوا، اور جواب وعلیکم السلام سے دیا گیا وہاں یہ بحث ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتداءً سلام ایک دعا ہے اور اہلِ عرب عموماً مقامِ دعا میں، الفاظِ دعا نکرہ استعمال کرتے ہیں، خواہ مرفوع ہوں یا منصوب جیسے ویلٌ له، خیبةً بددعا کے لیے اور سقیاً، شکراً وغیرہ دعا کے طور پر اِس کے پیشِ نظر سلام کو بھی نکرہ لا سکتے ہیں، اور جواب میں معرفہ کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ معرفہ کی صورت میں، چار فائدے حاصل ہوتے ہیں (۱) الإشعار بذکر الله تعالیٰ یعنی سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، جو ایک ذکر ہے اور معرفہ کے ساتھ ذکر کرنا اولیٰ ہے۔ (۲) اس صورت میں انسان اللہ سے سلامتی طلب کرتا ہے اور اللہ کا ایک نام ''السلام'' بھی ہے جو معرفہ ہے؛ لہٰذا اللہ کا نام جب معرفہ ہے تو جو لفظ اُس سے مشتق ہے اُسے بھی معرفہ ہونا چاہیے۔ (۳) الف لام کے دخول سے، اسم میں معنی کی کثرت پیدا ہوجاتی ہے تو

''السلام''معرفہ میں سلامتی کا معنی، کثرت کے ساتھ مطلوب ہوا۔ (۴) الف لام یہ کسی متعین چیز کی جانب اشارہ کے قائم مقام ہوتا ہے جیسے اسقِنِي الماءَ اُس وقت کہتے ہیں جب پانی سامنے موجود ہو، تو جب جواب دینے والے نے وعلیکم السلام کہا تو اس نے گویا یہ کہا: کہ آپ نے میرے لیے جس سلامتی کی دعا کی ہے، میں بعینہ وہ سلامتی کی دعا آپ کے لیے کر رہا ہوں،

الفائدة الرابعة: أنها تقوم مقام الإشارة إلى المعين كما تقول نا ولني الكتاب واسقني الماء وأعطى الثوب لما هو حاضر بين يديك؛ فإنك تستغني بها عن قولك "هذا" فهي مؤدية معنى الإشارة. (بدائع الفوائد:۲/۱۵۵)

جوابِ سلام کے تین مقامات ہیں

جوابِ سلام کے تین مقامات یعنی تین درجے ہیں، (۱) مقامِ فضل (۲) مقامِ عدل (۳) مقامِ ظلم: مقامِ فضل یہ ہے کہ انسان جواب احسن طریقے سے دے یعنی السلام علیکم کے جواب میں مثلا وعلیکم السلام ورحمة الله وبرکاته کہے اور مقام عدل یہ ہے کہ برابر اور ہم مثل جواب دے مثلا السلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السلام اور مقامِ ظلم یہ ہے کہ سلام کرنے والے کے الفاظ سے بھی کم الفاظ میں جواب دے مثلا السلام علیکم کا جواب صرف وعلیکم کے ذریعے دے؛ یہی وجہ ہے کہ سلام کرنے والے نے اگر سلامٌ علیکم کہا تو جواب میں وعلیکم السلام کا حکم ہے یعنی جواب دینے والا "السلام" معرفہ ہی استعمال کرے گا؛ تاکہ وہ مقامِ فضل کو بجالانے والا شمار ہو۔

فالفضل أن يرد عليه أحسن من تحيته، والعدل أن ترد عليه نظيرها، والظلم أن تبخسه حقه وتنقصه منها فاختير للراد أكمل اللفظتين هو المعرف بالأداة التي تكون للاستغراق. (بدائع الفوائد:۲/۵۵)

خط کے اخیر میں السلام علیکم سے پہلے ''واو'' لکھنے کی وجہ

خط کے اختتام پر والسلام علیکم لکھا جاتا ہے، صحابہ کرامؓ آپس میں خط و کتابت اسی

طرح کیا کرتے تھے جیسا کہ پیچھے دو خطوط بہ طور نمونے کے ذکر کیے گئے ہیں، سوال یہ ہے کہ آغازِ خط میں صرف السلام علیکم یا سلامٌ علیکم اور اختتامِ خط میں والسلام علیکم کیوں لکھا جاتا ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ واو عربی کا لفظ ہے جو عطف کے لیے آتا ہے یعنی اپنے مابعد کو ماقبل سے جوڑ دیتا ہے جیسے اردو میں ''اور'' آتا ہے، یہاں واو کے ذریعہ، سلام کو خط میں تحریر کردہ باتوں سے جوڑ دیا جاتا ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے خط میں چھوٹے چھوٹے جملوں کے بیچ میں عربی میں ''واو'' اور اردو میں ''اور'' لاتے ہیں اور جب اُس نے آخری جملے کو واو پر ختم کیا اور کہا: والسلام علیکم تو عربی داں طبقہ جانتے ہیں یا جانیں گے کہ اس نے مکتوب الیہ کو پہلے سلام کیا پھر مقصدِ تحریر بتایا اور اخیر میں دوبارہ نیا سلام کیا تو سلام میں تجدیدی معنی پیدا ہوگئے اور یہ بغر واو کے ممکن نہیں؛ ابن قتیبہؒ کی رائے یہ ہے: کہ والسلام علیکم میں واو کے ذریعہ پہلے والے سلام پر عطف ڈالا گیا ہے، ابن قیمؒ نے اِس رائے کی تردید کی ہے اور اِس کی وجہ یہی بتائی ہے کہ اس صورت میں تجدیدی معنی پیدا نہیں ہوں گے، دونوں ایک ہی سلام ہوجائیں گے تو دوبارہ سلام کرنے سے فائدہ کیا ہوا، التاسيس أولى من التاكيد قاعدہ مشہور ہے؛ اِس لیے اول الذکر رائے کے بارے میں ابن قیمؒ نے وهذا أحسن من قول ابن قتيبة کہا ہے۔ (بدائع الفوائد بحذف وزیادۃ:۱۵۶/۲)

اللہ کا انبیاء یا اہلِ جنت کو سلام کرنے کا مطلب — اشکال وجواب

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورُسُل کو سلام کیا ہے، اِسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت کو سلام کریں گے، ان لوگوں کو سلام کرنے کا کیا مطلب ہے اور کیا حکمت ہے؛ کیوں کہ معلوم ہو چکا ہے کہ سلام یہ سلامتی کی دعا ہے، یعنی جسے سلام کیا جاتا ہے، اُس کے لیے سلامتی کی درخواست، خداوند قدوس سے کی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ یہ طلبِ سلامتی کا معنی اللہ رب العزت کے حق میں کیسے صحیح ہوگا؛ کیوں کہ ہم بندے اللہ سے کسی چیز کی درخواست کرتے ہیں، اللہ کیسے اور کسی سے درخواست کریں گے؟

(خواص کے لیے) اِس میں کوئی شک نہیں کہ طلب ودرخواست کے لیے تین باتیں ضروری ہیں؛

بلکہ رکن ہیں، طالب، مطلوب اور مطلوب منہ(۱) یہ تینوں باتیں جب ہوں گی جب ''طلب'' کا وجود ہو مثلا: آپ نے سلام کیا تو آپ طالب ہوئے، دعاءِ سلام مطلوب ہوا اور اللہ تعالیٰ کی ذات مطلوب منہ ہوئی، اِس سے معلوم ہوا: کہ طالب اور مطلوب منہ الگ الگ ہوتے ہیں؛ لیکن کبھی طالب اور مطلوب منہ دونوں ایک ہی ہوتے ہیں، اِس صورت میں طلب کا وجود دو ہی رکن سے ہوتا ہے: طالب اور مطلوب، اور طالب ومطلوب منہ کا اتحاد ناممکن نہیں ہے؛ بلکہ ممکن ہے، دیکھیے انسان کا نفس، انسان کو کبھی نیکی کا حکم دیتا ہے، کبھی بدی سے روکتا ہے، انسان کا نفس کبھی گناہوں پر ابھارتا ہے اور انسان اُس کے مطابق کبھی کام کرلیتا ہے، تو انسان اور نفس دونوں ایک ہی ہیں، انسان نے اپنے آپ کو حکم دیا، اپنے آپ کو روکا، ارشادِ خداوندی ہے: إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ (۲) دوسری جگہ ہے: وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى. (۳) تو نفس انسانی آمر و مامور دونوں ہوا، معلوم ہوا کہ ایک ہی شخص طالب اور مطلوب منہ ہوسکتا ہے، اب حاصل یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل کو سلام کرکے، اُن کے لیے خود اپنی ذات پر رحمت کو لازم کیا ہے؛ حالاں کہ رحمت اللہ سے مانگی جاتی ہے، اللہ رحیم ورحمٰن ہیں، یا جیسے وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ. (۴) ہمارے اوپر مومنین کاملین کی مدد کرنا لازم ہے، اِن دونوں آیتوں کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت ونصرت کو یقینی بنانے کے لیے طلب وایجاب کی تعبیر، فعلِ کتابت اور فعلِ اِحقاق سے کی ہے یعنی حصولِ سلامتی کی تاکید در تاکید ہے، بالکل اسی طرح تسليم الله على أنبيائه ورسله کا مطلب ہوگا۔

(عوام کے لیے) انبیاء کے لیے سلامتی لازم ویقینی ہے، وہ اللہ کے برگزیدہ بندے اور نبی ورسول ہیں، ایک بندہ اپنے رب سے کوئی چیز مانگتا ہے، اُس کی مطلوبہ چیز اسے ملے گی یا نہیں، یہ اللہ کی مرضی وحکمت پر موقوف ہے؛ لیکن جب خود اللہ ہی کسی کو کچھ دینے پر آمادہ ہوجائیں تو اُس چیز کے

---

(۱) ابن قیمؒ نے ارکان ثلثہ کا تذکرہ کیا ہے، ورنہ طالب، مطلوب منہ کے ساتھ مطلوب لہ بھی ضروری ہے، ہم جس کو سلام کریں گے وہ مطلوب لہ ہوگا، مولف۔

(۲) یوسف:۵۳۔ (۳) النازعات:۴۰۔ (۴) الروم:۴۷۔

حصول میں کیا شبہ ہوسکتا ہے، اللہ کا انبیاء ورُسُل اور اہل جنت کو سلام کرنا، اور اس صورت میں اللہ کا طالب ومطلوب منہ نہ ہونا، سلامتی کے حصول وثبوت کے یقین کی جانب اشارہ کرنا ہے، ہم طالب ہیں، اللہ مطلوب منہ ہیں، ہم ضعیف ومخلوق ہیں، ہماری ہستی نابود ہونے والی ہے، اللہ خالق ومالک ہیں، اُس کی ہستی کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے، حی وقیوم ہے، طاقت وقوت اور قدرت کاملہ کا مالک ہے، ایسی ذات اگر طالب ہوجائے اور خود مطلوب منہ بھی ہوجائے تو ''طلب'' کس معیار کی ہوگی اور طلب کس درجے میں قبول ہوگی، ہم بندوں کی عقل اِس کا ادراک نہیں کرسکتی، بس یہ کہہ سکتی ہے کہ سلامتی کا حصول یقینی اور ضروری ہے۔ (بدائع الفوائد بحذف وزیادۃ:۲/۱۶۳)

السلام علیکم کے ساتھ "ورحمة اللّٰه وبركاته" کے اضافہ کی حکمت

سلام کے ساتھ رحمت وبرکت کا اضافہ، بیس نیکیوں کے اضافہ کا سبب ہوتا ہے، اور کل ملا کر تیس نیکیاں ملتی ہیں، یہ حدیث سے ثابت ہے اور اِس اضافہ کی حکمت کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے کہ ایسا رسول اللہ ﷺ نے کہا ہے؛ تاہم اِس کی مزید حکمتیں بھی ہوسکتی ہیں، ابن قیمؒ نے اپنی کتاب میں ''رحمت وبرکت'' کے اضافہ کی ایک لطیف اور نفیس حکمت بیان کی ہے، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

انسان کے لیے اِس دنیا میں سکون واطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے اور زندگی سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہونے کے لیے تین چیزیں ناگزیر ہیں؛ بلکہ انتفاع بالحیاۃ کی بنیاد ہیں، اِن تینوں کے بغیر یا تینوں میں سے کسی ایک کے بغیر زندگی سے مکمل فائدہ اٹھانا بہت مشکل ہے، وہ تین باتیں یہ ہیں: (۱) أحدها سلامته من الشرور من كل ما يضاد حياته وعيشه یعنی انسان کا تکالیف، شرور وفتن اور ہر ایسی چیز سے محفوظ اور سالم ہونا ہے جو انسانی زندگی اور عیش وآرام میں خلل ڈالنے والی ہوں، (۲) والثاني حصول الخير له یعنی دوسری چیز یہ ہے کہ انسان کو ہر طرح کے خیر وبھلائی اور منفعت ومسرت حاصل ہو، (۳) والثالث دوامه وثباته یعنی وہ خیر وبھلائی اور نفع پائیدار ہو، وقتی اور عارضی نہ ہو، جب یہ تینوں کسی انسان کی زندگی

میں موجود ہوں تو اُس کی دنیا، دنیا نہیں؛ بلکہ جنت کا نمونہ ہے۔

یقین جانیے اسلامی تحیہ ان تینوں معانی پر مشتمل ہے، دیکھیے السلام علیکم یتضمن السلامة من الشر یعنی السلام علیکم سے شرور وفتن سے حفاظت کی جانب اشارہ ہے، ورحمة الله یتضمن حصول الخیر یعنی "ورحمة الله" خیر وبھلائی کے حصول سے کنایہ ہے وقوله وبرکاته یتضمن دوامه وثباته اور "وبرکاته" دوام وثبوت اور حصولِ خیر کی پائیداری سے عبارت ہے؛ کیوں کہ برکت کا مفہوم کثرتِ خیر اور استمرارِ بھلائی ہے، اللہ اکبر اِس چھوٹے سے جملے میں، اللہ اور اُس کے رسول نے پوری دنیا کی بھلائی سمیٹ دی ہے۔ إن الله علی کل شيء قدیر. کاش سلام کے وقت اِن معانی کا استحضار ہم مسلمانوں کو ہوتا اور اِس پر کامل درجے کا یقین ہوتا، ہم پریشان نہ ہوتے، خوش حال ہوتے، مطمئن ہوتے۔

(خلاصہ بدائع الفوائد بحذف واضافہ: ۱۷۸/۲)

کیا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" پورا کہنا ضروری ہے؟ ایک شبہ اور شبہ کا حل - ایک علمی بحث

اوپر کی تفصیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب اسلامی تحیہ میں مذکورہ تینوں حکمتیں مُضمر ہیں تو ہر وقت اور ہمیشہ السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته کہنا ضروری ہوگا؛ حالاں کہ سلام کا ادنیٰ درجہ "السلام علیکم" ہے اور اِس پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور صرف السلام علیکم کے ذریعہ بھی سلام کی سنت ادا ہو جاتی ہے؛ حالانکہ جس نے السلام علیکم کہا اُس نے مکمل دعا نہیں دی، اس نے صرف سلامتیٔ شر کی دعا دی، اِسی طرح جس نے السلام علیکم ورحمة اللّٰه کہا اُس نے سلامتی اور بھلائی کے حصول کی دعا دی، اِس میں بھی دعا کی تکمیل نہیں ہوئی؛ حالاں کہ یہ بھی سلام ہے اور اِس پر بیس نیکیاں ملتی ہیں۔

اِس کا جواب یہ ہے کہ اگر سلام کرنے والے نے السلام علیکم ورحمة اللّٰه

وبرکاتہ کہا تو یہ اعلیٰ درجے کا سلام ہے اور یہ الفاظ اپنے معانی پر مکمل طور سے دلالت کرتے ہیں، اہلِ علم اِسے دلالت مطابقی کہتے ہیں، اور اگر اُس نے السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ کہا تو لفظوں کے اعتبار سے تعداد کم ہے؛ لیکن معانی مکمل ہیں اور یہ دونوں تیسرے معنی پر دلالت کرتے ہیں، بہ الفاظ دیگر سلام اور رحمت، برکت کو متضمن ہیں، اہلِ علم ایسی دلالت کو دلالتِ تضمُّنی کہتے ہیں، اور اگر اُس نے صرف السلام علیکم کہا تو لفظوں کے اعتبار سے، کم ہے؛ لیکن یہاں بھی رحمت وبرکت اس کے معانی میں شامل ہیں، بہ الفاظِ دیگر رحمت وبرکت، سلامتی کے لیے لازم ہیں، جب سلام ثابت ہوگا تو اُس کے لازمی معانی رحمت وبرکت بھی ثابت ہوں گے، اہلِ علم اِسے دلالت اِلتزامی کہتے ہیں؛ کیوں کہ سلام کے مفہوم میں اگر رحمت وبرکت داخل نہ ہوں تو یہ سلام، سلام نہیں رہ جائے گا، رہ گئی بات نیکیوں میں کمی زیادتی کی تو وہ تلفظ پر موقوف ہے، جتنے الفاظ زبان سے نکلیں گے، اتنی نیکیاں لکھی جائیں گی۔ (بدائع الفوائد بحذف وزیادۃ:۱۷۸/۲)

سلام میں رحمت وبرکت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیوں؟

السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ میں رحمت اور برکت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، اور سلام کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی گئی ہے، اِس کی کیا حکمت ہے؟ جواب اور حکمت یہ ہے کہ سلام تو خود اللہ تعالیٰ کا نام ہے، اِس صفتی نام کی اضافت ذاتی نام کی طرف کرنا بے معنی ہوگا، سلام اللّٰہ کہنا درست نہیں جیسے کوئی عالم دین ہے، اُس کے علم کی اضافت اُس کے نام کی طرف کرنا درست نہیں، مثلاً: کہا جائے: عالم زیدٍ اور خود زید ہی عالم ہے، اور جہاں تک بات رحمت وبرکت کی ہے تو اس کی اضافت مقامِ دعا میں اللہ کی طرف ہی ہوسکتی ہے، مقامِ دعا میں رحمت وبرکت کی نسبت اللہ کی طرف نہیں ہوگی تو کون ذات ہے؛ بلکہ کوئی ذات نہیں ہے جو رحمت وبرکت بندوں پر اتار سکے، اِس حکمت کے پیشِ نظر السلام بلا اضافت ہے اور رحمت وبرکت اضافت کے ساتھ ہے۔ فللہ الحمد.

إن السلام لما كان اسما من أسماء اللّٰه تعالى استغنى بذكره مطلقا عن

الإضافة إلى المسمى و أما الرحمة و البركة فلو لم يضافا إلى الله لم يعلم رحمة من ولا بركة من تطلب. (بدائع الفوائد:۲/۱۸۱)

''سلام'' اور''رحمة''کو مفرد اور''برکات''کو جمع لانے کی حکمت

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته میں سلام اور رحمت کو مفرد استعمال کیا گیا ہے؛ جب کہ برکات کو جمع، اِس کی کیا حکمت ہے؟ اصل حکمت تو حکیم وخبیر خداوند قدوس کو ہی معلوم ہے؛ تاہم ابن قیمؒ نے اِس کی حکمت اپنے انداز میں یہ بتائی ہے کہ لفظ سلام یہاں مفرد ہی استعمال ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ سلام یا تو مصدرِ محض ہے یا اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے؛ اگر مصدر محض مانیں تو مصدر شيء واحد کے درجے میں ہوتا ہے، مصدر کی جمع نہیں آتی ہے، اور اگر سلام اللہ کا نام ہو تو جمع لانا محال ہوگا، خدا جیسے اپنی ذات میں تنہا ہے، صفات میں بھی تنہا ہے؛ الغرض دونوں تقدیر پر سلام کی جمع نہیں لا سکتے۔

إن السلام إما مصدر محض فهو شيء واحد فلا معنى لجمعه و إما اسم من أسماء الله فيستحيل أيضا جمعه فعلى التقديرين لا سبيل إلى جمعه.

اور رحمت کو مفرد اس لیے لایا گیا ہے کہ یہ مصدر ہے اور مصدر کی جمع نہیں آتی ہے اور اِس کے اخیر میں گول ۃ ایسے ہی ہے جیسے محبة، خلة وغیرہ میں ہے، یعنی گول ''ۃ'' تحدید اور وحدت کے لیے نہیں ہے؛ لہٰذا جیسے محبة کی جمع محبات یا خلة کی جمع خلات نہیں آتی ہے ویسے ہی رحمة کی جمع رحمات نہیں آتی۔ دوسری بات یہ کہ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ اگر اُن کی جمع استعمال کریں تو مفہوم اور معانی ناقص رہتے ہیں، یہ الفاظ دیگر جمع تحدید اور تعداد پر دلالت کرتی ہے، جمع کے افراد ہوں گے جن کی کوئی نہ کوئی حد ہوگی، برخلاف مفرد کے کہ اگر وہ مفرد استعمال ہوں تو بغیر تحدید کے مسمی اور ذات پر دلالت کرتے ہیں، ایسی جگہوں میں مفرد کا استعمال، معنی ومفہوم کے اعتبار سے جمع سے زیادہ بہتر اور کامل ہوتا ہے، رحمت انہیں الفاظ میں سے ہے، ابن قیمؒ لکھتے ہیں: یہ ایک عجیب بات ہے، وهذا بديع جدا أن يكون مدلول المفرد أكثر من مدلول

الجمع، یعنی مفرد کی اپنے معانی پر دلالت، جمع کی دلالت سے زیادہ ہے۔

مثال:(۱) قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ (الانعام:۱۴۹) أعم ومن أتم معنى من أن يقال فلله الحجج البوالغ (۲) وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا. (ابراہیم:۳۴) أتم معنى أن يقال وإن تعدوا نعم الله. (۳) رَبَّنَا آتِنَا فِيْ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِيْ الآخِرَةِ حَسَنَةً. (البقرة:۲۰۱) أتم معنى من أن يقال حسنات. دیکھیے ان تمام مثالوں میں مفرد کا استعمال، جمع کے استعمال سے زیادہ اہم اور زیادہ معانی کا حامل ہے۔

اور رہ گئی بات برکت کے جمع لانے کی تو اِس کی حکمت یہ ہے کہ ''وبرکاتہ'' سے خیر و بھلائی کی کثرت اور منفعت کی پائیداری کی جانب اشارہ ہے، یعنی خدا تعالیٰ سے ایسی برکت کی دعا کی جارہی ہے کہ برکت کا ایک فرد ختم ہوجائے تو فوری دوسرا فرد اُس کی جگہ لے لے اور یہ سلسلہ چلتا رہے، تھمے نہیں، برکت کی بارش برستی رہے؛ لہٰذا یہاں جمع کا استعمال قرینِ قیاس ہے؛ چناں چہ قرآن سے اِس حکمت کی تائید ہوتی ہے، ارشاد ہے: رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ. (۱) دیکھیے رحمت مفرد اور برکت جمع مستعمل ہے، دوسری مثال تشہد میں پڑھی جانے والی تحیات ہے، السلام عليكم أيها النبي ورحمة الله وبركاته. غور کریں سلام اور رحمت مفرد ہیں جب کہ برکات جمع ہے۔ (بدائع الفوائد:۲/۱۸۳)

رحمت کی اضافت کی تحقیق

رحمۃ اللہ یہ مرکب اضافی ہے، یہاں اضافت میں دو احتمال ہیں: أحدها مضاف إليه إضافة مفعول إلى فاعله، یعنی رحمت مصدر جو حقیقت میں مفعول ہے، اُس کی اضافت اللہ کی طرف ہے جو کہ فاعل ہے، یعنی اللہ رحم کرنے والے ہیں یعنی اے اللہ رحم فرمائیے، جیسے اللہ تعالیٰ نے جنت کی منظر کشی کرتے ہوئے فرمایا ہے: "فقال للجنة إنما أنت رحمتي أرحم بك من أشاء. (۲) أنت رحمتي میں رحمت مخلوق ہے جس کی اضافت خالق کی طرف کی گئی ہے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ رحمت صفت ہے، اس کی اضافت موصوف کی طرف کی گئی ہے، یعنی اللہ صفت رحمت

(۱) ہود:۷۳. (۲) مسلم:۲۸۴۶،باب النار يدخلها الجبارون.

سے متصف ہیں،والثاني مضاف إليه إضافة صفة إلى الموصوف بها. (بدائع الفوائد:۲/۱۸۳)

برکت کی اضافت کی تحقیق

مذکورہ بالا تحقیق جو رحمت کے سلسلے میں پیش کی گئی ہے،اور وہاں اضافت میں دو احتمال کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہی دونوں احتمال یہاں بھی ہیں یعنی برکت جو مفعول ہے اُس کی اضافت فاعل کی طرف ہے؛ کیوں کہ برکت اللہ کا ایک فعل ہے، اور اللہ جس پر برکت نازل فرماتے ہیں وہ مبارک (اسم مفعول) ہوتا ہے؛ چناں چہ اِسی معنی کے اعتبار سے برکت کی دعائیں منقول ہیں مثلا: اللهم بارك لنا في رجب وشعبان (۱) اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے، یعنی برکت ایک وصف ہے جس سے اللہ تعالیٰ متصف ہے، پہلی صورت میں برکت کا فعل بارك مباركة استعمال ہوتا ہے اور دوسری صورت میں برکت کا فعل تبارك استعمال ہوتا ہے، دونوں میں فرق یہ ہے کہ بارك فعل ہے، بندوں کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے اور تبارك جو صفت ہے یہ صرف خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور صرف تبارک ہی استعمال ہوتا ہے، دوسرے صیغے مستعمل نہیں ہوتے؛ چناں چہ قرآن میں ہے: فَتَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْن. (الاعراف:۵۴) تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ. (الملک:۱) تَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ . (المؤمنون:۱۴) وغیرہ۔ (بدائع الفوائد:۲/۱۸۵)

بار بار سلام کرنے کی حکمت

ہر لمحہ تغیر پذیر ہے،شریعت نے انسانی حالت کی معمولی تبدیلی کے بعد دوبارہ سلام کرنے کا حکم دیا؛ تاکہ امن وامان کا جو معاہدہ ہے،اُس کی تجدید ہوتی رہے اور محبت والفت میں مزید پختگی پیدا ہو؛ چناں چہ انہیں وجوہات کی وجہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بازار جانے کا معمول تھا؛ تاکہ وہاں لوگوں کو سلام کرکے جہاں ایک طرف سلام کی فضیلت حاصل کریں، وہیں دوسری طرف آپسی محبت میں اضافہ کا سبب بنیں؛ تاکہ امن وآشتی کا ماحول بنا رہے۔(مرقاۃ:۹/۵۷)

---

(۱) شعب الایمان:۳۵۳۴.

بچوں کو سلام کرنے کی حکمتیں

حضرت انسؓ سے مروی ہے: کہ رسول اللہ ﷺ کچھ لڑکوں کے پاس سے گذرے تو آپ نے اُن کو سلام کیا۔ (مسلم:۲۱٦۸)

بلاشبہ آپ کا یہ عمل انکساری اور دنیا والوں کے تئیں انتہائی درجے کی شفقت ومحبت کی علامت ہے، اِس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ گھر کے بڑے بوڑھوں کو، مدرسے کے اساتذہ کو اور خانقاہوں کے پیر ومسترشدین کو گاہے بہ گاہے چھوٹے لڑکوں، طلبہ اور مریدین کو سلام کرتے رہنا چاہیے؛ تاکہ اُن کی اپنی تربیت ہو اور وہ سنتِ سلام کو رواج دینے کے عادی بنیں، شرح ابن بطال میں ہے:

وفيه تدريب لهم على تعليم السنن ورياضة لهم على آداب الشريعة ليبلغوا حد التكليف، وهم متأدبون بأدب الإسلام. (شرح ابن بطال:۹/۲۵)

اسی کے ساتھ ساتھ بچوں کو سلام کا جواب دینے پر آمادہ کریں۔

وينبغي لوليه أن يأمره بالرد؛ليتمرّن على ذلك.
(فتح الباری:۱۱/۴۱)

تعارض کا حکیمانہ حل

حضرت انسؓ والی حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے بچوں کو سلام کیا؟ حالاں کہ ایک دوسری روایت میں ہے کہ چھوٹی عمر والا، بڑی عمر والے کو سلام کرے(۱) دونوں احادیث میں ایک گونہ تعارض ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اِس کا حل پیش کیا ہے اور ساتھ میں حضور ﷺ کے سلام کی حکمت بیان کی ہے، رحمۃ اللہ الواسعہ سے پوری عبارت نقل کی جاتی ہے۔

دنیا کا عام دستور ہے کہ گھر میں آنے والا، گھر والوں کو سلام کرتا

(۱) بخاری:٦۲۳۴.

ہے، اور ادنیٰ بڑے کو سلام کرتا ہے، نبی ﷺ نے اِس رواج کو بحالہ باقی رکھا؛ چناں چہ چھوٹوں کو حکم دیا کہ بڑوں کو سلام کریں، اور گذرنے والے کو- جو گھر میں آنے والے سے مشابہ ہے- حکم دیا کہ وہ بیٹھے ہوؤں کو سلام کرے، اور تھوڑوں کو- جو تھوڑے ہونے کی وجہ سے ادنیٰ ہیں- حکم دیا کہ وہ زیادہ کو سلام کریں۔

دوسری حکمت اِس حکم میں یہ ہے کہ اگر آدمی اپنے بڑے اور اَشرف کی قدر پہچانے، اُس کی توقیر کرے، اور بڑھ کر اُس کو سلام کرے، تو اِس سے سوسائٹی کی شیرازہ بندی ہوتی ہے، لوگ باہم مربوط ہوتے ہیں؛ ورنہ بڑوں اور چھوٹوں میں رشتہ ٹوٹ جاتا ہے؛ اِسی لیے حدیث میں فرمایا: کہ جو ہمارے چھوٹوں پر مہربانی نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا حق نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں۔(۱) البتہ نبی ﷺ یہ بات بھی جانتے تھے کہ سلام لینے میں ایک طرح کی خود پسندی ہے، چھوٹا جب بڑے کو سلام کرتا ہے تو اُس کو فخر محسوس ہوتا ہے؛ چناں چہ نبی ﷺ نے اپنے فعل سے بڑوں کو تواضُع اور خاک ساری کی تلقین کی کہ اُن کو سلام کرنے میں پیش قدمی کرنا چاہیے؛ کیوں کہ بڑھ کر سلام کرنے والا تکبر سے پاک ہوتا ہے(۲) اور سوار کو حکم دیا کہ پیادہ کو سلام کرے؛ اِس میں خصوصیت سے یہ بات ملحوظ ہے؛ کیوں کہ سوار لوگوں کے نزدیک بڑی ہیبت والا ہوتا ہے اور وہ بھی خود کو بڑا تصور کرتا ہے؛ اِس لیے اس کو تاکید کی کہ وہ اپنے اندر تواضع پیدا کرے اور پیادہ کو سلام کرے۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ: ۵۴۶/۵)

---

(۱) ابوداؤد، رقم: ۴۹۴۳. (۲) مشکوۃ، رقم: ۴۶۶۶.

ایسی ہی بات فتح الباری میں ہے:

فـي السـلام على الصبان، تدريبهم على آداب الشريعة، وفيـه طـرح الأكابر، رداء الكبر وسلوك التواضع، ولين الجانب. (فتح الباری:۱۱/۴۱)

یعنی دو مقصد سے بچوں کو سلام کرنے کا حکم ہے: بچے سلام سیکھیں گے، بڑے خود پسندی اور تکبر سے بچیں گے۔

مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دوسری جگہ لکھتے ہیں:

بچے مستقبل کی امت ہیں، کل ہم نہیں رہیں گے اور وہ ہماری جگہ لیں گے؛ اس لیے بچوں کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دینی چاہیے، پس جس طرح بچوں کو تمرین کے لیے نماز پڑھوائی جاتی ہے اور روزہ رکھوایا جاتا ہے، اُسی طرح اُن کو سلام بھی کیا جائے؛ تاکہ وہ سلام کرنا اور جواب دینا سیکھیں، علاوہ ازیں بڑوں کا چھوٹوں کو سلام کرنا تواضع کی دلیل ہے۔ (تحفۃ الألمعی:۶/۴۷۶)

ایک مجلس میں تین مرتبہ سلام کرنے کی حکمت

حضرت انسؓ سے مروی ہے: کہ حضور ﷺ لوگوں کے پاس آتے تو انہیں تین مرتبہ سلام کرتے تھے۔ (بخاری:۶۲۴۴)

عام حالات میں آپ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ سلام ایک مرتبہ کیا کرتے تھے اور یہی مسنون ہے۔

وقـول أنـس: أنـه كـان إذا تـكلم بكلمة أعادها ثلاثا، يريد في أكثر أمره وأخرج الحديث مخرج العموم، والمراد به الخصوص. (شرح ابن بطال:۷/۲۲)

آپ کا تین مرتبہ سلام کرنا کسی وقتی اور عارضی مصلحت وضرورت کی وجہ سے ہوتا تھا؛

چناں چہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مجمع کثیر ہوتا تھا اور ایک سلام تمام لوگوں تک نہیں پہنچ پاتا تھا تو آپ تین مرتبہ سلام کرتے تھے، یعنی آپ سامنے اور دائیں بائیں الگ الگ سلام کرتے تھے؛ تاکہ سب کی دلجوئی بھی ہوجائے۔

دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ سلام میں اِسماع (یعنی سامنے والے کو الفاظِ سلام سنانا) واجب ہے، اگر آپ یہ خیال کرتے کہ پہلا سلام سنا نہیں گیا تو دوسری یا تیسری مرتبہ سلام کرتے تھے؛ تاکہ سامعین سن لیں؛ چناں چہ ایک مرتبہ ایسا واقعہ پیش آیا، آپ ﷺ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے، آپ نے سلام کیا، کوئی آواز نہیں آئی تو دوبارہ، سہ بارہ آپ نے سلام کیا، کوئی جواب نہیں ملا تو آپ یہ کہتے ہوئے "قَضَيْنَا مَا عَلَيْنَا" (ہم نے واجبی کام پورا کرلیا) واپس لوٹ گئے،(۱) گویا یہ تین بار سلام کرنا استئذان اور اجازت مانگنے کے لیے تھا؛ جس کی تائید ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: الاستئذان ثلاث (بخاری، رقم:۶۲۴۵)

تیسری وجہ یہ ہے کہ پہلا سلام اجازت کے لیے ہوتا تھا، دوسرا سلام اجازت ملنے کے بعد، داخلے کے وقت ہوتا تھا؛ جب کہ تیسرا سلام واپسی کے وقت ہوتا تھا، أحدها الاستئذان والثاني عند الدخول والثالث عند الوداع. (حاشیۂ مشکوۃ، ص:۳۳)

اور اگر تین مرتبہ سلام کرنا آپ کا دائمی معمول ہوتا تو یقیناً صحابہ کرامؓ بھی آپ کو ہمیشہ تین مرتبہ سلام کرتے اور آپ بھی ہر ملاقاتی کو تین مرتبہ سلام کرتے یا اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت تین مرتبہ سلام کرتے؛ حالاں کہ احادیث میں ایسا نہیں ہے، ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

من تأمل هديه: علم أن الأمر ليس كذلك، وأن تكرار السلام منه كان أمراً عارضا في بعض الأحيان.

(زادالمعاد:۲/۳۸۲)

---

(۱) الأدب المفرد، رقم:۱۰۰۸.

تین مرتبہ سے زائد سلام کرنا

اگر کسی نے کسی کو تین مرتبہ سلام کیا؛ لیکن سامنے والے کو سنائی نہیں دیا تو کیا جب تک مخاطب کو سلام سنائی نہ دے، مزید سلام کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جمہور کی رائے یہ ہے کہ تین مرتبہ سے زائد سلام کرنا مناسب نہیں، حدیث کے ظاہر پر عمل کرنا بہر حال اولیٰ ہے، اور حدیث میں تین سے زائد سلام کرنے کا تذکرہ نہیں ملتا؛ البتہ امام مالکؒ کی رائے یہ ہے کہ مقصد اِسماع ہے؛ لہٰذا تین مرتبہ سے زائد بھی سلام کر سکتے ہیں۔ (عمدۃ القاری: ۱۵/۳۶۱)

تین مرتبہ سلام کرنا، تین مرتبہ جواب دینا

سلام ایک ہی مرتبہ کیا جاتا ہے اور جواب بھی ایک ہی مرتبہ دیا جاتا ہے؛ البتہ ایک روایت ملتی ہے جس میں صحابی نے تین مرتبہ سلام کیا اور حضور ﷺ نے تین مرتبہ جواب دیا، حدیث پڑھیں:

ابو تمیمہ ہجیمیؒ اپنی قوم کے ایک شخص (ابو جُریّ جابر بن سلیمہ ہجیمیؓ) سے روایت کرتے ہیں: وہ کہتے ہیں: میں نے حضور ﷺ کو ڈھونڈھا؛ لیکن آپ کو پا نہ سکا (یہ صحابی نئے تھے حضور کو پہچانتے نہیں تھے) میں بیٹھ گیا اچانک وہاں ایک جماعت تھی جن میں آپ بھی تھے اور میں پہچانتا نہیں تھا اور آپ اِس جماعت کے درمیان مُصالحت کرارہے تھے پھر جب آپ کام سے فارغ ہوئے (اور چلنے کے لیے اٹھے) تو آپ کے ساتھ اُن میں سے بعض حضرات کھڑے ہوئے، تو انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ سُن کر میں نے آپ کو پہچان لیا تو میں نے عليك السلام يا رسول اللّٰه، عليك السلام يا رسول الله، عليك السلام يا رسول الله کہا نبی ﷺ نے فرمایا: عليك السلام مُردے کا سلام ہے، پھر آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا جب کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی سے ملے تو چاہیے کہ کہے: السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، پھر نبی ﷺ نے میرے سلام کا جواب دیا وعليك ورحمة الله وعليك ورحمة الله وعليك ورحمة

الله . (ترمذی: ۲۸۶۵-باب ۲۸/ابواب الاستیذان)

تشریح: یہ ایک جزئی واقعہ ہے اس پر مسئلہ کی بنیاد نہیں رکھ سکتے، اصل مسئلہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا سلام اور جوابِ سلام ایک مرتبہ ہے، روایت کی شرح میں مفتی سعید احمد صاحب لکھتے ہیں:

یہ صحابی چوں کہ نو وارد تھے؛ اِس لیے انہوں نے تین مرتبہ سلام کیا اور غلط طریقہ پر سلام کیا؛ چناں چہ آپ نے پہلے اُن کو سلام کرنے کا صحیح طریقہ بتایا پھر آپ نے بھی اُن کو تین مرتبہ جواب دیا یہ تین مرتبہ جواب دینا اُن کی دلداری کے لیے تھا، ورنہ شرعاً ایسا کرنا ضروری نہیں۔ (تحفۃ الالمعی: ۶/ ۴۹۷)

ابتداءً عليك السلام سے ممانعت کی حکمت

آپ ﷺ نے سلام کے آغاز میں عليك السلام یا عليكم السلام کہنے سے منع فرمایا ہے اور علت یہ بیان کی کہ یہ مُردوں کا سلام ہے، درحقیقت آپ نے اِس جملے سے مُردوں کے سلسلے میں، عرب میں رائج سلام کی جانب اشارہ کیا ہے کہ عرب کے لوگ عموماً جب مُردوں کو سلام کرتے ہیں تو اُن کا نام یا اُن کے نام پر دلالت کرنے والا لفظ پہلے استعمال کرتے ہیں اور سلام کا لفظ بعد میں؛ چناں چہ شعراء کے کلام سے اِس کی تائید ہوتی ہے، شعر پڑھیے:

عليك سلامُ الله قيس بن عاصم ☆ ورحمته ما شاء أن يترحما

اے قیس! تم پر اللہ کا سلام اور اس کی رحمت ہو، جتنا وہ چاہے۔

دیکھیے قیس بن عاصم کی موت پر اُسے جو سلام کیا گیا ہے، اس میں عليك پہلے ہے، معلوم ہوا کہ ایسے سلام سے آپ کا منع کرنا اِس بنیاد پر تھا کہ عرب کے لوگ مُردوں کو ایسے ہی سلام کرتے تھے، آپ نے اُسی مروّج عادت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ (زاد المعاد: ۵/ ۳۸۵)

الدر المنضود کے مولف لکھتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ عرف جاہلیت میں مَوتٰی کو سلام کرنے کا طریقہ

یہی تھا یعنی علیك السلام اور یا مطلب یہ ہے کہ یہ طریقہ سلام کا صرف اَموات کے لیے مشروع ہے، اَحیاء کے لیے نہیں؛ جس کی وجہ دو ہیں: اول یہ کہ یہ صیغہ احیاء میں مشروع، جواب کے لیے ہے کہ اس طرح سلام کے جواب میں کہا جاتا ہے؛ پس اگر اِس صیغہ کو شروع ہی میں اختیار کرلیا جائے گا تو پھر جواب کے لیے کیا باقی رہ جائے گا، دوسری وجہ یہ لکھی ہے کہ چوں کہ یہ مشہور ہے کہ "علی" ضرر کے لیے آتا ہے، شروع ہی میں "علیك" کہنے کی صورت میں مسلم علیہ کو اول وہلہ میں وحشت ہوگی بخلاف میت کے۔(الدر المنضود:۶/۶۶۶)

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: علیك السلام تحیة الموتی میں موتی سے مراد زمانہ جاہلیت کے کفار ہیں، جن کے دل مُردہ ہیں، وہ ایسے سلام کرتے ہیں، تم مسلمان ایسا نہ کرو۔(مرقاۃ:۱۴/۱۱۴)

علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ: سلام اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے؛ لہٰذا اسے آپس میں رائج کرو، جب یہ اللہ کا نام ہے تو آداب وتسلیم کے موقع پر اِسے مقدم ہونا چاہیے، اور مخلوق کا نام مؤخر علیك السلام کہنے میں ابتداءً علیك آتا ہے جو مخلوق ہے اور السلام مؤخر ہوجاتا ہے جو خالق ہے؛ اس لیے ابتداءً علیکم السلام کہنا مناسب نہیں۔

(عمدۃ القاری:۱۵/۳۶۷)

تاہم ابن بطالؒ لکھتے ہیں: کہ کسی نے مخلوق کا نام مقدم کردیا اور خالق کا نام مؤخر، تو اس نے کوئی حرام کام نہیں کیا۔

لثبوت ذلك عن النبي – عليه السلام – (شرح ابن بطال:۹/۳۱)

ملحوظہ: خیال رہے کہ آپ کے ارشاد "فإن علیك السلام تحیة الموتیٰ" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مُردوں کو علیك السلام کے ذریعہ سلام کرنا مسنون ہے؛ بلکہ اِس ارشاد کا مطلب بس

وہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا، اور اِس کی دلیل یہ ہے کہ زیارتِ قبور کے وقت آپ سے "السلام علیکم أهل دار قوم مؤمنين" کہنا ثابت ہے، یعنی مسنون سلام میں زندوں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں ہے، جیسے زندوں کو السلام علیکم کہا جاتا ہے ویسے ہی مردوں کو السلام علیکم کہا جاتا ہے، فالسنة لا تختلف في تحية الأحياء والأموات. (مختصر السنن:۶/۴۹، بحوالہ زاد المعاد:۲/۸۵)

سلام کی حد "وبركاته" ہے، اِس کی تائیدی حکمتیں

سلام کے الفاظ وبرکاتہ پر پورے ہو جاتے ہیں یہ الفاظ دیگر کلماتِ سلام کی زیادتی تین کلمات تک مسنون ہے، اس کی تفصیلی بحث پیچھے آ چکی ہے، یہاں تائیدی حکمتیں درج ذیل ہیں:

مفتی شفیع صاحبؒ کی رائے:

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہ کلمات کی زیادتی صرف تین کلمات تک مسنون ہے؛ اِس لیے زیادہ کرنا مسنون نہیں اور حکمت اِس کی ظاہر ہے کہ سلام کا موقع مختصر کلام کرنے کا مقتضی ہے؛ اِس میں اتنی زیادتی مناسب نہیں کہ کسی کام میں مُخِل یا سننے والے پر بھاری ہو جائے۔ (معارف القرآن:۲/۵۰۴)

اس کی مزید وضاحت انوار القرآن میں یوں ہے:

دوسرے یہ کہ اضافہ تین الفاظ تک محدود ہوگا؛ کیوں کہ ملاقات کی ابتداء سرسری کلام اور مختصر سلام کا موقع ہوتا ہے، اس کو لامحدود کیسے کیا جا سکتا ہے؛ اگر سلام کرنے والے ہی نے تینوں الفاظ پورے کر دئے تو اضافہ کی کیا صورت ہوگی، کہیں تو انتہاء کرنی پڑے گی؛ چناں چہ تین الفاظ تک حد بندی کر دی گئی......ورنہ تسلسل جاری رکھنا پڑے گا۔ (تفسیر انوار القرآن:۲/۴۲۱)

ابن قیمؒ کی رائے: مسنون سلام السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته ہی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ سلام ایک تحیہ ہے اور تحیہ کا مطلب زندگی ہے اور زندگی کی تکمیل تین باتوں سے ہوتی ہے: پہلی چیز ہے انسان کا شر وفتن سے صحیح سلامت رہنا، دوسری چیز ہے خیر وبھلائی کا حصول اور تیسری چیز ہے اُس خیر وبھلائی کی پائیداری اور اُس کا دوام، السلام علیکم سے پہلی چیز مراد ہے، جب کہ ''ورحمة اللہ'' سے دوسری چیز اور ''وبرکاتہ'' سے تیسری چیز مراد ہے، اب اس کے آگے کچھ ہے ہی نہیں؛ لہٰذا اسلام کو یہیں ختم ہونا چاہیے۔ (بدائع الفوائد: ۲/۱۸۱)

ثواب میں اضافہ کی وجہ

کلماتِ سلام میں اضافہ سے ثواب میں اضافہ کی وجہ یہ ہے کہ سلام کی مشروعیت کی غرض، بشاشت ومسرت، اتحاد ویگانگت، مودت ومحبت، ذکر ودعا اور معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے؛ کہ وہی سلامتی کے ضامن ہیں؛ پس کلماتِ سلام میں اضافہ، مقصدِ سلام کی تکمیل کرتا ہے؛ اِس لیے ثواب بڑھتا رہتا ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ: ۵/۵۴۸)

ناقص رائے

ایک اور بات یہ کہ کسی بھی چیز میں تین درجے ہوتے ہیں: اعلیٰ، اوسط اور ادنی السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته اعلیٰ درجہ ہے؛ کیوں کہ تین دعاؤں پر مشتمل ہے، اور السلام علیکم ورحمة الله اوسط، اور السلام علیکم ادنیٰ درجہ؛ کیوں کہ بالترتیب دو اور ایک دعا پر مشتمل ہیں۔

سلام میں "السلام" کی تقدیم کی وجوہات

(۱) سلام کے آغاز میں "السلام" آتا ہے اور سلام کے اختتام پر بھی "السلام" آتا ہے، صاحب تفسیر کبیر علامہ رازیؒ کہتے ہیں: یہ اچھی ترتیب ہے، اِس ترتیب کے مطابق آغاز اور اختتام دونوں اللہ کے ذکر پر ہوتا ہے اور یہ ترتیب اللہ کے ارشاد هو الأول والآخر کے مطابق

ہے؛ علاوہ ازیں جب کسی کام کی ابتداء اور انتہا دونوں ذکرِ خداوندی پر ہو، تو اُس کی برکت سے، دونوں کے درمیان جو طے ہوگا، اللہ اُسے قبولیت سے نوازیں گے، اِس کی قوی امید کی جاسکتی ہے؛ چناں چہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے: جب کوئی سلام کرنے کا ارادہ کرے تو اُسے السلام علیکم کہنا چاہیے؛ کیوں کہ اللہ ہی سلام ہیں؛ لہٰذا اللہ سے پہلے کسی اور چیز سے آغاز مت کرو۔

(اوجز المسالک: ۱۷/۱۶۴)

(۲) لفظ سلام کی تقدیم وتاخیر کے حوالے سے قرآن کریم کا طرزِ عمل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ السلام کے ذریعہ جو دعا دی جاتی ہے وہ خیر کی دعا ہے اور خیر کی دعا میں لفظِ خیر کو مقدم کرنا بہتر ہے؛ لہٰذا پہلے السلام کہا جائے؛ چناں چہ قرآن میں جہاں جہاں سلام کو دعاءِ خیر کے لیے استعمال کیا گیا ہے، وہاں سلام کو مقدم کیا گیا ہے مثلاً:

سَلَامٌ عَلَى نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ (۱) سَلَامٌ عَلَى إِلْ يَاسِيْنَ (۲) وغیرہ، اور جہاں دعاءِ خیر نہیں؛ بلکہ اللہ کی لعنت اور غضب کا بیان ہے وہاں اُسے مقدم کیا گیا ہے، جو مستحقِ لعنت ہے مثلاً: اللہ تعالیٰ کا ابلیس سے کہنا: وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْ إِلَى يَوْمِ الدِّيْنِ. (۳) اور جیسے وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ. (۴) وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْد. (۵) (زادالمعاد: ۲/۳۸۵)

(۳) الفرق بين الرد والابتداء آغاز سلام اور جواب سلام میں فرق کرنے کے لیے یہ ترتیب اختیار کی گئی ہے؛ کیوں کہ اگر سلام کرنے والے نے السلام علیکم کہا اور جواب دینے والے نے بھی السلام علیکم کہا تو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ سلام کس نے کیا اور جواب کس نے دیا؛ بالخصوص اُس وقت جب کہ جوابِ سلام بالکل متصلاً اور بغیر وقفہ کے دیا جائے، سلام کرنے والے کا مقصود یہ ہے کہ وہ اُسے جواب دے، یہ مقصود نہیں ہے کہ وہ سلام سے اسی طرح آغاز کرے جیسے اُس نے کیا ہے اور جواب کا پتہ اُسی وقت چلے گا؛ جب کہ سلام اور جوابِ سلام میں کوئی وجہ فرق ہو، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے اُن صحابی کو منع کیا جنہوں نے عليك السلام کہہ کر سلام کیا تھا۔

(۱) الصافات: ۷۹. (۲) الصافات: ۱۳۰. (۳) ص: ۷۸. (۴) الحجر: ۳۵. (۵) الشوریٰ: ۱۶

فإنه لو قال له في الرد: السلام عليكم أو سلام عليكم لم يعرف أ هذا رد السلام أم ابتدأ تحية منه؛ فإذا قال: عليك السلام عرف أنه قد رد عليه تحيته. (بدائع:۲/۱۵۲)

(۴) سلام کرنے والا اپنے مومن بھائی کو سلامتی کے نزول کی دعا دیتا ہے، اُس کے پیشِ نظر سلامتی ہے؛ لہٰذا یہاں سلام کو مقدم کیا گیا اور جواب دینے والا وعلیکم السلام کہہ کر، سلام کرنے والے کے لیے سلامتی وحفاظت کا خواہاں ہوتا ہے، وہ یہ چاہتا ہے کہ جب اِس مومن بھائی نے سلام کر کے مجھے سلامتی کی دعا دی ہے تو میرا اخلاقی اور شرعی فریضہ بنتا ہے کہ میں بھی اُسے سلامتی کی دعا دوں؛ چناں چہ اِس جذبے کے اظہار کے لیے وہ "وعلیکم" کو مقدم کرتا ہے، بالفاظِ دیگر سلام کرنے والے کا نام پہلے لیتا ہے کہ میں بھی آپ کے لیے شرور وفتن سے سلامتی اور حفاظت کا مُتَمَنّی ہوں۔ (بدائع الفوائد:۲/۱۵۳)

(۵) لفظ سلام کی تقدیم میں مخاطب کو اولِ وہلہ میں اطمینان دلانا ہے اور تفاولِ نیک کا ارادہ کرنا ہے، جو لفظ "علیکم" مقدم کرنے کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا؛ کیوں کہ لفظ "علی" سے ایہامِ ضرر ہوسکتا ہے؛ البتہ جوابِ سلام "وعلیکم السلام" میں واوِ عاطفہ چوں کہ پہلے ہے، جس کے ذریعہ سلام پر عطف ہونے کی وجہ سے علیٰ موہمِ ضرر نہیں رہتا؛ اس لیے جوابِ سلام میں علی کی تقدیم گوارا کر لی گئی۔ (تفسیر انوار القرآن:۲/۴۲۱)

السلام علی اللّٰہ کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ بہ الفاظ دیگر اللہ کو سلام کر سکتے ہیں یا نہیں؟

السلام علی اللّٰہ کہنا درست نہیں ہے، حضور ﷺ نے اِس سے منع فرمایا ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ ہم لوگ نمازوں میں السلام علی الله قبل عباده، السلام علی جبرئیل، السلام علی میکائیل، السلام علی فلان وفلان یعنی اللہ پر اس کے بندوں کی طرف سے سلام ہو، جبرئیلؑ پر سلام ہو، میکائیلؑ پر سلام ہو، فلاں فلاں پر سلام ہو، نماز سے فراغت کے بعد حضور ﷺ نے ہماری طرف چہرہ پھیر کر فرمایا: "إن الله هو السلام" یعنی "السلام علی

الله "اللہ پر سلام ہومت کہو؛ کیوں کہ اللہ خود "السلام" ہے۔(بخاری:۶۲۳۰،کتاب الاستئذان)

ممانعت کی وجہ: سلام ایک دعا ہے،سلام کرنے والا جسے سلام کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے اُس کے لیے سلامتی کی دعا کرتا ہے اور اگر السلام علی الله کہا جائے تو لازم آئے گا کہ اللہ کے لیے سلامتی کی دعا کی جا رہی ہے اور یہ درست نہیں ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کی جاتی ہے،اللہ کے لیے درخواست نہیں کی جاتی ،اللہ سے دعا کی جاتی ہے،اللہ کے لیے دعا نہیں کی جاتی ، والله تعالیٰ هو المطلوب منه لا المطلوب له وهو المدعو لا المدعو له. لہٰذا السلام علی الله محال ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو سلامتی نصیب فرماتے ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے: وسلام على المرسلين(۱) سلام على إبراهيم (۲) وغیرہ،قرآن میں ہے: تحيتهم يوم يلقونه سلام (۳) یعنی اہلِ جنت جس دن اللہ تبارک وتعالیٰ سے ملیں گے اُن کا تحیہ سلام ہوگا،یعنی اللہ تعالیٰ انہیں سلام کریں گے،یعنی یہ سلام فرشتوں کے ذریعہ نہیں ہوگا؛ بلکہ خدا تعالیٰ اہلِ جنت کو سلامتی کی دعا دیں گے،اور یہاں یہ معنی مراد لینا محال ہے کہ یہ سلام بندوں کی طرف سے اللہ کو ہوگا؛ کیوں کہ جب انہیں دنیا میں السلام على الله کہنے سے منع کر دیا گیا تو آخرت میں انہیں یہ بات بخوبی یاد رہے گی کہ اللہ کو سلام کرنے سے حضور نے منع فرمایا ہے۔(خلاصہ بدائع الفوائد:۲/۱۴۱)

ولما كان السلام من أسماء الله لم يجز أن يقال: السلام على الله، وجاز أن يقال: السلام عليكم؛ لأن معناه الله عليكم. (شرح ابن بطال:۹/۹)

إذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما میں سلاماً کے منصوب ہونے کی وجہ

چوں کہ عباد الرحمٰن کی مدح مقصود ہے؛ اسی لیے سلاماً کو منصوب ذکر کیا گیا ہے جو مصدر محذوف کی صفت ہے،یعنی قالوا قولا سلاماً أى سدادا وصوابا وسليما من الفحش اگر سلامٌ یہاں مرفوع ذکر کیا جاتا تو مذکورہ مدح حاصل نہ ہوتی؛ بلکہ مطلب یہ ہو جاتا کہ جہالت والے لوگ جب اُن سے مخاطب ہوتے ہیں تو یہ لوگ السلام علیکم کہتے ہیں؛ حالاں کہ آیت کا

(۱) الصافات:۱۸۱. (۲) الصافات:۱۰۹. (۳) الاحزاب:۴۴.

یہ مقصد نہیں ہے اور نہ ہی اِس صورت میں اُن کی تعریف ہوگی ،تعریف اُسی صورت میں ہوگی جب کہ جاہلین نے غلط بات کہی اور انہوں نے اچھی بات کہی۔ فهو من باب دفع السيئة بالتي هو أحسن. (بدائع الفوائد:۲/۱۵۹)

نماز میں پہلے سلام پھر درود —— اس ترتیب کی حکمت

قرآن میں درود کا تذکرہ پہلے اور سلام کا تذکرہ بعد میں ہے؛ لیکن نماز میں ترتیب اس کے برعکس ہے،تشہد میں پہلے التحیات کے اندر حضورﷺ پر سلام ہے، اُس کے بعد درود پڑھنے کا حکم ہے، ایسا کیوں؟ حالاں کہ نبی کریمﷺ کی یہ عادت مبارکہ تھی عبادات میں قرآن نے جو ترتیب رکھی ہے، آپ اُسی ترتیب کو اختیار کرتے تھے: دیکھئے آپ نے سعی کا آغاز صفا سے فرمایا اور کہا: ہم وہیں سے آغاز کریں گے جہاں سے اللہ نے کیا ہے: اشارہ ہے إن الصفا والمروة من شعائر الله (۱) کی جانب ،دیکھیے آپ نے وضو میں فرائضِ وضو کی ترتیب وہی رکھی جو قرآن نے بیان کی یعنی پہلے چہرہ، پھر ہاتھ پھر سر پھر پیر؛ کیوں کہ قرآن میں یہی ترتیب ہے، اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ترتیب قرآنی کا لحاظ فرمایا کرتے تھے، اِس کے باوجود نماز کے اندر، ترتیبِ قرآنی کا لحاظ نہیں فرمایا، اِس کی کیا حکمت ہے؟ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

نماز،عبودیت کے اظہار کا اعلیٰ درجہ ہے،نماز میں عُبودیت قلب کے ساتھ ساتھ،تمام ظاہری اعضاء وجوارح کی عبودیت ظاہر ہوتی ہے، جب ایک بندہ اخلاص کے ساتھ نماز پڑھتا ہے تو اُس کا ظاہر اور باطن دونوں مکمل طور سے عبودیت کا اظہار کرتے ہیں، جب اِس عبودیت وتذلُّل کی تکمیل ہوتی ہے اور نماز اختتام کو پہنچتی ہے،تو جیسے ایک ذلیل اور بے قیمت بندہ اپنے مجازی آقا کے سامنے انتہائی عاجزی وذلت کے ساتھ بیٹھتا ہے؛ اُسی طرح نمازی کو حکم ہوا کہ وہ بھی اختتام صلاۃ پر اپنے حقیقی آقا کے سامنے انتہائی ادب، عاجزی اور خضوع وانکساری کے ساتھ بیٹھ جائے؛ تاکہ اُس سے خشیتِ خداوندی کا اظہار ہو سکے،اب چوں کہ کسی بادشاہ کے پاس لوگ آتے ہیں تو تحیہ وسلام پیش کرتے ہیں،اعلیٰ قسم کی تعریف کرتے ہیں،خداوند قدوس تمام بادشاہوں کے بادشاہ ہیں،اُن کے

---

(۱) البقرۃ:۱۵۸۔

سامنے ایک ادنی بندہ بیٹھا ہوا ہے تو اُسے حکم ہوا کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں انتہائی اعلیٰ قسم کی تعریف وثناء پیش کرے؛ چناں چہ التحیات للہ والصلوات والطیبات کے ذریعہ وہ خدا کی تعریف کرتا ہے کہ قولی، بدنی اور مالی جتنی عبادتیں اور اُس کی قسمیں ہوسکتی ہیں سب خداوند قدوس کے لیے سزاوار ہیں؛ گویا اِن الفاظ کے ذریعہ بندہ نے اپنے رب کی بارگاہ میں اپنا ''سلام'' پیش کیا، جب یہ ''سلام'' ہو چکا تو اُس ذات کو ''سلام'' کرنے کا حکم دیا گیا، جس کے واسطے سے ہمیں یہ نماز؛ بلکہ ہر قسم کا خیر ملا، تواب السلام علیك أیها النبي کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کو ''سلام کیا گیا پھر رحمت وبرکت کی دعا سے اِس سلام کی تکمیل کرائی گئی ورحمة اللہ وبرکاتہ پھر اُسے حکم ہوا کہ اپنے اوپر سلام بھیجو کہ تمہیں بھی سلامتی کی ضرورت ہے، پھر کہا گیا: کہ اللہ کے جو نیک بندے باقی رہ گئے ہیں انہیں بھی سلام کیا جائے السلام علینا وعلی عباد اللّٰہ الصالحین، گویا جناب خداوندی میں سب کو سلام کیا گیا، لفظ ''سلام'' سے خدا کو سلام نہیں کر سکتے؛ کیوں کہ ''سلام'' تو خدا کا نام ہے اس لیے وہاں التحیات (جمع کے ساتھ) لایا گیا؛ تاکہ تحیات میں عموم واستغراق رہے، اور بقیہ میں لفظ ''سلام'' ذکر کیا گیا، سلام کے بعد اِس اہم مقام کو اللہ کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کی شہادت پر ختم کرنے کا حکم ہوا، أشهد أن لا إلٰه إلا اللّٰه وحده لا شریك له وأشهد أن محمدا عبده ورسوله. اب اللہ کی تعریف اور اس کی ثنا مکمل ہوئی۔

اب اس بندے کو دعا کرنی ہے، تشہد میں دو چیزیں بنیادی ہیں: ایک دعاءِ ثنا، دوسرے دعاء طلب وسوال، اور اِن دونوں میں دعاءِ ثنا اہم اور اشرف ہے؛ کیوں کہ یہ خداوند قدوس کا حق ہے اور دوسری دعا یعنی طلب اور سوال یہ بندے کا حصہ ہے تو التحیات میں پہلی قسم کی تکمیل ہوئی، دوسری قسم کو اب شروع کرنا ہے، فیصلہ یہ کرنا ہے کہ طلب وسوال میں اہم اور انفع اور عظیم الشان فائدہ کیا ہے، اسلامی عقل وخرد کا فیصلہ یہی ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے پیارے رسول پر درود کی درخواست ہے؛ کیوں کہ جو کچھ ہمیں ملا یا ملے گا سب حضور ﷺ کے صدقہ میں ہے، علاوہ ازیں بندے کو اخیر میں اپنے لیے کچھ مانگنا ہے اور مانگنے کا ادب ہے إذا دعا أحدکم فَلْیَبْدَأْ بحمد

اللّٰہ والثناء علیه ثم لیصل علی النبي ﷺ ثم لیدع (ترمذی، رقم:۳۴۷۷ فی الدعوات)

عن عمر بن الخطابؓ قال: إن الدعاء موقوف بین السماء والأرض لا یصعد منه شيء حتی تصلي علی نبیك ﷺ. (ترمذی:۴۸۶، فی الصلاۃ)

لہٰذا اُسے اِن دو باتوں کی وجہ سے حکم ہوا کہ درود پڑھے، اب درود پڑھ چکا تو حکم ہوا کہ اپنے لیے دعا کرلو، ذرا سوچیے تشہد از اول تا آخر کیسے ایک دوسرے سے مربوط ہے، اور یہ ربط اپنے اندر کتنا حُسن رکھتا ہے، کیا کوئی بندہ ایسا کرسکتا ہے؟ یہ تو کوئی ایسی ذات ہی کرسکتی ہے جس کی یہ صفت ہو لا مثال له ولا مثیل له. (خلاصہ بدائع الفوائد مع اضافہ:۱۹۰/۲)

اِس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ کیوں نماز کے تشہد میں پہلے سلام ہے پھر درود ہے، فللّٰہ الحمد.

بارگاہِ خداوندی میں سلام پیش کرنے کا اسلوب

التحیات للّٰہ یعنی جملہ انواعِ تعظیم وتسلیم اللہ تعالیٰ شانہ کے لیے ہیں، ابوسلیمان خطابیؒ مشہور شارحِ حدیث فرماتے ہیں کہ ہر زمانہ میں ہر بادشاہ کے لیے سلام وآداب کے طریقے الگ الگ رہے ہیں؛ لیکن حق تعالیٰ کی شایانِ شان اُن میں سے کوئی سا بھی نہیں تھا؛ اِس لیے حضور ﷺ نے اُن تمام انواعِ سلام کی طرف اشارہ(۱) کرتے ہوئے، ان سب کو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص فرمایا یعنی جملہ انواعِ تعظیم وتسلیم صرف اللہ کے لیے ہیں۔ (الدر المنضود:۳۵۸/۲)

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (الأحزاب: ٥٦)

صلاۃ وسلام میں، فعل "سلموا" کے ساتھ "تسلیما" کے اضافہ کی حکمت

اس آیت میں صلوا کے ساتھ کوئی مصدر نہیں ہے؛ جب کہ "سلموا" کے ساتھ

---

(۱) اور اشارہ کرنے والے جناب رسول اللہ ﷺ ہیں، آپ سے بڑھ کر کوئی فصیح وبلیغ نہ ہوا نہ ہے، آپ ہی نے یہ تعظیم وتکریم اور بارگاہ رب العالمین میں سلام پیش کرنے کا یہ اسلوب اختیار فرمایا ہے۔

"تسلیما" مصدر کا اضافہ ہے، ایسا کیوں؟ مطلوب تو درود و سلام دونوں ہیں؟ ابن قیمؒ نے اس کی حکمت بیان کی ہے، خلاصہ درج ذیل ہے:

عربی داں حضرات جانتے ہیں کہ فعل کے بعد مصدر کا اضافہ فعل کی تاکید کے لیے ہوتا ہے، اِس آیت میں تاکید، صلاۃ وسلام دونوں کی ہے؛ البتہ جہتِ تاکید الگ الگ ہے، آیت کا آغاز لفظ إنَّ کے ساتھ ہے جو نہایت تاکید پر دلالت کرتا ہے، اِس کے بعد مضارع کا صیغہ ہے جو استمرار و دوام پر دلالت کرتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ اور اُس کے فرشتے ہمیشہ درود بھیجتے رہتے ہیں، قرآن کے اولین مخاطب اہلِ عرب تھے جو اہلِ زبان تھے، اُنہوں نے اس بلیغ انداز سے سمجھ لیا کہ نبی کریم ﷺ کا مرتبہ اللہ کے نزدیک اور فرشتوں کے نزدیک کیسا ہے؟ اب اِس کے بعد جب انہیں درود پڑھنے کا حکم دیا گیا تو صرف اشارۂ حکم کافی سمجھا گیا، حکم کی تاکید کی ضرورت ہی نہیں پڑی کہ مخاطب کو یہ چیز پہلے سے حاصل ہو چکی ہے، لہٰذا فعل کی تاکید کی کوئی ضرورت نہیں اور ''سلام'' کے اندر یہ معنی نہیں پیدا ہوئے، اور وہ امر کی شکل میں ہے، خبر کی شکل میں نہیں ہے، تو اُس فعل کی تاکید کی ضرورت پڑی؛ تاکہ درود و سلام کا توازن برقرار رہے، اب صلاۃ میں تکرار کا حصول خبر اور طلب کے ذریعہ ہوا اور ''سلام'' میں تکرار فعل اور مصدر سے حاصل ہوا، اور فعل کی تاکید، فعل کے تکرار کے مترادف ہوتی ہے؛ الغرض: صلوا میں تاکید پہلے سے ہے؛ اِس لیے مصدر سے تاکید کی ضرورت نہیں اور "سلموا" میں کوئی تاکید نہیں؛ اس لیے تسلیما کے ذریعہ تاکید لائی گئی، ابن قیمؒ یہ لکھ کر آخر میں لکھتے ہیں: فإنه بديع جدا فتأمله. (بدائع الفوائد: ۲/ ۱۸۸)

اوپر جو کچھ لکھا گیا ابن قیم کی تحریر کی روشنی میں لکھا گیا ہے، اس کی مزید تفصیل حضرت حکیم الامتؒ کی زبانی سنیے اور پڑھیے:

نماز میں تحیہ کے مقرر ہونے کی وجہ

جب حکمنامۂ الٰہی کے پڑھنے سے فراغت ہوئی تو حضور الٰہی میں بیٹھ جانے کی اجازت عطا ہوئی، اور اُس سے (نمازی سے) پوچھا جاتا ہے کہ ہمارے حضور میں کیا تحفہ لائے ہو؟ تو اُس

وقت دوزانو بیٹھ کر (اس طرح بیٹھنا تعظیم کے لیے ہے چوزانوں ایسا نہیں) اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اے خدا، تعظیمات قلبی اور عبادات بدنی اور مالی کا مستحق تو ہی ہے اور تیرے ہی حضور کے لائق ہے؛ لہٰذا میرا سارا مال وبدن اِس امر کے لیے تیرے حضور میں حاضر ہے۔

التحیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام مقرر ہونے کا راز

نماز میں نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے واسطے بھی سلام مقرر کیا گیا؛ تا کہ نبی کی یاد دل سے نہ بھلائیں اور اُن کی رسالت کا اقرار کرتے رہیں اور نعمتِ اسلام اور آپ کی تبلیغِ رسالت کی قدر دانی کریں اور اس کے شکریہ میں آپ پر سلام بھیجیں من لم يشكر الناس لم يشكر الله یعنی جو لوگوں کا شکر گزار نہ ہو وہ خدا کا کب شکر کر سکتا ہے، اِس طرح سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ حق (خاص کر ایسے زبردست محسن کا جن کے کرم سے آج ہم انسان بن گئے، نیز مسلمان اور جنت کے حق دار ہو گئے) ادا ہو جائے گا؛ لہٰذا تحیہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام مقرر ہوا۔

عام مومنین وصُلحاء پر سلام مقرر ہونے کی حکمت

نماز میں السلام علينا وعلى عباد الله الصالحين میں سلام کو عام کر دیا گیا، یعنی ہم پر سلام اور خدا کے نیک بندوں پر سلام، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جب بندے کی زبان سے یہ نکلا تو ہر ایک نیک بندے کہ جو آسمان وزمین میں ہیں، سلام پہنچ جائے گا (ابوداؤد) اِس میں تعمیمِ سلام، حقِ ہمدردی بنی نوع کی بجا آوری کے لیے ہے، اور اپنے اوپر جو سلام ہے یہ آدابِ دعا وسلام میں سے ہے، ورنہ سخت محرومی کی بات ہے کہ دوسروں کے لیے اور عام بندوں کے لیے تو تمام بدیوں، عیبوں، بیماریوں اور آفتوں سے سلامتی مانگی جائے اور اپنے کو محروم رکھا جائے۔

(احکامِ اسلام عقل کی نظر میں، ص:۹۸)

لطیفۂ التحیات

مولانا محمد عاقل صاحب سنن ابی داؤد کی شرح میں لکھتے ہیں:

شروح حدیث میں التحیات کے بارے میں لکھا ہے کہ جب واقعۂ معراج میں حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ نے اللہ تعالیٰ شانہ کی حمد وثنا ان مخصوص الفاظ میں عرض کی التحيات لله والصلوات والطيبات تو اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے جواب ملا السلام عليك أيها النبي ورحمة الله وبركاته (حضور ﷺ چوں کہ کسی موقع پر بھی اپنی امت کو نہ بھولتے تھے؛ اس لیے) آپ نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا السلام علينا وعلى عباد الله الصالحين، مطلب یہ تھا کہ اے اللہ آپ کی جانب سے سلامتی صرف مجھ پر ہی نہیں؛ بلکہ میرے ساتھ دوسرے نیک بندوں پر بھی ہونی چاہیے، یہ سارا منظر جبرئیل امین دیکھ رہے تھے تو اِس پر انھوں نے فوراً فرمایا: أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمداً عبده ورسوله.

ایک اشکال اور جواب:

چوں کہ حضور ﷺ کی حمد وثنا جناب باری میں ليلة المعراج میں ایک مخصوص مقام پر سدرة المنتهى سے آگے ہوئی تھی تو اس پر حضرت شیخ (مولانا زکریا کاندھلویؒ) نے یہ اشکال لکھا ہے کہ جبرئیل امین تو سدرة المنتهى پر پہنچ کر رک گئے تھے تو پھر وہ اُس وقت مقام حمد وثنا میں کہاں تھے کہ شہادتین پڑھتے؟

حضرت نے یہ اشکال اپنے ایک مکتوب گرامی میں کیا ہے، بندہ کے ذہن میں اس کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے واپسی میں جب حضور ﷺ نے حضرت جبرئیل کو اپنی تمام سرگذشت سنائی ہو تب

انھوں نے ایسا کہا ہو أشھد أن لا إلٰہ إلا اللہ و أشھد أن محمداً عبدہ ورسولہ، واللہ تعالیٰ أعلم .(الدرالمنضود:۲/۲۶۰)

تشہد کے بعد درود ودعا کی وجہ

تشہد کے بعد دعا کے متعلق آں حضرت ﷺ نے فرمایا: کہ جو دعا نمازی کو پسند ہو وہ کرے (بخاری) یہ اِس واسطے کہ نماز سے فارغ ہونے کا وقت دعا کرنے کا وقت ہے؛ کیوں کہ نماز پڑھنے کی وجہ سے رحمتِ الٰہی اُس پر چھا جاتی ہے اور ایسی حالت میں دعا مستجاب ومقبول ہوا کرتی ہے اور دعا کے آداب میں سے پہلے جناب باری کی حمد وثنا بیان کرنا اور نبی ﷺ کا توسُّل کرنا ضروری ادب ہے، یعنی آں حضرت ﷺ پر صلوات، سلام وبرکات کے تحفے بھیجے جائیں؛ تاکہ دعا مستجاب ہوجائے پھر اُس کے بعد اپنے لیے اور اپنے ماں باپ کی لیے اور اہلِ اسلام کے لیے دعائے مغفرت وہدایات وغیرہ ضروریات دین کرکے، نماز کو ختم کرنے کے لیے دائیں بائیں طرف منہ کرکے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہہ کر نماز سے فارغ ہوجاتے ہیں۔

نماز کے آخر میں السلام علیکم کی وجہ

دائیں بائیں سلام پھیرنے میں اشارہ ہے کہ وقتِ نماز میں گویا میں (نمازی) اِس عالم سے باہر چلا گیا تھا اور ماسوی اللہ (اللہ تعالیٰ کے سوا سب سے الگ تھلگ ہوکر) سے فارغ ہوکر اُس کی درگاہ میں پہنچ گیا تھا، اِس کے بعد اب پھر آیا ہوں اور موافقِ رسمِ آیندگان (آنے والوں کے طریقہ کے موافق) ہر کسی کو سلام کرتا ہوں۔

جاں سفر رفت وبدن اندر قیام ☆ وقت رجعت زاں سبب گوید سلام

(روح سفر کو گئی اور بدن مقیم رہا؛ اِسی وجہ سے واپسی کے وقت سلام کہتا ہے) اِسی لیے فقہاء نے لکھا ہے: کہ داہنے سلام میں داہنی طرف کے فرشتوں اور نمازیوں کی اور بائیں طرف کے سلام میں بائیں طرف والوں کی اور امام بالکل سامنے ہو تو دونوں میں؛ ورنہ جس طرف ہو اُس طرف کے سلام میں نیت کرے۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں: ۹۷ تا ۱۰۰)

نماز میں حضور (ﷺ) کو سلام کرنے کی حقیقت — ایک اہم اور نفیس بحث

عبادات فقط اللہ جَلّ شانہ ہی کا حق ہے، کسی قسم کی عبادت میں اُس کا کوئی شریک نہیں، اللہ تعالیٰ اس بات سے غنی ہیں کہ کوئی اُن کا شریک اور ساجھی ہو، یہ حاصل ہے التحیات لله کا پھر اس سے آگے ہے، السلام علیك أیها النبي ورحمة الله وبرکاته الخ اِس کی حقیقت یہ ہے کہ قاعدہ کی بات ہے، ہر محسن اور مُربّی کی محبت کا جوش انسان کے دل میں فطرۃً پیدا ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہم پر کیسے کیسے احسانات ہیں، وہی ہیں جن کے ذریعہ سے ہم نے خدا کو جانا پہچانا، وہی ہیں جن کے ذریعہ سے ہمیں خدا کے اوامر ونواہی اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کی راہیں معلوم ہوئیں، وہی ہیں جن کے ذریعہ سے خدا کی عبادت کا اعلیٰ طریقہ یعنی اذان اور نماز ہمیں میسر ہیں اور جن کی ذریعہ سے لا إله إلا اللّٰه کی پوری حقیقت ہم پر منکشف ہوئی......

ممکن تھا جس طرح سے اور قوموں نے اپنے محسنوں اور نبیوں کو؛ بوجہ اُن کے احسانات کثیرہ کے، غلطی سے خدا بنالیا اور توحید کی تعلیمات کو بھلا دیا، اور نبی کو معبود مان لیا، یہ خدشہ ہم مسلمانوں میں بھی تھا؛ مگر اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اِس امت کو اِس ابتلاء سے بچالیا اور لا إله إلا اللّٰه کے ساتھ محمدا عبده ورسوله کو جوڑ کر مسلمانوں کو شرک سے بچالیا؛ بلکہ اسی باریک حکمت کے لیے آں حضرت ﷺ کی قبر بھی مدینہ منورہ میں بنوائی؛ کیوں اگر مکہ میں آپ کی قبر ہوتی تو ممکن تھا کہ کسی کے دل میں خیالِ پرستش آجاتا یا کم از کم مخالفینِ اسلام اِس پر اعتراض کرتے: کیوں کہ قبر شریف اگر مکے میں ہوتی اور لوگ کعبہ کی طرف دور دراز سے نماز پڑھتے، تو دشمن تہمت تراش سکتے تھے کہ یہ نبی کی عبادت کرتے ہیں؛ مگر اب مدینہ میں قبر ہونے سے جو لوگ مکہ میں جانبِ شمال سے جانبِ جنوب منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں تو اُن کی پیٹھ آں حضرت ﷺ کی قبر مبارک کی طرف ہوتی ہے، اِس طرح ہم شرک اور اُس کے وہم وگمان سے محفوظ ہوگئے، مگر محسن سے محبت کرنا اور گرویدۂ احسان ہونا انسان کی فطرت کا تقاضا تھا، اِس واسطے اِس کی ایک راہ کھول دی کہ ہم آپ کے لیے دعا کیا کریں، اور اِس طرح سے آں حضرت ﷺ کے مدارج میں ترقی ہوا کرے؛ چناں چہ ہر مسلمان نماز

میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے السلام علیك أیها النبي و رحمة الله وبرکاته کا پاک تحیہ (سلام کا تحفہ) پیش کرتا ہے اور دردِ دل سے شکر گزار ہو کر گویا کہ آپ کے احسانات اور مہربانیوں کے خیال سے آپ کی ایسی محبت پیدا کر لیتا ہے جیسے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے سامنے موجود ہیں، آپ کے حسنِ احسانات کے نقشہ سے آپ کا وجود حاضر کی طرح سامنے لا کر؛ نہ حقیقۃً حاضر جان کر (یعنی تصور مبارک کو ذہن میں سامنے لا کر نہ کہ خود حضور کو واقع میں اپنے سامنے مان کر جو غلط ہوگا) مخاطب کے رنگ میں عرض کرتا ہے السلام علیك أیها النبي ورحمة الله وبرکاته اور پھر آپ کے دین کے سچے خادم یعنی صحابہ، اولیاء اللہ، اَصفیاء واَتقیاء اور ابدال آئے اور قیامت تک آتے رہیں گے، اُن کے واسطے بھی بوجہ اُن کی حسن خدمات کے تعلیم کی گئی کہ السلام علینا وعلی عباد الله الصالحین کہے۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں، ص:۱۰۲ تا ۱۰۴ اختصاراً)

نماز مکمل کرنے کے بعد اللهم أنت السلام ومنك السلام الخ پڑھنے کا راز

احادیث نبویہ میں کچھ دعائیں وارد ہیں، جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز ختم کرنے کے بعد پڑھا کرتے تھے، یہ ایسا ہے جیسا کہ کسی عالی شان دربار سے رخصت ہونے کے وقت آداب وسلام بجا لاتے ہیں اور یونہی چپ چاپ رخصت نہیں ہوتے؛ بلکہ دربار سے رخصت ہونے کے وقت بھی آداب ونیاز وعرضِ حال کرتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں (اور نماز سے جو قربِ الٰہی حاصل ہوا، عاجزی وانکساری ہوئی اُس کے بعد کچھ مانگنا قبول کی امید رکھتا ہے) چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادائے فرض کے بعد یہ کلمات پڑھا کرتے تھے اللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ ومِنْكَ السَّلَامُ وإِلَيْكَ يَرْجِعُ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وتَعَالَيْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ والإِكْرَامِ. علی ہذا القیاس اور بھی بہت سی ادعیہ ہیں، جن کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز ختم کرنے کے بعد پڑھا کرتے تھے۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں، ص:۱۰۷)

نماز جنازہ کے ختم پر سلام پھیرنے کی وجہ

امام گویا کہ اِس عالم سے نکل کر عالم لاہوت (خدائی حضوری کا جہاں) میں بدرگاہِ الٰہی، شفاعتِ میت کے لیے حاضر ہوا تھا؛ پس جب اُس درگاہ سے فارغ ہو کر آدمیوں وملائکہ کی طرف

رجوع کرتا ہے تو برسم آئندگان (آنے والے لوگوں کی رسم کے مطابق) سب کو سلام کرتا ہے؛ جیسا کہ بالعموم نماز میں کیا کرتا ہے، اور نیز اِس میں بطور فال حسن، اُس کی جانب سے اُن کو اور میت کے حق میں پیغامِ سلامتی وقبولِ شفاعت بھی سناتا ہے (یعنی گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب نمازیوں کی مردہ کے حق میں سفارش کے قبول ہونے کو اور سلامتی کا پیغام مردہ کے اوران کے حق میں سناتا ہے۔

جاں سفر رفت وبدن اندر قیام ☆ وقت رجعت زاں سبب گوید سلام

(روح سفر کو گئی اور بدن مقیم رہا، اِسی وجہ سے واپسی کے وقت سلام کہتا ہے)

(احکام اسلام عقل کی نظر میں، ص:۱۳۴)

حضرت ابراہیمؑ کا سلامٌ کہنا

سورہ ذاریات آیت نمبر۲۴ میں ہے: فرشتوں نے سلاماً کہا اور حضرت ابراہیمؑ نے سلامٌ کہا، اس کی وجہ کیا ہے؟ ایک وجہ ''آیاتِ سلام'' کے تحت گذری، دوسری وجہ ابن قیمؒ نے بیان کی ہے:

حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام نے سلامٌ کہا، جس کا مطلب ہے سلامٌ علیکم تو یہ اشارہ تھا کہ آئندہ حضورﷺ کی امت کو ایسے ہی سلام کرنا ہے، اور اِس طرح سلام کرنا دینِ حنیف اور ملتِ ابراہیمیہ کا حصہ ہے، جس کی اقتداء اور پیروی کا حکم حضورﷺ کو بھی دیا گیا ہے، تو حضرت ابراہیمؑ نے سلامٌ کہہ کر اقتداء واتباع کو آسان کر دیا، اور اگر وہ مہمانوں کے طرز پر ہی جواب دیتے تو یہ لطیف نکتہ پیدا نہ ہوتا۔ (بدائع:۱۵۸/۲)

نماز کا اختتام "سلام" سے کیوں؟ ابن قیمؒ کی تحقیق

نماز دین کا ستون ہے اور ایک اہم ترین عبادت ہے، اِس کے دو دروازے ہیں: ایک باب الدخول: یعنی نماز میں داخل ہونے کا دروازہ، دوسرے باب الخروج: یعنی نماز سے نکلنے

کا دروازہ،'' اللہ اکبرؔ'' باب الدخول ہے؛ جب کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ باب الخروج ہے، اِس انتخاب کی وجہ کیا ہے؟ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

جب بندہ نماز میں داخل ہونے کا ارادہ کرتا ہے تو تمام مصروفیات ومشاغل سے کنارہ کش ہوتا ہے، تمام تعلقات وعلائق کو ختم کر دیتا ہے؛ چوں کہ اب ربِ کائنات سے مناجات کرنی ہے، تو اُس پر ضروری قرار دیا گیا کہ وہ رب کائنات کی بارگاہ میں باریابی کے لیے ادب واحترام کا ایک جامع لفظ اختیار کرے، شریعت نے بتایا: وہ لفظ اللہ اکبر ہے، جس کا مطلب ہے "اللہ أكبر من كل شئ" یعنی اللہ کی ذات ہر اُس چیز سے بڑی اور عظیم ہے جسے انسانی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں، انسانی عقلیں سوچ سکتی ہیں، تو اِس لفظ میں عظمتِ خداوندی اور اللہ کی کبرائی کا ایک سمندر ہے، کوئی دوسرا لفظ اِس جگہ اِس کی نیابت نہیں کر سکتا؛ اِسی لیے بعض ائمہ کے نزدیک نماز، اللہ اکبر سے ہی شروع ہو سکتی ہے، دوسرے الفاظ سے نہیں، اِسی لیے تو کہا گیا: کہ جس نے اللہ اکبر کے ذریعہ نماز شروع کر دی تو اللہ کی کبریائی اور عظمت کا تقاضہ یہ ہے کہ اب اُس کے دل میں، غیر اللہ کا خیال بھی نہ آئے؛ اگر نماز میں اُس کا دل کہیں اور ہے تو وہ نماز میں داخل ہی نہیں ہوا بل الباب عنه مسدود. ابوالفرج ابن الجوزیؒ نے اپنے کسی وعظ میں بڑی پیاری بات لکھی ہے: حضور القلب أول منزل من منازل الصلاة کہ حضور قلب یعنی دل اللہ کی جانب مائل ہو، یہ نماز کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے، اگر یہ منزل حاصل نہیں ہوئی تو دوسری اہم منزلیں مثلاً: مناجات وغیرہ وہ کیسے حاصل ہوں گی، تو اللہ اکبر اُسی حضور قلب کا مقدمہ ہے، اب اگر اُس نے اللہ اکبر کا حق ادا کر دیا تو وہ درحقیقت دروازے سے گھر میں داخل ہوگا اور وہاں سے خیر وبھلائی اور ثواب کی شکل میں تحفہ تحائف لے کر واپس لوٹے گا۔

اب جب نماز پوری ہوگئی تو گھر سے نکلنے کے لیے "السلام عليكم ورحمة الله" کا دروازہ دکھایا گیا اور کہا گیا: کہ تم داخل ہوئے اللہ کا نام لے کر تو تم نکلو بھی اللہ کا نام لے کر؛ گویا آغاز اللہ کے ذاتی نام سے اور اختتام اللہ کے صفاتی نام پر اور صفاتی ناموں میں سے السلام کا

انتخاب اِس لیے، کہ نمازی جب تک نماز میں ہوتا ہےتو ہرطرح کی آفات وشروراور باطنی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے، یہ اللہ کے نام کی برکت ہوتی ہے، اب جب وہ نماز کی تکمیل کر کے نماز سے باہر نکلنے کا ارادہ کررہا ہےتو خارجِ صلاۃ آفات وشرور، شیطانی وساوس ہر جانب سے منہ کھولے کھڑے ہیں، اب جب اس نے لفظ ''سلام'' کا اصل مفہوم ذہن میں رکھتے ہوئے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہہ لیا تو اللہ کی طرف سے ایک محافظ فرشتہ مقرر ہوتا ہے جو دوسری نماز تک اس کی حفاظت کرتا ہے، یہ دفعِ مضرت ہوا، اور جلبِ منفعت یہ ہوتا ہے کہ سلامتی کے حصول میں دوام واستمرار رہتا ہے۔(بدائع:۱۹۵)

الغرض اختتامِ صلاۃ پر لفظ ''سلام'' کا انتخاب ایک ایسا انتخاب ہے جو مالک حقیقی کا انتخاب ہے، اِس کے فوائد وثمرات کا مشاہدہ بصارت سے نہیں، بصیرت سے کیا جاسکتا ہے اور بصیرت کے حصول کے لیے اخلاص وروحانیت کا حصول ناگزیر امر ہے، اور یہی بات بہت مشکل ہے؛ لیکن ناممکن الحصول نہیں ہے، ہمتِ مرداں مددِ خدا۔

مفتی تقی صاحب لکھتے ہیں:

> بہر حال ''سلام' معمولی چیز نہیں یہ زبردست دعا ہے، اور اِس کو دعا کی نیت سے کہنا اور سننا چاہیے، سچی بات یہ ہے کہ اگر ایک آدمی کی بھی دعا ہمارے حق میں قبول ہوجائے تو ہمارا بیڑہ پار ہوجائے، اِس لیے کہ دنیا وآخرت کی ساری نعمتیں اِس سلام کے اندر جمع ہیں۔
>
> (اصلاحی خطبات:۶/۱۶۸)

ایک اشکال اوراس کا جواب

اختتام نماز پر سلام کا حکم دیا گیا ہے؛ تاکہ نمازی، نماز کے بعد شرور وفتن سے سلامت رہے؛ لیکن سوال یہ ہے کہ اُس نے تو السلام علیکم کہا ہے، اس نے تو دوسرے کو سلامتی کی دعا دی ہے، اس کا جواب مندرجہ ذیل اقتباس میں پڑھیے، اقتباس مفتی تقی صاحب کا ہے:

اِسی وجہ سے بزرگوں نے فرمایا: کہ نماز کے اندر جب آدمی سلام پھیرے تو داہنی طرف سلام پھیرتے وقت یہ نیت کرلے کہ میرے دائیں جانب جتنے مسلمان اور جتنے فرشتے ہیں اُن سب پر سلامتی بھیج رہا ہوں، اور جب بائیں جانب سلام پھیرے تو اُس وقت یہ نیت کرے کہ میرے بائیں جانب جتنے مسلمان اور جتنے فرشتے ہیں، اُن سب پر سلامتی بھیج رہا ہوں اور پھر یہ ممکن نہیں کہ تم فرشتوں کو سلام کرو اور وہ جواب نہ دیں، وہ ضرور جواب دیں گے اور اِس طرح اُن کی دعائیں تمھیں حاصل ہوجائیں گی؛ لیکن ہم لوگ بے خیالی میں سلام پھیر دیتے ہیں اور نیت نہیں کرتے، جس کی وجہ سے اِس عظیم فائدے اور ثواب سے محروم رہ جاتے ہیں۔ (اصلاحی خطبات: ۶/۱۶۳)

اللهم صل على محمد اور السلام عليكم أيها النبي کا فرق

نماز میں سلام کرتے ہوئے، السلام عليك أيها النبي کہنے کا حکم ہے، عليك، خطاب کا صیغہ ہے؛ عموماً خطاب کے لیے مخاطب کا سامنے ہونا ضروری ہوتا ہے، اور درود پڑھتے ہوئے الصلاة عليك نہیں کہا جاتا؛ بلکہ اللهم صل على محمد پڑھنے کا حکم ہے، على محمد غائب کا صیغہ ہوا، تو ایک خطاب اور دوسرا غائب، اِس انتخاب میں کیا حکمت ہے؟ ما الحكمة في كون السلام وقع بصيغة الخطاب والصلاة بصيغة الغيبة؟

عموماً اِس سوال کا جواب یہ دیا جاتا کہ "السلام عليك أيها النبي" یہ حکایت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب باحیات تھے، صحابہ سلام ایسے ہی پڑھتے تھے، اسی کی حکایت حضور کی وفات کے بعد بھی کی جاتی ہے، اور اللهم صل على محمد کے تحت یہ جواب دیا جاتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات میں کوئی عیب نہیں اور ہم سراپا عیوب ونقائص ہیں؛ پس جس شخص میں بہت عیوب ہوں وہ ایسے شخص کی کیا ثنا کرے گا جو پاک ہے؛ اِس لیے ہم اللہ ہی سے درخواست کرتے ہیں کہ

وہی حضورﷺ پر صلاۃ وسلام بھیجے۔

لیکن اس فرق میں ایک حکمت ابن قیمؒ نے لکھی ہے جو ایک عاشقانہ اور مجذوبانہ حکمت ہے، پڑھیے۔

نماز میں درود در حقیقت اللہ تعالیٰ سے التماس ہے کہ اللہ حضورﷺ پر درود بھیجیں، ظاہر سی بات ہے درخواست میں لفظ غیبت کا ہی استعمال ہوسکتا ہے، اللهم صلّ عليك مقامِ دعا میں کہنا درست نہیں اور جہاں تک حضورﷺ پر سلام کی بات ہے تو وہاں خطاب کا لفظ اس لیے روا رکھا گیا کہ ایک مومن کے دل میں حضورﷺ کی محبت، اُس کے مال، جان اور آل اولاد سے بھی زیادہ ہونی چاہیے، اور یہ محبت اور حضورﷺ کا خیالی تصور دل میں ایسا ہونا چاہیے کہ گویا آں جناب دل میں ہمیشہ موجود ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

مثالك في عيني وذكرك في فمي ☆ ومثواك في قلبي، فأين تغيب

تمہارا تصوراتی جسم میری نگاہوں میں ہے، تمہارا تذکرہ ہر وقت زبان زد ہے، اور تمہاری جائے قیام میرے دل میں ہے بتاؤ تم مجھ سے غائب ہوسکتے ہو؟

ایک نمازی کی نماز میں ایسی حالت ہو اور ہونی چاہیے تو حضورﷺ گویا نگاہوں کے سامنے ہیں؛ اگرچہ آپ کا جسم یہاں موجود نہیں؛ لیکن آپ کی محبت یہاں موجود ہے؛ لہٰذا موجود کو مخاطب بنانا زیادہ بہتر ہے، الفاظِ غیبت استعمال کرنے سے؛ لہٰذا السلام عليك أيها النبي کی تعلیم دی گئی، اور متکلم بھی موجود ہوتا ہے؛ اس لیے وہ اپنی لیے بھی کہتا ہے: السلام علينا اور دوسرے بندے اگرچہ نگاہوں کے سامنے ہیں، دائیں بائیں ہیں، لیکن وہ دل میں نہیں ہیں؛ اس لیے اُن کے لیے الفاظِ غیبت استعمال ہوئے اور على عباد الله الصالحين کہا گیا، یہ ایک عاشقانہ فرق ہے، اس کو سمجھنے کے لیے، محبتِ حقیقی کے مفہوم کا سمجھنا، ناگزیر ہے۔

(خلاصہ بدائع الفوائد: ۱۹۱/۲)

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

ساتواں باب

لَا يَلْقَىٰ مُسْلِمٌ مُسْلِماً فَيَبَشُّ بِهِ وَيُرَحِّبُ بِهِ وَيَأْخُذُ بِيَدِهِ إِلَّا تَنَاثَرتِ الذُّنُوبُ بَيْنَهُمَا كَمَا يَتَنَاثَرُ وَرَقُ الشَّجَرِ

(شعب الإيمان:٨٩٥٧، فصل في المصافحة)

مضامینِ سلام ومتفرقاتِ سلام

سلام حقانیتِ اسلام کی ایک بڑی دلیل

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته لفظوں کے اعتبار سے تو یہ تین جملوں پر مشتمل ہے؛ لیکن اِن کے معانی پر غور کریں گے تو علم وحکمت کا ایک سمندر نظر آئے گا، جس کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ انسانی عقلیں نہیں لگاسکتیں، انسان کی خوش گوار اور پُر لطف زندگی وہ بھی دوام واستمرار کے ساتھ، شرور وفتن سے حفاظت، خیر وبھلائی کا حصول اور جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا ایسا لاثانی امتزاج، الفت ومحبت، انسیت ومودت، اتحاد واتفاق اور آپسی رشتہ اخوت کی پائیداری کی اتنی حسین اور پیاری دعا، اِس سلام میں مضمر ہے کہ انسان کو رہنے دیجیے پھر انسانوں میں اپنے تو دور، پرائے بھی اس بات کی گواہی دیں گے اور دیتے ہیں: کہ اسلام سچ اور حق ہے، کائنات اور کائنات کی چیزوں کو عقل وزبان دے دی جائے تو وہ بھی، اِس کی حقیقت وصداقت کو نہ صرف یہ کہ تسلیم کریں گی؛ بلکہ رب کائنات کے سامنے سر بہ سجدہ ہوجائیں گی، اسلامی سلام کی جامعیت، معنویت، نورانیت وروحانیت اور رموز واشارات کی تفصیل آپ پڑھیں گے تو آپ بھی محسوس کریں گے کہ ایمان ویقین میں اضافہ ہو رہا ہے، علامہ ابن قیمؒ نے تو یہاں تک لکھ دیا اور کچھ سوچ کر ہی لکھا ہوگا؛ کیوں کہ محقق بلا سوچے سمجھے کوئی بات نہیں لکھتا، وہ لکھتے ہیں:

> فإذا كان هذا في فرع من فروع الإسلام وهو التحية التي يعرفها الخاص والعام، فما ظنك بسائر محاسن الإسلام وجلالته وعظمته وبهجته التي شهدت بها العقول الفطن؛ حتى أنها من أكبر الشواهد وأظهر البراهين الدالة على نبوة محمد ﷺ وكمال دينه وفضله وشرفه على جميع الأديان...... فلو اقتصر عليها كانت آية وبرهانا على صدقه وأنه لا يحتاج معها إلى خارق ولا آية منفصلة. (بدائع الفوائد: ۱۷۸/۲)

یعنی جب اسلامی سلام جو فروعات اسلام کی ایک فرع اور شاخ ہائے اسلام کی ایک چھوٹی سے شاخ ہے، جس کو ہر کس وناکس جانتا پہچانتا ہے اور برتتا ہے، اُس کی حکمت ومعنویت اور تاثیر کا یہ عالم ہے کہ عقلیں حیران اور ششدر ہیں تو تمام محاسن اسلام کا کیا عالم ہوگا؟ یہ حضور پاک ﷺ کی نبوت ورسالت کی صداقت کی ایک بڑی دلیل اور ظاہر برہان نہیں تو پھر کیا ہے، کیا اِس بات سے دین اسلام کی فضیلت وشرافت تمام ادیان پر ثابت نہیں ہوتی؟ بلکہ اگر اسلام اور پیغمبرِ اسلام صرف اسلامی تحیہ ہی پر اکتفا کرتے، مزید احکام ومسائل کی تشریع وتشریح نہ کرتے تب بھی یہ تحیہ دینِ اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت کی دلیل ہوتی، مزید کسی معجزہ کی ضرورت نہ پڑتی؛ کیوں کہ ربِ کائنات کی طرف سے مقرر کردہ جو چیز بھی ہوتی ہے اُس کا مقابلہ اُسی کی مخلوق؛ وہ بھی کمزور مخلوق کیوں کر کر سکتی ہے، سچ ہے کلام الملوك ملوك الكلام، وإن في ذلك لعبرة لأولي الأبصار.

اور یہ سلام چوں کہ خدا کا عطا کردہ تحیہ ہے، جب اِس کے رموز واشارات اور حکمت بالغہ کا یہ عالم ہے تو خدا کا کمالِ علم، کمالِ حکمت، کمالِ رحمت اور کمالِ لطف وکرم کا کیا عالم ہوگا، کیا دنیاوی الفاظ میں گنجائش ہے کہ ان کو سمیٹ سکیں؟ ہم انسان کیا کہہ سکتے ہیں، خدوانِد قدوس نے فیصلہ کر دیا ہے، لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَاداً لِّكَلِمَاتِ رَبِّىْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّىْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ. (۱) الفاظ کا ہی احاطہ ناممکن ہے تو معانی کا احاطہ کس کے بس میں ہے، لیکن ایک بات جو بہت بڑی بات ہے، وہ یہ کہ سلام کی معنویت اور روحانیت ونورانیت اور اس کی تاثیر کی روح ''اخلاص'' ہے، جو ہر عمل کی روح ہے، اس کے بغیر سلام بس سلام ہے، خوشبو سے خالی ایک پھول ہے۔

کثرت سے سلام کرنے میں خواتین کی کوتاہی

جو بھی شخص راستے میں ملے، جس کے بارے میں اتنا معلوم ہو کہ یہ مسلمان ہے تو ایک

(۱) الکہف:۱۰۹.

مسلمان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اُسے سلام کرے، وقت ہو تو خیریت معلوم کرے، یہ حکم صرف مَردوں کا نہیں ہے؛ بلکہ عورتیں بھی اِس حکم کی مخاطب ہیں، وہ اِس حکم کی مکلّف ہیں کہ آپس میں شناسائی اور دوستی ہو یا نہ ہو، رشتہ داری ہو یا نہ ہو، بس اتنا معلوم ہے کہ یہ خاتون مسلمان ہے تو بوقتِ ملاقات اُسے سلام کریں، اور کثرت سے کریں؛ کثرت کا مطلب یہ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے ملاقات ہوئی تھی اور ذرا دیر کے بعد پھر ملاقات ہوگئی تو عزیمت اور ہمت کا تقاضہ یہ ہے کہ پھر سلام کریں، یہ نہیں کہ سویرے جو ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی تو سلام کرلیا اور شام کو پھر ملاقات ہو رہی ہے تو بغیر سلام کیئے گفتگو شروع ہوگئی؛ عموماً خواتین میں اِس حوالے سے کوتاہی پائی جاتی ہے، اُن میں سلام کی عادت نہیں ہوتی - سادات اور بزرگ علمی گھرانے مستثنیٰ ہیں، الحمد للہ اُن کی تربیت اُن کے بڑے کرتے ہیں- اِس لیے خواتین کو اِس حوالے سے پابند بنانا چاہیے اور انہیں پابند بنانے کے لیے خود گھر کے بڑے لوگوں کو اِس کا پابند بننا ہوگا، تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے، جو روایتیں افشاءِ سلام کے بارے میں منقول ہیں، مخاطب صرف مرد حضرات نہیں ہیں؛ بلکہ خواتین بھی برابر کی مخاطب ہیں، حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

> عورتوں میں السلام علیکم کہنے کا اور مصافحہ کرنے کا رواج نہیں ہے، یہ دونوں باتیں ثواب کی ہیں، اِن کو پھیلانا چاہیے۔
>
> (بہشتی زیور کامل: ۲۹۴/۵)

اپنے بچوں کو "السلام علیکم" کا عادی بنائیں

مغربی ممالک میں انگریز ملاقات کے وقت گڈ مارننگ، گڈ ایوننگ اور گڈ نائٹ اور ٹاٹا بائی بائی بولتے ہیں اور ہاتھ ہلاتے ہیں اور اپنے بچوں کو یہی تعلیم دیتے ہیں، یہ وبا ہمارے ملک میں بھی آئی؛ چناں چہ ہمارے ملک کے غیر مسلموں نے بھی بخوشی اسے قبول کرلیا، اُن کی دیکھا دیکھی بہت سے مسلم گھرانوں کے بچوں؛ بلکہ بڑوں میں بھی اِس کا رواج ہوگیا؛ بلکہ گھر کا کوئی شخص باہر جاتا ہے تو عورتیں بچوں کو تعلیم دیتی ہیں اور کہتی ہیں بیٹے پاپا کو ٹاٹا کرو، اگر اُس نے نہیں کیا تو ہاتھ پکڑ

کر Tata کرنے کا عادی بناتی ہیں، اگر کسی غیرت مند شخص نے کہا: کہ بچوں کو سلام سکھانا چاہیے تو جواب ملتا ہے ابھی بچہ ہے، بعد میں سب سیکھ جائے گا، یاد رکھیں یہ ایک بھیانک غلطی ہے اور بچے کے ساتھ محبت نہیں؛ بلکہ اُس کی اسلامی زندگی کے ساتھ کھلواڑ ہے، درخت جب ابتدائی مرحلے میں ہوتا ہے تو اُس کی شاخوں کو موڑنا آسان ہوتا ہے؛ کیوں کہ اُس میں لچک ہوتی ہے؛ لیکن جب تناور اور مضبوط درخت بن جاتا ہے تو اس کو موڑنا، توڑنے کے مترادف ہوتا ہے، بچے کا ذہن پریس مشین جیسا ہوتا ہے، بچپن میں جو چھاپیں گے وہی چھپے گا، دعا چھاپیں گے تو دعا اور گالی چھاپیں گے تو گالی چھپے گی، آج Tata اور Buy buy چھاپیں گے تو کل السلام علیکم کیسے زبان سے نکلے گا؛ اِس لیے ماؤں بہنوں اور گھر کے بڑے لوگوں کو اس پر خصوصی توجہ دینی چاہیے، زمانے سے مرعوب نہ ہوں، اسلامی تہذیب ہی آپ کی کامیابی کی ضامن ہے، دنیا کی ترقی اور دنیا کی نام نہاد تہذیب، آخرت میں بھی ترقی اور تہذیب شمار ہو، ضروری نہیں، وہاں تہذیب واخلاق کی صحت کا پیمانہ، اخلاقِ نبوی، تہذیب نبوی ہوں گے اور بس، پیچھے حدیث گذری ہے کہ السلام علیکم حضرت آدمؑ نے کہا تھا: اور اللہ نے کہا تھا کہ یہی آپ کی اور آپ کی اولاد کا سلام ہے، معلوم ہوا کہ سلام عطیہ خداوندی ہے، کیا عطیہ خداوندی کے برابر کوئی اور عطیہ ہوسکتا ہے، اور اگر بات غیروں کی تہذیب کی ہو تو اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں اُن کی قباحت وشناعت دو چند ہو جاتی ہے، مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

> اگر ذرا غور کریں تو یہ (السلام علیکم) اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کا حدو حساب ہی نہیں، اب اِس سے زیادہ ہماری بدنصیبی کیا ہوگی کہ اس اعلیٰ ترین کلمہ کو چھوڑ کر ہم اپنے بچوں کو ''گڈ مارننگ'' ''گڈ ایوننگ'' سکھائیں اور دوسری قوموں کی نقالی کریں، اِس سے زیادہ ناقدری اور ناشکری اور محرومی کیا ہوگی؟ (اصلاحی خطبات:۶/۱۶۰)

السلام علیکم کے بجائے تسلیم وغیرہ

سوال:(۲۰۷۵)(الف)بعض حضرات خط لکھتے وقت "السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته" کے بجائے ''تسلیم، آداب، نیاز، سلام مسنون'' اوراس جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟

(ب) غیر مسلم بھائیوں سے خط وکتابت اور ملاقات کے وقت کیا لفظ استعمال کرنا چاہیے؟ اگر کوئی ہندو بھائی "السلام علیکم" کہے یا لکھے تو جواب میں کیا کہنا یا لکھنا چاہیے؟

جواب: (الف) اسلام سے پہلے عربوں میں ملاقات کے وقت کچھ اور کلمات کہے جاتے تھے، بعض کلمات جن کا حدیث میں ذکر آیا ہے، مشرکانہ بھی نہیں تھے؛ لیکن اِس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ایک مستقل کلمہ "السلام علیکم" مقرر فرمایا جو بہت ہی بامعنی دعاؤں پر مشتمل ہے، اِس سے صاف ظاہر ہے کہ اصل اسلامی طریقہ "السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته" لکھنا ہے، دوسرے الفاظ لکھے جائیں تو اُس سے یہ سنت ادا نہیں ہوگی۔

(ب) غیر مسلموں کو آداب، یا ایسے کلماتِ احترام کہے جاسکتے ہیں جن میں مشرکانہ معنی نہ پائے جائیں، رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کو خطوط لکھتے ہوئے "السلام علی من اتبع الھدی" کی تاویل اختیار کی ہے، یہی کلمات لکھنا زیادہ مناسب ہے، اگر اس سے فتنہ کا اندیشہ نہ ہو؛ اگر کوئی غیر مسلم خط میں "السلام علیکم" لکھے تو جواب میں "وعلیکم" لکھنے کی گنجائش ہے، جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے، بہتر ہے کہ ایسی صورت میں "سلام" کے لفظ سے گناہ اور کفر سے سلامتی کے معنی مراد لیں۔ (کتاب الفتاوی:۶/۱۲۳)

اللہ حافظ یا خدا حافظ کہنا؟

سوال: (۲۰۷۶) کسی شخص کو رخصت کرتے وقت ''اللہ حافظ'' کہنا بہتر ہے یا ''خدا حافظ'' کہنا؟ بعض لوگ خدا حافظ کہنے سے منع کرتے ہیں؟

جواب: خدا حافظ بھی کہنا جائز ہے، اور اللہ حافظ کہنا بھی ؛ کیوں کہ ''خدا'' کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے معروف ہو چکا ہے اور اِس کے معنی میں کوئی ایسی بات نہیں جو اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کے خلاف ہو، البتہ ''اللہ'' کا لفظ ''خدا'' سے زیادہ بہتر ہے؛ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عَلَم ذاتی اور اصل نام ہے، اور بالعموم یہی نام قرآن حدیث میں وارد ہوا ہے؛ تاہم مسنون طریقہ یہ ہے کہ رخصت کرتے وقت رسول اللہ ﷺ جو دعا پڑھا کرتے تھے وہی دعا پڑھی جائے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے: کہ جب آپ ﷺ کسی کو رخصت فرماتے تو اس کا ہاتھ تھام لیتے اور یہ دعا پڑھتے۔

استودع الله دينك وأمانتك وآخر عملك.

اور میں تمہارا دین، تمہاری امانت اور تمہارے آخری عمل کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرتا ہوں۔ (کتاب الفتاوی: ۱۲۴/۶)

ٹاٹا، بائی بائی کہنا

سوال: (۲۰۷) گھر سے باہر جاتے وقت چھوٹے بچوں کو ٹاٹا کہا جاتا ہے، یا بائی بائی کہا جاتا ہے، کیا اس طرح کے الفاظ کہنے مناسب ہیں یا ہم اپنے بچوں کو اللہ حافظ کہہ کر ہاتھ ہلائیں تو کیا یہ ہاتھ ہلانا جائز ہوگا؟

جواب: رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اپنی معاشرت میں غیر مسلموں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے؛ چنانچہ اسلام سے پہلے عربوں کے یہاں ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت کچھ اور الفاظ کہے جاتے تھے جو ''صبح بخیر'' اور ''شب بخیر'' کے ہم معنی ہوا کرتے تھے؛ بلکہ اُن میں اللہ تعالیٰ کی طرف بھی نسبت ہوتی تھی، کہ اللہ تمہاری صبح اچھی کرے، اللہ تمہاری شب اچھی کرے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے لیے اُن کلمات کو پسند نہیں فرمایا اور ہدایت فرمائی کہ وہ جب ایک دوسرے سے ملیں تو "السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ" کہیں، جب حضور ﷺ نے مشرکین کے ایسے کلمات کو بھی پسند نہیں فرمایا ہے جن میں معنی کے اعتبار سے کوئی برائی نہیں تھی، تو ''ٹاٹا'' اور ''بائی بائی'' جیسے الفاظ کہنے اور یہود ونصاریٰ کی رَوِش اختیار کرنے کی کیسے

گنجائش ہوسکتی ہے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ سلام کیا جائے اور سلام کا جواب دیا جائے؛ کیوں کہ اِس سے زیادہ جامع کوئی دعا نہیں ہوسکتی، سلام میں ہر طرح کے آفات وشرور سے حفاظت کی دعا ہے اور رحمت اور برکت کی دعا بھی ہے؛ گویا یہ ایک جامع دعا ہے جو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے کہتا ہے۔

خدا حافظ کہنے کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ حضور ﷺ نے رخصت ہونے والے شخص کو جو دعا دی ہے، اُس میں اللہ تعالیٰ کے حفظ وامان کا ذکر بھی ہے، خدا حافظ کہنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ ہلانے کی اجازت نہیں؛ البتہ اگر مخاطب دور ہو تو جیسے سلام اشارہ سے کیا جاسکتا ہے، اُسی طرح خدا حافظ کہنے کے ساتھ ساتھ اشارہ کرنے کی بھی اجازت ہوگی؛ بہر حال بحیثیت مسلمان ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے سماج میں اسلامی ثقافت کو زندہ رکھیں، اِس سے زیادہ ناسمجھی اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ دوسرے کے سامنے دست سوال دراز کرے، اسلام جیسے جامع نظامِ زندگی کے موجود ہوتے ہوئے دوسری تہذیب وثقافت سے مانگنے کی چیز حاصل کرنے کی بھی یہی مثال ہے۔ (کتاب الفتاویٰ:۶/۱۲۶)

سلام کے وقت کیا نیت ہو؟

اسلام میں اعمال کی قدر وقیمت کا دارومدار نیتوں پر ہے، نیتوں کی وجہ سے اعمال کا وزن بڑھتا اور گھٹتا ہے، مومن کی نیت کو اُس کے عمل سے بہتر بتایا گیا ہے، سلام بھی ایک عمل ہے، سلام کے وقت کیا نیت ہونی چاہیے؟

صاحب اوجزؒ نے ابن العربیؒ کے حوالے سے لکھا ہے: اگر آپ السلام علیکم بوقتِ ملاقات کسی سے کہیں تو سلامتی کی اِس دعا میں زمین وآسمان میں موجود اللہ کے ہر بندے کو یاد کیجیے، وہ باحیات ہوں یا وفات پاچکے ہوں، اِس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جن جن فرشتوں کو آپ کا سلام پہنچایا جائے گا وہ بھی آپ کو سلامتی کی دعا دیں گے، اور اُن کی دعا کی قبولیت یقینی ہے، آپ کامیابی سے ہم کنار ہوں گے، اور وہ لوگ جو عبادتِ خداوندی میں مصروف ہیں اور آپ نے اُن مقبول بندوں کی بھی نیت کی ہے، تو ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ جواب دیں گے یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

(اوجز المسالک:۱۷/۲۰۷)

ردالمحتار میں ہے:

بوقتِ سلام، سلام کرنے والے کی نیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ جسے سلام کررہا ہے، اُس کی عزت وآبرو اور مال واولاد کی پاسداری اور نگہبانی کرے گا، اور یاد رہے عزت وآبرو کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ (۵۹۶/۹)

تعلیماتِ اسلام کی خوبی دیکھیے، ایک چھوٹے سے جملے میں نیت کی وجہ سے کتنی برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں، السلام علیکم تو ہر مسلمان کہتا ہے؛ لیکن یہ نیت ہم کتنے مسلمان کرتے ہیں خود سوچ سکتے ہیں، ہمیں سلام کے وقت اِس نیت کا استحضار رکھنا چاہیے، نیت سے عادت، عبادت بن جائے گی، نیز اِس نیت وعمل میں یکسانیت کی وجہ سے چین وسکون اور محبت وخلوص نصیب ہوگا۔

مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

ایک بات میں اور غور کیجیے کہ حضور اقدس ﷺ نے ہمیں جو کلمہ تلقین فرمایا ہے وہ ہے "السلام علیکم" جو جمع کا صیغہ ہے، السلام علیك نہیں فرمایا؛ اس لیے کہ السلام علیك کے معنی ہیں تجھ پر سلامتی ہو اور السلام علیکم کے معنی ہیں تم پر سلامتی ہو اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس طرح ہم لوگ اپنی گفتگو میں ''تو'' کے بجائے ''تم'' یا ''آپ'' کے لفظ سے خطاب کرتے ہیں جس کے ذریعہ مخاطب کی تعظیم مقصود ہوتی ہے، اُسی طرح "السلام علیکم" میں جمع کا لفظ مخاطب کی تعظیم کے لیے لایا گیا ہے۔

لیکن بعض علماء نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے: کہ اِس لفظ سے ایک تو مخاطب کی تعظیم مقصود ہے، دوسرے یہ کہ جب تم کسی کو سلام کرو تو سلام کرتے وقت یہ نیت کرو کہ میں تین افراد پر سلام کررہا

ہوں، ایک اُس شخص کو اور دو اُن فرشتوں کو سلام کرتا ہوں جو اُس کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں، جن کو ''کِراماً کاتبین'' کہا گیا ہے، ایک فرشتہ انسان کی نیکیاں لکھتا ہے، دوسرا فرشتہ اُس کی برائیاں لکھتا ہے؛ اِس لیے سلام کرتے وقت اُن کی بھی نیت کرلو؛ تاکہ تمہارا سلام تین افراد کو ہو جائے اور اب ان شاء اللہ تین افراد کو سلام کرنے کا ثواب مل جائے گا، اور جب تم فرشتوں کو سلام کروگے تو تمہارے سلام کا ضرور جواب بھی دیں گے، اور اِس طرح اُن فرشتوں کی دعائیں تمہیں حاصل ہو جائیں گی، جو اللہ تعالیٰ کی معصوم مخلوق ہیں۔ آگے فرماتے ہیں:

اِسی وجہ سے بزرگوں نے فرمایا: کہ نماز کے اندر جب آدمی سلام پھیرے تو داہنی طرف سلام پھیرتے وقت یہ نیت کرلے کہ میرے دائیں جانب جتنے مسلمان اور جتنے فرشتے ہیں اُن سب پر سلامتی بھیج رہا ہوں اور جب بائیں جانب سلام پھیرے تو اُس وقت یہ نیت کرلے کہ میرے بائیں جانب جتنے مسلمان اور جتنے فرشتے ہیں اُن سب پر سلامتی بھیج رہا ہوں، اور پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ تم فرشتوں کو سلام کرو اور وہ جواب نہ دیں، وہ ضرور جواب دیں اور اِس طرح اُن کی دعائیں تمہیں حاصل ہو جائیں گی؛ لیکن ہم لوگ بے خیالی میں سلام پھیر دیتے ہیں اور نیت نہیں کرتے، جس کی وجہ سے اِس عظیم فائدے اور ثواب سے محروم رہ جاتے ہیں۔ (۱)

(اصلاحی خطبات: ۶/۱۶۳)

---

(۱) اور یہی محرومی بوقت ملاقات سلام میں ہوتی ہے وہاں بھی عموماً اس نیت کا استحضار نہیں ہوتا۔

استاذ و شاگرد کا مجروح ہوتا ہوا رشتہ —— سلام، کوتاہی اور حل

مدارس میں اساتذہ اور طلبہ کی آپسی میل جول، رہن سہن، اِفادہ واستفادہ، درس وتدریس اور تعلیم وتربیت روزہ مرہ کے معمولات میں سے ہیں، ایک پڑھانے، سکھانے اور دینی تربیت اور اخلاق وتہذیب بتانے کو اپنا فریضہ سمجھتا ہے، دوسرا پڑھنے، سیکھنے اور تربیت واخلاق حاصل کرنے کے لیے اپنا گھر بار، ماں باپ، وطنِ مالوف اور اچھی، بےفکر اور پُرلطف زندگی کو خیر باد کہے ہوئے ہے، دونوں کے پاس کئی سال ہوتے ہیں کہ اُن سالوں میں اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کرلیں؛ اور قرونِ ماضیہ میں اِس کی اتنی مثالیں ملیں گی کہ ان کو ترتیب دے کر اہلِ خرد نے کئی کتابیں ترتیب دے ڈالی ہیں۔

استاذ وشاگرد کا رشتہ ایک مقدس، پاکیزہ اور تاریخی رشتہ ہوتا ہے؛ لیکن استاذ کا واقعی شفیق وکریم اور مخلص استاذ کی مثال ہونا ناگزیر ہے، اِسی طرح شاگرد کا لائق وفائق اور مطیع وفرماں بردار اور کچھ سیکھنے کے نیک جذبہ سے سرشار ہونا ضروری ہے، اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ طالب علمانہ وضع قطع اور شاگردانہ طرزِ زندگی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالے، اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا طالب علم بن جائے کہ فرشتے اپنے پر بچھائیں، مچھلیاں سمندروں میں اور چیونٹیاں اپنے بلوں میں اُس کے لیے دعائیں کریں۔

اِس رشتے کی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لیے، اور ان نیک بنیادوں پر اپنی تعمیر وترقی اور تہذیب واخلاق کی بلند وبالا عمارت کھڑی کرنے کے لیے، سلام کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے بنیاد میں، بنیادی پتھر، سلام ایک ایسی کنجی ہے، جس سے استاذ وشاگرد کے درمیان پائے جانے والے فاصلے کے مضبوط سے مضبوط دروازے وا کیے جاسکتے ہیں۔

اساتذہ کو چاہیے کہ وہ اپنے شاگردوں کو سلام کرنے میں سبقت کریں اور نیت ہو کہ اِس سے اُن کی تربیت ہوگی، کل کو یہی شاگرد، استاذ کی مسند پر بیٹھیں گے تو اگلی نسلوں تک یہ میراث پہنچائیں گے، اور شاگرد کو استاذ سے زیادہ سلام کرنے میں پہل کرنی چاہیے، اس کا حق بھی بنتا ہے،

وہ طالب ہے استاذ مطلوب ہے، طلبہ اپنے استاذ کو سلام کی شکل میں، جو ہدیہ محبت پیش کریں گے تو اس کی قیمت مادی ہدیہ سے زیادہ ہوگی؛ بالخصوص وہ طالب علم جو اپنے استاذِ محترم سے کچھ لینا چاہتا ہے، تو اُس استاذ کی پاکیزہ قربت کے حصول کے لیے سلام سے بڑھ کر کوئی اور ذریعہ نہیں ہے، آپ خلوص سے دو چار بار استاذ کو سلام کریں، مصافحہ کریں، استاذ کی توجہ آپ پر یقینی طور سے پڑے گی، اور اگر استاذ کی توجّہ آپ پر ہوگئی تو یقین مانیے (اگر چہ اب یقین ماننے والے کم ہیں) آپ کو وہ سب کچھ حاصل ہوسکتا ہے جو کتابوں سے حاصل نہیں ہوسکتا، کتاب تو الفاظ ہیں، الفاظ کے معانی اساتذہ ہیں، کتاب تو جسم ہے روح اساتذہ ہیں، کتاب تو پھول ہے، خوشبو اساتذہ ہیں، فیصلہ آپ کریں آپ کو کیا لینا ہے، اگر کچھ لینا ہے تو اساتذہ کو خلوص دل سے سلام کریں؛ کیوں کہ سلام، اساتذہ وطلبہ کی باہمی محبت کا ذریعہ ہے اور یہی پاکیزہ اور مقدس محبت اصل جوہر ہے، جس طالب علم کو یہ پاکیزہ محبت حاصل ہوگئی وہ واقعی طالب علم کہلائے جانے کے لائق ہے، حضور ﷺ نے افشاءِ سلام کو محبت کا ذریعہ قرار دیا ہے، کیا اس سے انکار کرنا ممکن ہے؟ حدیث پڑھیے۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تمہیں وہ عمل نہ بتادوں جس کے کرنے سے تمہارے درمیان محبت ویگانگت پیدا ہوجائے (وہ یہ ہے کہ) سلام کو آپس میں خوب پھیلاؤ۔

(شعب الایمان، رقم: ۸۷۴۵)

معلوم ہوا کہ اہل ایمان کی باہمی محبت ومودت کا دارومدار سلام پر ہے اور سلام کرنے اور اُس کا جواب دینے سے یہ محبت ومودت دلوں میں پیدا ہوتی ہے، اب غور کیجیے، اگر وہ اہل ایمان ایسے دو فریق ہوں جن کا مقصد ہی ایمان واسلام کی ترویج واشاعت ہے، تو سلام کے ذریعہ اُن کی محبت کیا رنگ لائے گی، اندازہ مشکل نہیں، آسان ہے، شاگرد اِس نیت سے استاذ کو سلام کرے گا تو استاذ کی دعائیں ملیں گی، اُس کی توجہ اور نظرِ شفقت کا مستحق ہوگا، اُس کی دنیا بدل جائے گی۔

اِس تفصیل کی ضرورت اِس لیے پڑی کہ موجودہ زمانے میں مدارس میں استاذ وشاگرد کا رشتہ دم توڑ رہا ہے، اساتذہ وطلبہ، شیر وشکر ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے مدمقابل ہوگئے

ہیں، دونوں کے درمیان قربت کے بجائے، فاصلے بڑھتے ہی جارہے ہیں، شاگرد سے خلوص ختم ہوا وہ استاذ کو ملازم سمجھنے لگا، استاذ سے اخلاص ختم ہوا وہ شاگردوں کو قوم وملت کی امانت نہیں؛ بلکہ ٹائم پاس اور معیشت فقط کا ذریعہ سمجھنے لگا، إلا ما شاء الله و الا من شاء ، بعض طلبہ کہتے ہیں: کہ اب اساتذہ، اساتذہ نہیں رہے، یہ کلیہ تسلیم کرلیا جائے یا یہ کہہ لیا جائے کہ طلبہ کی نظر اب طلبہ کی نظر نہیں رہی، فیصلہ قارئین کریں، کمی دونوں طرف سے روز افزوں ہے، قصور کس کا کتنا ہے، یہ طے کرنے کا موقع نہیں اور اِس کا کوئی فائدہ بھی نہیں، بس ضرورت اور وقت متقاضی اِس بات کے ہیں کہ یہ رشتہ پھر سے اُستوار ہو اور سدا سلامت رہے، اِس کی آبیاری کے لیے، اور اس کی سلامتی کے لیے سلام کی ترویج واشاعت کھاد، پانی اور دیگر میٹریل سے زیادہ مؤثر اور دیرپا ہے، دیر ہماری طرف سے ہے، آیئے ہم اساتذہ اور طلبہ مل کر آپس میں سلام کو خلوص واخلاص کے ساتھ رائج کریں، نتیجۂ محبت خدا پر چھوڑ دیں، وہ کوشش کرنے والوں کی کوشش کو ضائع نہیں کرتا۔

بھیگے ہوئے پروں سے ہی پرواز کر کے دیکھ ☆ انجام اس کے ہاتھ ہے آغاز کر کے دیکھ

حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

> دوسری بات ضروری سمجھنے کے قابل یہ ہے کہ جب واسطۂ نعمت کی شکرگزاری بھی ضروری ٹھہری، یہاں سے استاذ وپیر وغیرہما کا حق بھی نکل آیا کہ یہ لوگ نعمتِ حقیقی، علم دین وعرفان ویقین کے واسطے ہیں، سو جتنی بڑی نعمت ہوگی اتنا ہی واسطۂ نعمت کا بھی حق ہوگا۔
>
> اِس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ استاذ وپیر کا حق کتنا بڑا ہے، افسوس اس زمانے میں یہ دونوں علاقے ایسے کمزور ہوگئے ہیں کہ کوئی ان کی وقعت نہیں رہی۔

آگے حضرتؒ نے حقوقِ استاذ کے عنوان کے تحت استاذ کے ۱۵ حقوق لکھے ہیں، ان میں سے حق نمبر ۹ یہ ہے:

جب حلقہ کے قریب پہنچے، سب حاضرین کو سلام کرے پھر استاذ کو
بالخصوص سلام کرے؛ لیکن اگر وہ تقریر وغیرہ میں مشغول ہوں تو اس
وقت سلام نہ کرے۔ (فروع الایمان مع اصلاحی خطبات: ۳۶۰)

غریب اور اپنے سے کم رتبے والے کو بھی سلام کریں

اسلام میں امیر و غریب اور چھوٹے بڑے کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا، یہاں برتری اور فوقیت کا مدار ''تقویٰ'' پر ہے، اور تقویٰ کی جگہ دل ہے اور دل کا حال صرف خدا کو معلوم ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ سارے مسلمان بھائی ہیں؛ لہٰذا وہ بھائی امیر ہو یا غریب سلام سب کو کرنا چاہیے۔

عموماً مسلمان پہرے دار، واچ مین، ملازم و محافظ، ڈرائیور، غریب و مسکین، چھوٹی برادری وغیرہ کو لوگ سلام نہیں کرتے یہ غلط ہے، یہ تواضع کے خلاف ہے، انہیں بھی سلام کرنا چاہیے، شان گھٹے گی نہیں، بڑھے گی، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

إن من رأس التواضع أن تبدأ بالسلام من لقيتَ.
ہر ملاقاتی کو سلام میں پہل کرنا، تواضع و انکساری کی جڑوں میں سے
ایک جڑ ہے۔ (المصنف: ۱۴۱/۶)

علامہ سیوطیؒ کی الجامع الصغیر میں یہ حدیث ہے:

إن من موجبات المغفرة، بذل السلام وحسن الكلام.

(الجامع: ۲۴۹۶)

کہ سلام کو رواج دینا اور اچھی گفتگو کرنا، مغفرت کا ذریعہ ہیں، اس
حدیث کی شرح میں ہے:

بذل السلام أي إفشاؤه بين الناس على من لقيته،
عرفته أم لا: لا سيما الفقراء والمساكين. (فیض القدیر: ۵۴۲/۲)

بہر حال افشاءِ سلام کی جتنی بھی روایتیں ہیں، وہاں کم رتبہ لوگوں کا

کوئی استثناء نہیں ہے۔

سلام کرنے کی بابت اہلِ علم کی کوتاہی

حضرت تھانویؒ کے افادات میں ہے:

مجھے علماء سے شکایت ہے کہ ہم لوگ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں، عوام کو سلام کرنے سے ہم کو عار آتی ہے؛ بلکہ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ پہلے دوسرے ہم کو سلام کریں، ہم عوام کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں؛ حالاں کہ مناسب یہ تھا کہ ہم اُن کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرتے، ہم خود اپنے آپ ہی کو کہتے ہیں کہ ابتداء بالسلام نہیں کرتے، اور اس کا منشأ وہی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا ہے۔

(اسلامی تہذیب:۶۲)

سلام کرنا مسلمانوں کا شعار ہے

مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہ بیان کرتے ہیں:

یہ سلام مسلمانوں کا شعار ہے، اِس کے ذریعہ انسان پہچانا جاتا ہے کہ یہ مسلمان ہے ایک مرتبہ میرا چین جانا ہوا اور چین میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے؛ لیکن اُن کی زبان ایسی ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی، ہماری زبان اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی؛ اس لیے اُن سے بات چیت کرنے اور جذبات کے اظہار کا کوئی ذریعہ نہ تھا؛ لیکن ایک چیز ہمارے درمیان مشترک تھی، وہ یہ کہ جب بھی کسی مسلمان سے ملاقات ہوتی تو وہ کہتا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" اور اِس کے ذریعہ وہ جذبات کا اظہار کرتا، یہ حضور ﷺ کی اتباع کی برکت تھی، اِس سنت نے تمام

مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھا ہوا ہے اور رابطہ کا ذریعہ ہے، اور اِن الفاظ میں جو نور اور برکت ہے وہ کسی اور لفظ سے حاصل نہیں ہوسکتی، آج کل فیشن کی اتباع میں سلام کے بجائے کوئی ''آداب عرض'' کہتا ہے، کوئی تسلیمات کہتا ہے، کسی نے ''سلام مسنون'' کہہ دیا، یادرکھیے اِن الفاظ سے سنت کا ثواب اور سنت کا نور حاصل نہیں ہوسکتا۔ (اصلاحی خطبات: ۶/۱۸۷)

سلام کے بجائے ''خدا حافظ'' یا ''فی امان اللہ'' کہنے کا حکم

اِس وقت ہمارے یہاں ایک نامناسب طریقہ رائج ہوگیا ہے اور وہ ہے سلام چھوڑ کر خدا حافظ، اللہ حافظ یا فی امان اللہ کہا جاتا ہے، اِس طرح رخصتی یا جدائی کے وقت سلام کے بجائے دوسرے کلمات کا ادا کرنا صحیح نہیں؛ کیوں کہ ہم نے سلام کو چھوڑ کر اُسے اختیار کیا ہے اور یہ شریعت کے اندر تبدیلی ہے، دین کے اندر ایسی تبدیلی کرنے کا کسی کو بھی اختیار نہیں ہے اور ایسا کرنا غلط ہے اور بالکل ممنوع ہے، ہاں اگر آپ واپسی پر پہلے سلام کریں، بعد میں اللہ حافظ یا فی امان اللہ کہہ دیں تو اِس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

بہر حال واپسی میں سلام کی سنت کو زندہ کریں اور رخصتی کے وقت سلام کو چھوڑ کر، اُس کی جگہ فی امان اللہ کو فروغ نہ دیں: کیوں کہ اس طرح کرنا صحیح نہیں، میں اکثر ٹیلیفون پر یہی بات سنتا ہوں، لوگ ٹیلیفون بند کرتے وقت فی امان اللہ، اللہ حافظ کہتے ہیں، کوئی سلام نہیں کرتا، ٹیلیفون ہو یا زبانی ملاقات، دونوں کا ایک ہی حکم ہے، پہلے سلام کرنا چاہیے، جب ٹیلیفون بند کرنے لگیں تو السلام علیکم ورحمة الله کہہ کر پھر ٹیلیفون بند کریں، کسی کا دل چاہے تو سلام کے بعد فی امان اللہ کہہ لے، فی امان اللہ کہنا سنت نہیں، صرف جائز ہے۔ (اصلاحی خطبات ۹/۲۶۰)

سلام کے بعد خیریت معلوم کرنا

سلام کی مشروعیت اِسی لیے ہوئی ہے کہ دو مسلمان ایک دوسرے کو امن وسلامتی کی دعا

دیں اور اظہارِ محبت کے ساتھ، حقِ محبت واخوت کی ادائیگی کریں؛ لہٰذا اسلام کے بعد اگر فرصت ہو تو ایک دوسرے کی خیریت معلوم کریں، اُس کے اہلِ خانہ، کاروبار اور دیگر عبادات ومعاملات کے سلسلے میں دریافت کریں، اُس کی پریشانیوں کو سنیں اور تسلی کے چند کلمات کہیں، مشورے کی ضرورت ہو تو مفید مشورے دیں اور جس سے یہ سب معلوم کیا جائے، اُسے ہر حال میں خدا کی تعریف کرنی چاہیے، اِس سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے، مصیبت ختم ہوتی ہے، گلے شکوے کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے؛ لہٰذا ایسا شخص جس سے خیرت دریافت کی جائے وہ ''الحمدللہ''، ''اللہ کا شکر ہے، ''خدا کا کرم'' ہے جیسے الفاظ کہے؛ چناں چہ حضرت انس ابن مالکؓ سے مروی ہے: انہوں نے سنا کہ حضرت عمر ابن خطابؓ کو ایک شخص نے سلام کیا تو آپ نے جواب دے کر کہا: کیف أنت؟ کیسے ہو؟ اُس نے کہا أحمد إليك الله (حضرت عمرؓ خوش ہوئے) اور کہا: میرا یہی مقصد تھا، (۱) ظاہر سی بات ہے حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ (اوجز: ۱۷/۱۹۷)

سوال عمر بن الخطابؓ الرجل عن حاله على سبيل التأنيس وحسن العشرة لمن عرفه الإنسان أن يسئل عن حاله. (المنتقی: ۷/۲۸۲)

حضرت ابوذرؓ شام سے تشریف لائے تو مسجد میں داخل ہوئے وہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے، حضرت ابوذرؓ نے السلام علیکم کہا، انہوں نے جواب دیا وعلیکم السلام، کیف أنت یا أباذر یعنی اے ابوذر کیسے ہیں؟ حضرت ابوذرؓ نے کہا بخیرٍ، بخیر ہوں، آپ کیسے ہیں؟ (المصنف: ۶/۱۳۳)

تشریح: دیکھیے صحابہ کا آپس میں سلام کے بعد خیریت دریافت کرنے کا معمول تھا؛ بالخصوص اگر کافی دنوں کے بعد ملاقات ہو تو خیر خیریت معلوم کرنا اخلاقی فریضہ ہے، اور خیریت معلوم کرنا، سلام سے پہلے جائز نہیں ہے، شرح ابن بطال میں ہے: ولكن لا يكون هذا إلا بعد التحية المأمور بها من السلام. (شرح ابن بطال: ۶/۵۱)

---

(۱) موطا مالک، رقم الحدیث: ۱۷۳۱، باب جامع السلام.

خوش آمدید کہنا

سلام ومصافحہ اور معانقہ کے بعد اگر آنے والے کو خوش آمدید کہا جائے، اُس کا پر جوش اور پر تپاک استقبال کیا جائے تو اِس سے مودت ومحبت اور فرحت وسرور میں اضافہ ہوتا ہے، نفرت وعداوت کی بیخ کنی ہوتی ہے، بہ الفاظِ دیگر خوش آمدید یا اِس جیسے جملے کے ذریعہ مقصدِ سلام کی تکمیل ہوتی ہے اور مہمان کی آمد پر میزبان کو اِنشراح ہے اس کا اظہار ہوتا ہے، عربی میں خوش آمدید کی جگہ مـــرحبـــاً بك استعمال ہوتا ہے اور یہ چیز تقریباً تمام مذاہب میں ہے، انگریزی تہذیب میں Welcome اور غیر مسلموں کے یہاں سَوَاگتَم جیسے الفاظ مستعمل ہیں؛ لہٰذا ہم مسلمانوں کو بھی مرحبا، مرحباً بکم، أهلا وسهلا خوش آمدید وغیرہ سلام کے بعد کہنا چاہیے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرحبا اور خوش آمدید کہنا ثابت ہے، امام ترمذیؒ نے بـــاب مـا جـاء فـی مـرحبـاً کے تحت یہ حدیث ذکر کی ہے۔

(۱) حضرت علیؓ کی حقیقی بہن اُمِّ ہانی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: کہ میں فتح مکہ کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئی، میں نے آپ کو نہاتے ہوئے پایا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کپڑے سے آپ کو چھپائے ہوئے تھیں، ام ہانی کہتی ہیں: میں نے سلام کیا آپ نے پوچھا (ظاہر ہے پہلے جواب دیا ہوگا) من هذه؟ کون ہے؟ میں نے عرض کیا، میں ام ہانی ہوں، آپ نے فرمایا: مرحبا بأم هاني کہ ام ہانی کو میں خوش آمدید کہتا ہوں...... (ترمذی، رقم: ۲۷۳۶، باب ماجاء فی مرحبا)

تشریح: (۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر فتنہ وفساد کا خطرہ نہ ہو تو عورت مرد کو سلام کر سکتی ہے۔

(۲) جو شخص غسل کر رہا ہو اور ننگے نہ ہو؛ بلکہ پردہ میں ہو تو اُسے سلام کر سکتے ہیں۔

(۲) دوسری حدیث: حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس دن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: مـرحبـا بـالـركـب المهاجر، ہجرت کرنے والے اونٹ سوار کو میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ (ترمذی، رقم: ۲۷۳۷)

(۳) حضرت براء ابن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

حاضر ہوا آپ نے مجھے خوش آمدید کہا اور میرا ہاتھ پکڑا اور کہا: براء! کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہارا ہاتھ کیوں پکڑا؟ میں نے کہا: نہیں! آپ نے کہا: لا یلقی مسلم مسلما فیبش به ویرحب به ویأخذ بیده إلا تناثرت الذنوب بینهما کما یتناثر ورق الشجر.

(شعب الایمان: ۸۹۵۷، فصل فی المصافحہ)

(۴) مجلس میں آنے والے پر دہشت چھائی ہوتی ہے اسے مرحبا کہہ کر اس کا استقبال کرو۔ (کنز العمال: ۲۵۴۹۹ رواہ الدیلمی عن الحسن بن علی)

(۵) حضرت علیؓ سے مروی ہے: کہ حضرت عمار بن یاسرؓ آئے، (اور) حضور ﷺ سے اجازت مانگی، آپ نے فرمایا: اجازت دے دو (جب وہ اندر آئے تو فرمایا:) خوش آمدید طیب ومطیَّب. (بخاری: ۳۸۲۸، ابواب المناقب)

خیریت دریافت کرنا سو رحمتوں کے نزول کا سبب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب دو مسلمانوں کی آپس میں ملاقات ہوتی ہے اور وہ (سلام کے بعد) ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن دونوں کے درمیان سو رحمتیں نازل فرماتے ہیں، ننانوے رحمتیں اُس کے لیے ہوتی ہیں جو انتہائی بشاشت وطلاقت اور خوشی ومسرت کا اظہار کرنے والا ہوتا ہے۔ (رواہ الطبرانی باسناد فیہ نظر، الترغیب والترھیب: ۴۳۳/۳)

تشریح: اگر چہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث مضبوط نہیں ہے؛ لیکن ترغیب وفضیلت کے روایت اگر چہ ضعیف ہو، قابل نقل ہوتی ہیں، أن أحادیث الفضائل یتسامح فیها عند أهل العلم کلهم (۱) بہر حال حدیث کے مضمون سے دو باتیں بنیادی طور سے معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ سلام ومصافحہ کے بعد، خیریت معلوم کرنا چاہیے، یہ چیز نزول رحمت کا سبب ہے، دوسرے یہ کہ ملاقات کے وقت، چہرے پر خوشی کے آثار ہونے چاہئیں، انسان کو اس طرح ملنا چاہیے کہ سامنے والے کو

---

(۱) الاذکار: ۲۸۳.

ایسا محسوس ہو کہ یہ میرے ہی انتظار میں تھا، مجھے دیکھ کر اِس کا چہرہ دمک اٹھا، اِس سے محبت بڑھتی ہے، اِس کے برخلاف اگر کوئی بوقت ملاقات "عبوساً قمطریراً" کی تصویر بن جائے، چہرے سے نفرت وعداوت کا اظہار ہو تو محبت کم، نفرت ودوری زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، جو اسلامی سلام ومصافحہ کی مقصدیت کے خلاف ہے، ہنستا اور مسکراتا ہوا چہرہ اور کِھلے ہوئے پھول سب کو پسند ہوتے ہیں، دوست ودشمن کا کوئی فرق نہیں اور مرجھایا ہوا چہرہ اور مرجھائے ہوئے پھول عموماً ناپسند کیے جاتے ہیں۔(۱)

نوٹ: حدیث میں جن سو رحمتوں کے نزول کا تذکرہ ہے یہ رحمتیں، اُن دس، بیس، تیس نیکیوں کے علاوہ ہونگی جو سلام کرنے اور جواب دینے پر ملتی ہیں، جن کی صراحت حدیث میں ہے۔ مولف

سلام کا جواب نہ ملنے پر بدگمانی سے بچیں

سلام کا جواب دینا واجب ہے، بلاوجہ جواب نہ دینا، نفرت وعداوت کا سبب ہوجاتا ہے؛ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جسے سلام کیا گیا ہے، اُس پر استغراقی کیفیت طاری ہے، کوئی فکر دامن گیر ہے یا ایسے حالات ہیں، جن حالات میں انسان آس پاس کی چیزوں سے بے خبر ہوجاتا ہے، ایسے شخص کو کسی نے سلام کیا اور اُس نے جواب نہیں دیا تو اس سے شکایت پیدا ہوجانا ایک فطری کمزوری کا نتیجہ ہے؛ لیکن اول مرحلہ میں اُس سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے؛ بلکہ مثبت اسباب تلاش کرنے چاہئیں، بدگمانی سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ کے پاس سے گذرے اور حسبِ عادت سلام کیا، حضرت عثمانؓ نے کوئی جواب نہیں دیا، حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس یہ شکایت

خیریت پوچھنے سے متعلق مزید روایتیں: (۱) عن خثيمة قال: سألت عائشة: كيف أصبحت؟ قالت بنعمة. (۲) عن مغيرة قال: سمعت إبراهيم وسلّم عليه فقال: وعليكم، فقال: كيف أنت؟ قال بنعمة الله. (۳) عن عطاء بن السائب أن أبا عبد الرحمان السلمي كان إذا قيل كيف أنت؟ قال: بخير نحمد الله، تفصیل کے لیے دیکھیے: المصنف ۱۴۷/۶، باب فی الرجل يقال له: كيف أصبحت.

لے کر آئے کہ حضرت عثمانؓ نے اُن کو سلام کا جواب نہیں دیا، دونوں حضرات اُسی وقت حضرت عثمانؓ کے پاس وجہ دریافت کرنے کے لیے تشریف لائے، حضرت عثمانؓ نے عذر بیان کیا کہ حضرت عمرؓ کا سلام تو دور کی بات، اُن کے گذرنے کی آہٹ بھی مجھے محسوس نہ ہوسکی؛ کیوں کہ اس وقت میرے اوپر گہری فکر سوار تھی، میں اُس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ امت کی نجات کس عمل میں ہے؟ اور حضورﷺ سے پوچھنا بھول گیا؛ حالاں کہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے، حضرت صدیقؓ نے فرمایا کہ میں نے پوچھا تھا تو آں جناب نے فرمایا تھا کہ نجات کے لیے وہی کلمات ہیں جو میں نے ابوطالب پر پیش کیے تھے یعنی لا الہ الا اللہ جو ان کو پڑھ لے اور عمل کرلے تو یہ اس کے لیے سرمایۂ نجات ہے۔ (مسند ابی یعلی الموصلی، رقم:۱۳۳)

نیک لوگوں کی زیارت اور دعا وسلام

اللہ کے جو نیک بندے ہوتے ہیں اُن کی زیارت، اُن سے ملاقات، ان کی صحبت میں کچھ دیر بیٹھنا، اُن سے دعائیں لینا اور اُن کی باتوں کو سننا یقیناً کارِثواب ہے، دلوں کی دنیا بدلنے میں بزرگوں کی زیارت اپنا ایک الگ مخصوص مقام رکھتی ہے، رویۃ الصالحین لها أثر عظیم. کونوا مع الصادقین.

اس لیے بزرگانِ دین اور صادقین وصالحین کی زیارت سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اُن سے دعا وسلام کا سلسلہ قائم رکھنا چاہیے، اُن سے مصافحہ کرنا چاہیے، احادیث میں بھی اِس کا حکم آیا ہے۔

حضورﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی مریض کی عیادت کی، یا اپنے بھائی سے ملاقات کی (دونوں کی محبت خالص، اللہ کے واسطے ہو) تو ایک آواز لگانے والا آواز لگاتا ہے، تم نے بڑا اچھا کام کیا، تمہارا چلنا مبارک ہو، اور تم نے جنت میں ایک ٹھکانا بنالیا۔

(ترمذی، رقم:۲۰۰۸ فی البر والصلۃ)

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

یستحب استحبابا متأکدا زیارة الصالحین والإخوان والجیران والأصدقاء والأقارب وإکرامهم وبرهم وصلتهم.

کہ نیک لوگوں کی زیارت، اپنے دینی بھائی، پڑوسی، دوست واحباب اور دیگر رشتہ داروں کی زیارت وملاقات مستحب ہے، اُن کی عزت کرنا، ان کے ساتھ صلہ رحمی کرنا مستحب ہے۔ (الاذکار:۳۰۵)

ملحوظہ: زیارتِ صالحین اور اُن سے سلام ومصافحہ کرنا مستحب تو ہے؛ لیکن ان کو ذہنی یا کسی قسم کی اذیت پہنچانا ناجائز ہے؛ اس لیے زیارت اور دعا وسلام ایسے اوقات میں اور ایسے طریقے سے کریں کہ انہیں کوئی تکلیف نہ ہو، علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

وینبغي أن تکون زیارته لهم علی وجه لا یکرهونه وفي وقت یرتضونه. (ایضا:۳۰۶)

دعا کی درخواست کیجیے

بزرگوں سے ملاقات ہو تو سلام ومصافحہ کے بعد مجلس میں ہی، یا رخصتی کے وقت، اُن سے دعا کی درخواست کیجیے؛ بلکہ عام حالات میں بھی آپس میں ایک دوسرے سے دعا کی درخواست کرنی چاہیے، اہلِ فضل اور بزرگوں سے دعا کی درخواست تو کرنی ہی چاہیے، چھوٹوں سے بھی یہ درخواست کر سکتے ہیں، سرکارِ دو عالم ﷺ نے حضرت عمرؓ سے دعا کی درخواست کی ہے، روایت پڑھیے: عن عمر بن الخطابؓ قال: استأذنت النبي ﷺ في العمرة فأذن وقال: لا تَنْسَنَا یا أُخَيَّ من دعائك. (ابوداؤد، رقم:۱۴۹۸، فی الصلاۃ)

ایک ادب

کسی سے ملنے جائے تو سلام ومصافحہ کے بعد موقع ہو تو جو مقصد ہے بیان کردے،

حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

کوئی حاجت لے کر کہیں جائے تو موقع پا کر فوراً اپنی بات کہہ دے، انتظار نہ کرائے، بعضے آدمی پوچھنے پر تو کہہ دیتے ہیں کہ صرف ملنے آئے ہیں، جب وہ بے فکر ہوگیا اور موقع بھی نہ رہا، اب کہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کہنا ہے تو اس سے بہت اذیت ہوتی ہے۔

(آداب المعاشرت مع اصلاحی نصاب:۴۶۸)

دوسری جگہ ہے:

اگر کہیں جائے اور صاحب خانہ سے کچھ حاجت یا فرمائش کرنی ہے مثلاً: کسی بزرگ سے کوئی تبرک لینا ہو تو ایسے وقت میں اُس کو ظاہر کردو اور درخواست کرو کہ اُس شخص کو اس کے پورا کرنے کا وقت بھی ملے، بعضے آدمی عین جانے کے وقت فرمائش کرتے ہیں تو اِس میں صاحبِ خانہ کو بڑی تنگی پیش آتی ہے، وقت محدود ہوتا ہے؛ کیوں کہ مہمان جانے پر تیار ہے اور ممکن ہے کہ اُس محدود وقت کے اندر اُس کو مہلت نہ ہو، کسی کام میں مشغول ہو؛ پس نہ تو اُس کے کام کا حرج گوارا ہے نہ اس درخواست کا رد کرنا گوارا ہے، تو اِس سے بہت تنگی پیش آتی ہے، تو ایسا کام کرنا جس سے دوسرے شخص کو تنگی ہو، روا نہیں اور تبرک مانگنے میں اِس کا بھی لحاظ رکھو کہ وہ چیز اُن بزرگ سے بالکل زائد ہو ورنہ سہل یہ ہے کہ چیز اپنے پاس سے یہ کہہ کر اُن کو دے دو کہ آپ اس کا استعمال کر کے ہم کو دیجیے۔ (ص:۴۷۰)

نوٹ: بعض دفعہ کسی بزرگ کے پاس آنے والا بہت شرمیلا اور کم گو ہوتا ہے، وہ جا کر بھی کچھ نہیں بول پاتا؛ اس لیے بڑوں کو بھی پوچھ لینا چاہیے کہ آنے کا کوئی خاص مقصد تو نہیں ہے، اِس سے حوصلہ ملتا ہے۔ (مولف)

حاجی سے سلام ومصافحہ

حج ایک عاشقانہ عبادت ہے اور دین کے اُن پانچ بنیادی ستونوں میں سے ایک اہم اور جلیل القدر ستون ہے، جن پر اسلام کے عقائد واحکام کی پوری عمارت کھڑی ہے، اس کی فرضیت قرآن کریم سے ثابت ہے، گو حج کا رواج حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے ہے؛ بلکہ اُن سے پہلے انبیاء کے بارے میں بھی اقوال ملتے ہیں کہ انہوں نے حج کیا؛ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اُس وقت حج فرض نہیں تھا؛ بلکہ یہ امت محمدیہ پر فرض ہوا، بہ الفاظ دیگر حج اِس امت کی خصوصیت ہے، ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

ثم اختلف في أن الحج كان واجبا على الأمم قبلنا أم وجوبه مختص بنا لكما لنا، والأظهر الثاني.

(مرقاۃ: ۲۶۳/۵ کتاب المناسک)

حج کی دولت جسے نصیب ہوجاتی ہے اُن کے نصیبہ ور ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا، حج کی توفیق بے پناہ اجر وثواب کا باعث ہے، ایک روایت میں ہے:

والحج المبرور ليس له جزاء إلا الجنة. (۱) یعنی حج مبرور کا بدلہ جنت کے علاوہ کچھ نہیں ہے، دوسری روایت میں ہے:

من حج لله فلم يرفث ولم يفسق رجع كيوم ولدته أمه. (۲) یعنی جو شخص اللہ کے واسطے حج کرے اور (دورانِ حج) نہ عورت سے ہم بستری کرے اور نہ فسق میں مبتلا ہو تو وہ اِس طرح (بے گناہ ہوکر) واپس آتا ہے جیسے (اُس دن بے گناہ تھا) کہ جس دن اُس کو اُس کی ماں نے جنا تھا۔

جب حج کے ایسے فضائل ہیں اور حاجی حج کر کے گناہوں سے بالکل پاک صاف ہوجاتا

---

(۱) بخاری، رقم: ۱۷۷۳۔ (۲) بخاری، رقم: ۱۵۲۱۔

ہے تو وہ اللہ کا مقرب بندہ ہوجاتا ہے، اُس کی بخشش ہوچکی ہوتی ہے؛ لہٰذا اُس کی واپسی پر اُس سے ملنا، اس کو سلام کرنا، مصافحہ کرنا، اُس کا استقبال اور اُسے خوش آمدید کہنا اور اُس سے اپنی اصلاح اور اپنے گناہوں سے مغفرت کی دعا کی درخواست کرنا سب کارِ ثواب ہوں گے، اللہ بندوں کی مغفرت کے بہانے ڈھونڈ تا ہے، کیا پتہ حاجی کی دعا ہی اُس کی مغفرت کا ذریعہ بن جائے؛ چناں چہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إذا لقيت الحاجّ فسلم عليه وصافحه ومره أن يستغفرلك قبل أن يدخل بيته، فإنه مغفور له. (احمد: رقم: ۶۱۱۲)

جب تم حاجی سے ملو تو اُس کو سلام کرو اور اُس سے مصافحہ کرو اور اُس سے اپنے لیے بخشش (کی دعا کرنے) کو کہو، اِس سے پہلے کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہو اور یہ اِس لیے ہے کہ اُس کی بخشش کی جاچکی ہے۔

تشریح: مظاہر حق جدید میں ہے:

جیسا کہ ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے، حاجی مستجاب الدعوات ہوجاتے ہیں جس وقت کہ وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے ہیں اور گھر واپس آنے کے چالیس روز بعد تک ایسے ہی رہتے ہیں، چناں چہ گذشتہ زمانے میں دستور تھا اور اب بھی ہے کہ جب حجاج اپنے گھر واپس آتے تھے تو لوگ اُن کے استقبال کے واسطے جایا کرتے تھے اور ان کی غرض یہ ہوتی تھی کہ چوں کہ اِس شخص کی مغفرت ہوچکی ہے اور یہ گناہوں سے پاک ہوکر آیا ہے، اِس سے مل کر مصافحہ کریں، پیشتر اس کے کہ وہ دنیا میں ملوث ہوجائے؛ تاکہ ہم کو بھی ان سے کچھ فیض پہنچے، اگرچہ آج کل یہ غرض کم اور نام ونمود کا جذبہ

زیادہ ہوتا ہے۔

چناں چہ اِس حدیث میں بھی حاجی سے سلام ومصافحہ کرنے کے لیے گھر میں داخل ہونے سے پہلے کی قید اِس لیے لگائی گئی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ وہ اُس وقت دنیا میں ملوث اور اپنے اہل وعیال میں مشغول نہیں ہوتا؛ بلکہ اِس وقت تک وہ راہِ خدا ہی میں ہوتا ہے اور گناہوں سے پاک صاف ہوتا ہے اور اِس صورت میں حاجی چوں کہ مستجاب الدعوات ہوتا ہے، اِس لیے فرمایا کہ اُس سے اپنے لیے مغفرت وبخشش کی دعا کراؤ؛ تاکہ اللہ تعالیٰ اُسے قبول کرے اور تمھیں مغفرت وبخشش سے نوازے۔ (مظاہر حق: ۳/۲۷۹)

نوٹ: اب زمانہ بدل گیا، اب حجاج سے لوگ ملتے ہیں تو سلام ومصافحہ کرتے ہیں؛ لیکن دعاءِ مغفرت کی درخواست نہیں کرتے، بلکہ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی ہیں، سفر کیسا رہا، وہاں کے حالات کیسے رہے، میرے لیے کیا تحفہ لائے ہیں، فلاں سے ملاقات ہوئی یا نہیں، فلاں نے میرے لیے کیا بھیجا ہے؟ وغیرہ وغیرہ، عموماً سلام ومصافحہ کے بعد ہماری گفتگو کے یہی عنوانات ہوتے ہیں، اِس موقع پر بھول جاتے ہیں تو دعاءِ مغفرت کی درخواست، اور اِس کی وجہ اِس کے سوا کیا ہوسکتی ہے کہ ہم مسلمانوں پر دنیا کا ایسا غلبہ ہے کہ گناہوں اور گناہوں پر مُرتّب ہونے والی نحوستیں اور سزاؤں کا احساس ہی نہیں ہوتا، جسے گناہوں کے زخم کا احساس ہوگا وہ اس کی مرہم پٹی کی فکر کرے گا، کاش ہم اسے سمجھتے، اللہ توفیق دے۔

مجاہد، عمرہ کرنے والا اور طالب علم کا حکم

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ: عمرہ کرنے والے، جہاد کرنے والے اور دینی طالب علم بھی حاجی کے حکم میں ہیں؛ لہٰذا یہ لوگ جب اپنے گھر واپس آئیں تو اُن سے بھی گھر میں داخل ہونے سے پہلے

سلام ومصافحہ کیا جائے اور دعاءِ بخشش ومغفرت کی درخواست کی جائے؛ کیوں کہ یہ لوگ بھی بخشے بخشائے ہوتے ہیں۔ (مرقاۃ المفاتیح: ۵/۲۸۰)

سلامتی کی دعا پلِ صراط پر بھی ہوگی

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے مروی ہے: کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: مومنین کا شعار(۱) پلِ صراط پر: رب سلّم سلّم اے پروردگار بچا! بچا! ہوگا۔ (ترمذی، رقم الحدیث: ۲۴۲۶ فی شأن الصراط)

تشریح: السلام علیکم کے ذریعہ دنیا میں، مسلمان ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دیتے اور لیتے ہیں، یہ دعا اتنی اہمیت کی حامل ہے کہ کل قیامت میں بھی اِس سلامتی کی دعا کی ضرورت پڑے گی، پلِ صراط(۲) پر انبیاء اور امتوں کا شعار: رب سلّم سلّم ہوگا، یعنی ہر ایک کی زبان پر یہی دعا ہوگی، اِس حدیث سے معلوم ہوا: کہ پلِ صراط کا معاملہ بڑا سنگین ہے، اس سے کون پار ہوتا ہے اور کسے آنکڑے کھینچ لیتے ہیں؟ اِس کی کسی کو خبر نہیں؛ اِس لیے اس موقع پر ہر شخص انتہائی درجہ گھبرایا ہوا ہوگا اور سلامتی کی دعا کر رہا ہوگا، اللہ ہمیں پلِ صراط سے بہ سلامت گذار دے، آمین۔

سلام کا فائدہ

دیکھیے: اگر آپ نے کسی سے ملاقات کے وقت ''ہیلو'' کہہ دیا تو آپ کے اِس لفظ سے اُس کو کیا فائدہ ہوا؟ دنیا کا کوئی فائدہ ہوا؟ یا آخرت کا کوئی فائدہ ہوا، ظاہر ہے کہ کوئی فائدہ نہیں ہوا؛ لیکن اگر آپ نے ملاقات کے وقت یہ الفاظ ''السلام علیکم ورحمة

---

(۱) شعار: علامت، خاص نشان (Motto) نعرہ، وہ عبارت جس سے کوئی جماعت اپنا تعارف کرائے، جیسے مسلمان نعرہ تکبیر لگاتے ہیں یہ مسلمانوں کا شعار ہے، اِسی طرح پلِ صراط پر مومنین کا شعار رب سلّم سلّم ہوگا، تحفۃ الالمعی: ۶/۲۰۲.

(۲) پل: صراط کا ترجمہ ہے: اصل اور ترجمہ کو ملا کر ایک لفظ بنایا ہے، اردو میں ایسا بہت ہوتا ہے، جیسے آبِ زمزم، پیش امام وغیرہ......قیامت کا دن اِس دنیا کا آخری دن ہے اور جنت وجہنم دوسری دنیا میں ہیں، قیامت کے دن جنت وجہنم کے فیصلے ہو جائیں گے تو لوگ اِس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل کیے جائیں گے، وہ ایک پل (Bridge) کے ذریعہ منتقل کیے جائیں گے، جنتی اُس پار ہو جائیں گے اور جہنمیوں کو آنکڑے جہنم کی طرف کھینچ لیں گے، تحفۃ الالمعی: ۶/۲۰۲.

اللہ وبرکاتہ" جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "تم پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں" تو اِن الفاظ سے یہ فائدہ ہوا کہ آپ نے ملاقات کرنے والے کو تین دعائیں دیں......اور اگر آپ نے کسی کو "گڈ مارننگ" یا "گڈ ایوننگ" کہا یعنی صبح بخیر، شام بخیر تو اگر اس کو دعا کے معنی پر بھی محمول کرلیں تو اِس صورت میں آپ نے جو اُس کو دعا دی وہ صرف صبح اور شام کی حد تک محدود ہے، کہ تمہاری صبح اچھی ہو جائے یا تمہاری شام اچھی ہو جائے؛ لیکن اسلام نے ہمیں جو کلمہ سکھایا وہ ایسا جامع کلمہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ بھی کسی مخلص مسلمان کا سلام اور دعا، ہمارے حق میں اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے تو ان شاء اللہ ساری گندگی ہم سے دور ہو جائے گی اور دنیا و آخرت کی فلاح حاصل ہو جائے، یہ نعمت آپ کو دنیا کی دوسری قوموں میں نہیں ملے گی۔(اصلاحی خطبات:۱۶۰/۶)

مہمان سے سلام ومصافحہ، پُر تپاک انداز میں کیجیے

مہمان رزق میں برکت کا سبب ہوتا ہے، اسلامی عقیدہ ہے کہ ہر کوئی دوسرے کا نہیں، اپنا رزق کھاتا ہے، ہاں سبب کوئی دوسرا بن سکتا ہے؛ چوں کہ انسانی جِبلّت کی تخلیق میں شحُ اور بخل بھی شامل ہے، جس کے تقاضہ سے انسان کبھی مہمان کی آمد سے گھبراجاتا ہے؛ اسی لیے اسلام نے اِکرامِ ضَیف پر خصوصی توجہ دی ہے اور کہا: من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ (۱) گویا اکرامِ ضیف ایمانی تقاضہ ہے اور صحابہ نے اکرامِ ضیف کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ ایسی مثالیں دنیا نے کیوں کر دیکھی ہوں گی، وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۲) آیت ایک صحابی کی بے مثال مہمان نوازی پر اُتری؛ حالاں کہ اُن کے دستر خوان پر کوئی اہم ڈِش اور پکوان

(۱) بخاری:۶۰۱۸،فی الادب۔ (۲) الحشر:۹۔

کی مختلف قسمیں نہیں تھیں؛ لیکن اُن کے دل میں اِکرامِ ضَیف کا ایسا جذبہ تھا کہ اس جذبہ کی قدردانی رب کائنات نے قرآن میں آیت نازل کرکے، کی۔

لٰہذا مہمان یا مسافر آئیں تو گھبرانا نہیں چاہیے؛ بلکہ بشاشت اور خندہ پیشانی اور پُر تپاک انداز میں گرمجوشی کے ساتھ سلام ومصافحہ کرنا چاہیے، مرحبا کہتے ہوئے استقبال کرنا چاہیے، خوش آمدید کے ترانے پڑھنا چاہیے، پھر جو کچھ میسر ہو پیش کرنا چاہیے، اصل مہمان نوازی وہی ہے جو تکلُّفات سے خالی ہو، ماحَضَر پیش کردینا، مہمان نوازی کی بےعزتی نہیں ہے؛ مہمان نوازی کا مطلب ہم نے پرتکلُّف مہمان نوازی بنادیا ہے، جس کی وجہ سے لوگ مہمان سے کتراتے ہیں، جس کے نتیجہ میں سلام ومصافحہ بے دلی سے ہوتا ہے، صحابہ کرامؓ مہمان کو دیکھ کر مرحباً و أھلا کہا کرتے تھے، (۱) خوش ہوتے تھے اور جو کچھ ہوتا پیش کردیتے تھے؛ گو مہمان کے اعزاز میں تکلف کی بھی اجازت ہے۔

مسلمانوں کے دلوں کو جوڑنے کا آسان نسخہ

حضور ﷺ کا ارشاد ہے: أفشوا السلام بینکم تحابوا (۲) یعنی سلام کو رواج دو، محبت پیدا ہوگی، علامہ مناویؒ اِس کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حکم میں ایک بڑی مصلحت ہے، وہ یہ کہ یہ مسلمانوں کے قلوب جوڑنے کا آسان نسخہ ہے، آپسی مدد اور ایک دوسرے کے باہمی تعاون کی ضمانت ہے، حسد، کینہ اور دشمنی کے خاتمے کے لیے بہت ہی سہل ترکیب ہے، اُخوت ومحبت کے حصول کے لیے افشاءِ سلام ایک بڑا تحفہ ہے، شیخ ابن العربیؒ لکھتے ہیں: افشاءِ سلام کا فائدہ، حصولِ الفت ومحبت ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شریعت پر عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے، لوگ اِس سلسلے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، اور اس میں کافروں کی رسوائی کا سامان بھی ہے، مذکورہ حدیث کے الفاظ اِس طرح بھی آئے ہیں: أفشوا السلام فإنہ للہ تعالیٰ رضاً (۳) یعنی سلام کو رواج دو، یہ چیز اللہ کی خوش نودی کا ذریعہ ہے،

---

(۱) مسلم: ۲۰۳۸ فی الأشربۃ. (۲) الجامع الصغیر للسیوطی: ۱۲۲۸. (۳) الجامع الصغیر للسیوطی: ۱۲۲۹

یہ ایسا فعل ہے کہ اللہ، اِس فعل کے کرنے والے سے خوش رہتے ہیں، أفشوا السلام كي تعلوا بھی مروی ہے، یعنی سلام کو رواج دو؛ تاکہ تمہیں سرخ روئی حاصل ہو یعنی سلام کو رواج دینا، آپسی محبت کا ذریعہ ہے، جب مسلمانوں میں آپسی محبت ہوگی تو اتحاد واتفاق ہوگا، اُن کی جمعیت مضبوط ہوگی، اور جس کی جمعیت مضبوط ہوتی ہے وہ قوم غالب اور حاکم رہتی ہے اور جس کی جمعیت پارہ پارہ ہوتی ہے وہ قوم مغلوب ومحکوم ہوجاتی ہے، آج ہماری محکومی اور مظلومی کا بہت بڑا سبب متحد نہ ہونا ہے، انتشار وخلفشار کا شکار ہونا ہے، اور اِس اختلاف وانتشار کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں، ایک بنیادی سبب ترکِ سلام بھی ہے، أفشوا السلام كي تعلوا کی روشنی میں کیا اِس سے انکار ممکن ہے؟ اللہ افشاء سلام کی توفیق دے۔ (خلاصہ فیض القدیر:۲/۲۳)

کیا قیامت میں اللہ تعالیٰ بندوں کو سلام سے نوازیں گے؟

السلام علیکم کے ذریعہ مسلمان ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دیتے ہیں اور چوں کہ السلام اللہ کا اسم مبارک بھی ہے اور اللہ کو بھی یہ نام اتنا پسند ہے کہ کل قیامت میں جب اللہ کے نیک بندے جنت یعنی دار السلام میں داخل ہوجائیں گے تو اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو لفظ "سلام" سے ہی مخاطب فرمائیں گے اور سلام کریں گے، یہ کتنا بڑا اعزاز ہے، اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، ويسلم يوم القيامة على أهل الجنة: چناں چہ ارشادِ خداوندی ہے: لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُم مَّا يَدَّعُونَ ۔ سَلَامٌ قَوْلًا مِن رَّبٍّ رَّحِيمٍ. (یٰس:۵۷،۵۸)

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کو یہ سلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست ہوگا؛ کیوں کہ قولا من رب رحيم، اِس پر صراحۃً دلالت کررہا ہے؛ اگر قولًا من رب رحيم نہ ہوتا تو اس بات کا احتمال تھا کہ سلام، فرشتوں کے واسطے سے کرایا جائے گا۔

ابن ماجہ میں ہے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس وقت کہ اہل جنت اپنی نعمتوں میں مست ہوں گے، اچانک اُن کے سامنے اوپر سے ایک نور چمکے گا، وہ اپنے سر

اٹھائیں گے، دیکھیں گے کہ اللہ جَلّ جلالُہ ، انہیں اوپر سے دیکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کہیں گے: یــا أهل الجنة سلام عليكم پھر آپ علیہ السلام نے آیت سلام قولا من رب رحيم کی تلاوت فرمائی، پھر وہ نور اُن سے پوشیدہ ہو جائے گا اور اللہ کی رحمت و برکت اُن پر سایہ فگن رہے گی۔(۱) خلاصہ بدائع الفوائد لابن القیم :۲/۱۴۱

حضور ﷺ کو درخت اور پتھر کا سلام

قرآنی آیات اور احادیث متواترہ سے غیر انسانی مخلوق، حیوانات ونباتات وجمادات میں سے ہر ایک کا خدا کی پاکی بیان کرنا اور تسبیح وتقدیس میں لگے رہنا ثابت شدہ مسئلہ ہے؛ اگرچہ اُن کی عبدیت اور عبادت کا نہج ایسا نہج ہے جو انسانی فہم وادراک سے ماوراء ہے، ارشاد باری تعالیٰ وَلَـٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ .(۲) کا یہی مطلب ہے۔

البتہ جس ہستی ماوراء الوریٰ کی تسبیح وتکبیر ہوتی ہے وہ اُس کی شان کے مطابق اور اُس کی عظمت کے لائق ہوتی ہے، اِسی طرح اگر ان غیر ذوی العقول (بے عقل) مخلوق سے تعظیما اور ادباً سلام کرنے کا طریقہ ثابت ہوتا ہے تو اس میں کیا تعذّر رہے، حضور انور ﷺ جس وقت قضاءِ حاجت کے لیے دور دراز تشریف لے جاتے تو ہر جانب سلام کی آواز گونجنے لگتی، اچانک آپ مڑ کر پیچھے دیکھتے تو درخت اور پتھر آپ کو سلامی پیش کرتے ہوئے دکھائی پڑتے (مفہوم سیرۃ ابن ہشام) معلوم ہوا کہ آپ ہر ایک کو اِس حد تک دل عزیز تھے کہ جمادات ونباتات کا سلام بھی آپ کا معجزہ بن جائے۔

(اہمیت سلام وملاقات:۲۶)

بعثت کے وقت ایک پتھر آپ کو سلام کرتا تھا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مکہ میں ایک پتھر ہے وہ مجھے سلام کیا کرتا تھا، جن ایام میں مجھے نبی بنایا گیا، میں اُس کو اب بھی جانتا ہوں (وہ کہا کرتا تھا: السلام عليك يا رسول الله)

(بخاری:۳۶۵۳ ابواب المناقب)

---

(۱) ابن ماجہ، رقم:۱۸۴ ضعیف (۲) بنی اسرائیل:۴۴.

پہاڑوں اور درختوں کا سلام کرنا

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں: میں نبی ﷺ کے ساتھ مکہ میں تھا یعنی یہ مکی دور کا واقعہ ہے؛ پس ہم مکے کے بعض کناروں میں نکلے تو جو بھی پہاڑ یا درخت آپ ﷺ کے سامنے آتا وہ کہتا تھا: السلام علیك یا رسول الله. (بخاری:۳۶۵۵ ابواب المناقب)

ملک الموت کا سلام

حدیث شریف میں ملک الموت کا سلام السلام علیك یا ولی الله وارد ہوا ہے، جس کا مطلب ہے کہ تم پر سلامتی ہو اے اللہ کے دوست قرآن وحدیث کے مطابق یہ سلام، وداعی سلام کہلائے گا، جو روحِ مومن کے واسطے باعثِ تسکین وراحت ہوتا ہے۔ (شعب الإیمان، رقم:۳۹۸)

ایک علمی بات

السلام علیك کی اصل سَلَّمتُ سلاماً علیك ہے، سلاماً مفعول مطلق کے فعل، سَلَّمتُ کو حذف کر دیا، سلاماً علیك رہ گیا، اِس کے بعد دوام واستمرار کے معنی پیدا کرنے کے لیے جملہ فعلیہ کو جملہ اسمیہ سے بدل دیا گیا، سلام علیك ہو گیا، تو گویا اِس کی اصل سلامٌ من قِبَلِي علیك ہے۔ (عربی حاشیہ ہدایۃ النحو:۱۷)

یا نبي سلامٌ علیك یا رسول سلامٌ علیك

اسلام میں تمام عبادات: نماز، روزہ، حج، ذکر، تلاوتِ قرآن سب کے لیے کچھ آداب وشرائط ہیں، جن کی رعایت کی جائے تو عبادت مقبول ہوتی ہے اور اگر اُن حدود وقیود سے ہٹ کر کوئی دوسری صورت اختیار کی جائے تو ثواب کے بجائے گناہ ہوتا ہے، قرآن کریم کی تلاوت ایک بہترین عبادت ہے؛ لیکن یہ تلاوت اگر رکوع وسجدہ میں کی جائے تو یہ تلاوت مسنون طریقہ کے خلاف ہوگی، نماز اسلام کی بنیاد ہے، اُمُّ العبادات ہے، ہر حال میں مطلوب ہے؛ لیکن اگر کوئی فجر کو

عصر میں یا عصر کی چار رکعات کو پانچ رکعات پڑھے تو حرام ہے۔

جسے آں حضرت ﷺ پر درود و سلام کی توفیق مل جائے، اُس کی سعادت اور نیک بختی کے کیا کہنے، یہ ایک افضل عبادت ہونے کے ساتھ ساتھ موجبِ برکات بھی ہے، سوال یہ ہے کہ اِس کے حدود و قیود ہیں یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ دوسری سب عبادات کی طرح، اِس کے بھی آداب وشرائط ہیں، جن کی خلاف ورزی باعثِ ثواب نہیں، باعثِ گناہ ہے۔

انفرادی طور سے درود وسلام کے سلسلے میں کوئی کلام نہیں، گفتگو اُس درود وسلام کے بارے میں ہے جو ایک مخصوص معاشرے میں رائج ہے، یعنی بعض مساجد میں ایسا ہوتا ہے کہ فجر و عصر اور جمعہ کی نماز یا اختتامِ تراویح پر التزام کے ساتھ جماعت بنا کر اور کھڑے ہو کر باآواز بلند يا نبي سلام عليك يا رسول سلام عليك پڑھا جاتا ہے، اِس کے علاوہ گھروں میں بھی کسی مخصوص تقریب میں اِس فعل کو انجام دیا جاتا ہے، نیز اس درود و سلام کے ساتھ مندرجہ ذیل عقائد بھی ہوتے ہیں۔

۱- ایسی مجلس میں نبی کریم ﷺ بنفسِ نفیس تشریف لاتے ہیں؛ کیوں کہ وہ حاضر و ناظر ہیں؛ لہٰذا وہ ہمارا سلام خود سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔

۲- جو لوگ ایسا نہیں کرتے ہیں وہ نبی کریم ﷺ کے سچے پیروکار نہیں ہیں۔

۳- سلام کے الفاظ بالکل مخصوص ہوتے ہیں یعنی يا نبي سلام عليك يا رسول سلام عليك

۴- اس درود و سلام کے لیے قیام ضروری ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طریقہ پر جناب نبی کریم پر درود و سلام پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ ذیل میں ہر ایک کا حکم درج کیا جا رہا ہے۔

کسی نماز کے بعد یا مخصوص تقریب میں اجتماع والتزام کے ساتھ بلند آواز سے درود و سلام پڑھنا نہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے نہ صحابہ و تابعین سے اور نہ ائمہ مجتہدین اور علماء

سلف میں کسی سے؛ اگر یہ عمل اللہ اور رسول ﷺ کے نزدیک محمود و مستحسن ہوتا تو صحابہ و تابعین اور ائمہ دین اِس کو پوری پابندی کے ساتھ کرتے؛ حالاں کہ اُن کی پوری زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا؛ اگر مخصوص نمازوں میں درود و سلام پڑھنا شرعاً مطلوب ہوتا تو اس مسئلے میں اختلاف ہی کیوں ہوتا؟ نماز سے کوئی زمانہ خالی نہیں، نماز کے اوقات، رکعات اور ہر چھوٹی بڑی چیزیں صحیح سند اور تواتر کے ساتھ منقول ہیں، کتابوں میں درج ہیں، اُن میں مذکورہ درود و سلام کا آخر کوئی تذکرہ کیوں نہیں؟ یہ دلیل ہے کہ قرونِ اولیٰ میں اِس کا کوئی ثبوت نہیں تھا، اگر تھا تو جیسے نماز ساری امت کے پاس پہنچی، یہ درود و سلام کا مخصوص طریقہ امت تک کیوں نہیں پہنچا، اور اگر نہیں تھا تو اب اس طریقے پر اصرار کو کیا نام دیا جائے، سنت یا بدعت؟

مذکورہ سلام میں دو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، یا نبی، یا رسول، اردو میں کہیں گے اے نبی، اے رسول، ''یا'' عربی میں اور ''اے'' اردو میں، خطاب کے الفاظ ہیں یعنی کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنا، اب اگر یہ الفاظ اِس عقیدے سے ہوں کہ جس طرح اللہ ہر جگہ موجود اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، کائنات کی ہر آواز کو سنتا اور حرکت کو دیکھتا ہے، اسی طرح (معاذ اللہ) رسول کریم ﷺ بھی موجود اور حاضر و ناظر ہیں، تو یہ خدائی صفات میں شرک کے مترادف ہے، اور نصاریٰ کی طرح رسول کو خدا کا درجہ دینا ہے، اور اگر عقیدہ ہو کہ حضور ﷺ اِس مجلس میں تشریف لاتے ہیں تو اگرچہ بطورِ معجزہ یہ ممکن ہے؛ مگر اِس اِمکان کی شرعی دلیل چاہیے، اتنی بڑی بات قرآن و حدیث میں ہونی چاہیے؛ حالاں کہ نہیں ہے، حضور ﷺ کی محبت میں مغلوب ہو کر اگر ایسا معجزہ اپنی طرف سے ثابت کیا جائے تو اسے محبت نہیں، محبت کا خون کہیں گے، یہ الفاظ دیگر حضور ﷺ پر افتراء ہے، اِس محبت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اللہ کی محبت میں مغرب، تین کے بجائے چار رکعت پڑھ لے، اور سوچے کہ مجھے چار رکعات کا ثواب ملے گا؛ حالاں کہ وہ نماز ہی فاسد ہوگی، اور اگر اس طرح کا کوئی بھی عقیدہ نہیں ہے تب بھی اِس کی وجہ سے غلط عقیدہ کو راہ ملتی ہے، بسا اوقات لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد پیدا ہو جاتے ہیں، اِس لیے ان سے اجتناب ضروری ہے۔

ہاں اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ روضۂ اقدس پر الفاظِ خطاب کے ساتھ السلام علیك یا رسول اللہ وغیرہ پڑھنا سنت سے ثابت ہے وہاں سلام کا نذرانہ پیش کرنا مستحب ہے؛ کیوں کہ براہِ راست حضورﷺ کا سلام سننا اور جواب دینا روایات سے ثابت ہے، حضورﷺ نے ارشاد فرمایا:

جو شخص میری قبر کے پاس درود وسلام پڑھتا ہے، اسے میں خود سنتا ہوں اور جو دور سے درود وسلام بھیجتا ہے وہ فرشتوں کے ذریعہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے(۱) اگر حضورﷺ خود تشریف لاتے ہیں تو پہنچانے کا کیا مطلب ہوگا؟

فتاویٰ رشیدیہ میں ہے:

> جب انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کو علم غیب نہیں تو ''یا رسول اللہ'' کہنا بھی جائز نہ ہوگا؛ اگر یہ عقیدہ کر کے کہے کہ وہ دور سے سنتے ہیں بسببِ علمِ غیب کے تو خود کفر ہے اور جو یہ عقیدہ نہیں تو کفر نہیں؛ مگر کلمہ مشابہ کفر ہے؛ البتہ اگر اس کلمہ کو درود شریف کے ضمن میں کہے اور عقیدہ کرے کہ ملائکہ اس درود کو آپ کے پیش عرض کرتے ہیں تو درست ہے؛ کیوں کہ حدیث شریف میں ہے کہ ملائکہ درود بندۂ مومن کا، آپ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں اور ایک صنف ملائکہ اسی خدمت پر ہیں۔ (رشیدیہ، ص:۱۷۶)

مذکورہ سلام میں قیام ضروری ہوتا ہے، یہ بھی درست نہیں، جس طرح ذکر وتلاوت کھڑے ہو کر، بیٹھ کر؛ بلکہ لیٹ کر: ہر طرح جائز ہے، اِسی طرح درود شریف بھی ہر طرح جائز ہے، اب اگر کوئی کھڑے ہونے کو اپنی طرف سے واجب قرار دے اور دوسرے طریقے کو غلط کہے تو غیر واجب کو واجب قرار دینے کی وجہ سے ناجائز ہوگا، یہاں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں: کہ ہم اِس لیے کھڑے ہوتے

---

(۱) شعب الإیمان:۱۴۸۱

ہیں کہ حضورﷺ تشریف لاتے ہیں، اور آنے والے کے اعزاز واکرام کے لیے کھڑے ہونا مستحب ہے، سوال یہ ہے کہ حضورﷺ کی آمد کی علامت کیا ہے؟ پھر آنے والے کو ایک بار سلام کیا جاتا ہے یا بار بار، پھر یہ سلام، بوقتِ ملاقات والا سلام ہے یا درود وسلام والا، بہر حال کئی الجھنیں ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ حضورﷺ کی آمد کا ثبوت کیا ہے؟ اور مجلس میں قدوم نہیں صرف ذکرِ قدوم ہوتا ہے، دونوں میں فرق ہے، پھر حضورﷺ تو اپنے لیے قیام ناپسند کرتے تھے؛ اِسی لیے عموماً صحابہؓ آپ کی آمد پر کھڑے نہیں ہوتے تھے، دیکھئے ترمذی، رقم الحدیث: ۲۷۵۸

ایک قابلِ غور بات

مفتی تقی عثمانی صاحب کے خطبات میں ہے:

غور کریں درود وسلام ایک تحفہ اور ہدیہ ہے جو حضورﷺ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے اور جب کسی بڑے کو کوئی ہدیہ پیش کیا جاتا ہے تو کیا اُس کو یہ کہا جاتا ہے کہ آپ ہمارے گھر تشریف لائیں، ہم آپ کی خدمت میں تحفہ پیش کریں گے یا اُس کے گھر بھیجا جاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جس شخص کے دل میں اپنے بڑے کی عزت اور احترام ہوگا وہ کبھی اِس بات کو گوارہ نہیں کرے گا کہ وہ بڑے سے کہے (یا مجبور کرے) کہ آپ ہدیہ قبول کرنے کے لیے میرے گھر آئیں؛ بلکہ وہ چاہے گا کہ میں خود جاکر اُس کو ہدیہ پیش کروں یا کسی اپنے نمائندے کو بھیجے گا کہ وہ ادب واحترام کے ساتھ اُس کی خدمت میں یہ ہدیہ پہنچادے؛ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے یہی نظام بنایا ہے کہ کوئی روضہ پر جاکر سلام کا ہدیہ پیش کرے تو حضورﷺ خود وہ ہدیہ قبول فرماتے ہیں اور اگر وہ نہ جاسکا اور اُسے ہدیہ بھیجنا ہے تو نمائندے کے طور پر فرشتے مقرر ہیں۔ (اصلاحی خطبات: ۶/ ۹۵)

حقیقتِ قیامِ مجلس

حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

میں کھڑے ہونے کو فی نفسہ منع نہیں کرتا؛ لیکن یہ بھی تو سمجھو کہ اس کی حقیقت کیا ہے...... یہ ایک وجد ہے اور وجد ہوتا ہے واردات پر، بغیر اس کے وجد کی صورت بنانا نہایت درجہ تصنُّع ہے؛ اگر کوئی شخص وارد کے غلبہ سے مُضطَر ہو جاوے تو اس کو جائز ہے؛ مگر یاد رہے کہ وہ اضطرار کسی خاص مضمون کے ساتھ مخصوص نہ ہوگا۔

قیام کی ابتداء: ابتداء اِس کی اِس طرح ہوئی کہ ایک شخص مضطر ہو کر کھڑا ہو گیا، اُس کی حالت کی تائید میں اور اُس حالت مستحسنہ کو باقی رکھنے کے واسطے حاضرینِ مجلس بھی کھڑے ہو گئے اور اِس کو علامہ غزالیؒ نے لکھا ہے: کہ اگر ایک شخص وجد سے کھڑا ہو جائے تو اُس کے ساتھ سب کو کھڑا ہونا چاہیے؛ کیوں کہ اِس میں تانیس اور اُس کی حالت کا اِبقا ہے؛ لیکن مجلس بھر میں اول جو شخص کھڑا ہوگا، اُس کو ہرگز جائز نہیں کہ وہ مکر کرے، غرض قیام کی ابتداء یوں ہوئی پھر بلا وجہ اِس کو رسم کر لیا اور ہم اِس رسم ہی کو منع کرتے ہیں، حالت کو منع نہیں کرتے؛ کیوں کہ حالت تو غیر اختیاری ہے، مگر ایسے کتنے ہیں؟ آپ سو پچاس مولویوں کو دیکھیے تو وہاں ایک بھی ایسا نہ ملے گا اور اگر ہوں گے بھی تو بمشکل ایک دو، باقی سب خشک۔

بے بنیاد اعتقاد

میں توسع کر کے کہتا ہوں کہ اگر یہ فعل صرف رسم کے مرتبہ میں رہتا تب بھی خیر ممکن تھا کہ اس پر خاموشی کی جاتی؛ مگر غضب یہ ہوا کہ بعض

لوگ سمجھتے ہیں کہ خود حضور ﷺ تشریف لاتے ہیں؛ حالاں کہ یہ بے دلیل ہے؛ اگر دلیل میں کسی کا کشف پیش کیا جاوے تو اول ممکن ہے کہ کشف صحیح نہ ہو، دوسرے اگر صحیح بھی ہو تو اِس کا خلاصہ یہ ہوگا کہ کسی مجلس خاص میں کسی صاحبِ کشف کو ایسا مکشوف ہو تو اس سے دوام پر کیوں کر استدلال ہوسکتا ہے، اور یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ جب ایسا ہوگا تو ایسا بھی ہوگا............لزوم اور دوام کے لیے تو کسی مستقل دلیل کی ضرورت ہے۔(وإذ لیس فلیس) تو یہ اعتقاد بے بنیاد ہوا جس کی اصلاح واجب ہوئی۔(خطبات حکیم الامت:۱۲۶/۵)

ایک مرتبہ کچھ لوگ بآواز بلند صلاۃ وسلام پڑھ رہے تھے تو ابن مسعودؓ نے ان کو مسجد سے باہر نکال دیا تھا، شامی میں بحوالہ بزازیہ منقول ہے: صحيح عن ابن مسعودؓ أنه أخرج جماعة من المسجد يهللون ويصلون على النبي ﷺ جهراً وقال لهم: ما أراكم إلا مبتدعين. (ردالمحتار:۳۹۸/۶، فصل فی البیع)

سلام کے الفاظ جو مخصوص ہوتے ہیں، اِس کا ثبوت بھی نہیں ہے؛ بلکہ درود وسلام کے بارے میں آتا ہے کہ حتی الامکان جو الفاظ منقول ہیں انہیں کو پڑھا جائے، اپنی طرف سے گو اجازت ہے، مگر پسندیدہ نہیں۔

الغرض نفسِ درود وسلام ایک بڑی عبادت ہے؛ لیکن مروّجہ درود وسلام میں جو باتیں شامل ہوگئی ہیں، اُس کی وجہ سے اِس کو سنت نہیں کہا جائے گا، اِس کا ترک ضروری ہے۔

مزید تفصیل کے لیے جواہر الفقہ ۲۱۲/۱، فتاویٰ رشیدیہ/۲۳۲، امداد الفتاوی ۲۷۴/۴ کا مطالعہ کریں۔

''السلام'' اسماءِ حسنیٰ کا حصہ ہے

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ننانوے-ایک کم سو- نام ہیں، جو اِن کو

یاد کرے گا جنت میں جائے گا۔ (ترمذی، رقم الحدیث: ۳۵۲۸، ابواب الدعوات)

سورہ اعراف آیت نمبر: ۱۸۰ میں ہے:

وللہ الأسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا اور اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے نام ہیں، پس اُس کو اُن ناموں سے پکارو یعنی موسوم کرو، ان کے ذریعہ دعا کرو؛ کیوں کہ یہ صفاتی اسماءِ حسنیٰ، اللہ تعالیٰ کے کمالات کے عنوانات اور ان کی معرفت کے دروازے ہیں؛ پس اللہ تعالیٰ کے ذکر کی ایک بڑی جامع شکل یہ بھی ہے کہ بندہ عظمت ومحبت کے ساتھ اُن پاک ناموں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرے، اُن کو اپنا وظیفہ بنائے، اور اُن ناموں کا ورد کر کے دعا مانگے، اِن شاء اللہ اس کی دعا قبول ہوگی اور آخرت میں جنت نشیں ہوگا۔

(تحفۃ الالمعی: ۱۶۹/۸)

رحمۃ اللہ الواسعۃ میں ہے:

اور اللہ کے ناموں میں برکت اس وجہ سے ہے کہ مخلوقات کی ہر نوع میں کچھ چیزیں اللہ کی تجلیات کا مورد ہوتی ہیں، اِس وجہ سے وہ متبرک ہو جاتی ہیں، جیسے انسانوں میں انبیاء اور زمین میں کعبہ؛ اِسی طرح الفاظ کی دنیا میں اللہ تعالیٰ کے وہ نام بابرکت ہیں جو حضرات انبیاء کے ذریعہ نازل کئے گئے ہیں؛ اِس لیے جب بندہ اُن ناموں کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اللہ کی رحمت کو قریب پاتا ہے۔

(رحمۃ اللہ: ۱۶۰/۴)

"السلام" اللہ کے ننانوے اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک اہم نام ہے، جس کو اسلامی تحیہ کا جز قرار دیا گیا ہے؛ تا کہ اس کی خوب اشاعت ہو سکے اور بندوں کا فائدہ ہو، اِس نام کی تحقیق اور معانی

شروع کتاب میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، ذیل میں مزید وضاحت پیش کی جارہی ہے۔

مرقاۃ المفاتیح اور مظاہر حق جدید میں ہے:

السلام ''بے عیب وسلامت'' (۱) اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو ہر برے کام اور ہر برے اخلاق سے بے عیب بنائے، قشیریؒ نے کہا ہے: کہ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ قلب سلیم کے ساتھ اپنے مولیٰ کی طرف رجوع کرے، بعض حضرات نے اس سے بندہ کا نصیب یہ بتایا ہے کہ ''مسلمان اُس کی زبان اور اُس کے ہاتھ سے محفوظ وسلامت رہیں؛ بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ بہت زیادہ شفقت کا معاملہ کرے، جب وہ کسی ایسے مسلمان کو دیکھے، جو اُس سے عمر میں بڑا ہو تو یہ کہے کہ: یہ مجھ سے بہتر ہے؛ کیوں کہ اِس نے میری نسبت زیادہ عبادت اور طاعت کی ہے اور ایمان ومعرفت میں مجھ پر سبقت رکھتا ہے، اور اگر کسی ایسے شخص کو دیکھے جو عمر میں اُس سے چھوٹا ہو تو بھی یہ کہے: یہ مجھ سے بہتر ہے؛ کیوں کہ اُس نے میری بہ نسبت گناہ کم کیے ہیں، نیز اگر کسی مسلمان بھائی سے کوئی قصور ہو جائے اور وہ معذرت کرے تو اُس کی معذرت قبول کر کے، اُس کا قصور معاف کر دیا جائے۔

(مرقاۃ المفاتیح: ۷۷/۵)

خاصیت: اگر کوئی شخص اِس اسمِ مبارک کو کسی بیمار پر ایک سو گیارہ

---

(۱) القدوس السلام: القدوس بہت پاک، بے عیب، قدُس (ک) قُدْساً پاک ہونا، بے داغ ہونا......السلام: سالم، محفوظ، عیوب ونقائص سے خالی، سلِمَ (س) من الآفات: آفات سے محفوظ رہنا، بچا رہنا......اللہ تعالیٰ میں نہ ماضی میں کوئی عیب تھا، یہ قدوس کا حاصل ہے، اور نہ آئندہ اُن میں عیب کا احتمال ہے، یہ سلام کا حاصل ہے۔ القدوس فیما لم یزل و السلام فیما لا یزال، مرقاۃ ۷۶/۵.

مرتبہ پڑھے تو اِن شاء اللہ حق تعالیٰ اُسے صحت وشفا عطا فرمائے گا
اور اگر کوئی شخص اِس کو برابر پڑھتا رہے تو خوف سے نڈر رہوگا۔

(مظاہر حق جدید:۳/۱۱۸)

ہم تمام مسلمانوں کو اسماء حسنیٰ یاد کرنا چاہیے، اور بوقتِ ذکر اور بوقتِ سلام، سلام کے مفہوم ومعانی کا استحضار رکھنا چاہیے، اللہ توفیق دے۔

دوسلام مُفسِدِ صلاۃ ہیں

السلام علیکم کہنا کارِثواب ہے؛ لیکن محل میں ہو تب، دوسلام ایسے ہیں کہ اگر کسی نے السلام علیکم کہہ دیا تو نماز فاسد ہوجاتی ہے، ایک سلام تحیہ(۱) دوسرے قعدہ اخیرہ سے پہلے پہلے جان بوجھ کر سلام تحلیل؛ لہٰذا اگر کسی نے نماز پڑھتے ہوئے کسی کو سلام کر دیا تو نماز فاسد ہوجائے گی اور اگر کسی نے قعدہ اخیرہ سے پہلے پہلے نماز سے نکلنے کے لیے قصداً وعمداً السلام علیکم کہہ دیا تو نماز فاسد ہوجائے گی، صاحبِ درمختار نے سلام فی الصلاۃ کے مفسد اور غیر مفسد ہونے پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے:

فسلام التحية مفسد مطلقاً وسلام التحليل إن عمداً.

(الدر مع الرد، کتاب الصلاۃ باب ما یفسد الصلاۃ:۱/۶۱۴، نعمانیہ)

لہٰذا اگر قعدہ اخیرہ سے قبل کوئی السلام علیکم بھول سے کہہ دے یا امام کو کسی غلطی پر متنبہ کرتے ہوئے کسی نے السلام علیکم کہہ دیا تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ (فتاویٰ ریاض العلوم:۲/۵۰۷)

سلام، مصافحہ اور معانقہ — خواب اور اُس کی تعبیریں

مومن کا خواب مبشراتِ الٰہی اور نبوت کا ایک جز ہوتا ہے؛ چناں وحی اور نبوت کا سلسلہ

---

(۱) سلام تحیہ، مفسدِ صلاۃ اُس وقت ہے؛ جبکہ یہ سلام کسی کو مخاطب بنا کر کیا گیا ہو؛ اگر مخاطب سامنے نہیں ہے اور نہ اسے کچھ پتہ ہے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، تفصیل کے لیے دیکھیے (کیا نمازی اشارے سے سلام کا جواب دے سکتا ہے، ص:۱۶۶)

ختم ہونے کے باوجود سچے خواب کا سلسلہ جاری ہے جن سے آئندہ ہونے والی باتوں کا علم ہوسکتا ہے، وہ خواب کبھی واقع کے مطابق ہوتا ہے اور کبھی نہیں اور قوتِ خیالیہ کی راہ سے کچھ اچھی اور بری صورتیں دکھائی دیتی ہیں، ذیل میں سلام ومصافحہ اور معانقہ کے تعلق سے کچھ خواب اور اُن کی تعبیریں نقل کی جارہی ہیں، جو تفسیر الأحلام(۱) نامی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

(۱) اگر کوئی شخص اپنے کسی دشمن کو خواب میں دیکھے کہ وہ اُس سے مصافحہ یا معانقہ کررہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ دونوں کے درمیان سے عداوت ودشمنی ختم ہوگی اور الفت ومحبت میں اضافہ ہوگا۔

(۲) اگر کوئی شخص خواب میں دیکھے کہ اُس کا دشمن اُس سے مصافحہ کررہا ہے تو یہ دشمن کی طرف سے صلح کی علامت ہے۔

(۳) اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ وہ ایسے شخص کو سلام کررہا ہے کہ اُس کے اور سلام کرنے والے کے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلَّم علیہ کو سلام کرنے والے کی طرف سے راحت وسکون پہنچے گا اور اگر دونوں کے درمیان دشمنی ہے تو گویا سلام کرنے والا اپنے دشمن کی سازشوں سے محفوظ رہے گا۔

(۴) اگر کوئی شخص خواب میں دیکھے کہ وہ غیر شناسا بوڑھے شخص کو سلام کررہا ہے تو یہ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے عذاب سے محفوظ رہنے کی دلیل ہے۔

(۵) اور اگر خواب میں یہ دیکھے کہ وہ کسی جان پہچان کے بوڑھے شخص کو سلام کررہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اُس کی شادی کسی حسین وجمیل عورت سے ہوگی، اور اُسے مختلف قسم کے میوہ جات حاصل ہوں گے، لقولہ تعالیٰ: لهم فيها فاكهة ولهم ما يدعون، سلام قولا من رب رحيم.

---

(۱) یہ کتاب مشہور تابعی محمد بن سیرینؒ (م:۱۱۰ھ) کی جانب منسوب ہے، لیکن نسبت کی صحت میں شبہ ہے، جو تعبیریں نقل کی جارہی ہیں اُن کا پس منظر کیا ہے، دلائل کیا ہیں، کتاب میں مذکور نہیں ہیں اور وہ تعبیریں بالکل صحیح بھی ہوں، ضروری نہیں، مولف۔

(۶) اگر کسی کو کسی نامعلوم نوجوان نے خواب میں سلام کیا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ شخص اپنے دشمنوں کے شرور وفتن سے محفوظ رہے گا۔

(۷) اگر کسی نے کسی کے گھر اپنی شادی کا پیغام دیا اور خواب میں دیکھا کہ وہ اُس گھر میں رہنے والوں کو سلام کر رہا ہے اور گھر والوں نے سلام کا جواب بھی دیا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اُس گھر میں اس کی شادی ہوسکتی ہے اور اگر سلام کا جواب نہیں دیا تو شادی میں رکاوٹ ہوسکتی ہے۔

(۸) اگر دو شخصوں کے درمیان تجارتی معاملہ ہو اور سلام کرنے والے کو جواب ملا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی آپسی تجارت مستحکم ہوگی اور اگر جواب نہیں دیا تو مطلب یہ ہے کہ تجارتی تعلقات بگڑنے والے ہیں۔

(۹) اگر کسی نے خواب میں یہ دیکھا کہ وہ کسی مرے ہوئے یا باحیات شخص سے مصافحہ یا معانقہ کر رہا ہے تو یہ درازیٔ عمر کی دلیل ہے۔

(۱۰) اگر کوئی خواب میں دیکھے کہ وہ عورت سے معانقہ کر رہا ہے تو یہ اس کے دنیا سے دل لگانے کی بات ہے اور آخرت سے دور ہونے کی علامت ہے اور خواب میں مَردوں سے معانقہ کرنا یہ مساعدت کی دلیل ہے۔ (تفسیر الأحلام، الباب السابع فی تاویل السلام والمصافحۃ، ۱/۹۷-۲/۳۰۶)

آٹھواں باب

ولَـفْـظُ السَّلَامِ فِي المَوَاضِعِ كُـلِّهَا: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَوْ سَلَامٌ عَـلَيْكُمْ بِالتَنْوِيْنِ وَبِدُوْنِ هٰذَيْنِ كَـمَـا يَـقُولُ الْجُهّالُ، لَا يَكُونُ سَلَامـاً؛ لِمُخَالَفَتِهِ السُّنَّةَ الَّتِيْ جَاءَ تْ بِالتَّرْكِيْبِ الْعَرَبِيِّ.

(رد المحتار: ٩/٥٩٦)

سلام کی غلطیاں

سلام کی غلطیاں

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اور ہر چیز شریعت کی طرف سے طے شدہ ہے، اپنی طرف سے یا ماحول ومعاشرہ سے متاثر ہوکر یا غلط فہمی یا کم علمی کی وجہ سے شریعت میں نہ کمی زیادتی جائز ہے اور نہ غلط طریقہ استعمال روا ہے؛ تاہم ہر چیز میں کمیوں اور کوتاہیوں کے ساتھ غلطیوں کا پایا جانا ایک یقینی امر ہے، سلام بھی اِس سے مستثنیٰ نہیں، ذیل میں سلام میں پائی جانے والی اَغلاط کی نشاں دہی کی گئی ہے؛ تاکہ اُن غلطیوں کو سدھارا جاسکے۔

مسئلہ: ''بعض لوگ السلام علیکم کے بجائے خط میں سلام مسنون لکھ دیتے ہیں سو'' اگر خط میں کوئی لکھے کہ بعد سلام مسنون عرض ہے تو چونکہ شریعت میں یہ صیغہ سلام کا نہیں بلکہ السلام علیکم ہے؛ اس لیے اس صیغۂ سلام مسنون کا جواب دینا واجب نہ ہوگا؛ اگرچہ سلام مسنون لکھنا جائز ہے۔

(الإفاضات: ۷/۱۹۹)

فائدہ: اس سے ثابت ہوا کہ بعض اکابر کے خطوط میں جو بعد سلام مسنون لکھا ہے وہ اس لیے ہے کہ انہوں نے مخاطب پر جواب واجب کرنے سے احتیاط فرمائی ہے، جیسے چھینکنے پر الحمدللہ آہستہ کہنا یا آیت سجدہ کو کھلی ہوئی آواز سے پڑھنے کی تعلیم فرمائی ہے؛ تاکہ دوسروں پر واجب نہ ہو۔

مسئلہ: سلام کا صیغہ حدیث شریف میں ہے السلام علیکم یا اس کے قریب قریب الفاظ آئے ہیں پس اور کوئی لفظ آداب، بندگی، کورنش وغیرہ کہنا یہ سب بدعت سیئہ ہے جس سے بچنا ضروری ہے خیر! اگر کوئی سلام کے لفظ سے بہت ہی برا مانے تو اُس کو حضرت سلامت، یا تسلیم یا تسلیمات کہنے تک گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

مسئلہ: سلام کے وقت جو اکثر لوگوں کی عادت ہاتھ اٹھانے کی ہے یہ عادت میرے نزدیک ضروری الترک ہے؛ کیوں کہ سلام کے ادا ہونے میں تو ہاتھ اٹھانے کو کوئی دخل نہیں، بس ہاتھ اٹھانا تعظیم کے لیے ہے جو کہ درست نہیں۔

مسئلہ: بعض لوگ سلام کے جواب میں صرف سر ہلا دینا یا ہاتھ صرف اٹھا دینا کافی سمجھتے ہیں، اِس کے متعلق جاننا چاہیے کہ قرآن مجید میں ہے کہ جب تم کو کوئی سلام کرے تو اس سے اچھا جواب دو یا ویسا ہی لوٹا دو، اِس سے معلوم ہوا کہ سلام کے جواب میں صرف سر ہلا دینا یا ہاتھ اٹھا دینا کافی نہیں، اِس طرح جواب نہیں ہوتا؛ بلکہ زبان سے جواب دینا ذمہ میں رہ جاتا ہے۔

مسئلہ: بعض عورتیں سلام، شریعت کے قاعدہ کے بالکل خلاف کرتی ہیں، بعض تو سلام کو صرف سام کہتی ہیں چار حروف بھی پورے اُن کی زبان سے نہیں نکلتے: حالاں کہ عورتوں میں السلام علیکم کہنے کا؛ بلکہ مصافحہ کرنے کا رواج ہونا اور اِن دونوں باتوں کو پھیلانا چاہیے، دونوں باتیں ثواب کی ہیں۔

مسئلہ: اور اِس سے بھی زیادہ تعجب یہ ہے کہ جواب دینے والی، سارے کنبہ کا نام گنوا دیتی ہے کہ بھائی جیتا رہے اور بیٹا زندہ رہے اور شوہر خوش رہے وغیرہ؛ لیکن ایک لفظ وعلیکم السلام نہ کہا جائیگا (حالانکہ وعلیکم السلام کہنا سنت ہے)

مسئلہ: اکثر جگہ عورتوں میں (پہلے سلام کا آپس میں رواج تھا ہی نہیں) اب بھی اِس قسم کا رواج ہے کہ بجائے زبان سے سلام کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا، بس اِسی کو کافی سمجھ لیا اُدھر سے جواب ملا جیتی رہو، بچے جیتے رہیں، ٹھنڈی سہاگن رہو، اور جو ذرا لکھی پڑھی ہوئیں تو صرف لفظ سلام کہہ دیا؛ مگر چند روز سے یہاں بحمد اللہ اِس قصبہ (تھانہ بھون) میں عورتوں میں بھی آپس میں السلام علیکم کا رواج ہو گیا ہے۔

مسئلہ: سلام میں یہ بے احتیاطیاں کی جاتی ہیں، یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ وقت سلام کا نہیں ذکر،

قرآن، خطبہ، اذان وغیرہ سب میں آتے جاتے سلام کرتے ہیں، مثل مشہور ہے کہ ''او چھے نے سیکھا سلام، صبح دیکھے نہ شام'' حالانکہ عبادت کے وقت خواہ وہ ذکر ہو یا قرآن یا نماز، اِن وقتوں میں سلام کرنا منع ہے، دوسرے جو شخص گناہ میں مشغول ہو اُس کو سلام نہ کرے؛ کیوں کہ گنہ گار کی تعظیم جائز نہیں اور سلام کرنا ایک قسم کی تعظیم ہے؛ اس لیے اس کو سلام نہ کرے، تیسرے پیشاب پاخانہ کی حالت میں اور کھانے پینے کی حالت میں بھی سلام نہ کرنا چاہیے۔ (معاشرت کے حقوق)

خلاصہ یہ ہے کہ فقہاء نے تین موقعوں میں سلام کرنا منع کیا ہے۔ (۱) جب کوئی طاعت میں مشغول ہو۔ (۲) اسی طرح جب کوئی معصیت میں مشغول ہو۔ (۳) اور تیسرا موقع یہ ہے کہ حاجت بشریہ میں مشغول ہو۔

مسئلہ: بعض لوگ جوان عورتوں کو سلام کرتے یا اُن کے سلام کا جواب دیتے ہیں؛ حالاں کہ فقہاء نے نامحرم جوان عورت کے سلام کرنے یا اُس کا سلام لینے (یعنی سلام کا جواب دینے) سے منع کیا ہے۔

مسئلہ: سلام کے لیے بعض جگہ ''آداب و تسلیمات'' وغیرہ کہنے کا رواج ہے یہ غلط اور خلاف شریعت ہے۔

لطیفہ: ایک شخص نے ایسے موقعہ پر اصلاح کی خاطر طنزِ ملیح کے طور پر لطیفہ کیا کہ ایک مجلس میں جا کر کہا کہ میرا بھی سجدہ قبول ہو، لوگوں نے کہا کہ یہ کیا واہیات ہے؟ کہا کہ حضور ہر آنے والا شخص مختلف الفاظ سے سلام کر رہا ہے، کوئی آداب قبول ہو کہتا ہے، کوئی بندگی، کوئی کورنشات، کوئی اور کچھ؛ حتی کہ سب صیغے (الفاظ) ختم ہو گئے میں نے سوچا کہ اب میں کیا کہوں، تو میرے لیے سجدہ کے سوا کچھ باقی نہ تھا؛ اِس لیے میں نے اِس کو اختیار کیا، خلاصہ یہ کہ سلام میں خلافِ شرع الفاظ استعمال نہ کرنا چاہیے۔ (وعظ الارتیاب)

مسئلہ: بعض نے سلام کے بارے میں ایک نہایت سخت غلطی کی کہ ایک طالب علم نے اپنے والد ماجد کو سلام کیا، تو وہ کہنے لگے کہ بیٹا یہ بے تمیزی ہے آداب کہا کرو، صاحبو! یاد رکھو کہ سلام کو بے تمیزی کہنا حضور ﷺ کی سنت کو بے تمیزی کہنا ہے، حضور ﷺ کی سنت کو بے تمیزی کہنے والا کافر ہے؛

اگر توبہ نہ کرے تو حکومتِ اسلامیہ کو اُس کا قتل کرنا واجب ہے۔

(تسہیل المواعظ:۲/۳۲۹) (اغلاط العوام،ص:۱۹۳-۱۹۶)

سوال: ہمارے یہاں سلام کا رواج اِس طرح ہے کہ چھوٹے بڑوں کے قدم پر ہاتھ پھیرتے ہیں، آنکھوں سے لگاتے ہیں، آیا اس قسم کا سلام عندالشرع جائز ہے یا نہیں؟

جواب: سلام کا یہ طریقہ خلافِ سنت وخلافِ اسلام ہے، ہریجنوں کا طریقہ ہے، اس کو ترک کرنا لازم ہے۔ (محمودیہ:۹/۷۰)

مسئلہ: بعض جُہّال سلام چھوڑ کر اللہ اللہ یا واللہ کہتے ہیں، تو فی نفسہ یہ الفاظ محبوب ومحمود ہیں؛ لیکن ترکِ سنت سے عاصی واختراعِ جدید سے بدعتی اور استعمالِ بے محل سے بے ادب ہوگا، دیکھو کافر صرف اللہ کہنے سے مومن نہیں ہوتا۔ (رحیمیہ:۱۰/۱۳۲)

غلط رواج: حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے تقریبوں میں عورتوں کے جانے اور جمع ہونے'' کے مفاسد اور خرابیوں کی تعداد ۳۲ شمار کرائی ہے، ان میں سے پندرہواں گناہ یہ لکھا ہے:

> اب گھر میں پہنچیں تو وہاں کی بیبیوں کو سلام کیا خوب ہوا، بعضوں نے تو زبان کو تکلیف ہی نہیں دی، فقط ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا بس سلام ہوگیا، اِس طرح سلام کرنے کی حدیث میں ممانعت آئی ہے، بعض نے سلام کا لفظ کہا بھی تو صرف سلام یہ بھی سنت کے خلاف ہے السلام علیکم کہنا چاہیے، اب جواب ملاحظہ فرمائیے، ٹھنڈی رہو، سہاگن رہو، عمر دراز، دودھوں نہاؤ، پھولو پھلو، بھائی جیے، میاں جیئے، بچہ جیئے، غرض کنبہ بھر کے نام گنانا آسان اور وعلیکم السلام جس کے اندر سب دعائیں آجاتی ہیں، مشکل، یہ ہمیشہ ہمیشہ سنت کی مخالفت کرنا، پندرھواں گناہ ہوا۔
>
> (اشاعتی بہشتی زیور۶/۳۱۰)

مسئلہ: بعض بڑی بوڑھیوں کی؛ بلکہ بعض جوانوں کی بھی عادت ہے کہ منت مانتی ہیں کہ اگر میری فلاں مراد پوری ہوجائے تو مسجد میں جا کر سلام کروں یا مسجد کا طاق بھروں، پھر مسجد میں جا کر اپنی منت پوری کرتی ہیں؛ سو یاد رکھو عورتوں کو مسجد میں جانا اچھا نہیں، نہ جوان کو نہ بوڑھی کو، کچھ نہ کچھ بے پردگی ضرور ہوتی ہے، اللہ میاں کا سلام یہی ہے کہ کچھ نفلیں پڑھ لو، دل سے زبان سے شکر ادا کرلو، سو یہ گھر میں بھی ممکن ہے اور طاق بھرنا یہی ہے کہ جو توفیق ہو محتاجوں کو بانٹ دو، سو یہ بھی گھر میں ہوسکتا ہے۔ (بہشتی زیور: ۲۹۲/۵)

غلط رسم: (جب بچہ پیدا ہوتا ہے) نائن گود میں کچھ اناج ڈال کر سارے کنُبے میں بچے کا سلام کہنے جاتی ہے، اور وہاں سب عورتیں اس کو اناج دیتی ہیں، اِس کو چھوڑنا چاہیے۔ (بہشتی زیور: ۳۰۲/۶)

مسئلہ: عورتوں میں السلام علیکم کہنے کا اور مصافحہ کرنے کا رواج نہیں ہے، یہ دونوں باتیں ثواب کی ہیں، اِن کو پھیلانا چاہیے۔ (ایضاً)

نماز کے بعد سلام: بعض علاقوں میں لوگ نماز سے فراغت کے بعد ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، یہ مسنون سلام نہیں، اِس رواج کو ترک کرنا چاہیے، کتاب الفتاوی میں ہے:

سلام کا نماز سے کوئی تعلق نہیں، سلام کا تعلق ملاقات سے ہے، ابتداء ملاقات میں سلام کرنا چاہیے، جن لوگوں سے پہلے ہی ملاقات ہوئی، ساتھ ساتھ نماز ادا کی؛ اُس جگہ وہ لوگ موجود ہیں، تو نماز کے بعد خاص طور پر انہیں دوبارہ سلام کرنے کے کوئی معنی نہیں، رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اِس موقع پر

سلام ثابت نہیں۔ (کتاب الفتاویٰ:۱/۴۰۲)

دو لہے کا سلام کرنا

بعض جگہوں پر دولہا ایجاب وقبول کے بعد، اُسی مجلس میں لوگوں کو کھڑے ہو کر سلام کرتا ہے، وہ بھی چاروں طرف الگ الگ، اِس کی کوئی اصل نہیں۔ فتاویٰ ریاض العلوم میں ہے:

شریعت مطہرہ میں سلام کا موقع، وقتِ ملاقات ہے نہ کہ بعد نکاح؛
لہٰذا اِس موقع پر سلام کرنا محض رسم اور بے محل ہے۔

(فتاوی ریاض العلوم:۱/۳۸۴)

سلامی کا رواج

بعض علاقوں میں رخصتی سے کچھ پہلے دولہا کو لڑکی کے گھر کے آنگن یا صحن میں بیٹھایا جاتا ہے؛ جہاں سالیاں اور خاندان یا محلے کی دیگر لڑکیاں اور عورتیں ہوتی ہیں، اور اکثر غیر محرم ہوتی ہیں، وہ سب باری باری دولہا کو سلام کرتی ہیں، رومال اور پیسے دیتی ہیں، انگوٹھیاں اور پیسوں کا ہار پہنایا جاتا ہے، دودھ مالیدہ کھلاتی ہیں، یہ سب ناجائز اور سخت گناہ کی بات ہے، بے پردگی کا گناہ الگ، پھر یہ محض رسم ہے، قرآن وحدیث میں کہیں نہیں؛ بلکہ ہندوانہ طریقہ ہے مسلمانوں کو ترک کرنا ضروری ہے۔ (مولف)

تحفہ ملنے پر سلام کرنا

بعض مہذب گھرانوں میں دستور ہے کہ کسی جانب سے اگر تحفہ ملے تو فوراً اٹھ کر سلام کرتے ہیں، یہ بھی غیر اسلامی سلام ہے۔ (پرہیز کرنا چاہیے) (جامع الفتاویٰ،۳/۳۱۵)

بندگی اور آداب کا حکم

سلام کا صیغہ حدیث شریف میں ہے السلام علیکم یا اس کے قریب قریب الفاظ

آئے ہیں، آداب، بندگی، کورنش یہ سب بدعت سیئہ ہے۔(فروع الایمان دراصلاحی نصاب:۴۲۱)

غلطی: بعض لوگ کہتے ہیں کہ سجدۂ تلاوت کر کے دونوں طرف سلام پھیرے یہ بھی محض غلط ہے۔(اغلاط العوام دراصلاحی نصاب/۵۰۰)

مسئلہ: لوگوں میں ایک غلط طریقہ یہ رائج ہے کہ اگر اُن سے کہا جائے: فلاں سے سلام کہنا تو پہلے وہی جواب دے دیتا ہے، پھر جس کو سلام کہلوایا ہے اُس کو سلام پہنچاتا ہے، یہ غلط طریقہ ہے، جس کے ذریعہ سلام بھیجا جارہا ہے، اُس کے ذمہ جواب نہیں، اُس کے ذمہ صرف سلام پہنچانا ہے، پھر وہ جب سلام پہنچائے تو جس کو سلام پہنچایا ہے وہ جواب دے گا اور جواب میں سلام پہنچانے والے کو بھی شامل کرے گا۔(تحفۃ الالمعی:۶/۴۷)

نئے چاند کو دیکھ کر سلام کرنا

نیا چاند دیکھ کر سلام کرنا ثابت نہیں، نئے چاند دیکھنے پر جو دعائیں منقول ہیں، اُن میں کہیں سلام کرنے کا تذکرہ نہیں۔(محمودیہ:۱۹/۸۸)

شام کو لائٹ یا چراغ جلنے پر سلام کرنا

شام کو چراغ جلے یا لائٹ جلائی جائے تو اُس وقت سلام کرنا درست نہیں، بعض علاقوں میں ایسا رواج ہے، روشنی کا آنا یقیناً ایک بڑی نعمت ہے؛ لیکن ایسے وقت میں سلام کرنا ثابت نہیں ہے، مشرکانہ طریقہ ہے، اِس سے بچنا چاہیے۔(مولف)

مسجد، عیدگاہ اور دینی مدارس کو سلام کرنا

مسجد کو، عیدگاہ کو اور ایسے ہی دینی مدارس کو دیکھ کر سلام کرنا ثابت نہیں۔

(دارالافتاء دارالعلوم دیوبند:۱۰۵۵۶)

سلام کے لیے سر پر ہاتھ رکھنا

سوال: بعض جگہ زبان سے سلام کرنے کو سُوءِ ادبی سمجھ کر سر پر ہاتھ رکھنے اور جھک کر آداب بجالانے ہی کو سلام تصور کرتے ہیں، ایسی صورت میں سنت ادا ہوتی یا نہیں؟

جواب: سنت ادا نہیں ہوتی؛ البتہ زبان سے لفظ سلام کے ساتھ ہاتھ اٹھانے یا سر اور سینہ پر رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (فتاویٰ مولانا عبدالحی:۴۵۶)

''جیتے رہو''، ''خوش رہو'' کا حکم

ہمارے ہندوستان کے بعض علاقوں میں جب بوڑھی عورتوں کو سلام کیا جاتا ہے تو وہ جواب میں "وعلیکم السلام" کی جگہ کہتی ہیں جیتے رہو، خوش رہو، اللہ سلامت رکھے وغیرہ، یہ سب الفاظ دعا تو ہیں؛ لیکن سلامِ مسنون کے جواب کے لیے کافی نہیں، جان کار لوگوں کو بتانا چاہیے؛ ہاں جواب مسنون کے بعد یہ سب دعائیہ جملے استعمال کر سکتے ہیں۔ (مولف)

غلط رواج: بعض علاقوں میں جب کوئی رشتہ دار اور عزیز کسی کے گھر میں آتا ہے بوقت ملاقات وہ سب کو الگ الگ سلام کرتا ہے؛ حالاں کہ وہ لوگ ایک ہی مجلس میں ہوتے ہیں، ایسے مواقع میں سب کو الگ الگ سلام کرنا ضروری نہیں ہے، علامہ شامیؒ نے تو ایک ہی مجلس میں دوبارہ کوئی سلام کردے تو لکھا ہے کہ جواب دینا واجب نہیں، یہاں تو خالہ کو الگ سلام، بہن کو الگ سلام، خالو کو الگ سلام، یہ رواج قابلِ ترک ہے، ایک سلام کافی ہے؛ ہاں اگر سب سے الگ الگ مجلسوں میں ملاقات ہو تو الگ الگ سلام کرے۔

وإن سلَّم ثانيا في مجلس واحد، لا يجب رد الثاني. (شامی:۵۹۷/۹)

نواں باب

مَا مِنْ مُسْلِمَيْنِ يَلْتَقِيَانِ، فَيَتَصَافَحَانِ
إِلاَّ غُفِرَ لَهُمَا قَبْلَ أَنْ يَّتَفَرَّقَا

(سنن أبي داؤد، رقم: ۵۲۱۲)

تکملۂ سلام — مصافحہ اور فضائل ومسائل

(پہلی فصل)

مصافحہ اور اُس کا ثبوت

مصافحہ کو سلام کا تکملہ کہا گیا ہے، اِس سے گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے،مصافحہ ایک ایسا دانہ ہے،جس کے بیج سے محبت و پیار کے پھول کھلتے ہیں،اسلام ایک جامع مذہب ہے، جو زندگی کے تمام شعبوں میں انسان؛ بالخصوص مسلمانوں کی صحیح اور مثبت رہبری کرتا ہے،عقائد سے عبادات تک، سیاست سے معاملات تک اور معاشرت سے اخلاقیات تک، اِس کی روشن تعلیمات کا دائرہ وسیع ہے: بالخصوص الفت ومحبت، راحت وسکون اور اتحاد و اتفاق کی جتنی بنیادیں ہوسکتی ہیں،جن پر ایک صالح ، پرسکون اور اسلامی معاشرے کا قیام عمل میں آسکتا ہے،اُن سب تعلیمات واخلاقیات پر اسلام نے روشنی ڈالی ہے، اس کی تعلیم دی ہے، رغبت دلائی ہے اور رو بہ عمل لانے کی تاکید کی ہے،اس کے بالمقابل ہر وہ کام جس سے نفرت وعداوت، اختلاف و ہنگامہ اور انتشار وخلفشار میں اضافہ ہوتا ہے،اسلام نے اُس سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔

سلام کے بعد مصافحہ،من جملہ اسلامی تعلیمات کے، ایک اہم تعلیم ہے،جس کا دنیاوی فائدہ محبت ومودت کا اظہار اور اُس میں دوام ہے، جو ایک اسلامی اور صالح معاشرہ کے لیے ناگزیر امر ہے،محبت کے بغیر زندگی کا سفر ناتمام رہتا ہے، اور اِس سفر کی منزل نفرت وعداوت پر ختم ہوتی ہے، اور اِس منزل پر انسانیت کی آبادی ختم ہوکر، شیطانیت وحیوانیت کی آبادی شروع ہوتی ہے، اور اُخروی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں مصافحہ کرکے دعاءِ مغفرت کرتے ہیں تو اُن کی مغفرت ہوجاتی ہے، گویا مصافحہ کرنے والے کے دونوں ہاتھ میں لڈو ہوتے ہیں، اُس کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوتی ہیں؛ اسی لیے اسلام اور پیغمبرِ اسلام نے اِس شعبہ پر خاص توجہ دی ہے اور اس کے مستقل

فضائل واحکام بیان کیے گئے ہیں۔

آج پوری دنیا میں مصافحہ کا رواج ہے، اور وہ بھی اظہارِ محبت کے لیے ہوتا ہے؛ لیکن اُن کے مصافحہ کو اسلامی مصافحہ نہیں کہا جاتا ہے، اُسے ہاتھ ملانا کہا جاتا ہے، ان کا مصافحہ، روح سے خالی ہوتا ہے، مصافحہ کی روح، اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی درخواست کرنا ہے، وہ کسی معاہدہ کی تکمیل پر ہاتھ ملاتے ہیں، کسی جیت پر ہاتھ ملاتے ہیں، اور ہم آخرت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مصافحہ کرتے ہیں، نبی کریم ﷺ سے لے کر آج تک پورے اسلامی ممالک میں اِس کا رواج ہے، ذیل میں مصافحہ کے ثبوت کے سلسلے کی روایتیں اور عبارتیں ذکی کی جاتی ہیں؛ تاکہ اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔

مصافحہ کے ثبوت میں اکثر محدثین نے مستقل باب ''باب المصافحہ'' کے عنوان سے قائم کیا ہے اور اِس کے تحت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت تقریباً اکثر محدثین نے بیان کی ہے۔

(۱) حضرت قتادہؒ کہتے ہیں: کہ میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا: کیا حضور ﷺ کے صحابہ کرامؓ میں مصافحہ کا رواج تھا تو حضرت انسؓ نے جواب دیا ہاں۔ (بخاری، رقم: ۶۲۶۳)

سوال کا منشا یہ تھا کہ ملاقات کے وقت سلام کے بعد، محبت والفت میں اضافہ کی خاطر صحابہ کرامؓ آپس میں مصافحہ کرتے تھے یا نہیں؛ بالخصوص صحابہ کا معمول پوچھا؛ کیوں کہ معلوم تھا کہ اگر صحابہؓ کرتے تھے تو یقیناً نبی کریم ﷺ کی اقتداء میں کرتے ہوں گے، حضور ﷺ کو مصافحہ کرتے ہوئے دیکھا ہوگا، اور صحابہ کرامؓ معیارِ حق ہیں، وہ جو کریں گے یقیناً اتباعِ رسول میں ہی کریں گے۔

عمدۃ القاری میں ہے:

وقد قال أنس: كانت المصافحة في أصحاب رسول الله ﷺ، وهم الحجة والقدوة للأمة ثم أتباعهم وقد ورد فيها آثار حسان. (۱۵/۳۷۷)

بخاری کی اس روایت کو علامہ نوویؒ نے ریاض الصالحین میں بھی ذکر کیا ہے، اس کی شرح

نزھۃ المتقین میں ہے:

أفاد الحديث: مشروعية المصافحة؛ لأنها كانت موجودة فيما بين الصحابة رضي الله عنهم، وهذا إجماع سكوتي، وهو حجة. (۱/۵۹۵)

یعنی اس حدیث سے مصافحہ کی مشروعیت معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ صحابہ میں اِس کا رواج تھا؛ لہٰذا مصافحہ کی مشروعیت پر اجماعِ سکوتی ہے اور یہ ایک مستقل دلیل ہے۔

علامہ نوویؒ اپنی دوسری کتاب ''الأذکار'' میں لکھتے ہیں:

اعلم أنها سنة مجمع عليها عند التلاقي. (ص:۳۰۲)

اسی کے حاشیہ میں ہے: والمصافحة عند التلاقي سنة بلا خلاف.

یعنی مصافحہ کی سنیت متفق علیہ مسئلہ ہے، اِس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

شرح ابن بطال میں ہے: المصافحة حسنة عند عامة العلماء. (ص:۹/۴۸)

(۲) حضرت عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے اور آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے وهو أخذ بيد عمر بن الخطابؓ. (بخاری، رقم:۶۲۶۴)

تشریح: ہاتھ پکڑنا کس لیے تھا؟ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: فإنه هو المصافحة. (عمدۃ القاری:۱۵/۳۷۷)

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: أن الأخذ باليد يستلزم التقاء صفحة اليد بصفحة اليد غالباً. (فتح الباری:۱۱/۶۷)

یعنی أخذ ید مصافحہ سے کنایہ ہے؛ کیوں کہ ہاتھ پکڑنا ہاتھ کے رخ کا دوسرے کے ہاتھ کے رخ سے ملنے کو مستلزم ہے اور مصافحہ کے لغوی معنی یہی ہیں، نیز امام بخاریؒ نے اِس روایت

کو باب المصافحۃ کے تحت ذکر کیا ہے، جس کا صاف مطلب ہے کہ أخذ ید کا مطلب یہاں مصافحہ ہی ہے؛ لہٰذا یہ مصافحہ کی مشروعیت کی دلیل ہوئی۔

(۳) أخرجه أبو بكر الروياني في مسنده من وجه آخر عن البراء: یعنی حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ نبی کریم ﷺ سے میری ملاقات ہوئی تو آپ نے مجھے مصافحہ کا شرف بخشا، تو میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول! كنت أحسب أن هذا من زي العجم یعنی میں مصافحہ کو عجمیوں کا طریقہ اور تہذیب سمجھتا تھا تو آپ نے فرمایا: نحن أحق بالمصافحة کہ مصافحہ کے ہم زیادہ حق دار ہیں؛ کیوں کہ یہ مغفرت کا ذریعہ ہے۔ (فتح الباری:۱۱/۶۶)

نحن أحق بالمصافحة اور صافحني مشروعیت کی دلیل ہے۔

(۴) سرکار دو عالم ﷺ کا مصافحہ کا معمول:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے نبی کریم ﷺ کے مصافحہ کے بابت دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا: ما لقيته قط إلا صافحني کہ میری جب بھی آپ سے ملاقات ہوئی آپ نے مجھ سے ضرور ہی مصافحہ کیا۔ (ابوداؤد:۵۲۱۴، باب فی المعانقۃ)

اس حدیث سے آں جناب ﷺ کے مصافحہ کرنے کا معمول معلوم ہوتا ہے۔

(۵) حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں: کہ ایک سائل نے آں جناب ﷺ سے پوچھا کہ کیا اِس کی اجازت ہے کہ کوئی اپنے بھائی یا اپنے دوست سے ملے تو، اُس کا ہاتھ پکڑے اور اُس سے مصافحہ کرے؟ آپ نے فرمایا: ہاں اِس کی اجازت ہے۔ (ترمذی، رقم:۲۷۲۹، ماجاء فی المصافحۃ)

(۶) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: من تمام التحية الأخذ باليد یعنی دعا وسلام کی تکمیل اُس وقت ہوتی ہے جب مصافحہ بھی کیا جائے۔
(ترمذی:۲۷۳۱، فی المصافحۃ)

یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے؛ لیکن نفسِ ثبوت پر اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(۷) تمیم ابن مسلمہؒ کہتے ہیں: کہ جب حضرت عمرؓ شام تشریف لائے تو حضرت ابوعبیدہ

بن الجراحؓ نے آپ کا استقبال کیا فأخذ بیده تو انھوں نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کیا اور ہاتھوں کو چوما، حضرت تمیم کہتے ہیں: کانوا یرون أنها سنة. یعنی صحابہؓ اسے مسنون سمجھتے تھے، حضرت شعبیؒ کا کہنا ہے: کان أصحاب النبي ﷺ یصافح بعضهم بعضا. (شرح السنۃ:۱۲/۲۹۲)

(۸) حضرت قتادہؒ کہتے ہیں: کہ حضرت ایاس بن نبہشؒ نے حضرت انسؓ سے مسئلہ پوچھا: أرأیت الرجل یلقی أخاه جابیا من سفر یأخذ بیده؟ کہ بتائیے کوئی شخص اپنے بھائی سے سفر سے واپسی پر ملاقات کرے تو اس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرسکتا ہے؟ حضرت انسؓ نے کہا: قد کان أصحاب رسول الله ﷺ یتصافحون. کہ صحابۂ رسول کا تو یہ معمول تھا، یعنی مصافحہ کرنا چاہیے۔ (شعب الایمان:۸۹۴۳، فصل فی المصافحۃ)

(۹) نعمان بن حمیدؒ کہتے ہیں: میں اپنے ماموں حضرت عباد بن شرحبیلؒ کے ساتھ حضرت سلمانؓ کے پاس گیا، فلما رآه صافحه سلمان، جب انہوں نے دیکھا تو حضرت سلمانؓ نے اُن سے (ماموں سے) مصافحہ کیا۔ (المصنف:۶/۱۳۷)

فقہی عبارتیں

(۱) (ولا بأس بالمصافحة) لأنه هو المتوارث. وقال علیه الصلاة والسلام: من صافح أخاه المسلم وحرّك یده تناثرت ذنوبه. (ہدایہ مع تکملہ شرح فتح القدیر:۶۲)

(۲) (كالمصافحة) أي كما تجوز المصافحة؛ لأنه سنة قديمة متواترة. (الدر المختار مع رد المحتار:۹/۵۴۷)

اِن تمام روایات وتصریحات کی روشنی میں فقہاء نے کہا ہے: کہ مصافحہ کے مستحب ومسنون ہونے پر علماء کا اتفاق ہے؛ اگرچہ امام مالکؒ کی طرف کراہت کا قول منسوب ہے؛ چنانچہ کتاب المنتقی میں ہے:

فعلی هذه الروایة یحتمل أن یرید — والله أعلم — في الحدیث، المصافحة أن یصفح بعضهم عن بعض، من الصفح وهو التجاوز والغفران وهو

أشبه؛ لأن ذلك يذهب الغل في الأغلب، واحتج مالك لمنع المصافحة باليد بقوله عزوجل إذ دخلوا عليه فقالوا سلما قال سلٰم قوم منكرون (۱) ولم يذكروا مصافحة، وقوله ﷺ يذهب الغل أي العداوة، ومعنىٰ ذلك أنه إذا صفح عن أخيه، وصفح عنه أخوه، ذهب ما في أنفسهما من الغل. (المنتقى:۲۱۶/۷)

لیکن ہاتھوں سے مصافحہ کے ثبوت پر روایتیں اتنی زیادہ ہیں کہ انکار کی گنجائش نہیں؛ یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ کی طرف دوسرا اور آخری قول، استحباب کا منسوب ہے، ابن بطالؒ لکھتے ہیں:

المصافحة حسنة عند عامة العلماء، وقد استحبها مالك بعد كراهة. (۴۸/۹)

شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ صاحب، الزرقانیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وروى عن مالك خلافه، وهو الذي يدل عليه معنى ما في "الموطا" وعلى جوازها جماعة العلماء سلفا وخلفا وفيه آثار. (اوجز المسالک:۱۲۷/۱۶، کتاب حسن الخلق)

تقریباً یہی بات ابن حجرؒ نے لکھی ہے:

قال ابن عبد البر: روى ابن وهب عن مالك أنه كره المصافحة والمعانقة، وذهب إلى هذا سحنون وجماعة، وقد جاء عن مالك جواز المصافحة وهو الذي يدل عليه صنيعه في الموطأ، وعلى جوازه جماعة العلماء سلفا وخلفا، والله أعلم. (فتح الباری:۶۸/۱۱)

اب خلاصہ یہ نکلا کہ مصافحہ کے مسنون ومستحب ہونے پر اتفاق ہے، امام مالکؒ ابتداءً اِسے مکروہ خیال کرتے تھے؛ لیکن بعد کو وہ بھی اِس کے مستحب ہونے کے قائل ہوگئے تھے۔

مصافحہ کی لغوی تحقیق

مصافحہ ''صفح'' سے ہے، صفحۃ الورق پتے کے ایک رخ کو کہتے ہیں، اور مصافحہ جو باب

---

(۱) الذاریات:۲۵.

مفاعلۃ کا مصدر ہے، اس کے معنی ہیں: اپنے ہاتھ کے رخ کو دوسرے کے ہاتھ کے رخ کے ساتھ ملانا، اِس حال میں کہ ایک شخص کے چہرے کا رخ دوسرے شخص کے چہرے کے رخ کی جانب ہو۔

والمصافحة: الأخذ باليد، والرجل يصافح الرجل إذا وضع كفه في صفح كفه، ومنه حديث المصافحة عند اللقاء، وهي مفاعلة من إلصاق صُفح الكف بالكف، وإقبال الوجه على الوجه. (لسان العرب: ص ف ح)

ایک رائے یہ بھی ہے کہ مصافحہ صفح بمعنی ''معاف کرنا اور چشم پوشی سے کام لینا'' سے مشتق ہے، اور مصافحہ میں ہاتھ پکڑنا معاف کرنے کی علامت ہوتی ہے، جیسے ہاتھ کا چھڑا لینا اِعراض کی دلیل ہوتی ہے۔

ويمكن أن يكون ماخوذا من الصفح بمعنى العفو، ويكون أخذ اليد دلالةً عليه كما أن تركه مُشعر بالإعراض عنه. (مرقاة المفاتیح: ۹/۴۷، باب المصافحۃ)

صفحۃ الورق کے معنی ہیں: پتے کا ایک رخ، پس ہاتھ کے دو رخ ہیں: ایک ہتھیلی کی جانب کا، دوسرا پشت کی جانب کا، اور صافحہ مصافحۃ (باب مفاعلۃ) کے معنی ہیں اپنے ہاتھ کے رخ کو دوسرے کے رخ کے ساتھ ملانا، یہ آدھا مصافحہ ہے، پھر جب ہر ایک دوسرا ہاتھ رکھے گا تو دونوں کے ہاتھ کا دوسرا رخ بھی مل جائے گا، اب مصافحہ کامل ہوا؛ کیوں کہ ہر ایک کے ہاتھ کے دونوں رخ دوسرے کے ہاتھ کے دونوں رخوں کے ساتھ مل گئے۔ (تحفۃ الالمعی: ۶/۵۰۰)

مصافحہ کا شرف سب سے پہلے کسے حاصل ہوا؟

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: کہ جب اہل یمن آپ ﷺ کے پاس آئے تو حضور ﷺ نے فرمایا: کہ تمہارے پاس اہل یمن آئے ہیں وهم أول من جاء بالمصافحة یعنی یہ اُن لوگوں میں پہلے ہیں جنہیں مصافحہ کا شرف حاصل ہے۔(۱) حافظ ابن حجرؒ نے جامع ابن وھب کے حوالے سے "وكانوا أول من أظهر المصافحة" کے الفاظ نقل کیے ہیں۔

(۱) ابوداؤد، رقم: ۵۲۱۳.

معلوم ہوا کہ آپ ﷺ سے مصافحہ کا شرف سب سے پہلے اہل یمن کو حاصل ہوا ہے؛ لیکن مولانا یحییٰ صاحبؒ لکھتے ہیں: کہ اولیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل یمن کو مصافحہ کی کثرت اور شیوع کے اعتبار سے اولیت کا شرف حاصل ہے؛ کیوں کہ اُن کے یمن سے آنے سے پہلے بھی صحابہؓ کے درمیان مصافحہ کا رواج تھا۔

كتب مولانا محمد يحيىٰ المرحوم: قوله: وهم أول من جاء بالمصافحة أي بالكثرة والشيوع، وإلا فكانت المصافحة فيهم قبل الإتيان من أهل اليمن.
(بذل المجهود: ۵۹۷/۱۳)

آدابِ ملاقات

جب ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان سے ملاقات ہو تو سب سے پہلے سلام کرنا چاہیے، یہ تحیۃ الاسلام ہے، یعنی ہر مسلمان پر لازم ہے کہ دوسرے مسلمان کو سلامتی کی دعا دے، خواہ اُس کو پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو، بس اتنا معلوم ہونا چاہیے کہ وہ مسلمان ہے، پھر اگر معرفت یا عقیدت ہے تو سلام کے بعد مصافحہ بھی کرنا چاہیے اور یہ تحیۃ المعرفۃ ہے، اِس سے سلام کی تکمیل ہوتی ہے۔
(تحفۃ الالمعی: ۵۰۲/۶)

مصافحہ ذریعہ مغفرت ہے

(۱) حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو بھی دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں پھر وہ مصافحہ کرتے ہیں تو دونوں کے جدا ہونے سے پہلے دونوں کی مغفرت کردی جاتی ہے۔ (ابوداؤد، رقم: ۵۲۱۲، باب فی المصافحۃ)

تشریح: اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ ملاقات کے وقت سلام کے بعد؛ اگر فرصت ہو تو مصافحہ کرنا چاہیے، مصافحہ اُن اعمالِ صالحہ میں سے ہے، جن سے صغیرہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں، ہر انسان سے چھوٹی موٹی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں، اللہ کا یہ کریمانہ قانون ہے کہ اُس نے صغائر کی معافی کے لیے آسان راہیں بتادی ہیں، دوسری طرف مصافحہ کرنے سے محبت ومودت اور فرحت وسرور اور

پائیدار زندگی نصیب ہوتی ہے، وحشت ونفرت اور قطعِ تعلق کا قلعہ قمع ہو جاتا ہے، اوپر حدیث میں جو یہ کہا گیا کہ دونوں کے جدا ہونے سے پہلے دونوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے، تو جدائیگی سے مراد جسمانی جدائی بھی ہو سکتی ہے کہ دونوں جب اپنی اپنی راہ لے لیتے ہیں تو ان کی مغفرت کر دی جاتی ہے، اور جدائی سے مراد مصافحہ سے فراغت بھی ہو سکتی ہے یعنی مغفرت کے لیے مجلس کا بدلنا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ اُسی مجلس میں جب دونوں مصافحہ سے فارغ ہو جاتے ہیں تو اُن کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ (مرقاۃ:۹/۷۵)

چنانچہ اس دوسرے قول کی تائید اِس روایت سے ہوتی ہے: عن أبي أمامة أن رسول الله ﷺ قال: إذا تصافح المسلمان لم تفرق أكفهما حتى يغفر لهما.
(المعجم الکبیر:۸۰۸۶)

اور مغفرت کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان بشاشت، باہمی محبت وملاطفت اور ذکرِ الٰہی کی اشاعت رب العالمین کو پسند ہے؛ اس لیے مصافحہ کرنے والے مغفرت کے حقدار ہوتے ہیں۔ (رحمۃ اللہ الواسعۃ:۴/۳۶۶)

(۲) حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب دو مسلمان آپس میں ملیں اور ایک دوسرے سے مصافحہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی تعریف کریں اور بخشش چاہیں تو اُن دونوں کو بخش دیا جاتا ہے۔ (ابوداؤد:۵۲۱۱، باب في المصافحۃ)

تشریح: اوپر والی روایت سے معلوم ہوا کہ مغفرت کا سبب صرف مصافحہ ہے؛ لیکن اِس دوسری روایت میں دو باتوں کا اضافہ ہے کہ: مصافحہ کے بعد دونوں اللہ کی حمد وثنا کریں اور استغفار کریں یعنی مغفرت کی دعا مانگیں؛ لہٰذا پہلی روایت میں اگرچہ استغفار کا تذکرہ نہیں ہے؛ مگر وہاں بھی اس قید کو بڑھایا جائے گا؛ کیوں کہ حادثۂ واحدۃ میں مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے۔

اور حدیث میں پہلے تعریف کرنے کا تذکرہ ہے اور اُس کے بعد استغفار کا؛ جس سے معلوم ہوتا ہے پہلے تعریف کرنی چاہیے، پھر استغفار کرنا چاہیے؛ لیکن معاملہ اِس کے برعکس ہے، حکم

ہے پہلے استغفار کریں پھر اللہ کی حمد وثنا کریں،سوال یہ ہے کہ حدیث میں پہلے حمد کا تذکرہ کیوں کیا گیا؟اِس کی وجہ مفتی سعید احمد صاحب لکھتے ہیں:

> اور حدیث میں واو عاطفہ مطلق جمع کے لیے ہے،اور حمد کا موقع، مزاج پرسی کا وقت ہے،لوگ عام طور پر اس وقت حمد کرنا بھول جاتے ہیں؛اِس لیے اہمیت ظاہر کرنے کے لیے اس کو مقدم کیا گیا ہے۔(تحفۃ الالمعی:۶/۵۰۵)

فائدہ: حمد کی صورت یہ ہے کہ خیریت وحال پوچھنے پر الحمد للہ کہا جائے اور مغفرت کی صورت یہ ہے کہ یغفر اللہ لنا ولکم کہا جائے۔(الدعاء المسنون:۴۴۱)

مصافحہ کرتے وقت ''ایک اہم نیت''

ابھی آپ نے روایت پڑھی کہ مصافحہ کرنے سے گناہوں سے مغفرت ہوتی ہے؛ لہٰذا بوقتِ مصافحہ یہ نیت کرلینی چاہیے کہ اللہ اِس مصافحہ کی برکت سے ہمارے گناہوں کو بخش دیں گے، اِس کے ساتھ ساتھ ایک نیت اور ہے جو اہم ہے اور تکبر وبڑائی کا علاج ہے۔

> ڈاکٹر عبد الحی صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے: کہ بھائی جب بہت سارے لوگ مجھ سے مصافحہ کرنے کے لیے آتے ہیں تو میں بھی بہت خوش ہوتا ہوں؛اِس لیے خوش ہوتا ہوں کہ یہ سب اللہ کے نیک بندے ہیں، کچھ پتہ نہیں کہ کون بندہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول بندہ ہے، جب اِس مقبول بندے کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھو جائیگا تو شاید اُس کی برکت سے اللہ تعالیٰ مجھ پر بھی نوازش فرمادیں-یہی باتیں بزرگوں سے سیکھنے کی ہیں- اس لیے جب بہت سے لوگ کسی سے مصافحہ کے لیے آئیں تو اُس وقت آدمی کا دماغ خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ جب

اتنی ساری مخلوق مجھ سے مصافحہ کررہی اور میری مُعتَقِد ہورہی ہے، واقعۃً اب میں بھی بزرگ بن گیا ہوں؛ لیکن جب مصافحہ کرتے وقت یہ نیت کرلی کہ شاید اِن کی برکت سے اللہ تعالیٰ مجھے نواز دیں، میری بخشش فرمادیں تو اب سارا نقطہ تبدیل ہوگیا اور اب مصافحہ کرنے کے نتیجے میں تکبر اور اپنی بڑائی پیدا ہونے کے بجائے تواضع اور عاجزی اور شکستگی ،انکساری پیدا ہوگی؛ لہٰذا مصافحہ کرتے وقت یہ نیت کرلیا کرو۔(اصلاحی خطبات:۶/۱۸۰)

سلام کے مقاصد کی تکمیل

سلام کا مقصد،محبت ومسرت اور جذبۂ اکرام واحترام کا اظہار ہے،اِس اظہار کا ذریعہ سلام کے علاوہ؛ بلکہ اُس سے بالاتر مصافحہ بھی ہے، جوعموماً سلام کے ساتھ اور اُس کے بعد ہوتا ہے اور اُس سے سلام کے اِن مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے؛چناں چہ حدیث میں:

بیمار کی بیمار پرسی کی تکمیل اُس وقت ہوتی ہے،جب بیمار پرسی کرنے والا اپنا ہاتھ بیمار کے ماتھے پر رکھے یا فرمایا: اُس کے ہاتھ پر رکھے،پھر اُس سے پوچھے کیسی طبیعت ہے؟ اور آپس میں دعاوسلام کی تکمیل اُس وقت ہوتی ہے جب مصافحہ بھی کیا جائے۔

(ترمذی:۲۷۳۲)

رحمۃ اللہ الواسعہ میں ہے:

ملاقات کے وقت سلام کے بعد اگر مصافحہ اور معانقہ کیا جائے اور آنے والے کوخوش آمدید کہا جائے؛ تو اس سے مودت ومحبت اور فرحت وسرور میں اضافہ ہوتا ہے اور وحشت ونفرت اور قطع تعلق کا اندیشہ دور ہوتا ہے،یعنی یہ باتیں سلام کے مقاصد کی تکمیل کرتی

ہیں، حدیث میں ہے کہ سلام کا تکملہ، مصافحہ ہے۔ (رحمۃ اللہ: ۴/ ۳۶۵)

مصافحہ سے قبل سلام کرنا ضروری ہے

(۱) حضرت جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ کی ملاقات، جب صحابۂ کرامؓ سے ہوتی تھی تو اُن سے مصافحہ نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ انہیں سلام کرتے تھے۔
(جمع الفوائد، رقم: ۷۷۲۴)

(۲) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً نقل کرتے ہیں: کہ ایک مومن کی جب دوسرے مومن سے ملاقات ہوتو اولاً اُسے سلام کرے اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرے تو دونوں کے گناہ ایسے جھڑ جاتے ہیں جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ (ایضا: ۷۷۲۵)

(۳) حضرت عمرؓ سے مروی ہے: کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں اور اُن میں سے ایک دوسرے کو سلام کرتا ہے تو بے شک اللہ کے نزدیک دونوں میں محبوب ترین وہ ہوتا ہے، جو بشاشت ومسکراہٹ کے ساتھ ملے، پھر جب دونوں مصافحہ کرتے ہیں تو دونوں پر سو رحمتیں نازل ہوتی ہیں، پہل کرنے والے کے لیے نوے رحمتیں ہوتی ہیں اور جس سے مصافحہ کیا گیا ہے، اُس کے لیے دس رحمتیں ہوتی ہیں۔ (الترغیب، ص: ۴۳۳، فی المصافحۃ)

اِن روایتوں سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) شرعی مصافحہ اُسے کہیں گے، جس سے پہلے مسنون سلام بھی ہو؛ اگر بغیر سلام کیے ہوئے مصافحہ کیا تو اُسے مسنون مصافحہ نہیں کہا جائے گا، مثلاً: لوگ میٹنگوں میں ابتداء وانتہا میں بس ویسے ہی ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں، یا دو شخصوں میں کوئی بات طے پا جاتی ہے، معاہدہ ہو جاتا ہے، شادی بیاہ کے رشتے پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں، نئی نئی دوستی ہوتی ہے، کھیل کود میں کوئی بازی جیت جاتا ہے تو وہ ہاتھ ملاتے ہیں، یہ سب شرعی اور مسنون مصافحہ نہیں ہیں، اِن مواقع پر ہاتھ ملانا پختگی اور بات کی مضبوطی کی ضمانت ہوتی ہے، اصل مصافحہ وہی ہوگا، جس سے پہلے سلام بھی ہو۔

(۲) مغفرت کا استحقاق اُس وقت ہوتا ہے؛ جب ملاقات کے وقت پہلے سلام کیا

جائے۔

(۳) جیسے سلام میں سبقت کرنا فضیلت کا باعث ہے، ویسے ہی مصافحہ میں بھی سبقت کرنا رحمت میں اضافہ کا سبب ہے۔

(۴) سلام و مصافحہ کے وقت چہرے پر بشاشت اور مسکراہٹ کا ہونا، اللہ سے قُرب کا ذریعہ ہے۔

مصافحہ مغفرت کا ذریعہ کب بنے گا؟

سلام و مصافحہ پر اللہ کی طرف سے مغفرت وبخشش کا جو وعدہ ہے، اُس وعدے کی تکمیل کے لیے اخلاص ضروری ہے، نیک جذبات اور پاک احساسات کا ہونا ضروری ہے، قلب و دماغ میں اِس امر کا اِستحضار ضروری ہے کہ یہ ہمارے سچے رسول ﷺ کا سچا ارشاد ہے یہ غلط نہیں ہوسکتا، مولانا منظور نعمانی نور اللہ مرقدہ تحریر کرتے ہیں:

> یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ کسی عمل کی خاص تاثیر جب ہی ظہور میں آتی ہے؛ جب کہ اُس عمل میں روح ہو، نماز، روزہ اور حج اور ذکر اللہ جیسے اعمال کا حال بھی یہی ہے، بالکل یہی معاملہ سلام اور مصافحہ کا بھی ہے کہ، یہ اگر دل کے اخلاص اور ایمانی رشتہ کی بنا پر صحیح جذبہ سے ہوں، تو پھر دلوں سے کدورت نکلنے اور محبت ومودت کا رس پیدا ہوجانے کا یہ بہترین وسیلہ ہیں؛ لیکن آج ہمارا ہر عمل بے روح ہے۔ (معارف الحدیث: ۶/ ۱۶۲)

دوسری جگہ ہے:

> یہاں اس بات کو یاد کرلیا جائے کہ ہر عمل کی تاثیر اور برکت اِس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اُس میں روح ہو، جو دانہ بے جان ہو چکا، اُس سے پودا نہیں اُگتا۔ (ایضا: ۶/ ۱۶۲)

إنـمـا الأعـمـال بـالنيات حدیث اِس کی بنیاد ہے، آج معاشرے میں سلام بھی ہے، مصافحہ بھی ہے؛ لیکن نتیجہ صفر ہے، سلام ومصافحہ کے باوجود دلوں میں محبت والفت کے پھول نہیں کھلتے نفرت وعداوت، بُغض وحسد کے کانٹے نہیں جھڑتے، وجہ ظاہر ہے، سلام ومصافحہ کی روح غائب ہے، جسم بلا روح، مُردہ ہوتا ہے، سچ کہا نعمانی صاحبؒ نے: جو دانہ بے جان ہو چکا اُس سے پودا نہیں اُگتا، اللہ اخلاص وللّٰہیت کی توفیق دے۔

مصافحہ سے کینے کی صفائی ہوتی ہے

عطاء خراسانی تابعیؒ سے (بطریقِ اِرسال) مروی ہے: کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم باہم مصافحہ کیا کرو، اِس سے کینہ کی صفائی ہوتی ہے اور آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو، اِس سے تم میں محبت پیدا ہوگی اور دلوں سے دشمنی دور ہوگی۔ (موطا مالک، رقم: ۱۶۲۴، کتاب حسن الخلق)

تشریح: شریعت یہ چاہتی ہے کہ مسلمانوں کے قلوب میں صرف نورِ الٰہی رہے، اُس کا دل، خشیتِ باری سے مُنوّر رہے؛ چناں چہ ہر وہ چیز جو قلوب کی نورانیت کے لیے مانع ہو، شریعت نے اُس سے بچنے کی تاکید کی ہے؛ لیکن انسان کے ساتھ شیطان کا لگا رہنا ایک شرعی حقیقت ہے، وہ اُس سے وہ کام کرا لیتا ہے جو قلوب کی روشنی کو تاریکی سے بدل دیتا ہے، یہ اسلام ہی کی خوبی اور خصوصیت ہے کہ اس نے ہر مرض کا؛ بالخصوص روحانی مرض کا آسان آسان علاج بھی بتا دیا ہے، لوگ اِس نسخہ کو آزما کر، دل کی دنیا سنوار سکتے ہیں، دل کی جہاں بہت سی بیماریاں ہیں، اُن میں ایک بیماری ''کینہ'' ہے، کہنے کو تو یہ ایک بیماری ہے؛ لیکن اِس کی منفی شاخیں بہت ہیں، نفرت وعداوت، اختلاف وانتشار کی بنیاد ہی ''کینہ'' ہے، یہ کیسے دور ہوگا؟ شریعت نے اِس کے لیے ایک آسان طریقہ بتایا کہ سلام کے ساتھ ساتھ موقع ہو تو ایک دوسرے سے مصافحہ کیا کرو، یہ ارشادِ نبوی ہے، یقین واخلاص کے ساتھ عمل کرنے سے کینہ وحسد ضرور دور ہوں گے، ہماری نظر غلط ہو سکتی ہے، حضور ﷺ کی خبر غلط نہیں ہو سکتی۔ (جب کینہ ختم ہوگا تو محبت کے پھول کھلیں گے، جس کی عطر بیزی

سے ایک صالح واسلامی معاشرہ وجود میں آئے گا، اور دنیا جنت کا نمونہ ہوگی۔(۱)

سلام ومصافحہ مسکرا کر کیجیے

حضرت براء ابن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلا شبہ جب دو مسلمانوں کی ملاقات ہوتی ہے اور دونوں (سلام کے بعد) مصافحہ کرتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک اپنے دوست کی خاطر مسکراتا ہے اور دونوں یہ عمل صرف اللہ کی رضا کے واسطے کرتے ہیں تو دونوں کے الگ ہونے سے پہلے، دونوں کو بخش دیا جاتا ہے۔(الترغیب:۴۳۲/۳)

ویستحب مع المصافحة، البشاشة بالوجه. (الأذکار،ص:۳۰۴)

تشریح: اس روایت میں دو باتیں بطور خاص ذکر کی گئیں ہیں۔

(۱) مصافحہ کے وقت صرف رسمی ہاتھ نہ ملیں؛ بلکہ دونوں کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار ہوں، ایسے ملیں کہ دونوں کا یہ احساس ہو کہ یہ شخص مجھ سے مل کر بہت شاداں وفرحاں ہے، سلام ومصافحہ کا مقصد اظہارِ محبت ہے، مسکراہٹ اظہارِ محبت کی ایک بڑی علامت ہے، مومن کے دل کو خوش کر دینا صدقہ کا ثواب رکھتا ہے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ مصافحہ میں اخلاص وخلوص کی آمیزش ضروری ہے، اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ سلام ومصافحہ اِس نیت سے کرے کہ یہ حبیب خدا ﷺ کا ارشاد وعمل ہے اور اُن کے ارشاد کی تعمیل، درحقیقت ارشادِ خداوندی کی تعمیل ہے، رسمی طور سے مصافحہ اخلاص کے منافی ہے، دباؤ میں مصافحہ یا زبردستی مصافحہ یا غرض وغرض میں مصافحہ، مفادِ دنیا کے لیے تو ہوسکتا ہے، مفادِ آخرت کی لیے نہیں، عقل مند وہ ہے جو مفادِ آخرت کو سامنے رکھ کر ہر کام انجام دے، اخلاص وللّٰہیت اِسی کو کہتے ہیں۔

---

(۱) عطاء خراسانیؒ کی حدیث کے الفاظ ہیں، تصافحوا یذهب الغل: علامہ باجیؒ نے تصافحوا کا ایک دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے: مصافحہ صفح سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں معاف کرنا، چشم پوشی سے کام لینا؛ لہٰذا مطلب ہوا کہ ایک مومن جب دوسرے مومن کو معاف کر دیتا ہے، چشم پوشی سے کام لیتا ہے تو دلوں سے نفرت وحسد اور کینہ ختم ہوجاتے ہیں، المنتقی: ۲۱۶/۷.

مصافحہ کرنے کے چند اہم نبوی آداب

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ سے کوئی شخص ملاقات کرتا تو آپ اُس سے مصافحہ فرمایا کرتے تھے، تو اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے اُس وقت تک نہیں کھینچتے تھے؛ تا آں کہ وہ شخص خود ہی اپنا ہاتھ کھینچ لیتا، اور اپنا چہرہ اُس وقت تک نہیں پھیرتے تھے کہ وہ خود ہی پھیر لیتا اور آپ اپنے کسی ہم نشیں کے سامنے اپنے دونوں گھٹنوں کو بڑھاتے ہوئے (پھیلاتے ہوئے) نہیں دیکھے گئے۔ (ترمذی: ۲۴۸۷، أبواب الرقائق)

تشریح: اِس حدیث سے چار آدابِ نبوی معلوم ہوئے۔

(۱) بوقتِ ملاقات نبی کریم ﷺ کا مصافحہ کا معمول تھا۔

(۲) دوسرا ادب یہ معلوم ہوا کہ آدمی مصافحہ کرتے وقت اپنا ہاتھ خود سے نہ کھینچے، یعنی سامنے والے کو یہ احساس نہ ہو کہ ہم اُس کی ملاقات اور مصافحہ سے اکتا رہے ہیں، یا کبیدہ خاطر ہیں یا یہ شخص مجھے حقیر اور کمتر سمجھ رہا ہے؛ بلکہ اطمینان وسکون سے مصافحہ کرنا چاہیے، ہاں اگر ہاتھ کھینچنے سے ایسے تأثرات کا اندیشہ نہیں ہے تو ہاتھ کھینچ سکتے ہیں، اصل چیز جو سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ مصافحہ محبت اور دوامِ محبت کا ذریعہ ہونا چاہیے، اس کے لیے جو چیزیں مُمِدّ ومُعاون ہوں اُن کو برتنا چاہیے، دو مصافحہ کرنے والے کسی نہ کسی وقت اپنا ہاتھ کھینچے گے ہی؛ اگر دونوں میں سے کوئی اپنا ہاتھ کھینچے ہی نہ تو دیگر کام کب ہوں گے؟ تو مطلب ہوا کہ سامنے والے کو یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ یہ ہمارے مصافحے سے خوش نہیں ہے؛ لہٰذا جلد بازی نہیں کرنی چاہیے، صبر وتحمل کے ساتھ مصافحہ کرنا چاہیے، کیا عجب کہ آپ کی یہ شگفتگی کسی کے دل کے درد کا درماں بن جائے۔

تاہم اگر کوئی شخص ایسا ہو جو چمٹ جائے اور ہاتھ چھوڑنے کے لیے آمادہ ہی نہ ہو، تو اُس وقت بہر حال ہاتھ کھینچنے کی گنجائش ہے۔

(۳) تیسرا ادب یہ معلوم ہوا کہ انسان کی اپنی طرف سے یہی کوشش ہونی چاہیے کہ

جب تک ملاقات کرنے والا رخصت نہ ہو جائے، اُس کی جانب متوجہ رہے، اُس سے باتیں کرے؛ بالخصوص اُس وقت جب کہ وہ آپ سے ہی ملنے آیا ہو، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی آپ سے ملنے آیا ہے، آپ سے اپنا درد بانٹنے آیا ہے، آپ سے کچھ سننے آیا ہے، اب اُس وقت آپ اپنا چہرہ کسی اور طرف پھیر لیں، تو بندہ مومن کا دل ٹوٹ جائے گا، اور چہرہ پھیرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اُس کے سامنے بے رخی اور بے توجہی نہ برتیں، آپ ایسے گفتگو کریں جیسے آپ اُسی کے انتظار میں تھے، آپ ایسا برتاؤ کریں جیسے آپ کو اُس سے مل کر بے پناہ خوشی ہوئی ہے، صحیح معاشرہ ایسے ہی فروغ پاتا ہے، جو اسلام کا ایک اہم مقصد ہے؛ لیکن اِس سنت پر عمل کرنا ایک مجاہدہ سے کم نہیں، دل گُردہ کی بات ہے؛ البتہ اگر کہیں کوئی مجبوری ہے اور چہرہ پھیرنا ناگزیر ہے، چہرہ نہ پھیرنے سے اُس فائدہ سے بڑا کوئی نقصان ہو جائے گا تو مسئلہ الگ ہوگا، زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جہاں یہ معاملہ کرنا پڑتا ہے مثلاً: آپ کو کوئی کام ہے جس کے لیے تنہائی ضروری ہے اب اُسی وقت کوئی آ گیا اور جانے کا نام ہی نہ لے یا آپ کو کہیں جانا ہے، کوئی اُسی وقت آ گیا تو ایسے مواقع پر گنجائش ہے کہ اٹھ کر چلے جائیں یا اُس کو جانے کے لیے کہہ دیں اور انداز مشفقانہ ہو مثلاً: یہ کہے: آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی، میں مزید آپ سے بیٹھ کر استفادہ کرتا؛ لیکن فلاں کام درپیش ہے، اجازت ہو تو............اور بعض دفعہ ڈانٹنے اور زبردستی کی بھی نوبت آجاتی ہے، موقع و محل کے اعتبار سے اِس کی بھی اجازت ہے۔

(۴) جب مجلس میں کئی لوگ بیٹھے ہوں تو اپنے پَیر، ساتھی کی طرف لمبے نہ کیے جائیں، یہ بات ہم نشیں کو ناگوار ہوگی یہ بات تواضع اور خاکساری کے بھی خلاف ہے، قربان جائیے رحمۃ للعالمین کی رحمۃ اللعالمینی پر، امت کو ہر موڑ پر آدابِ انسانیت کی رہنمائی فرمائی اور رہنمائی ہی نہیں فرمائی، اُس کو برت کر دکھایا، قول و عمل کی یکسانیت کا فلسفہ اور اُس کی تاثیر دیکھنی ہو تو سیرتِ رسول کا مطالعہ کیا کیجیے، آج کردار و گفتار کا تضاد ہی اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ امت کے لیے سدِّ راہ بنا ہوا ہے، کاش ہم اِسے سمجھتے اور اوروں کو سمجھا پاتے۔

مصافحہ کے وقت مسکرانا ننانوے رحمتوں کا باعث

انسان، انسان کے بغیر زندگی نہیں بسر کرسکتا، ہر انسان کو دوسرے انسان کی ضرورت پڑتی ہے، یہ بات تجربہ اور مشاہدہ کی ہے کہ نفرت وعداوت اور چہرے کی بے رخی اور بے توجہی کے آثار بنے بنائے کام بگاڑ دیتے ہیں؛ جب کہ چہرے کی بشاشت ومسکراہٹ اور چہرے کی شادابی بگڑے کام بنادیتی ہے، اور یہ شادابی اگر ایک مسلمان کے دل میں فرحت وانبساط کی کلیاں کھلادے تو ایسی شادابی کے بدلے رب کائنات خوش ہوکر، بندے کو اپنی رحمت ومغفرت سے نوازتے ہیں، اِسی کی ترغیب وتحریص کے لیے نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

جب دو مسلمانوں کی ملاقات ہوتی ہے پھر دونوں سلام ومصافحہ کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ دونوں کے درمیان سو رحمتیں نازل فرماتے ہیں، ننانوے رحمتیں اُس کے لیے ہوتی ہیں، جو اپنے بھائی کے حق میں زیادہ حسنِ سلوک کرنے والا اور زیادہ بشاشت ومسکراہٹ کا اظہار کرنے والا ہو۔ (الترغیب والترہیب:۳؍۳۳)

سلام ومصافحہ سے چھوٹے چھوٹے سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں

حضرت سلمان فارسیؓ سے مروی ہے: کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی مسلمان اپنے بھائی سے ملاقات کرتا ہے پھر (مصافحہ کے لیے) اُس کا ہاتھ پکڑتا ہے تو (اُس مصافحہ کی برکت سے) دونوں کے صغیرہ گناہ ایسے جھڑ جاتے ہیں، جیسے سخت اور تیز آندھی کے وقت، سوکھے ہوئے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں، اور انہیں بخش دیا جاتا ہے؛ اگرچہ ان کے صغیرہ گناہ سمندر کے جھاگ کی مانند ہوں۔ (الترغیب:۳؍۴۳۴)

یعنی اخلاص کے ساتھ مصافحہ کرنا مکمل طور پر گناہ صغیرہ سے معافی کا ذریعہ ہے اور کبیرہ گناہ توبہ سے معاف ہوں گے، اور کیا عجب کہ جب صغیرہ گناہ معاف ہوجائیں تو کبیرہ گناہوں سے توبہ کی توفیق ملنے لگے، اور انسان اللہ کا مقرب بندہ بن جائے۔

مصافحہ کا صحیح اور مسنون طریقہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب دو مسلمان آپس میں ملیں تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑیں یعنی مصافحہ کریں تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ وہ دونوں کی دعائیں حاضر ہوں اور دونوں کو جدا نہ کریں؛ یہاں تک کہ دونوں کو بخش دیں۔
(الترغیب:۳/۴۳۲)

مصافحہ سے گناہ مٹ جاتے ہیں، اس کے لیے کچھ چیزیں ضروری ہیں: سب سے پہلے تو سلام کیا جائے پھر مصافحہ کیا جائے اور مصافحہ کے ساتھ ہر ایک زور سے "یغفر اللہ لنا ولکم" پڑھے، یعنی اللہ آپ کی اور ہماری مغفرت فرمائیں، پھر مزاج پُرسی کے وقت دونوں اللہ کی تعریف کریں اور ہر حال میں اللہ کا شکر بجالائیں؛ اگر ہمارا مصافحہ ایسا ہوگا تو یقیناً ہمارے گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہوگا۔

مصافحہ اعتدال سے کیجیے

مصافحہ اظہارِ محبت اور استمرارِ محبت کی بنیاد ہے؛ لیکن مصافحہ کرتے وقت چند باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے مثلاً: جس سے مصافحہ کرنا ہے وہ بہت جلدی میں ہے، ایسی صورت میں سلام پر اکتفا کرے، جس سے مصافحہ کرنا ہے، اُس کا ہاتھ اتنی زور سے نہ دبا دے کہ ہاتھ میں درد ہو جائے، کسی کو تکلیف پہنچانا منع ہے، بزرگ اور خدا رسیدہ لوگوں سے مصافحہ یقیناً ایک شرف وسعادت کی بات ہے؛ لیکن مجمع کثیر ہو اور اُن کے پاس وقت کم ہو تو زیارت و دیدار اور سلام پر ہی اکتفا کرنا چاہیے، بسا اوقات ہم مسلمان ایسے مواقع پر حدِ اعتدال سے نکل جاتے ہیں، ایک مصافحہ کے لیے کسی مسلمان کو دھکا دے دیا، کوئی سامان توڑ دیا؛ مزید براں بار بار مصافحہ کرنے سے اس بزرگ ہستی کو تکلیف ہو سکتی ہے، کوئی بھی چیز اعتدال کے ساتھ اچھی لگتی ہے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

مصافحہ کا مقصد اظہارِ محبت ہے، اور محبت کے اظہار کے لیے ایسا

طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس سے محبوب کو راحت ملے، مصافحہ تکلیف کا ذریعہ نہ بنے، کبھی ایسا ہوتا ہے، کوئی بزرگ کسی جگہ پہنچے تو پورا مجمع اُن بچارے ضعیف اور چھوئی موئی بزرگ پر ٹوٹ پڑتا ہے، ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ ساری برکت ومغفرت اِن بزرگ کے مصافحہ میں ہے؛ لہٰذا بلا مصافحہ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے، چاہے وہ بزرگ دَب جائیں، گر جائیں یا کسی اور مصیبت کا شکار ہو جائیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک وعظ ہے، جو آپ نے رنگون (برما) کی سورتی مسجد میں کیا تھا، اُس وعظ میں لکھا ہے: کہ جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وعظ سے فارغ ہوئے تو مصافحہ کرنے کے لیے مجمع کا اتنا زور پڑا کہ حضرت گرتے گرتے بچے، یہ حقیقی محبت نہیں ہے، یہ محض صورتِ محبت ہے؛ اس لیے کہ محبت کو عقل چاہیے کہ جس سے محبت کی جاری ہے، اُس کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ کیا جائے اور اُس کو دکھ اور تکلیف سے بچایا جائے، یہ ہے حقیقی محبت۔ (اصلاحی خطبات: ۱۷۸/۶)

حضرت تھانویؒ کی انکساری- بڑوں کے لیے ایک سبق

اوپر مفتی تقی عثمانی صاحب نے حضرت تھانویؒ کے وعظ کا حوالہ دیا ہے: جس کا سبق یہ ہے کہ مصافحہ اعتدال سے کرنا چاہیے؛ لیکن اس وعظ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے، جو یہاں نقل کیا جارہا ہے، یہ وعظ ''ملتِ ابراہیم'' کے نام سے ہے جو خطبات حکیم الامت میں چھپا ہوا ہے، اور تقریباً ۷۸ صفحات پر محیط ہے، کاتبِ وعظ نے وعظ کے اخیر میں جو کچھ لکھا ہے درجِ ذیل ہے، جس سے حضرت تھانویؒ کی انکساری کا اندازہ ہوتا ہے: حالاں کہ وہ بڑے اصولی انسان تھے، ایسی

بے اصولی عموماً ناپسند کرتے تھے، خیر کاتبِ وعظ کا آنکھوں دیکھا حال پڑھیے:

الحمد للہ رنگون کا یہ پہلا واقعہ جو نہایت زور وشور کے ساتھ ڈھائی گھنٹہ تک ہوتا رہا، ختم ہوا، بفضلہٖ تعالیٰ بہت زیادہ مجمع تھا، جس کا تخمینہ زائد از دو ہزار کیا گیا، سب لوگ نہایت متاثر تھے اور نہایت سکون کے ساتھ سنتے رہے؛ بعد وعظ بے حد اشتیاق کے ساتھ لوگوں نے مصافحہ کیا ایک، دوسرے پر گرتا تھا، بڑی مشکل سے وار آتا تھا، حضرت نے اپنے دو ہاتھ بڑھا دیئے تھے، اور لوگ تھے کہ مشتاقانہ بڑھ بڑھ کر چوم رہے تھے اور پروانہ وار ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے، ایسے موقع پر حضرت پر ایک عجیب حالتِ انکسار اور تواضع طاری ہوجاتی ہے، جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، حضرت دورانِ مصافحہ میں ہر شخص کی طرف نظرِ توجہ بھی ڈالتے جاتے ہیں؛ جیسا کہ دیکھنے والے پر مخفی نہیں رہتا؛ غرض عجیب دل فریب منظر ہوتا ہے، اور اس وقت حضرت پر ایک عجیب شانِ محبوبیت رہتی ہے۔ ختم شد، (خطباتِ حکیم الامت:۳۱/۴۰۰)

تعظیم وتکریم میں اعتدال مناسب ہے

حضرت تھانویؒ کی ایک تقریر ہے، جو سرائے میر (اعظم گڑھ) کے اسٹیشن پر ۲۸/صفر ۳۹ھ دوشنبہ ایک بجے شب ہوئی تھی؛ جب کہ مصافحہ میں لوگوں نے بہت تنگ کیا، اسٹیشن پر یہ حالت تھی کہ پلیٹ فارم پر پہنچنا مشکل ہوگیا اور دن بھر قصبہ سرائے میر میں بھی یہی ہوا تھا کہ ہر نقل وحرکت کے بعد جدید مصافحہ کرتے تھے؛ حتی کہ استنجے کو جاتے وقت بھی مصافحہ کرتے اور بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد پھر مصافحہ اور منع کرنے پر بھی نہ مانتے اور کپڑے اور ہاتھ پکڑ پکڑ کر مصافحہ کے لیے کھینچتے، اسٹیشن پر فرمایا تھا کہ تھانہ بھون کی ایک حکایت سن لو۔

ایک وقت میں چند شریروں کی کمیٹی قائم تھی، وہ شہر کے انتظامات میں بھی دخل دیتے تھے، اتفاق سے تھانہ بھون میں ایک میاں جی تشریف لائے؛ جو کہ بہت دیندار شخص تھے اُن کے آنے سے پہلے ایک میاں جی تھے، اُن کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ پر لوگ انہیں ترجیح دیں؛ اِس لیے انہوں نے اُن لڑکوں کو ایک عرضی لکھی: کہ اِن میاں جی کے رہنے سے مجھے اپنے نقصان کا اندیشہ ہے، اِن کے یہاں سے نکالنے کا انتظام کر دیا جائے، جب وہ عرضی پہنچی تو ایک لڑکے نے کہا: اِس کا انتظام میں کروں گا؛ پس وہ لڑکا اپنے گھر آیا اور اپنی ماں سے کہا: کہ میرے لیے دو روغنی روٹیاں پکا دو، آج میں دوپہر میں نہیں آؤں گا، مجھے کچھ کام ہے؛ پس آپ روٹیوں کو باندھ کر وہیں پہنچے، جہاں وہ نئے میاں جی تھے، وہ بے چارے اشراق کی نماز پڑھ رہے تھے جب وہ نماز سے فارغ ہوکر چلے تو آپ نے اُن کے سامنے جا کر سلام کیا انہوں نے جواب دیا، آپ نے دو قدم کے بعد سلام کیا انہوں نے دوبارہ بھی جواب دیا، چار قدم کے بعد پھر تیسری مرتبہ سلام کیا، اب وہ مُتغیر ہوئے کہ یہ قدم قدم پر سلام کیسا؟ اُس نے جب دیکھا کہ یہ چڑنے لگے پھر تو سلام کا تار باندھ دیا، اب وہ بے چارے بہت گھبرائے، ارادہ کیا کہ جس مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں چلے جائیں، اُس نے ہاتھ پکڑ لیا کہ کہاں چلے؟ میں تو سنت ادا کرتا ہوں اور آپ واجب کے ادا کرنے میں بھی سُستی کرتے ہیں؛ پس زبردستی گھر میں جانے سے روک دیا، جب کھانے کا وقت آیا اور انہوں نے اُس

وقت جانا چاہا، اُس نے روٹیاں سامنے رکھ دیں کہ کھانا یہاں کھا لیجیے، دوپہر میں سنت ادا کریں گے، وہ بے چارے ایسے گھبرائے کہ بستی چھوڑ کر بھاگ گئے...... مسکرا کر (حضرتؒ نے) فرمایا:

یہ بار بار مصافحہ کرنا اُن میاں جی کی طرح سے میرے بھی نکالنے کی ترکیب ہے، صاحبو! میں ویسے ہی نکل جاؤں گا ترکیبوں کی کیا ضرورت ہے؟

مصافحہ مُتمِّمِ سلام ہے

پھر فرمایا:

حدیث میں آیا ہے، إن من تمام تحیاتکم، المصافحة کہ مصافحہ تتمۂ سلام ہے، اور سلام کے لیے کچھ قواعد مقرر ہیں، تو مصافحہ کے لیے جو کہ اس کا تابع ہے بطریق اولیٰ ہوں گے مثلاً: لکھا ہے کہ اذان کے وقت سلام نہ کرو، کھانا کھاتے وقت سلام نہ کرو اور بھی مواقع ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ مشغولی کے وقت سلام نہیں کرنا چاہیے؛ اِس سے معلوم ہوا کہ مشغولی کے وقت مصافحہ بھی نہیں کرنا چاہیے، بہت سے علماء تو وداعی مصافحہ کو بھی بدعت کہتے ہیں؛ مگر خیر ہمارے علماء جائز کہتے ہیں؛ چوں کہ وداع کے وقت سلام تو نصوص سے ثابت ہے اور مصافحہ مُتمِّمِ سلام ہے تو مصافحہ بھی درست ہوا؛ مگر ہر چیز کی حد ہوتی ہے...... یہاں مصافحہ کی کوئی حد ہی نہیں ہے، استنجے کے بعد بھی مصافحہ، اٹھنے کے بعد بھی مصافحہ، بیٹھنے کے بعد بھی مصافحہ، اِسی واسطے میں نے یہ ترکیب کی تھی کہ کمرہ میں بیٹھ کر کواڑ بند کر لیتا تھا؛ اِس سے بہتوں کی دل شکنی ہوئی ہوگی؛ مگر کیا کیا جائے

اپنا تحمل بھی تو دیکھنا چاہیے، میری طبیعت کس قدر ہے، یہ سفر میں نے بغرض آسائش کیا ہے اور جب مصافحہ کی بھرمار ہوگی تو آسائش کہاں؟ نیز تعلیم کی بھی ضرورت ہے، کسی کے کان میں یہ پڑا ہی نہیں کہ ایسا مصافحہ نہ چاہیے؛ مصیبت یہ ہے کہ آج کل کے مشائخ بجائے اِس کے کہ اِس سے منع کریں اور اِس کی کوشش کرتے ہیں؛ کیوں کہ اِس سے اُن کی گرم بازاری ہوتی ہے، اِس واسطے میں نے اِس دل شکنی کو گوارا کیا کہ یہ بات یاد تو رہے گی۔ (خطباتِ حکیم الامت:۲۸/۵۴۲)

اشکال و جواب

یہاں ایک طالب علمانہ اشکال ہوسکتا ہے کہ کسی بزرگ ہستی کی آمد پر مصافحہ کی بھرمار ازراہِ محبت ہوتی ہے؟ اس بارے میں حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں:

محبت کی بھی حد ہونی چاہیے یہ نہیں کہ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے دوسرے کی تکلیف کا بھی خیال نہ کیا جائے، متنبّی کہتا ہے:

وأسكت كي ما لا يكون جواب یعنی میں خاموش رہتا ہوں؛ تا کہ محبوب کو جواب دینے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے، مصیبت یہ ہے کہ دین صرف نماز روزہ کا نام سمجھ لیا، دین کا ایک شعبہ یہ بھی تو ہے جو حدیث میں ہے وأحب لأخيك المسلم ماتحب لنفسك، تكن مسلماً یعنی دوسرے مسلمان کے لیے وہی بات پسند کرو جو اپنے واسطے کرتے ہو، تب مسلمان ہوگے جب اپنی تکلیف گوارا نہیں ہوتی، تو دوسرے کی تکلیف کیوں گوارا کی جائے؟ اِس کی تعلیم سے حدیثیں بھری پڑی ہیں کہ اپنے کسی فعل سے بھی دوسرے کو تکلیف نہ دی جائے، نہ قولاً نہ فعلاً۔ (خطباتِ حکیم الامت:۲۸/۵۴۴)

دوسری جگہ ہے:

ادب کے معنی لوگوں نے بار بار جھکنے، کھڑے ہونے اور آداب وتسلیمات لے لیے ہیں،حقیقت میں مودّب تھےتو صحابہ تھے؛ مگرنہ اُن میں بار بار اٹھنا تھا، نہ بار بار جھکنا تھا، نہ چبا چبا کر باتیں کرنا تھا؛ لیکن موقع پر دیکھیے کہ جان دینے میں بھی تأمل نہ تھا، زیادہ صورتِ تعظیم وتکریم کو اختیار کرنا، اِس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ شخص وقت پر کچھ کام نہ دے گا، نیز ایسی تعظیم سے دوسرے کا ضرر ہوتا ہے، اُس کے اندر عُجب پیدا ہوجاتا ہے۔(ایضاً:۲۸/۵۴۵)

آگے اپنی بات مدلل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: عنوان یہ ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا ادب

ہجرت کے واقعہ میں ہے کہ جب مسجد قبا میں آنے والے حضرت صدیق اکبرؓ سے، حضور ﷺ کے دھوکہ میں مصافحہ کرتے رہے، جب دھوپ چڑھ آئی تو حضرت صدیقؓ، حضور ﷺ پر چادر تان کر کھڑے ہوگئے، تب معلوم ہوا کہ حضور ﷺ یہ ہیں، سو حضور ﷺ اِس قدر سادگی سے رہتے تھے، اب یہاں قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ معلوم ہونے پر دوبارہ حضور ﷺ سے کسی نے مصافحہ نہیں کیا؛ نیز یہ کہ حضرت صدیقؓ نے حضور ﷺ کو تکلیف سے بچانے کے لیے خود ہی سب سے مصافحہ کیا، کہیے کیا ادب ہے، حقیقی ادب اِس کو کہتے ہیں، کس جانثاری سے لوگ آتے تھے، اور اُن کے لیے مصافحہ کس درجہ نعمتِ غیر مترقبہ تھی؛ مگر اپنی خواہش پوری کرنے کے مقابلہ میں حضور ﷺ کی تکلیف کا زیادہ پاس کیا......

آج کل تو لوگ غضب کرتے ہیں، میں ایک مرتبہ گردن جھکائے وظیفہ پڑھتا تھا، ایک شخص آئے اور مصافحہ کے لیے کھڑے رہے، میں نے آنکھیں بند کرلیں تاکہ وہ چلے جائیں؛ مگر وہ اِس پر بھی نہ گئے، اور پکار کر کہا کہ مصافحہ، میں نے بھی کہہ دیا کہ وظیفہ اور بعض لوگ تو کندھا پکڑ پکڑ کر کھینچتے ہیں کہ مصافحہ کرلیجیے، مصافحہ کیا ہوا بلائے جان ہوگیا، اور پھر کتنا ہی کہیے کوئی سنتا ہی نہیں، ابھی ایک شخص کو منع کیا اور دوسرا اُسی طرح مصافحہ کرنے کو تیار......اور یہ رسم قابلِ اصلاح ہے کہ مسافر چلتے وقت؛ جب کہ اسباب باندھتا ہوتا ہے، اُس وقت اُس کو گھیرتے ہیں، اُس وقت اُس کو مخلّٰی بالطبع چھوڑ دینا چاہیے، جب تک اسباب باندھے اُس سے ہٹ کر ایک طرف بیٹھ جانا چاہیے؛ ہاں اُس کی اعانت کے واسطے اگر ایک دو آدمی پاس رہیں جن سے بے تکلفی ہو تو خیر، جب تہیہ سفر کر چکے تو اطمینان سے مل لیں۔ (ایضاً)

مصافحہ میں ہاتھ بڑھانا ایک اخلاقی ذمہ داری

حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے: کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو سلام کیا، آپ وضو فرما رہے تھے سلام کا جواب نہیں دیا؛ حتی کہ جب آپ وضو سے فارغ ہوئے تو سلام کا جواب دیا اور ہاتھ بڑھا کر مصافحہ بھی کیا۔ (کنزالعمال:۲۵۷۱۸)

دورانِ وضو کوئی سلام کردے تو فوری جواب دینا بھی جائز ہے، اور اِس کی بھی گنجائش ہے کہ وضو مکمل کرکے، سلام کا جواب دے؛ تاکہ اعضاءِ وضو دھونے میں خلل واقع نہ ہو۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ نے وضو سے فراغت کے بعد سلام کا جواب دیا اور خود ہی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، حضور ﷺ کا یہ طرزِ عمل آپ کی خاکساری اور تواضع کا عکاس ہے،

بعض لوگ تواضع اختیار کرنے کو اپنی آن اور شان کے خلاف سمجھتے ہیں، سلام ومصافحہ یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جن میں پہل کرنا، تواضع وخاکساری کی دلیل ہے، انسان اِن دونوں چیزوں میں بسا اوقات پہل نہیں کرتا، راستہ کاٹ کر نکل جاتا ہے؛ اِس کی وجہ تواضع کی کمی ہوتی ہے، یہ نکتہ ہمیشہ ہر مسلمان کو یاد رکھنا چاہیے؛ بلکہ یہ ایک اسلامی حقیقت ہے کہ تواضع انسان کی پستی کی وجہ نہیں؛ بلکہ تواضع عند اللہ انسان کی رفعت وبلندی کا ایک یقینی ذریعہ ہے، یقین نہ ہو تو تجربہ کر کے دیکھئے، درخت کی وہی شاخیں جھکی ہوتی ہیں، جن پر پھل ہوتے ہیں، اور لوگوں کو سایہ بھی انہیں درختوں سے حاصل ہوتا ہے، اور جن درختوں پر پھل نہیں ہوتے، وہ دیکھنے میں بڑے لمبے اور مینار جیسے ہوتے ہیں؛ لیکن دھوپ میں اُن سے سایہ بھی نہیں ملتا، کوئی مسافر وہاں رکنا پسند نہیں کرتا؛ حتی کہ جانور بھی نہیں، مصافحہ میں ہاتھ بڑھائیے، تواضع کی دولت ملے گی۔

مصافحہ کے بعد ہاتھ چومنا ضروری نہیں

مصافحہ کرنے کے بعد بعض علاقوں میں ہاتھ چومنے کی رسم ہے، اِس سے بچنا چاہیے؛ کیوں کہ اصل سنت تو مصافحہ ہے، ہاتھ چومنا گو جائز ہے؛ لیکن سنت نہیں ہے اور یہ شوقِ محبت میں ہوتا ہے اور یہ ایک وجدانی بات ہے، کسی وقت شوق وجوشِ محبت کا غلبہ ہوتا ہے اور کسی وقت نہیں ہوتا، جب نہ ہو تو اُس وقت محض تصنع ہے جس سے بچنا چاہیے، اور ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ بعض طبائع پر توحید کا غلبہ ہوتا ہے، انہیں یہ فعل نہایت گراں معلوم ہوتا ہے؛ اِس لیے ان کی گرانی کا خیال کرتے ہوئے بھی اِس سے بچنا چاہیے۔

مصافحہ کرتے وقت کچھ دینا

بعض مرتبہ کسی خاص تقریب میں لوگ مصافحہ کرتے ہوئے ہاتھ میں روپے یا روپے کا لفافہ دیتے ہیں، اِس کا رواج کثرت سے ہو چکا ہے، اِس رواج کو ختم کرنا چاہیے، مصافحہ کی سنت میں یہ چیز زائد ہے، اِس کی وجہ سے اصل سنت کے ساتھ ایک دنیاوی چیز کا تلوُّث ہو جاتا ہے، جو اچھی بات نہیں، حضرت تھانویؒ نے اِس سے منع لکھا ہے۔ دیکھیے (اسلامی تہذیب:۶۹)

خوشی کے موقع پر مبارک بادی اور مصافحہ

انسان کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جن میں وہ بہت خوش ہوتا ہے، اور یہ خوشی اُس وقت دو چند ہوتی ہے جب اُس خوش کن خبر کی اطلاع کوئی دوسرا آکر دے، ایسے مواقع پر بھی صحابہ کرامؓ سے مصافحہ ثابت ہے؛ عموماً خوش کن خبر پر ایک دوست، ایک بھائی، دوسرے دوست اور بھائی کو مبارک باد دیتا ہے، اِس سلسلے میں صحابہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ سلام ومصافحہ پہلے کرتے تھے پھر مبارک بادی کے گلدستے پیش کرتے تھے، اور صحابہ کرامؓ کا یہ طرز عمل حد درجہ کی آپسی محبت وخلوص کا عکاس ہوا کرتا تھا، امام بخاریؒ نے باب المصافحۃ کے تحت حضرت کعب بن مالکؓ کی حدیث کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے، جس سے مصافحہ اور مبارک بادی کا ثبوت ہوتا ہے، حدیث کا ٹکڑا پڑھنے سے پہلے یہ ذہن میں رہے کہ غزوہ تبوک میں چند صحابہ کرام کی شرکت نہ ہوسکی تھی، اُن میں سے ایک حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بھی تھے، نبی کریم ﷺ ناراض تھے، یہ سلام کرتے تھے تو حضور ﷺ کے ہونٹ حرکت نہیں کرتے تھے، مسلمانوں نے بات چیت بند کردی تھی؛ لیکن حضرت کعب بن مالکؓ نے سچی توبہ کی، اور قبولیتِ توبہ پر آیت کا نزول ہوا، جس مجلس میں اُن کی توبہ کی قبولیت کی آیت اتری، حضرت کعبؓ موجود نہیں تھے، حضرت کعبؓ کی زبانی سنیے: اور خیال رہے کہ یہ واقعہ حضور ﷺ کے سامنے پیش آیا ہے۔

قال كعب بن مالك: دخلتُ المسجدَ؛ فإذا برسول الله ﷺ، فقام إليَّ طلحة بن عبيد الله يهرول حتى صافحني وهنأني. (عمدۃ القاری ۱۵/۳۷٦)

حضرت کعب بن مالک کہتے ہیں: میں مسجد نبوی میں جوں ہی داخل ہوا نبی کریم ﷺ پر نظر پڑی، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ میری جانب بڑی تیزی سے بڑھے اور مجھ سے مصافحہ کیا اور قبولیتِ توبہ پر مجھے مبارک باد دی۔

حضرت کعبؓ نے حضرت طلحہؓ کے کھڑے ہونے کو اور اُن سے مصافحہ کرنے کو اپنی زندگی کا اور زندگی کی باہمی الفت ومحبت کا ناقابل فراموش واقعہ قرار دیا اور اُن کے مصافحہ کرنے اور مبارک بادی پیش کرنے کو تاحیات بھلا نہ سکے، کاش ہم وہ منظر دیکھ پاتے تو ہمیں بھی اُس مصافحہ اور اُس مصافحہ پر مرتّب ہونے والی ناقابل فراموش محبت ومُودّت کا حد درجہ یقین ہوتا، اسی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے، حضرت کعب بن مالک کہتے ہیں:۔

فوالله لا أنساها لطلحة أبدا. اللہ پاک کی قسم! حضرت طلحہؓ کا یہ طرزِ عمل میں کیوں کر بھول سکتا ہوں (بخاری)

ابن بطالؒ کا اس ٹکڑے پر تبصرہ ہے:

فأخبر بعظيم موقع قيام طلحة إليه من نفسه ومصافحته له وسروره بذلك وكان عنده أفضل الصلة والمشاركة له. (شرح ابن بطال:۹/۴۸)

یعنی حضرت کعبؓ نے، حضرت طلحہؓ کے اُن کی جانب آنے کو، مصافحہ کرنے کو اور اس کی وجہ سے حاصل ہونے والی مسرت وشادمانی کو اپنی زندگی کا ایک عظیم واقعہ قرار دیا اور اسے بہترین تعلق اور باہمی رواداری کا ذریعہ قرار دیا۔

لہٰذا خوشی کے مواقع پر ہم مسلمانوں کو اِس طرزِ عمل کو اپنانا چاہیے، ایسے مواقع پر صرف اظہارِ خوشی اور میٹھائی کھانے کھلانے پر ہی بس نہیں کرنا چاہیے، یہ سب بھی جائز ہیں؛ لیکن پہلے سلام ومصافحہ پھر مبارک بادی، اور سلام ومصافحہ اور مبارک بادی کے اِس گلدستے میں جو پھول ہوں اُن میں خلوص کی خوشبو وشیرینی ضرور ہونی چاہیے؛ تاکہ اُس خوشبو سے محبت والفت اور انبساط وشادمانی کی فضا معطر ہوسکے، آپ خلوص کے ساتھ ایسا کریں، مصافحہ کی خاصیت ہی الفت ومحبت کو جنم دینا ہے، ابن بطالؒ نے سچ کہا:

وهي مما تنبت الود والمحبة. کہ مصافحہ ایک ایسا بیج ہے، جس

سے محبت ومودت کے پھول کھلتے ہیں؛ ہاں مگر آبیاری کے لیے خلوص واخلاص چاہیے۔

مصافحہ کے وقت دونوں کا رخ ایک دوسرے کی طرف ہونا چاہیے

مصافحہ کرتے وقت دونوں شخصوں کو ایک دوسرے کی طرف رخ کرنا چاہیے، فقہاء نے مصافحہ کا جو طریقہ لکھا ہے اُس میں اِس کی صراحت ہے؛ چناں چہ ردالمحتار میں ہے:

مصافحہ کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں سے ہو، براہِ راست ہاتھ، ہاتھ سے ملایا جائے، کپڑا حائل نہ ہو، ملاقات کے وقت کیا جائے، پہلے سلام کیا جائے پھر مصافحہ، مصافحہ کے وقت دونوں کا رخ ایک دوسرے کی طرف ہونا چاہیے۔ (ردالمحتار: ۲۴۴/۵)

اس سے معلوم ہوا کہ مصافحہ کا وہ طریقہ غلط اور خلاف سنت ہے، جس میں دو ملاقات کرنے والوں کا رخ آمنے سامنے نہ ہو؛ چناں چہ بعض موقعوں پر؛ بالخصوص جب دونوں اپنی تصویر کیمرے میں قید کرانے کا ارادہ رکھتے ہوں، اُس وقت اِس انداز میں مصافحہ کیا جاتا ہے کہ دونوں کے رخ آمنے سامنے کے بجائے کیمرے کے سامنے ہو جائیں؛ تاکہ دونوں کے چہرے تصویر میں آسکیں؛ عموماً لیڈر قسم کے لوگ ایسا کرتے ہیں، اخبارات میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، لکھنا یہ ہے کہ کوئی مسلمان اگر ایسے مصافحہ کرے، تو وہ رسمی مصافحہ کہلائے گا، شرعی نہیں، دنیاوی مقصد کے حصول کی خاطر کیا جاسکتا ہے، اُخروی ثواب کے حصول کے لیے کافی نہیں۔

مصافحہ رخصت ہوتے وقت جائز ہے

(۱) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ حضور ﷺ جب کسی کو رخصت کرتے تھے، تو اس کا ہاتھ پکڑتے، آپ اُس کا ہاتھ نہیں چھوڑتے تھے؛ یہاں تک وہ شخص خود ہی حضور ﷺ کا ہاتھ چھوڑ دیتا، اور یہ دعا دیتے: استودع اللہ دینَك وأمانتَك وآخرَ عملك اور ایک روایت میں وخواتيم عملك ہے۔ (مشکوۃ: ۲۱۴/۱، ترمذی: ۳۴۴۲)

مصافحہ کی مشروعیت اظہار محبت کے لیے ہے اور اظہارِ محبت کا موقع جیسے اولِ لقاء ہے، ایسے ہی وقتِ وداع بھی ہے؛ چناں چہ سلامِ وداع بھی اِسی لیے ہے، اور اِسی لیے پوری دنیا میں اِس کا دستور رہے۔ (احسن الفتاویٰ ۸/۴۰۶)

حضرت تھانویؒ نے رخصت کے وقت مصافحہ جائز ہے یا نہیں؟ کے جواب میں لکھا ہے: اختلاف ہے' اور مجوزین کی دلیل دو حدیثیں ذکر کی ہیں، ایک فعلی جو اوپر ابن عمرؓ کے حوالے سے گذری، اور دوسری قولی وتمام تحياتكم بينكم المصافحة (رواہ احمد والترمذی وضعفہ) اور استدلال یوں کیا ہے کہ جب سلام بوقت وداع مشروع ہے تو مصافحہ جو سلام کا تکملہ ہے بوقتِ وداع بدرجہ اولیٰ مشروع ہوگا، اور حدیث کا ضعف، ثبوتِ فضائل میں مضر نہیں۔

(امداد الفتاوی: ۴/ ۲۹۲)

بذل المجہود کے حاشیہ میں ہے:

> لوگوں میں مشہور ہے کہ واپسی اور رخصتی کے وقت مصافحہ کا ثبوت نہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔
>
> والمشهور على الألسنة أن المصافحة عند الوداع لا تثبت، وليس بصحيح، لروايات ذكرتها على هامش "جمع الفوائد" (۲/ ۱۴۱) (حاشیہ بذل المجہود: ۱۳/ ۵۹۶)

رخصتی اور الوداعی مصافحہ کے وقت کیا پڑھیں؟

رخصتی کے وقت مصافحہ کرتے ہوئے بھی دعا پڑھنی چاہیے مثلاً: يغفر الله لنا ولكم اور اگر کوئی عازمِ سفر ہو تو جس سے وہ مصافحہ کر رہا ہے اسے أستَودِعُ اللهَ دِينَك وأمَانتَك خَواتِيمَ عَمِلِكَ پڑھنا چاہیے جیسا کہ اوپر حدیث میں گذرا۔(۱)

(۱) دعا کا ترجمہ: میں تیرا دین، تیری ہر قابل حفاظت چیز اور تیرا آخری عمل اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہوں۔ في أمان الله، راشداً مَهْدِياً، سَالِماً غَانِماً جیسے کلماتِ دعائیہ بھی بول سکتے ہیں۔

عورتوں کا باہم مصافحہ ومعانقہ

سوال: (۲۰۷۸) کیا عورتیں آپس میں مصافحہ کرسکتی ہیں اور کیا گلے مل سکتی ہیں؟

جواب: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ما من مسلمين يلتقيان، فيصافحانِ إلا غفرلهما قبل أن يتفرقا.

دو مسلمان جب بھی آپس میں ملتے ہیں اور مصافحہ بھی کرتے ہیں،تو الگ ہونے سے پہلے اُن کے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔

اسی لیے ملاقات کے وقت مصافحہ کے مسنون ہونے پر امت کا اجماع واتفاق ہے۔

المصافحة سنة مجمع عليها عند التلاقي. (فتح الباری:۱۱/۵۷)

رسول اللہ ﷺ نے،اس میں مَردوں اورعورتوں کی کوئی تفریق نہیں فرمائی،نہ فقہاء نے فرق کیا ہے؛اس لیے جیسے ایک مرد دوسرے مرد سے مصافحہ ومعانقہ کرسکتا ہے، اسی طرح ایک عورت کا دوسری عورت سے بھی مصافحہ ومعانقہ کرنا سنت اور مسنون ہے۔

(کتاب الفتاویٰ:۶/۱۲۷)

مصافحہ کے لیے ہاتھ میں خوشبو لگانا

حضرت ثابت البنانی سے مروی ہے: کہ حضرت انسؓ اپنے دوستوں اور بھائیوں سے مصافحہ کے لیے صبح کو اپنے ہاتھ میں خوشبو لگایا کرتے تھے۔(الادب المفرد،رقم:۹۴۹،باب من دھن یدہ)

تشریح: مصافحہ میں چوں کہ ایک آدمی کا ہاتھ،دوسرے آدمی کے ہاتھ سے لگتا ہے،اب اگر ہاتھوں میں خوشبو لگی ہوتو دوسرے کا ہاتھ بھی معطر ہوجائے گا،اُسے دلی خوشی ہوگی،طبیعت باغ باغ ہوجائے

گی ،بعض بزرگوں کا یہ طریقہ رہا ہے؛ اگر چہ مصافحہ کے لیے یہ کوئی لازمی امر نہیں ہے۔

کیا مجلس میں سب سے مصافحہ کرنا ضروری ہے؟

حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

بعضے آدمی مجلس میں پہنچ کر سب سے الگ الگ مصافحہ کرتے ہیں؛ اگر چہ سب سے تعارف نہ ہو، اِس میں بہت وقت صَرف ہوتا ہے اور فراغ تک تمام مجلس مشغول اور پریشان رہتی ہے، مناسب یہ ہے کہ جس کے پاس قصد کر کے آئے ہو، اُس سے مصافحہ پر کفایت کرو؛ البتہ دوسروں سے بھی تعارف ہوتو مضائقہ نہیں۔

(آداب المعاشرت مع اصلاحی نصاب:۴۷۰)

مردوں کا عورتوں سے مصافحہ کرنا: جائز وناجائز کا معیار

سلام کی بحث میں یہ بات گذر چکی ہے کہ مردوں کا عورتوں کو کہاں سلام کرنا جائز ہے اور کہاں ناجائز ہے، وہ بحث ایک بار پھر پڑھ لی جائے، یہاں عرض یہ کرنا ہے کہ سلام میں تو صرف زبان سے آواز نکلتی ہے، وہاں فتنہ وفساد کا اعتبار فقہاء نے کیا ہے، اور مصافحہ میں ایک کا ہاتھ دوسرے سے ملتا ہے، مَس ہوتا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جس کو دیکھنا ناجائز ہے، اُس کو چھونا بھی ناجائز ہے؛ بلکہ چھونے میں قباحت زیادہ شدید ہے۔

وقد قال أصحابنا: كل من حرم النظر إليه حرم مسه؛ بل المس أشد. (الاذکار:۳۰۴)

اس اصول سے مصافحہ کا مذکورہ مسئلہ آسان ہو جاتا ہے، اس کی روشنی میں چند مسائل لکھے جاتے ہیں:

مسئلہ: اجنبیہ جوان لڑکی یا عورت سے مرد کا مصافحہ کرنا حرام ہے۔

مسئلہ: ایسی بوڑھی عورت جس کی طرف جنسی جذبات مائل نہ ہو سکتے ہوں، اُن سے مصافحہ

کرنے کی ضرورت ہو تو کر سکتے ہیں۔

مسئلہ: اسی طرح کوئی شخص اتنا بوڑھا ہو چکا ہے کہ جنسی جذبات کی فتنہ خیزیوں سے محفوظ اور بے خوف ہو چکا ہے، اس سے کوئی جوان عورت مصافحہ کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔

مسئلہ: عورت کی طرح شہوت کے ساتھ خوش شکل اور بے ریش لڑکے سے بھی مصافحہ نہ کرنا بہتر ہے۔

مسئلہ: اپنی بیوی سے مصافحہ کرنا جائز ہے۔

مسئلہ: ماں، بہن، بیٹی، بھتیجی، بھانجی یعنی ایسی عورتیں جو محرم ہیں، جن کو دیکھنا جائز ہے، اُن سے مصافحہ کر سکتے ہیں؛ لیکن اگر کسی کو اپنے نفس پر کنٹرول نہیں ہے؛ جیسا کہ اس دور کی فتنہ خیزی نے اور اخلاق سوز مواد اور انٹرنیٹ وفیس بک کے منفی یوز (Negetive Use) نے انسانیت کے اخلاق کو تباہ وبرباد اور تہہ وبالا کر دیا ہے، اِن حالات میں ایک شخص کا ہر جوان عورت سے مصافحہ ممنوع ہونا چاہیے، الا ماشاء اللہ اور الا من شاء اللہ. تفصیل کے لیے دیکھیے (الدر مع الرد: ۹/۵۲۹)

کیا سماجی تعلقات کی بنیاد پر عورتوں سے مصافحہ کر سکتے ہیں؟

آج کے دور میں مغربی تہذیب کے مطابق عورتیں، مَردوں کے مساوی ہیں؛ چناں چہ اس کلیہ کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیا گیا اور ہر جگہ عورتوں کی نمائندگی ہونے لگی؛ چناں چہ پارٹی میں، آفس میں، کمپنی میں، میٹنگوں میں، بینکوں میں اور تجارتی وسفارتی پروگراموں میں اور سیاسی تقریبات میں ہر جگہ مردوں کے شانہ بشانہ عورتیں ملیں گی، بدقسمتی یہ کہ مسلمان عورتیں بھی ملیں گی؛ مگر اِن مواقع پر، مسلمان مردوں کا، غیر مسلم عورتوں سے مصافحہ کرنا، یا مسلم عورتوں کا، غیر مسلم مردوں سے مصافحہ کرنا یا مسلم مردوں کا مسلم عورتوں سے مصافحہ کرنا، شرعاً ناجائز ہے، سخت گناہ ہے، اسلامی روح کے خلاف ہے، حضور ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ عورتوں سے بیعت کے وقت بھی مصافحہ نہیں کرتے تھے۔

ابتلى بعض المسلمين في هذا العصر بتقليد غيرهم في مصافحة المرأة

الأجنبية والانحناء بحجة احترامها، وهذا أمر مناف لأحكام الشرع ومخالف لهدي النبي صلى الله عليه وسلم الذي لم تمس يده يد امرأة أجنبية قط. (نزھۃ المتقین: ۱/۵۹۸)

فرشتوں کا علانیہ مصافحہ کرنا

حضرت حنظلہ ابن ربیع اسیدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: کہ ایک مرتبہ مجھ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہوئی تو وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ حنظلہ کیا حال ہے؟ میں نے کہا: حنظلہ تو منافق ہوگیا (یعنی حال کے اعتبار سے، ایمان کے اعتبار سے نہیں) حضرت ابوبکرؓ نے کہا سبحان اللہ یہ تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا: جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہیں اور جس وقت آپ ہمیں جنت ودوزخ کے بارے میں بتاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم جنت ودوزخ کو کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں؛ مگر جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے جدا ہوتے ہیں اور اپنی بیویوں، بچوں اور زمین جائیداد میں مشغول ہوتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: خدا کی قسم ہم بھی اسی حالت سے دوچار ہیں، اس کے بعد، میں اور حضرت ابوبکرؓ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! حنظلہ منافق ہوگیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، کیا مطلب؟ تو میں نے پوری تفصیل بتادی۔

یہ سن کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم پر ہمیشہ وہی کیفیت طاری رہے جو میری صحبت اور حالتِ ذکر میں تم پر ہوتی ہے (یعنی تم ہر وقت صاف دل اور اللہ سے ڈرنے والے رہو) تو یقیناً فرشتے تم سے تمھارے بچھونوں پر اور تمھاری راہوں میں مصافحہ کریں؛ لیکن اے حنظلہ! یہ ایک ساعت ہے اور وہ ایک ساعت ہے یہ آپ نے تین مرتبہ فرمایا: (مسلم، باب فضل دوام الذکر والفکر، رقم الحدیث: ۲۷۵۰)

تشریح: اگر کسی شخص کی حالت اور دلی کیفیت بَشَری موانع اور نفسانی خواہشات کے باوجود ایسی ہوجائے جو حدیث میں بیان کی گئی ہے تو وہ واقعی فرشتوں کو دیکھ سکتا ہے، مصافحہ کرسکتا ہے، کاش ہماری ایسی کیفیت کسی وقت ہوتی۔

اور بقول ملا علی قاریؒ: کہ ''فرشتے تم سے مصافحہ کریں'' کا مفہوم یہ ہے کہ ایسی صورت میں فرشتے علانیہ سب کے سامنے تم سے مصافحہ کرتے نظر آئیں اور تم اُن کو مصافحہ کرتے دیکھو، علانیہ کی قید اِس لیے لگائی گئی ہے کہ ویسے تو فرشتے اہلِ ذکر سے خفیہ طور پر مصافحہ کرتے ہی ہیں کہ جس کو دنیاوی نظریں نہیں دیکھ پاتیں۔ (مرقاۃ المفاتیح: ۶۱/۵)

''بچھونوں پر اور راہوں میں'' سے مراد ہے حالت فراغت اور حالتِ مشغولیت، مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں چاہے تم کسی کام میں مشغول رہتے اور چاہے فارغ ہوتے، ہر وقت اور ہمیشہ فرشتے تم سے مصافحہ کرتے رہتے۔ (مظاہر حق جدید: ۱۰۶/۳)

(دوسری فصل)

مصافحہ میں دعا کا ثبوت — غفلت،سببِ غفلت اور اصلاح

اسلامی مصافحہ اور غیر اسلامی مصافحہ میں فرق یہ ہے کہ اسلامی مصافحہ کرنے والے رب کائنات سے مغفرت کی درخواست کرتے ہیں اور غیر اسلامی مصافحہ دعاءِ مغفرت سے خالی ہوتا ہے،اسلامی مصافحہ سے گناہ جھڑتے ہیں،اس سلسلے میں ایک حدیث ہے:

عن البراء بن عازب: قال: قال رسول ا للهﷺ: وما من مسلمين يلتقيان، فيتصافحان، إلا غفر لهما قبل أن يتفرقا. (ترمذی:۲۷۳۳،باب المصافحۃ)

حضورﷺ نے فرمایا: جو بھی دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں پس وہ مصافحہ کرتے ہیں تو دونوں کے جدا ہونے سے پہلے دونوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

اس حدیث میں بوقتِ مصافحہ دعا پڑھنے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے،سوال یہ ہے کہ اس موقع پر دعا پڑھی جائے یا نہیں،اور دعا پڑھی جائے تو کون سی؟ اِس سلسلے میں پہلی بات تو یہ یادرکھنے کی ہے کہ مذکورہ روایت میں اگر چہ دعا پڑھنے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے؛لیکن دوسری روایت جو حضرت براء بن عازبؓ سے ہی مروی ہے،اُس سے پتہ چلتا ہے کہ بوقتِ مصافحہ مغفرت کی دعا اور اللہ کی تعریف کرنی چاہیے،حدیث پڑھیے:

عن البراء بن عازب قال: قال رسول اللهﷺ: إذا التقى المسلمان فتصافحا وحمدا الله واستغفراه غفر لهما. (ابوداؤد:۵۲۱۱،باب فی المصافحۃ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مغفرت کے لیے،دعاءِ مغفرت اور اللہ کی تعریف ضروری

ہے، لہٰذا مصافحہ کرتے وقت دعا کرنے کی قید پہلی روایت میں بھی ہوگی۔

مفتی سعید احمد صاحب لکھتے ہیں:

> یہ حدیث (پہلی روایت) اتنی مشہور ہوگئی کہ مصافحہ سے دعا رخصت ہوگئی؛ حالاں کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ ہی سے یہ حدیث ابوداوٗد میں اس طرح مروی ہے إذا التقى المسلمان، فتصافحان، وحمدا الله، واستغفراه غفرلهما. اور اس کی سند اعلیٰ درجہ کی ہے اور حادثہ واحدہ میں مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے، پس ترمذی کی روایت میں اگر چہ استغفار کا ذکر نہیں ہے، مگر اس کو بڑھایا جائے گا اور غفر الله لهما اس کا قرینہ ہے۔ (تحفۃ الالمعی: ۶/۵۰۵)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: جب دو مسلمان آپس میں ملیں تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑیں یعنی مصافحہ کریں تو اللہ پر حق ہے کہ وہ دونوں کی دعا میں حاضر ہوں اور دونوں کو جدا نہ کریں یہاں تک کہ دونوں کو بخش دیں۔ (الترغیب: ۳/۴۳۲)

معلوم ہوا کہ دعا کرنی چاہیے؛ اگر دعا ہی نہیں کریں گے تو بخشش کا کیا مطلب؟

مصافحہ کے وقت "يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ" پڑھا کیجیے

مصافحہ کی روایتوں میں عموماً مغفرتِ خداوندی کا تذکرہ ملتا ہے، اس لیے اِس موقع پر مغفرت کی دعا پڑھنی چاہیے اور دعا کے لیے يغفر الله لنا ولكم کا انتخاب مستحب ہے، یہ دعا اگر چہ حدیث کے الفاظ نہیں ہیں؛ لیکن شراح حدیث نے اِس دعا کا تذکرہ ہے، مولف نے اپنی ناقص تلاش میں جن کتابوں میں اس کا تذکرہ دیکھا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) وفي الحديث سنية المصافحة عند اللقى وأنه يستحب عند المصافحة حمد الله تعالىٰ والاستغفار وهو قوله "يغفر الله لنا ولكم".

(عون المعبود: ۱۴/۸۱، تحفۃ الاحوذی: ۷/۴۲۹)

(۲) مصافحہ کی دعا: جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے مصافحہ کرے تو کہے: یغفر الله لنا ولکم (اللہ ہماری اور آپ کی بخشش فرمائیں) اور دوسرا بھی یہی کہے اور دونوں- سلام کی طرح- یہ ذکر جہراً کریں۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ: ۳۶۶/۴)

(۳) پھر مصافحہ کے ساتھ ہر ایک سلام کی طرح زور سے کہے: یغفر الله لنا ولکم اللہ میری اور آپ کی مغفرت فرمائیں، پھر مزاج پرسی کے وقت دونوں اللہ کی تعریف کریں اور ہر حال میں اللہ کا شکر بجالائیں تو دونوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ (تحفۃ الالمعی: ۵۰۱/۶)

(۴) فائدہ: حمد کی صورت یہ ہے کہ خیریت وحال پوچھنے پر الحمد للہ کہا جائے اور دعاءِ مغفرت کی صورت یہ ہے کہ یغفر الله لناولکم کہا جائے، ہر ایک اپنے لیے اور دوسرے کے لیے مغفرت کی دعا کرے۔ (الدعاء المسنون: ۴۴۱)

اس اہم دعا کی شہرت کیوں نہ ہوسکی؟

عموماً دعاؤں کی عربی اور اردو کتابوں میں مستقل عنوان بنا کر یہ دعا نہیں لکھی گئی ہے، اور اِس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مصافحہ کی دعا کے بعینہ یہ الفاظ حدیث میں نہیں ہیں۔

مفتی محمود صاحبؒ لکھتے ہیں:

> مصافحہ کرتے ہوئے ہاتھ کو جو ہلاتے ہیں اس طرف اشارہ ہے کہ گناہ جھڑ رہے ہیں، اس لیے یغفر الله لنا ولکم پڑھتے ہیں، اگر چہ حدیث شریف میں اسکے پڑھنے کا ثبوت نہیں۔
>
> (ملفوظات فقیہ الامت: ۱۸/۲)

لیکن احادیث سے نفسِ دعاءِ مغفرت کا ثبوت ملتا ہے، ممکن ہے بعد کے محدثین فقہاء نے یغفر الله لنا ولکم کے الفاظ میں یہ دعا اپنی کتابوں میں لکھی جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ جامع بھی ہے اور یاد کرنے میں آسان بھی؛ الغرض اکثر محدثین اور فقہاء نے اس بنیاد پر اس دعا کو اپنی کتابوں میں نہیں لکھا کہ الفاظ، حدیث کے نہیں ہیں، مصافحہ کرنے والے پر الفاظ کا انتخاب چھوڑ

دیا، اور دوسرے محدثین نے الفاظ خود سے طے کر دیے؛ کیوں کہ ان الفاظ کی تائید مضمونِ حدیث سے ہوتی ہے؛ نیز الفاظ طے کرنے میں عجمیوں کے لیے زیادہ سہولت ہے کہ وہ عربی کے الفاظِ مغفرت پر مکمل طور سے قادر نہیں ہوتے، اُن کے لیے یغفر الله لنا ولكم پڑھنا بہت آسان ہے اور اس کو طے کر دینے سے موزونیت برقرار رہے گی، کہ جیسے سارے مسلمان السلام علیکم کے الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں، ویسے ہی مصافحہ کے وقت سارے مسلمان ایک رنگ میں ہی رنگ کر یغفر الله لنا ولكم کہیں۔

مفتی سعید احمد پالن پوری دامت برکاتہم رحمۃ اللہ الواسعۃ میں لکھتے ہیں:

نوٹ: مسنون دعاؤں کی کتابوں میں کسی وجہ سے یہ دعا شامل نہ ہوسکی؛ اس لیے لوگوں کے مصافحے بے دعا ہو کر رہ گئے؛ اس لیے شارح (شارح حجۃ اللہ البالغۃ) نے یہ دعا بڑھائی ہے، لوگوں کو چاہیے کہ اس کا اہتمام کریں اور مصافحہ کے ساتھ یا بعد میں مزاج پرسی کے وقت ہر حال میں اللہ کی تعریف کریں۔

(رحمۃ اللہ الواسعۃ: ۳۶۶/۴)

اُن کی دوسری کتاب تحفۃ الالمعی میں ہے:

ملحوظہ: لوگوں میں مصافحہ کی دعا کے سلسلے میں غفلت پائی جاتی ہے، لوگ سلام ہی کو مصافحہ کی دعا سمجھتے ہیں؛ بلکہ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ جو "مسنون دعائیں" چھپی ہیں، ان میں مصافحہ کی دعا نہیں؛ البتہ جماعتِ اسلامی نے جو مسنون دعائیں چھاپی ہیں، اُس میں مصافحہ کی دعا ہے۔

اور عام طور پر جو "مسنون دعائیں" چھپتی ہیں اُس میں مصافحہ کی دعا اِس لیے نہیں ہے کہ یہ کتاب امام نوویؒ کی کتاب الاذکار اور

ابن الجزری کی حصن حصین سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے، اوران دونوں کتابوں میں کسی وجہ سے مصافحہ کی دعا نہیں آئی؛ اس لیے مسنون دعاؤں میں وہ دعا رہ گئی اور اِس طرح پوری امت مصافحہ کی دعا سے محروم ہوگئی، پس لوگوں کو چاہیے کہ دعا کا اہتمام کریں اور یہ سنت زندہ کریں، مردہ سنت کو زندہ کرنے کا بڑا ثواب ہے۔(تحفۃ الالمعی: ۶/۵۰۲)

مصافحہ کے وقت کی مزید دعاؤں کا ثبوت

علامہ نوویؒ کی کتاب الاذکار، دعاءِ نبوی کا مستندترین ذخیرہ ہے، مصافحہ کے وقت کی دعا "یغفر اللہ لنا ولکم" لفظوں میں تو مذکور نہیں ہے، جس کی وجہ پیچھے ذکر کی گئی ہے؛ تاہم انہوں نے دعاءِ مغفرت کو مستحب قرار دیا ہے؛ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

ویستحب مع المصافحۃ، البشاشۃ بالوجہ، والدعاء بالمغفرۃ وغیرھا، یعنی مصافحہ کے ساتھ مسکرانا اور مغفرت وغیرہ کی دعا کرنا مستحب ہے۔ گویا علامہؒ نے الفاظ کا انتخاب مصافحہ کرنے والے پر چھوڑ دیا ہے۔(الاذکار:۳۰۴)

دعاءِ مغفرت یعنی یغفر اللہ لنا ولکم کے علاوہ دو دعائیں اور علامہ نے ابن السنیؒ کی کتاب عمل الیوم واللیلہ سے نقل کی ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں: کوئی بھی دو مسلمان بندے جو اللہ کے واسطے ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں، اُن میں سے جو کوئی اپنے دوست سے مل کر اُس سے مصافحہ کرتا ہے پھر دونوں نبی کریم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں تو اُن دونوں کے الگ ہونے سے پہلے اُن کے اگلے پچھلے گناہِ صغیرہ معاف کردیے جاتے ہیں۔(الاذکار، رقم:۸۰۷)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے مصافحہ کے لیے کسی کا بھی ہاتھ پکڑا تو

چھوڑنے سے پہلے یہ دعا پڑھتے تھے، اللهم آتنا في الدنيا وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار. (الاذکار:۸۰۸)

معلوم ہوا کہ مصافحہ کے وقت جیسے یغفر الله لنا ولکم پڑھ سکتے ہیں، ویسے ہی کبھی دورد پڑھ لیں یا اللهم آتنا في الدنيا الخ پڑھ لیں تو کوئی حرج نہیں۔

بوقت مصافحہ دونوں کو دعا پڑھنی چاہیے

مصافحہ کے وقت مغفرت کی دعا پڑھنے کا استحباب جو ذکر کیا گیا ہے تو یہ دعا مصافحہ کرنے والا اور جس سے مصافحہ کیا جارہا ہے دونوں کو پڑھنی چاہیے؛ عموماً بوقت مصافحہ دعا ہی نہیں پڑھتے اور اگر پڑھتے ہیں تو صرف مصافحہ کرنے والے جس سے مصافحہ کیا جاتا ہے وہ خاموش رہتا ہے، اِس حوالے سے اصلاح کی ضرورت ہے، توجہ سے اصلاح ممکن ہے، استغفار کے سلسلے کی جتنی روایتیں ہیں عموماً ان میں تثنیہ کے صیغے مروی ہیں؛ چناں چہ حضرت براءؓ کی مشہور روایت میں وحمدا الله واستغفراه کے الفاظ ہیں، یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ دعاءِ مغفرت "یغفر الله لنا ولکم" دونوں کو پڑھنی ہے۔

استغفار کا مطلب

مصافحہ کے وقت "یغفر الله لنا ولکم" پڑھنا یہ مغفرت کی دعا ہے جسے استغفار کہتے ہیں، یہاں استغفار کا مطلب سمجھ لینا چاہیے، کوئی بھی دعا جب سمجھ کر پڑھی جائے گی تو تاثیر دو چند ہوگی، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے الأذكار وما يتعلق بها کے تحت، استغفار کا تذکرہ کیا ہے، اہل علم وہاں دیکھ سکتے ہیں، عوام کے لیے رحمۃ اللہ الواسعہ سے یہاں مختصراً نقل کیا جاتا ہے۔

استغفار کے معنی ہیں توبہ کرنا یعنی اپنے گناہوں اور قصوروں کی معافی مانگنا اور بخشش طلب کرنا، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: استغفار کی حقیقت اور اُس کی روح یہ ہے کہ آدمی اپنے گناہوں کو سوچے، جنہوں نے اس کے نفس کو گھیر رکھا ہے، یعنی اس کو میلا اور گندہ کر رکھا ہے اور اسبابِ مغفرت اختیار کر کے نفس کو ان گناہوں سے پاک کرے۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ:۳۳۶/۴)

(تیسری فصل)

مصافحہ ایک ہاتھ سے یا دونوں ہاتھ سے؟

احادیث میں مصافحہ کے بارے میں بہت زیادہ تفصیل نہیں ہے؛ لیکن محدثین فقہاء اور بزرگانِ دین علماء نے فرمایا کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا سنت سے زیادہ قریب ہے اور دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا متوارث ہے اور معروف اسلامی طریقہ ہے؛ چناں چہ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ لکھتے ہیں:

ولا يذهب عليك أن السنة في المصافحة أن تكون باليدين كما هو المعروف عن الصحابة والتابعين والمتوارث عن المشائخ أن يلصقا بطن كفي يمينهما ويجعلا بطن كف يساريهما على ظهر كف يمين الآخر، هكذا وصل إلينا في الحديث المسلسل بالمصافحة.

یہ بات مخفی نہ رہے کہ مصافحہ میں سنت دونوں ہاتھ سے مصافحہ کرنا ہے، صحابہ وتابعین سے یہی مشہور ومعروف ہے اور مشائخ سے جو بات توارثاً منقول ہے وہ یہ ہے کہ دونوں شخص اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے اندرونی حصے کو ایک دوسرے سے ملائیں اور دونوں اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے اندرونی حصے کو دوسرے شخص کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے اوپری حصے پر رکھیں، مصافحہ کا یہ طریقہ حدیث مسلسل بالمصافحۃ میں ہم تک ایسے ہی پہنچا ہے۔ (اوجز المسالک:۱۶/۱۲۹)

علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

وفي القنية بالسنة في المصافحة بكلتا يديه.

اس کے حاشیہ میں علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

وهي إلصاق صفحة الكف بالكف وإقبال الوجه بالوجه، فأخذ الأصابع ليس بمصافحة خلافا للروافض، والسنة أن تكون بكلتا يديه. (ردالمحتار: ۹/۵۴۸)

احادیث

(۱) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: علمني رسول الله ﷺ — وكفي بين كفيه — التشهد كما يعلمني السورة من القرآن. آپ نے مجھے تشہد ایسے سکھایا جیسے قرآن کی کوئی سورت سکھایا کرتے تھے اور اس وقت میرا ہاتھ آپ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا۔ (بخاری: ۶۲۶۵)

امام بخاریؒ نے اِس روایت کو باب المصافحۃ اور باب الاخذ بالیدین کے تحت ذکر کیا ہے اور اس سے ثبوتِ مصافحہ بالیدین پر استدلال کیا ہے، اور مصافحہ کی کیفیت اور اُس کا طریقہ کیا ہوگا اُس کو ثابت کیا ہے کہ مصافحہ کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں مثلاً: ایک آدمی کی دونوں ہتھیلیاں، دوسرے آدمی کے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں ہوں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں اپنے دائیں ہاتھ سے مصافحہ کریں، تو "وكفي بين كفيه" کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ مذکورہ طریقہ، مصافحہ کا طریقہ نہیں ہے؛ بلکہ طریقہ وہ ہے جو ابن مسعودؓ نے بیان کیا ہے، اور طریقۂ مصافحہ تعلیم کے لیے ہو یا ملاقات کے وقت ہو دونوں برابر ہیں، ولما لم يكن في ذلك عند المصنف حديث على شرطه أخرج حديث ابن مسعود في التشهد. (الأبواب: ۶/۳۵۵)

غرض الإمام البخاري بذلك بيان كيفية اليدين؛ فإن المصافحة باليدين تحتمل صورا مختلفة...... ولا يضر على ذلك كونه للتعليم أو غير ذلك. (اوجز: ۱۶/۱۳۰)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں:

و أخـذه ﷺ يـد ابـن مسعـود وإن كان لتلقين التحيات ولكنه ماخوذ عن المصافحة فالجنس واحد.

(العرف الشذی علی الترمذی:۲/۱۰۱)

مفتی رشید صاحبؒ لکھتے ہیں:

حافظ ابن حجر، عینی، کرمانی اور قسطلانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے باب المصافحۃ اور باب الاخذ بالیدین میں اس روایت سے امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے استدلال پر کوئی اشکال نہیں فرمایا، یہ اس کی واضح دلیل ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی یہ استدلال صحیح ہے۔

(احسن الفتاوی:۸/۳۹۷)

اشکال: کچھ حضرات کہتے ہیں: کہ اس روایت سے دو ہاتھوں سے مصافحہ پر استدلال درست نہیں؛ کیوں کہ اگر چہ حضور ﷺ کے دونوں ہاتھ تھے، مگر ابن مسعودؓ کا تو ایک ہی ہاتھ ہے؟

جواب: احسن الفتاوی میں ہے:

اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ کے کفین کا ذکر صراحۃً ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے کفین کا ذکر دلالۃً، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور اکرم ﷺ سے تبرک حاصل کرنے کے لیے اپنے جسم کا زیادہ سے زیادہ حصہ آپ ﷺ کے جسد مبارک سے ملانے کی کوشش کرتے تھے، اِس کے پیش نظر یہ ناممکن ہے کہ حضور اکرم ﷺ تو دونوں ہاتھوں سے مصافحہ فرما رہے ہوں اور ابن مسعودؓ ایک ہاتھ سے، ایسے جانباز عشاق سے ایسی شرمناک گستاخی کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ (احسن الفتاویٰ:۸/۳۹۷)

مولانا امین صفدر صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

کسی حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے دوسرے ہاتھ کی نفی نہیں ہے اور یہ کس کا دل مانتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے دونوں مبارک ہاتھ بڑھائے ہوں اور ابن مسعودؓ نے صرف ایک، اصل بات یہ ہے کہ جب آدمی دونوں ہاتھ سے مصافحہ کرتا ہے تو ایک ہاتھ کے دونوں طرف دوسرے کی ہتھیلیاں لگتی ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک ہاتھ کی خوبی بیان فرمارہے ہیں کہ میرے اس ہاتھ کے دونوں طرف حضرت پاک ﷺ کی ہتھیلیاں مبارک لگی تھیں، اپنے دوسرے ہاتھ کی نفی نہیں فرمارہے ہیں۔ (تجلیات صفدر: ۱/۱۴۷)

مولف عرض گزار ہے کہ یہ جواب ان لوگوں کی سمجھ میں آئے گا جنہیں ''محبت'' کا مطلب آتا ہو، محبتِ حقیقی کا مفہوم جو نہیں جانتے، یہ جواب اُن کی سمجھ میں کیوں کر آئے گا، اور دوسرے ہاتھ کو اِس لیے بھی ذکر نہیں کیا کہ اس سے کوئی غرض متعلق نہیں۔

فإنه يستبعد من مثله أن لا يبسط يديه للنبي ﷺ، وقد يكون النبي ﷺ بسط له يديه، غير أن الراوي لم يذكره لعدم كونه غرضه متعلقا بذلك.

(الابواب والتراجم، باب المصافحۃ: ۶/۳۵۵)

(۲) امام بخاریؒ نے باب المصافحہ کے بعد، باب الاخذ بالیدین کے تحت ابن مسعودؓ کی مذکورہ روایت دوبارہ ذکر کی ہے، اور اس کے بعد حضرت حماد بن زیدؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ کے مصافحہ کا تذکرہ کیا ہے، صافح حماد بن زيد ابن المبارك بيديه یعنی حضرت حماد بن زیدؒ نے ابن مبارکؒ سے اپنے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا(۱) امام بخاریؒ نے یہ روایت اگرچہ تعلیقاً ذکر کی ہے؛ لیکن ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس کو موصولاً ذکر کیا ہے، الفاظ ہیں:

(۱) بخاری: ۲/۹۲۶۔

محمد بن إسماعيل البخاري يقول سمع أبي من مالك، ورأى حماد بن زيد يصافح ابن المبارك بكلتا يديه.

ذرا آگے لکھتے ہیں:

عن أبي إسماعيل إبراهيم قال رأيت حماد بن زيد وجاء ابن المبارك بمكة فصافحه بكلتا يديه. (فتح الباری:۶۸)

دنیاءِ علم حدیث کو معلوم ہے کہ علم حدیث میں حماد بن زیدؒ اور ابن المبارکؒ کا کیا مقام ہے، ابن المبارکؒ کو تو امیر المومنین فی الحدیث کہا جاتا ہے، اِن حضرات کی حدیث فہمی میں اور روایت دانی میں کیا کسی کو شبہ بھی ہوسکتا ہے، یہ حضرات دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کر رہے ہیں، اِس کی وجہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اِس طریقہ کو مسنون طریقہ سمجھتے ہوں گے، اور امام بخاریؒ بھی یہی بات ثابت کرنا چاہتے ہیں؛ اِسی لیے انہوں نے ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے کی کوئی روایت یا اثر ذکر نہیں کیا ہے، یہاں ایک اشکال ہوسکتا ہے کہ کچھ نسخوں میں باب الأخذ بالیدین کے بجائے باب الأخذ بالید ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ید سے مراد جنس ید ہے اور جنس ید، دونوں ہاتھ کو بولتے ہیں (۱) شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ لکھتے ہیں:

وأما على نسخة أبي ذر عن الحموي والمستملي بلفظ الإفراد، فإشارة إلى أن ما ورد في الروايات من لفظ الأخذ باليد، المراد بها الجنس، ولذا ذكر الإمام في الباب أثر حماد وحديث ابن مسعود – رضي الله عنه – وإلا فلا وجه لذكرهما في باب الأخذ باليد. (اوجز:۱۶/۱۳۰)

اور اگر صحیح نسخہ باب الأخذ بالید ہی ہو تو یہ کہا جائے گا کہ امام بخاریؒ نے باب، اخذ بالید کا قائم کیا اور روایت اخذ بالیدین کی ذکر کی ہے تو اس جانب اشارہ کیا ہے کہ جن روایتوں میں الأخذ بالید کا تذکرہ ہے وہاں مشروع مصافحہ مراد ہے جو دو ہاتھوں سے ہوتا ہے اور اس کو سمجھانے

(۱) اور اگر جنس مراد نہ ہوتو ایک ہاتھ سے مصافحہ کی کوئی روایت ضرور ذکر کرتے؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔

کے لیے حضرت حمادؒ کا اثر اور حضرت ابن مسعودؓ کی روایت نقل کی ہے، تو اس صورت میں یہی ثابت ہوا کہ مصافحہ دو ہاتھوں سے کرنا مسنون ومستحب ہے۔

وإما أن يقال: إنه أشار بذلك أن ماورد في بعض الروايات من الأخذ باليد فالمراد به، المصافحة المشروعة وهي تكون باليدين فلذا عقبها بأثر حماد.
(الابواب والتراجم:۶/۳۵۷)

(۳) تیسری حدیث: حضرت عبد الرحمان بن رزینؒ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں: ہمارا گذر مقام ربذۃ سے ہوا، ہمیں بتایا گیا کہ یہاں حضرت سلمہ بن الأکوع رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں تو ہم اُن کے پاس آئے فَسَلَّمْنَا عليه فأخرج يديه فقال بايعت بهاتين نبي الله ﷺ، ہم نے سلام کیا پھر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ نکالے اور کہا کہ میں نے انہیں دونوں ہاتھوں سے حضور ﷺ سے بیعت کی تھی۔ (الادب المفرد، رقم:۹۰۸، باب تقبیل الید)

اس روایت میں دونوں ہاتھوں سے بیعت کا تذکرہ ہے(۱) اس سے مسئلے پر کوئی اثر نہیں پڑتا؛ کیوں کہ بیعت میں درحقیقت مصافحہ ہی ہوتا ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضور ﷺ عورتوں کو ہاتھوں کے ذریعہ بیعت نہیں کرتے تھے؛ بلکہ زبان سے کہہ دیتے تھے کہ میں نے بیعت کر لی، ایک مرتبہ کچھ عورتیں حضور ﷺ کے پاس بیعت کی غرض سے آئیں آپ نے زبانی بیعت کر لی، اُن عورتوں میں ایک حضرت امیمہ بنت رقیقہ تھیں اُن کا بیان ہے کہ میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا يا رسول الله بايِعنَا تعني صافحنا (۲) غور فرمائیں انہوں نے بیعت کو مصافحہ سے تعبیر کیا، شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے الدر المنثور کے حوالے سے یہی روایت اِن الفاظ میں نقل کی ہے، أتيت النبي ﷺ في نساء لنبايعه "الحديث" وفيه قلنا: يا رسول الله ألا تصافحنا؟ قال: إني لا أصافح النساء. (اوجز:۱۶/۱۳۱)

---

(۱) اگر یہ روایت صحیح ہے تو پھر مصافحہ دو ہاتھوں سے مسنون ہے، پر استدلال بہت آسان ہوگا اور یہ بات غیر مقلدین حضرات کو بھی تسلیم کرنی پڑے گی، صاحب تحفۃ الاحوذی لکھتے ہیں: لأن المصافحة عند اللقاء والمصافحة عند البيعة متحدتان في الحقيقة ولم يثبت تخالف حقيقتهما بدليل أصلا. (۷/۴۳۲) ورنہ مذکورہ روایت کا کیا جواب ہوگا؟
(۲) مشکوٰۃ:۲/۳۵۴.

مذکورہ روایتوں سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرامؓ میں یہ بات مشہور تھی کہ بیعت میں مصافحہ ہوتا ہے اور وہ دونوں ہاتھوں سے ہوتا ہے، مزید وضاحت حضرت عائشہ کی ایک روایت کے الفاظ کی شرح سے ہوتی ہے: حضرت عائشہؓ کی ایک روایت ہے کہ حضور ﷺ عورتوں سے بیعت کے وقت کہتے تھے، بايعتكِ كلاماً يكلمها به والله ما مست يدُه يد امرأة قط في المبايعة. (۱)

شارح بخاری علامہ قسطلانیؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں: أي بالكلام لا باليد كما كان يبايع الرجال بالمصافحة باليدين یعنی حضور ﷺ کی عورت سے بیعت گفتگو سے ہوتی تھی نہ کہ ہاتھ سے جیسا کہ آپ مردوں کو دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کے ذریعہ بیعت کرتے تھے۔ (ارشادالساری: ۳۸۱/۷)

الغرض: مصافحہ چاہے عندالملاقاۃ ہو یا بیعت میں ہو دونوں ہاتھوں سے معروف ومشہور تھا۔

نوٹ: مذکورہ تفصیل سے یہ بات بھی حل ہو جاتی ہے کہ جن روایتوں میں بیعت یا مصافحہ کے سلسلے میں لفظ "کف" یا "یــد" کا تذکرہ ہے وہاں کف اور ید سے جنسِ کف اور جنسِ ید مراد ہے، ایک ہاتھ یا ایک کف مراد نہیں ہے؛ کیوں کہ سلمہ ابن الأ کوع رضی اللہ عنہ کی بیعت والی روایت میں یدین کی صراحت ہے؛ حالاں کہ اسی روایت میں آگے ہے فأخرج كفاً له ضخمة، كأنها كف بعير، فقمنا إليه فَقَبَّلْنَا. اب اگر یہاں "کفاً" سے جنس کف یعنی دونوں کف مراد نہ ہوں تو فأخرج يديه فقال بايعت بهاتين اور فأخرج كفاً له میں تعارض ہو جائے گا، شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ کی عبارت کا یہی خلاصہ ہے: لکھتے ہیں:

> فعُلم من رواية البخاري في "الأدب" أن ما ورد في بعض الروايات عند البيعة أو المصافحة لفظ الكف أو اليد فالمراد بهما الجنس الواحد؛ لأن في هذه الرواية تصريحاً باليدين ومع ذلك قال: فأخرج كفاله؛ فلابد أن ذكر الكف ههنا للجنس ويؤيده أيضا تقبيل الكفين جميعا. (اوجز: ۱۳۱/۱۶)

مشکوٰۃ: ۴۰۲/۲ ۳۵

حضرت شیخؒ نے اِس کے بعد چھ سات روایتیں ایسی ذکر کی ہیں جن میں "أيدي" جمع کے صیغے کے ساتھ مروی ہے، اور اپنی تحقیق پیش کی ہے کہ ولم أر بعدُ في رواية ولا أثر تصريحا باليد الواحدة ولو سلّم على الفرض، فقد أفاد شيخ مشائخنا الگنگوهي – قدس سره – في "الكوكب الدري": قوله: والأخذ باليد، اللام فيه للجنس فلا تثبت الوحدة. (اوجز:۱۶/۱۳۲)

یعنی ایک ہاتھ سے مصافحہ کی روایت یا اثر ابھی تک میری نظر سے نہیں گذرے ہیں اور اگر کہیں ایسی روایت مل جائے تو بقول حضرت گنگوہیؒ کے وہاں ید سے جنس ید مراد ہے۔

(۷) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حدیثِ رویا میں ہے کہ حضور ﷺ نے تبسم فرماتے ہوئے میری طرف اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے، میں قریب ہوا یہاں تک کہ میرے گھٹنے آپ کے گھٹنوں سے مل گئے، فأخذ ﷺ يدي بين يديه فصافح تو آپ ﷺ نے میرا ہاتھ اپنے دونوں مبارک ہاتھوں کے درمیان پکڑا اور مصافحہ فرمایا۔ (الدر الثمین:۱۵۲)

(۸) پیچھے جو روایتیں ذکر کی گئیں ہیں مسلمان جب مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے گناہ جھڑ جاتے ہیں؛ اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ ہاتھوں کے گناہ جھڑتے ہیں تو انسان دونوں ہاتھوں سے گناہ کرتا ہے تو دونوں کے گناہ جھڑنے چاہئیں اور یہ اُس وقت ہوگا جب مصافحہ دونوں ہاتھوں سے ہو۔ (تجلیات صفدر:۱/۱۴۶)

کیا مصافحہ ایک ہاتھ سے بھی ہوسکتا ہے؟

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ صراحۃً کسی روایت میں یہ نہیں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا، اس کے برخلاف دو ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کی روایتیں موجود ہیں جیسا کہ اوپر ذکر کی گئیں، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ حدیث میں مفرد کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے اور تثنیہ کا لفظ بھی آیا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ علماء دیوبند جن کا وصفِ امتیازی ''اعتدال'' ہے، انہوں نے دونوں باتوں کو تسلیم کیا ہے؛ چناں چہ علماء دیوبند کے سرخیل حضرت گنگوہیؒ لکھتے ہیں:

والحق فيه أن مصافحته ﷺ ثابتة باليد واليدين، إلا أن المصافحة بيد واحدة لما كانت شعار أهل الإفرنج وجب تركه لذلك. (الکوکب الدری:۳/۳۹۲، اوجز:۱۶/۱۳۲)

یعنی حق بات اِس سلسلے میں یہ ہے کہ حضور ﷺ کا ایک ہاتھ سے بھی مصافحہ کرنا ثابت ہے اور دو ہاتھوں سے بھی؛ لیکن اب ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا انگریزوں کا طریقہ بن چکا ہے؛ اِس لیے ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا واجب الترک ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں:

فبيد واحدة تجزئ وباليدين أكمل، یعنی ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا کافی ہے؛ لیکن دو ہاتھوں سے مصافحہ کرنا اکمل طریقہ ہے۔ فیض الباری میں حضرت کے الفاظ ہیں: اعلم أن كمال السنة في المصافحة أن تكون باليدين ويتأدى أصل السنة من يد واحدة أيضا. (العرف الشذی علی الترمذی:۲/۱۰۱، فیض الباری:۶/۲۰۴)

جن روایتوں میں ایک ہاتھ کا تذکرہ ہے، علماء دیو بند کے پاس اُس کی مناسب توجیہ موجود ہے جیسا کہ اوپر گذرا؛ لیکن اس کے باوجود علماء دیو بند نے دونوں روایتوں کو تسلیم کیا ہے، اعتدال کا یہی مفہوم ہے، حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے: اِس میں (مصافحہ میں) وسعت ہے جس طرح چاہو کرو۔ (امداد الفتاویٰ:۴/۳۷۰)

ایک ہاتھ سے مصافحہ پر اصرار اور شدت: آغاز، دلائل اور تجزیہ

متقدمین کی کتابوں میں ''مصافحہ ایک ہاتھ سے یا دو ہاتھوں سے کرنا چاہیے'' اِس عنوان کے تحت کچھ لکھا ہوا نہیں ہے جو کچھ باتیں ملتی ہیں وہ مصافحہ کی روایتوں کے ضمن میں، یہ اس امر کی دلیل ہے کہ قرونِ اولیٰ میں یہ مسئلہ کوئی معرکۃ الآراء مسئلہ نہیں تھا؛ بلکہ عموماً دو ہاتھوں سے لوگ مصافحہ کیا کرتے تھے اور کسی نے کبھی ایک ہاتھ سے کر لیا تو اسے کوئی خلافِ سنت بھی نہیں کہتا تھا؛ لیکن بعد میں اس مسئلے کو بھی نظر لگ گئی اور اس مسئلے کو ناک کا مسئلہ بنا لیا گیا، اور نوبت بایں جا رسید

کہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے کو ایک مخصوص جماعت نے اصل سنت قرار دیا اور دو ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کا انکار کر دیا، جس سے مسئلے میں شدت بڑھتی گئی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ پر کچھ روشنی ڈالی جائے، اور مقصد صحیح علم تک رسائی حاصل کرنا ہے، کسی کی تغلیط اور تضحیک ہرگز مقصود نہیں۔

ایک ہاتھ سے مصافحہ کی ابتداء

ہندوستان میں انگریز کی آمد سے قبل کسی اسلامی کتاب میں دو ہاتھ سے مصافحہ کرنے کو بدعت اور خلافِ سنت نہیں کہا گیا، اس دور میں مسلمان بوقتِ ملاقات دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتے تھے؛ لیکن انگریز ایک ہاتھ سے مصافحہ کرتے تھے (یہ طریقہ اُن میں اب بھی رائج ہے) انگریز کے اس طریقے کو سب سے پہلے نیچریوں نے اپنایا اور کالجوں وغیرہ میں ایک ہاتھ کے مصافحہ کا رواج شروع ہوگیا؛ البتہ وہ لوگ اِس کو حاکمِ قوم کا طریقہ سمجھتے تھے، پھر نیچری حضرات کی دیکھا دیکھی، اہل حدیث حضرات میں بھی صرف ایک دائیں ہاتھ سے مصافحہ کرنے کا رواج چل پڑا، یہاں بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے دو ہاتھوں سے مصافحہ کو جو مسلمانوں میں معروف ومتوارث تھا، خلافِ سنت قرار دیا اور ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے کو عینِ سنت قرار دیا، اس طرح سلام اور مصافحہ جو محبت ومغفرت کا ذریعہ تھا وہ بھی اختلاف اور لڑائی کا ذریعہ بن گیا۔ (تجلیات صفدر، بحذف واضافۃ: ۱/۱۴۱)

مفتی تقی عثمانی زید مجدہ کا بیان ہے:

> آج کے دور میں ایک طرف تو انگریزوں کی طرف سے فیشن چلا کہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا چاہیے، دوسری طرف بعض حلقوں کی طرف سے خاص طور پر سعودی عرب کے حضرات اس بارے میں تشدد اختیار کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ مصافحہ تو ایک ہی ہاتھ سے کرنا سنت ہے، دونوں ہاتھوں سے کرنا سنت نہیں۔
>
> (اصلاحی خطبات: ۶/۱۷۶)

اعتدال کا فیصلہ آپ کیجیے

ابھی آپ نے حضرت گنگوہیؒ اور علامہ کشمیریؒ کی باتیں پڑھیں، جس میں انہوں نے مصافحہ بالید اور مصافحہ بالیدین دونوں کو تسلیم کیا ہے؛ مولفِ کتاب نے، تحفۃ الاحوذی شرح سنن ترمذی دیکھی، جس میں مصافحہ کا ایک مستقل عنوان ہے "فائدة في بيان أن السنة أن تكون المصافحة باليد الواحدة يعني اليمنى من الجانبين سواء كانت عند اللقاء، أو عند البيعة. یعنی سنت، ایک ہاتھ یعنی دائیں ہاتھ سے مصافحہ کرنا ہے، دونوں طرف سے، خواہ ملاقات کے وقت ہو یا بیعت کے وقت ہو، اور یہی نہیں انہوں نے حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا یہی مسلک بتایا ہے اور مخصوص عبارتوں سے ثابت کیا ہے، اور مصافحہ ایک ہاتھ سے ہی مسنون ہے، اس کے لیے تین دلائل پیش کئے ہیں، جن پر بحث آگے آرہی ہے، مولف کو حیرانی ہے کہ آخر انہوں نے ان تمام روایتوں کو جن میں دو ہاتھوں سے مصافحہ کا تذکرہ ہے؛ کیوں چھوڑ دیا اور سارا زور اِس پر لگا دیا کہ مصافحہ مسنون ایک ہاتھ سے ہی ہے۔ آپ کس رائے کو معتدل کہیں گے؟ فیصلہ کیجیے۔

اُن روایات کا جائزہ جو مصافحہ بالید الواحدۃ کے سلسلے میں پیش کی جاتی ہیں

مولانا عبدالرحمان مبارک پوری صاحبؒ نے تحفۃ الاحوذی میں ایک روایت نقل کی ہے:

عن عبد الله بن بسر قال: ترون يدي هذه صافحت بها رسول الله ﷺ یہ روایت ابن عبدالبر کی ہے، مسند احمد کی روایت یوں ہے ترون كفي هذه فأشهد أني وضعتها على كف محمد ﷺ. (تحفہ: ۷/۴۳۰)

تجزیہ: یقیناً اس روایت میں یدی اور کفی کا تذکرہ ہے، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اولاً اس میں دوسرے ہاتھ کی نفی نہیں ہے، ثانیاً ایک ہاتھ سے بھی مصافحہ ہوسکتا ہے، دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کی نفی اس سے ثابت نہیں ہوتی، ثالثاً حضرت عبداللہؓ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میرا یہ ہاتھ حضور ﷺ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا، دوسرے ہاتھ سے کوئی خاص غرض متعلق نہیں ہے؛ اِس لیے اس کا

تذکرہ نہیں کیا، جیسا کہ ابن مسعودؓ کی روایت میں گذرا، رابعاً ید اور کف سے جنس ید اور جنس کف بھی مراد ہوسکتا ہے، خامساً دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کی حالت میں بھی درحقیقت مصافحہ ایک ہی ہاتھ سے ہوتا ہے؛ کیوں کہ ہر شخص کے ایک ہی ہاتھ کی ہتھیلی دوسرے کی ہتھیلی سے ملتی ہے، سادساً ثبوتِ ''ید'' عدم ثبوت ''یدین'' کو مستلزم نہیں۔ سابعاً اس روایت کو اگر معیار مصافحہ قرار دیا جائے تو ان روایتوں کا کیا ہوگا جس میں صراحتًا یا اشارۃً دو ہاتھوں کا تذکرہ ہے۔ الغرض اتنے سارے احتمالات کے ساتھ اِس روایت سے مصافحہ بالید کو ثابت کرنا تام نہیں۔ (الابواب:۶/۳۵۵، احسن الفتاویٰ:۸/۴۰۰، اوجز:۱۶/۱۳۳)

(۲) ایک روایت مسلم کی پیش کی جاتی ہے: عن عمرو بن العاص قال أتيت النبي ﷺ، فقلت: ابسط يمينك، فَلأُبايعك فبسط يمينه...... (تحفۃ الاحوذی:۷/۴۳۱)

تجزیہ: دائیں ہاتھ کا تذکرہ، دائیں ہاتھ کی شرافت وفضیلت کے لیے ہے، دوسری بات یہ کہ مصافحہ کی حالت میں درحقیقت دونوں شخصوں کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلیاں ہی ملتی ہیں، حدیث میں یمین کا تذکرہ، یسار سے احتراز کے لیے نہیں ہے، شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ لکھتے ہیں:

> لا يقال: إنه وقع التصريح بالمصافحة باليمين في بعض الروايات: لأن ذلك ليس إلا لشرافة اليمين، ولأن الأصل في إلصاق الكفين هما اليمينان، وليس ذكر اليمين للاحتراز عن اليسار. شیخؒ نے اس کو مدلل ثابت کیا ہے، تفصیل کی لیے اوجز دیکھیے۔ (اوجز:۱۶/۱۳۳)

نوٹ: یہ نہیں کہہ سکتے کہ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ کا جواب مصافحہ کے سلسلے میں ہے، اور مذکورہ حدیث بیعت کے بارے میں ہے؛ کیوں کہ خود مبارک پوری صاحبؒ نے لکھا ہے: لأن المصافحة عند اللقاء والمصافحة عند البيعة متحدتان في الحقيقة. (تحفہ:۷/۴۳۲)

(۳) ترمذی کی روایت (۲۷۲۹) ہے حضرت انسؓ راوی ہیں: اخیر میں ہے: قال: فيأخذ بيده، ويصافحه قال نعم.

(۴) ترمذی کی روایت (۲۷۳۱) ہے ابن مسعودؓ راوی ہیں: قال: من تمام التحیة، الأخذ بالید.

تجزیہ: بات بے غبار ہے کہ ید سے جنس ید مراد ہے، اور اس کی بہت ساری نظریں ہیں، وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَى عُنُقِكَ (۱) من رأى منكم منكرا فليغيره بيده (۲) المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده (۳).

اِن نصوص میں، ایسے ہی ید کا تذکرہ ہے جیسے اوپر کی روایتوں میں؛ حالاں کہ اِن تمام نصوص میں جنس ید مراد ہے، صرف ایک ہاتھ اور وہ بھی دایاں مراد نہیں۔

(خلاصہ احسن الفتاویٰ: ۳۹۹/۸، اوجز: ۱۳۱/۱۶، الابواب: ۳۵۵/۶)

ملحوظہ: ان مذکورہ توجیہات کو سامنے رکھا جائے تو مصافحہ بالید الواحدۃ کے سلسلے میں جتنی بھی روایتیں ذکر کی جائیں گی، اُن سب کا جواب بن جائے گا۔

فیصلہ کن بات

ایک ہاتھ سے مصافحہ جائز اور دونوں ہاتھوں سے اکمل ہے، اب جائز دونوں ہیں تو کس کو اختیار کرنا؛ بالخصوص اس زمانے میں سنت کے زیادہ قریب ہوگا اس سلسلے میں حضرت گنگوہیؒ کی رائے متوازن اور معتدل ہے اور دل کو لگتی ہے۔

والحق فيه أن مصافحته ﷺ ثابتة باليد واليدين، إلا أن المصافة بيد واحدة لما كانت شعار أهل الإفرنج وجب تركه لذلك. (الکوکب الدری: ۳۹۲/۳)

آج پوری دنیا میں جہاں بھی یہودی وعیسائی ہیں وہ سب ایک ہاتھ سے مصافحہ کرتے ہیں، یہی اُن کا شعار ہے، اور ہمارے ہندوستان میں بھی غیر مسلم بھائی ایک ہاتھ سے ہی مصافحہ کرتے ہیں، تو اُن کی مشابہت سے بچنے کے لیے ہم مصافحہ دونوں ہاتھوں سے کریں تو زیادہ اچھا

(۱) بنی اسرائیل: ۲۹. (۲) مسلم، رقم الحدیث: ۴۹. (۳) بخاری، رقم الحدیث: ۱۰.

ہوگا، ایک تو سنت سے ثابت بھی ہے، دوسرے مشابہت سے بچنے کا حکم بھی ہے، اور پھر یہی طریقہ بزرگانِ دین میں بھی متعارف رہا ہے، اور اسی طریقے کو علماءِ امت نے سنت کے قریب سمجھا ہے؛ لہٰذا اس مسئلے میں شدت اختیار کرنا اور اصرار کرنا درست نہیں، ایک ہاتھ سے مصافحہ پر اصرار کی تردید میں محقق ظفر احمد تھانویؒ لکھتے ہیں:

ثم المصافحة باليد الواحدة من شعار أهل الباطل في زماننا؛ فلا ينبغي الشبه بهم بترك ما هو المتوارث المتعارف بين المسلمين، وقد ثبت أنه صافح حماد بن زيد ابن المبارك بكلتا يديه، ولم يثبت خلافه عن أحدٍ؛ فلا ينبغي أن يترك سنة السلف باجتهاد هؤلاء المحدثين الجهلة. (اعلاء السنن: ۱۷/۴۳۴، کتاب الحظر)

(۱) احسن الفتاویٰ میں ہے:

ایک ہاتھ سے مصافحہ جائز اور دو ہاتھوں سے مستحب ہے۔

دلائل الاستحباب: (۱) احادیث یدین نا قابلِ تاویل ہیں اور روایات ید محتملۃ التاویلات

(۲) حماد بن زید اور عبد اللہ بن المبارک رحمہما اللہ تعالیٰ جیسے جلیل القدر ائمہ کا عمل۔

(۳) اُن کے عمل پر حاضرین وسامعین میں سے کسی کا نکیر نہ کرنا؛ بلکہ مشہور ائمہ حدیث رحمہم اللہ کا اِس سے استدلال کرنا۔

(۴) امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

(۵) چار مسلّم جبال الحدیث: حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ بدر الدین عینی، علامہ کرمانی اور حافظ قسطلانی رحمہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے امام بخاریؒ کے فیصلے کی تائید وتقریر۔

(۶) حضرات فقہاء کرام کا فیصلہ۔

(۷) ادب کا مدار عرف پر ہے اور صالحین کے عرف میں ایک ہاتھ سے مصافحہ کو خلاف ادب سمجھا جاتا ہے، کسی بڑے کو کوئی چیز پکڑاتے وقت ادباً دونوں ہاتھ استعمال کیے جاتے ہیں تو

مصافحہ میں دونوں ہاتھوں کو بڑھانا بطریق اولیٰ مقتضائے ادب ہوگا۔

(۸) علماء وصلحاء امت کا تعامل وتوارث۔

(۹) ایک ہاتھ سے مصافحہ کفار وفجار کا شعار ہے۔

(۱۰) محدثین وفقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے کسی سے ثابت نہیں۔ (احسن الفتاویٰ: ۴۰۳/۸)

اور فطرت سلیمہ سے رجوع کیا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ دونوں ہاتھ سے مصافحہ کرنے میں اپنے مسلمان بھائی کے سامنے تواضع وانکساری، الفت ومحبت اور بشاشت کی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے میں نہیں پائی جاتی۔ (آپ کے مسائل: ۲۵۹/۷)

لغت اور اس کا جواب

مصافحہ کا لغوی معنی بیان کیا جاتا ہے: إلصاق صفح الكف بصفح الكف اِس لغوی تحقیق کا تقاضہ یہ ہے کہ مصافحہ ایک ہاتھ سے ہی ہونا چاہیے؛ چناں چہ تحفۃ الاحوذی میں اس سے استدلال بھی کیا گیا ہے؛ بلکہ وہاں یہ بھی ہے کہ دو ہاتھوں سے مصافحہ کریں گے تو دو مصافحے ہوجائیں گے؛ حالاں کہ ایک مصافحہ کا حکم دیا گیا ہے، اس سلسلے میں شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے لکھا ہے: الصاق صفحة الكف بالكف میں ید اور یدین کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے، وہاں تو صرف مصافحہ کا ماخذِ اشتقاق بتانا مقصود ہے کہ مصافحہ صفحۃ سے مشتق ہے، صفح بمعنی معاف کرنا سے مشتق نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ اِس کے قائل ہیں، یعنی اہل لغت نے مصافحہ کی کیفیت کو بیان نہیں کیا ہے، لغت کی حقیقت بتلائی ہے اور جہاں کیفیت مصافحہ کا تذکرہ کرنا مقصود تھا وہاں یدین کا ذکر کیا ہے۔

ووجه ذلك أنهم إذا فسروها بإلصاق الصفحة أرادوا الإشارة إلى مأخذ الاشتقاق من أنه مشتق من الصفحة لا من الصفح عن العفو والتجاوز كما قال به بعضهم ولم يريدوا إذ ذاك بيان الكيفية، ولما أرادوا بيان الكيفية صرحوا بكونها باليدين. (اوجز: ۱۲۹/۱۶)

ایک دلچسپ واقعہ

اوپر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی جو روایت بخاری کے حوالے سے گذری ہے، جس کے الفاظ ہیں: وکفی بین کفیه اس حدیث کے متعلق حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے، صاحب بذل المجهود محدث جلیل مولانا خلیل احمد قدس سرہ کا ایک دلچسپ واقعہ، الابواب والتراجم میں ''تذکرۃ الخلیل'' کے حوالے سے نقل کیا ہے: پڑھیے: ایک بار آپ ٹونک تشریف لے گئے اور بندہ ہمراہ تھا، چند اہلِ حدیث ملنے آئے اور ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا، حضرت نے حسبِ عادت دونوں ہاتھ بڑھائے اور مسکرا کر فرمایا کہ مصافحہ اس طرح ہونا چاہیے، وہ بولے حدیث ہے صحابی کہتے ہیں: وکان یدی في یدیه ﷺ میرا ہاتھ حضور ﷺ کے دونوں ہاتھوں میں تھا، آپ نے بے ساختہ فرمایا پھر متبع سنتِ (نبویؐ) ہم ہوئے یا تم۔(۱) حضرت شیخ نے آگے لکھا ہے کہ حضرت کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ، فعلِ نبی کے موافق ہے اور ایک ہاتھ سے مصافحہ فعلِ صحابی کے موافق ہے، فَبُهِتَ. (الابواب والتراجم:۶/۳۵۵)

ایک جچا تُلا تبصرہ

پیچھے کہیں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا ایک جملہ نقل کیا گیا ہے یعنی اعلم أن کمال السنة في المصافحة أن تکون بالیدین ویتأدی أصل السنة من ید واحدة أیضا. یعنی مصافحہ میں کامل ومکمل سنت تو دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا ہے؛ تاہم اصل سنت ایک ہاتھ سے بھی ادا ہو جاتی ہے، اس تحقیق کی تسہیل مفتی سعید احمد صاحب کی زبانی سنیے:

> صفحۃ الورق کے معنی ہیں: پتے کا ایک رخ، پس ہاتھ کے دو رخ ہیں: ایک: ہتھیلی کی جانب کا دوسرا: پشت کی جانب کا اور صافح مصافحۃ (باب مفاعلت) کے معنی ہیں: اپنے ہاتھ کے رخ کو دوسرے کے ہاتھ کے رخ کے ساتھ ملانا اور یہ آدھا مصافحہ ہے،

(۱) تذکرۃ الخلیل:۲۹۸.

پھر جب ہر ایک دوسرا ہاتھ رکھے گا تو دونوں کے ہاتھ کا دوسرا رخ بھی مل جائے گا، اب مصافحہ کامل ہوا؛ کیوں کہ ہر ایک کے ہاتھ کے دونوں رخ دوسرے کے ہاتھ کے دونوں رخوں کے ساتھ مل گئے، آگے لکھتے ہیں:

اور غیر مقلدین جو مصافحہ کے مسئلہ میں مُصر ہیں کہ ایک ہی ہاتھ سے مصافحہ ہونا چاہیے، یہ اُن کی بے جا ضد ہے اور اہل حق جو اصرار کرتے ہیں کہ دو ہاتھ ہی سے مصافحہ ہوتا ہے، یہ بھی احادیث کی روشنی میں صحیح نہیں، صحیح بات یہ ہے کہ ایک ہاتھ کا مصافحہ ناقص مصافحہ ہے؛ اگر کوئی اس پر اکتفا کرے تو گنجائش ہے اور اصل مصافحہ دو ہاتھ سے ہونا چاہیے، یہی کامل سنت ہے۔ (تحفۃ الالمعی: ۶/۵۰۱)

شرح ابن بطال میں بھی اس طرف ہلکا سا اشارہ ہے: الأخــذ بالیدین ھو مبالغۃ المصافحۃ ۷/۴۹۔

مولفِ کتاب عرض گزار ہے کہ کمالِ سنت، اصل سنت یا ناقص مصافحہ اور کامل مصافحہ میں، کمال سنت اور کمال مصافحہ کو عام حالات میں اختیار کرنا کامل محبت کی دلیل ہوگی۔

بالفرض والمحال: البتہ اگر کسی جگہ حدیث صحیح اور صریح سے یہ بات معلوم ہو کہ ایک ہاتھ سے مصافحہ مسنون ہے تو فقہاء کے اقوال کو چھوڑنا پڑے گا اور اس تصریح صریح کے بغیر فقہاء کے اقوال پر عمل کرنا چاہیے۔ (فتاوی مولانا عبدالحی مبوب: ۱۱۷)

مصافحہ کا ایک اور طریقہ اور اس کا ثبوت

انگوٹھے کو انگوٹھے کی جڑ سے ملا کر اور ہاتھ کو پکڑ کر کسی قدر حرکت دینا بھی ثابت ہے، اور اس کی وجہ علامہ شامیؒ نے لکھی ہے: فإن فیہ عرقاً ینبت المحبۃ (۱) یعنی انگوٹھے میں ایک

حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے: کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

ایسی رگ ہوتی ہے، جس سے محبت بڑھتی ہے، یہاں خیال رہے کہ انگوٹھوں کے پکڑنے کا مطلب یہ نہیں کہ صرف انگوٹھا پکڑا جائے؛ کیوں کہ صرف انگوٹھا پکڑنا، چاہے ایک یا دونوں یا ہاتھ کی اور کوئی انگلی پکڑ لینا، شرعی مصافحہ نہیں ہے؛ بلکہ بقول علامہ شامیؒ: انگلیوں کا پکڑنا روافض کا طریقہ رہا ہے مسلمانوں کا نہیں، اور یہ بات بھی خیال رکھنے کی ہے کہ مصافحہ کرتے وقت کوئی کپڑا وغیرہ حائل نہیں ہونا چاہیے۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

فأخذ الأصابع ليس بمصافحة خلافا للروافض، والسنة أن تكون بكلتا يديه، وبغير حائل من ثوب أو غيره. (شامی: ۹/۵۴۸)

کیا زبردستی مصافحہ کرواسکتے ہیں؟

کوئی استاذ، والد یا مربی اپنے ماتحت بچوں، کسی غیر آدمی کو بطور تربیت وتعلیم روک کر مصافحہ کرائے تو اِس میں مضائقہ نہیں، غیر آدمی جب مصافحہ سے گھبراتا ہو تو اُس پر زور نہ دیا جائے، مصافحہ کرنا حدیث وفقہ سے ثابت ہے، حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام اور اولیائے عظام اور تمام امت مسلمہ کا طریقہ رہا ہے، اس کی فضیلت بھی آئی ہے، ان فضائل کو بیان کرنے پر اکتفا کر کے ترغیب تو دی جائے؛ مگر اس پر اِصرار اور زور نہ دیا جائے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۹/۱۱۳)

غیر مسلم سے مصافحہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

اگر مسلمان ایسی جگہ ہوں جہاں غیر مسلموں سے اکثر واسطہ پڑتا ہے، جیسے ہمارا ملک ہندوستان، اُن کے ساتھ تجارتی تعلقات ہوں، پڑوس کا تعلق ہو یا کوئی بھی معاشرتی تعلقات ہوں ایسی جگہوں میں اگر غیر مسلم مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے تو مصافحہ کر لینا چاہیے؛ بالخصوص اُس وقت جب مصافحہ نہ کرنے کی وجہ سے تعلقات خراب ہوسکتے ہیں، فتنہ وفساد کا خطرہ ہو فقہاء نے

ایسے حالات میں اجازت دی ہے، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

لا بأس بمصافحة المسلم جاره النصراني إذا رجع بعد الغيبة ويتأذى بترك المصافحة. (۹/۵۹۰ فصل فی البیع) (۱)

ہاں مصافحہ کا کوئی خاص مقصد نہ ہو، غیر مسلم سے کوئی دینی یا دنیاوی ضرورت متعلق نہ ہو تو مصافحہ نہ کرنا بہتر ہے۔كره للمسلم مصافحة أي بلاحاجة. (شامی:۹/۵۹۰)(۲)

کافر اور فاسق سے مصافحہ ومعانقہ

مصافحہ اور معانقہ کا مقصود اظہارِ محبت، تعظیم اور شفقت ہے، والكافر لا يستحق ذلك، سلام اصل ہے اور مصافحہ اُس کا تتمہ ہے اور "لا تبتدأ أهل الكتاب بالسلام" میں اصل ہی کو ختم کر دیا گیا، پھر تتمہ کی گنجائش کہاں، فاسق، فاجر ایمان سے خارج نہیں، گنہ گار ہے، شامی جلد نمبر ا میں ان لوگوں کو شمار کرایا ہے، جن کو سلام کرنا مکروہ ہے، ان میں فاسق بھی ہے؛ لیکن جہتِ فسق کے علاوہ کسی اور جہت سے اگر وہ مستحق اکرام ہو تو اس کا یہ حکم نہیں، نیز اگر مظاہرہ اخلاق کے ذریعہ اصلاح مقصود ہو تو پھر جہت بدل جائے گی؛ بلکہ کافر کے لیے بھی یہ جہت وجہ جواز ہو سکے گی۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۹/۱۱۶)

موقع ومحل دیکھ کر مصافحہ کیجیے

مصافحہ کرنا اگر چہ سنت ضرور ہے؛ لیکن ہر سنت کا کوئی محل اور موقع بھی ہوتا ہے، اگر وہ سنت اس کے موقع پر انجام دی جائے تو سنت ہوگی اور اگر اس پر عمل کرنے سے سامنے والے شخص کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں مصافحہ کرنا درست نہیں ہے اور اگر زیادہ تکلیف ہونے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں مصافحہ کرنا ناجائز ہے، ایسے وقت میں صرف زبان سے سلام کرنے پر اکتفا کرے اور "السلام علیکم" کہہ دے اور سامنے والا جواب دے دے۔

---

(۱) عن أبي عبد الله العسقلاني قال: أخبرني من رأى ابن محيريز يصافح نصرانيا في مسجد دمشق.

(۲) عن الحسن أنه كان يكره أن يصافح المسلم اليهودي والنصراني، المصنف ۶/۱۳۸.

مثلاً ایک شخص کے دونوں ہاتھ مصروف ہیں، دونوں ہاتھوں میں سامان ہے یا ایک ہاتھ میں سامان ہے دوسرے ہاتھ میں موبائل ہے جو کان پر لگا ہوا ہے یا کوئی بیٹھ کر اہم مضمون لکھ رہا ہو یا مفتی فتوی لکھ رہا ہو اور آپ نے ملاقات کے وقت مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیے، ایسے وقت وہ بے چارہ پریشان ہوگا، اب آپ سے مصافحہ کرنے کی خاطر اپنا سامان پہلے زمین پر رکھے یا اپنا اہم کام موقوف کرے اور پھر آپ سے مصافحہ کرے؛ لہٰذا ایسی حالت میں مصافحہ کرنا سنت نہیں؛ بلکہ خلافِ سنت ہے؛ بلکہ اگر مصافحہ کی وجہ سے دوسرے کو تکلیف پہنچے گی تو گناہ کا بھی اندیشہ ہے آج کل لوگ اِس معاملے میں بڑی بے احتیاطی کرتے ہیں۔

وعظ کے بعد واعظ سے مصافحہ کرنا

واعظ سے بعد وعظ کے مصافحہ کرنا جائز ہے؛ مگر اس کا التزام کرنا اور ضروری سمجھنا جائز نہیں ہے۔ (فتاوی رشیدیہ:۵۵۳)

مصافحہ کرتے ہوئے ہاتھ ہلانا

اس میں کوئی حرج نہیں، مفتی محمود صاحبؒ فرماتے ہیں:

> مصافحہ کرتے ہوئے ہاتھ کو جو ہلاتے ہیں، اس طرف اشارہ ہے کہ گناہ جھڑ رہے ہیں؛ اس لیے یغفر الله لنا ولکم پڑھتے ہیں۔
>
> (ملفوظات فقیہ الامت:۱۸/۲)

ہر سلام کے ساتھ مصافحہ کرنا

سوال: آج کل مصافحہ ہر سلام کے ساتھ کرتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟

جواب: تھوڑی تھوڑی دیر میں ہر سلام کے ساتھ مصافحہ درست نہیں۔

(دار الافتاء دار العلوم دیوبند:۱۱۳۷۶)

(چوتھی فصل)

فجر وعصر کے بعد مصافحہ: ایک تحقیقی جائزہ

مصافحہ کرنا مسنون ہے اِس سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو بخش دیتے ہیں؛ لیکن ہر سنت کا کوئی محل اور موقع بھی ہوتا ہے؛ اگر وہ سنت اُس کے موقع پر انجام دی جائے تو سنت ہوگی اور اس پر عمل کرنے سے ان شاء اللہ ثواب حاصل ہوگا؛ لیکن اگر اس سنت کو بے موقع اور بے محل استعمال کرلیا تو ثواب کے بجائے گناہ کا اندیشہ ہوتا ہے مثلاً: درود شریف پڑھنا بہت بڑی عبادت اور سعادت کی بات ہے، کیا کوئی نماز میں صرف درود ہی درود پڑھ لے تو نماز ہوجائے گی؟ نہیں ہوگی؛ بلکہ فقہاء نے لکھا ہے: کہ قعدہ اولیٰ میں اگر نماز پڑھنے والا تشہد پڑھنے کے بعد درود شروع کردے اور اللھم صل علی محمد تک پڑھ دے تو سجدہ سہو واجب ہوجائے گا، اب فیصلہ کیجیے نمازی نے درود پڑھ کر کون سا گناہ کردیا کہ سجدہ سہو واجب ہوگیا۔

نبی کریم ﷺ نے ایک صحابیؓ کو ایک دعا سکھائی اور فرمایا کہ سونے سے پہلے یہ دعا پڑھ لیا کرو، دعا کے الفاظ یہ تھے۔

آمنت بكتابك الذي أنزلتَ وبنبيك الذي أرسلتَ (۱) چند روز کے بعد حضور ﷺ نے ان صحابیؓ سے فرمایا کہ وہ دعا ذرا سناؤ، اُن صحابیؓ نے دعا سناتے وقت "وبنبيك" کے بجائے "ورسولك" پڑھ دیا یعنی، دعا میں لفظ ''نبی'' کی جگہ ''رسول'' کا لفظ پڑھ دیا، حضور ﷺ نے فرمایا وہی لفظ کہو جو میں نے سکھایا تھا؛ حالاں کہ نبی اور رسول کے لفظ میں کوئی خاص فرق نہیں؛ بلکہ

بخاری، کتاب الدعوات، باب اذ بات طاهراً، رقم الحدث: ۲۴۷۔

اصطلاحی فرق کے اعتبار سے تو رسول کا درجہ نبی سے بلند ہوتا ہے، نبی کے لیے شریعت و کتاب کا ملنا ضروری نہیں؛ جب کہ رسول وہ ہوتا ہے جسے نئی شریعت اور نئی کتاب ملی ہو، غور فرمائیں ادنیٰ تبدیلی منظور نہیں کی گئی، سبق دیا گیا کہ شریعت پر، شریعت کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے، ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں: اگر ایک کام تم اپنی طرف سے اور اپنی مرضی کے مطابق کرلو اور وہی کام تم اتباع سنت کی نیت سے، حضور ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق انجام دے دو، دونوں میں زمین وآسمان کا فرق محسوس کروگے، جو کام تم اپنی طرف سے اور اپنی مرضی سے کروگے وہ تمہارا اپنا کام ہوگا اور اس پر کوئی اجر وثواب نہیں اور جو کام تم اتباع سنت کی نیت سے کروگے تو اس میں سنت کی اتباع کا اجر وثواب اور سنت کی برکت اور نور شامل ہوجاتا ہے۔ (اصلاحی خطبات:۶/۱۸۸)

الغرض سنت کو برمحل انجام دیا جائے تو کارِ ثواب اور بے محل انجام دیا جائے تو کارِ عقاب ہے۔

پیچھے آپ نے مصافحہ کی مشروعیت وفضائل کی بہت سی روایتیں پڑھیں، ان سب میں عموماً لقاء، استقبال اور التقاء کے الفاظ ہیں، جس کا صاف مطلب ہے کہ مصافحہ بوقتِ ملاقات بعد سلام مشروع ہے؛ اِسی لیے محدثین نے لکھا ہے:

واعلم أن هذه المصافحة مستحبة عند كل لقاء.

(الأذکار:۳۰۳)

قال ابن الحاج من المالكية في المدخل: وموضع المصافحة في الشرع، إنما هو عند لقاء المسلم لأخيه(۱) فالمصافحة سنة مجمع عليها عند التلاقي (۲) فإن محل المصافحة المشروعة، أول الملاقاة. (مرقاۃ:۹/۷۶)

ان سب تصریحات میں ''ملاقات'' کی قید ہے، اب طے یہ کرنا ہے کہ ملاقات کا مطلب کیا ہے؟ ملاقات کا مطلب عرف میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ دو یا دو سے زائد آدمی ایک جگہ موجود نہ ہوں پھر کہیں سے کوئی آجائے اور سامنا ہوجائے، ایک گھر میں پوری فیملی ہوتی ہے، وہاں کوئی نہیں

(۱) شامی:۱/۵۴۸. (۲) ارشاد الساری:۱۳/۲۶۹.

کہتا کہ میری فلاں سے ملاقات ہوئی، اُسی فیملی کے کچھ افراد کہیں جائیں تو جہاں جائیں گے وہاں ملاقات ہوگی، جب واپس اپنے گھر آئیں گے تو ملاقات ہوگی، اِسی کو ملاقات کہتے ہیں؛ لہٰذا ان حالات میں مصافحہ کرنا مشروع و مسنون ہوگا؛ لہٰذا اس کے علاوہ کسی خاص موقع یا کسی خاص تقریب کے وقت مصافحہ کو ضروری سمجھنا، غیر شرعی بات ہوگی۔

مسجد میں لوگ پانچ وقت نماز کے لیے آتے ہیں، آتے وقت ایک دوسرے سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے اور کچھ کی نہیں ہوتی ہے، سلام و دعا بھی ہو جاتا ہے، اب مسجدوں میں نماز کے اختتام پر اچانک لوگ مصافحہ کرنے لگیں تو اسے آپ کیا کہیں گے؟ سنت یا خلافِ سنت کچھ لوگ فجر و عصر کی نماز کے بعد مصافحہ التزام کے ساتھ کرنا نہ صرف ضروری سمجھتے ہیں؛ بلکہ جو اُس وقت مصافحہ نہیں کرتا یا منع کرتا ہے، انہیں اچھا نہیں سمجھتے کچھ اور سمجھتے ہیں، اُن حضرات کا مستدل ممکن ہے وہ روایتیں ہوں، جن میں مصافحہ کا عمومی حکم ہے، مثلا تصافحوا وغیرہ، اوپر کی تصریحات سے اس طرزِ عمل کا غیر مشروع اور غیر مسنون ہونا ظاہر ہو جاتا ہے؛ تاہم مولف ان عبارتوں کو یہاں ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہے، جن میں اس وقت مصافحہ کو جائز کہا گیا ہے، پھر ان عبارتوں کا تحقیقی جائزہ لیا جائے گا۔

(۱) علامہ نوویؒ جو شرح حدیث کے مستند ترین امام تسلیم کیے جاتے ہیں، انہوں نے الاذکار میں لکھا ہے کہ فجر اور عصر کی نمازوں کے بعد، لوگوں کی جو مصافحہ کرنے کی عادت ہے، شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، فلا أصل له في الشرع على هذا الوجه؛ لیکن آگے انہوں نے لکھا ہے کہ ولكن لا بأس به، اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے اور دلیل دی ہے کہ اصل مصافحہ سنت ہے، اور لوگوں کا بعض احوال میں مصافحہ کرنا اور اکثر احوال میں اِفراط و تفریط کر دینا، بعض احوال کو مسنون مصافحہ سے خارج نہیں کرے گا، اور اگر فجر و عصر کے بعد مصافحہ ثابت نہیں ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ بدعت مباحہ ہے؛ چناں چہ شیخ عبد السلام نے اپنی کتاب ''القواعد'' میں بدعت مباحہ کی مثال میں، اسی مصافحہ کو پیش کیا ہے جو فجر و عصر کے بعد ہوتا ہے۔ (الاذکار: ۳۰۳)

(۲) فقہاء احناف میں سے علامہ حصکفیؒ کی رائے بھی اباحت وجواز کی ہے، وہ لکھتے ہیں: واطلاق المصنف تبعا للدرر والكنز والوقاية والنقاية والمجمع والمتلقى وغيرها يفيد جوازها مطلقا ولو بعد العصر وقولهم إنه بدعة: أي بدعة حسنة.

(الدر مع الرد:۷/۵۴۸)

تجزیہ: حافظ ابن حجرؒ نے علامہ نوویؒ کی دلیل اباحت پر تبصرہ کیا ہے، قلت: وللنظر فيه مجال، کہ علامہ نوویؒ کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائش ہے، دیکھیے نفل نماز کی مشروعیت میں کسی کو کلام نہیں؛ بلکہ نفل پڑھنے کی ترغیب آئی ہے؛ لیکن محققین نے نفل کے لیے کسی مخصوص وقت کو متعین کرنے کو مکروہ لکھا ہے؛ بلکہ بعض محققین نے تو اس طرح کی نمازوں کے لیے وقت کی تخصیص کو حرام لکھا ہے، بالکل یہی شکل فجر وعصر کے بعد مصافحہ کے التزام کی ہے، لکھتے ہیں:

فإن أصل صلاة النافلة سنة مرغب فيها، ومع ذلك فقد كره المحققون تخصيص وقت بها دون وقت، ومنهم من أطلق تحريم مثل ذلك كصلاة الرغائب التي لا أصل لها. (فتح الباری:۱۱/۶۶)

مشہور حنفی شارحِ حدیث ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے: ولا يخفى أن في كلام الإمام نوع تناقض. یعنی علامہ نوویؒ کی بات میں ایک گونہ تناقض ہے؛ کیوں کہ ایک طرف آپ بعض احوال واوقات میں مصافحہ کو مسنون کہتے ہیں تو دوسری طرف اسی مصافحہ کو فجر وعصر کے بعد بدعت مباحہ کہتے ہیں، ایک چیز سنت بھی ہے اور وہی بدعت بھی ہے، لأن إتيان السنة في بعض الأوقات لا يسمى بدعة. (مرقاۃ المفاتیح:۹/۷۴)

مشہور سلفی عالم دین مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ نے ابن حجرؒ اور ملا علی قاریؒ کی رائے کی تائید کی ہے، لکھتے ہیں:

قلت: الأمر كما قال القاري والحافظ. (تحفۃ الاحوذی:۷/۴۲۶)

صاحب عون المعبود علامہ اشرف عظیم آبادیؒ نے بدعت مباحہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

وتقسيم البدع إلى خمسة أقسام كما ذهب إليه ابن (۱) عبد السلام وتبعه النووي أنكر عليه جماعة من العلماء المحققين. (عون المعبود:۸۲/۱۴،باب فی المصافحۃ)

صاحب تحفۃ الاحوذی نے یہی رائے علامہ شوکانیؒ کی بھی نقل کی ہے: وقد أنكر القاضي الشوكاني أيضا على تقسيم البدعة إلى الأقسام الخمسة في نيل الأوطار في باب الصلاة في ثوب الحرير والقصب. (۴۲۷/۷)

یعنی شیخ عبد السلامؒ نے بدعت کی پانچ قسمیں کی ہیں: واجبہ،محرمہ،مکروہہ،مستحبہ اورمباحہ، اورفجر وعصر کے بعد مصافحہ کو بدعت مباحہ کہا ہے یہ درست نہیں ہے،بدعت بہر حال بدعت ہے۔

علامہ حصکفیؒ کی رائے کا تجزیہ

علامہ شامیؒ فجر وعصر کے بعد مصافحہ کی کراہت کے قائل ہیں اورعلامہ حصکفیؒ کی عبارت کی شرح میں لکھتے ہیں:

خاص طور سے نمازوں کے بعد مصافحہ پر مواظبت یہ سبب ہوسکتا ہے اس امر کا کہ کم پڑھے لکھے لوگ سمجھیں گے کہ فجر وعصر کے بعد مصافحہ کرنا مسنون ہے اور دوسرے اوقات کے مقابلہ میں اس وقت مصافحہ کرنا زیادہ خصوصیت وفضیلت کا باعث ہے؛ حالاں کہ اِن اوقات میں سلف سے مصافحہ پر مواظبت والتزام کہیں منقول نہیں ہے۔

آگے علامہؒ نے ملتقط نامی کتاب کے حوالے سے لکھا ہے:

(۱) الاذکار میں ابو محمد عبد السلامؒ ہے،یعنی ابن کا لفظ نہیں ہے،الاذکار للنووی:۳۰۴۔

أنـه تـكـره الـمـصـافحة بعد أداء الصلاة بكل حال؛ لأن الـصـحـابة رضـي الـله تعالىٰ عنهم ما صافحوا بعد أداء الصلاة، ولأنها من سنن الروافض. (شامی:۵۴۷/۷)

یعنی نمازوں کے بعد مصافحہ کرنا بہر حال مکروہ ہے؛ کیوں کہ صحابہ کرام میں اس کا معمول نہیں تھا؛ بلکہ یہ تو روافض کا طریقہ ہے۔

آگے علامہؒ نے صاحب تبیین المحارم کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے شافعیہ سے نقل کیا ہے:

أنها بـدعة مكـروهة لا أصـل لها في الشرع، وإنه ينبه فاعلها أولاً ويعزر ثانياً. (ایضاً)

یعنی فجر وعصر کے بعد مصافحہ کرنے والے کو پہلے سمجھایا جائے گا؛ اگر سمجھ گیا تو ٹھیک ہے؛ ورنہ سزا دی جائے گی۔

پھر علامہ ابن الحاج مالکیؒ کا قول نقل کیا ہے:

إنها مـن البـدع، وموضع المصافحة في الشرع، إنما هو عـنـد لـقـاء الـمسلم لأخيه لا في أدبار الصلوات، فحيث وضـعها الشرع يضعها، فينهى عن ذلك ويزجر فاعله لما أتى به من خلاف السنة. (ایضا)

یعنی نمازوں کے بعد مصافحہ بدعت ہے؛ لہٰذا جس جگہ شریعت نے مصافحہ کو مشروع کیا ہے وہیں مصافحہ کیا جائے اور جو اس کے خلاف کرے اُس کو سمجھایا بجھایا جائے اور اسلامی ملک ہو تو گوش مالی بھی کی جائے۔

خلاصہ: ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ بعض نمازوں کے بعد خصوصی طور پر مصافحہ کرنے کے

سلسلے میں اہل علم کی آراء مختلف ہیں، دلائل کی روشنی میں آپ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ سنت کے قریب بات کیا ہے؟

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

> ہاں نمازِ فجر کے بعد مصافحہ کرنے کا طریقہ آں حضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں نہیں تھا اور اس کا رواج دینا اور التزام بدعت ہے۔ (کفایت المفتی: ۹/۹۲)

ایک متوازن رائے

مذکورہ دونوں اوقات میں لوگوں کا مصافحہ کرنا مشروع و مستحب طریقے پر نہیں ہے؛ کیوں کہ مسنون مصافحہ کا وقت، آغازِ ملاقات ہے، (یہ کیا بات ہوئی) ان نمازوں میں لوگ بغیر مصافحہ کے ایک دوسرے سے ملتے ہیں، گفتگو کرتے ہیں، علمی مذاکرہ کرتے ہیں (اور خیر خیریت معلوم کرتے ہیں) اور اس میں پانچ دس منٹ تو گذر ہی جاتے ہیں، بعض دفعہ خاصا وقت گذر جاتا ہے، پھر جب نماز پوری ہوگئی وہی لوگ ایک دوسرے سے مصافحہ کرنے لگے، فأين هذا من السنة المشروعة (تو کہاں لوگوں کا یہ طرزِ عمل اور کہاں یہ سنت؛ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک) اسی وجہ سے ہمارے بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ اس وقت مصافحہ کرنا مکروہ ہے؛ بلکہ یہ مذموم ترین بدعت ہے، ہاں اگر کوئی شخص مسجد ایسے وقت آیا کہ لوگ نماز میں مشغول ہیں یا نماز شروع کرنے والے ہیں اور وہ شخص نماز سے فراغت کے بعد ان لوگوں سے مصافحہ کرے تو یہ مصافحہ بلاشبہ مسنون مصافحہ ہے؛ بشرطیکہ اس نے مصافحہ سے پہلے سلام بھی کیا ہو، یہاں یہ بات مخفی نہ رہے کہ اگرچہ کسی متعین وقت اور مکروہ وقت میں مصافحہ کرنا مکروہ ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص اُس وقت مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھادے تو اپنا ہاتھ کھینچ لینا اور اس طرح بے اعتنائی برتنا مناسب نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اِس کی وجہ سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھانے والے شخص کو دکھ پہنچے گا اور کسی مسلمان کو دکھ پہنچانا آداب کی

رعایت سے زیادہ اہم ہے؛ الحاصل اس وقت مروجہ طریقے پر مصافحہ کی ابتداء مکروہ ہے؛ مگر مجابرہ (بدخلقی) مناسب نہیں اگر چہ اس میں ایک گونہ بدعت پر تعاون ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح: ۷/۴۹)

عیدین میں مصافحہ اور گلے ملنے کا مسئلہ

آج پورے ملک میں عیدین کی نماز اور خطبہ کے بعد مسجد اور خارج مسجد مصافحہ اور معانقہ کا رواج ہو چکا ہے، عید کے دوسرے دن اخبارات میں دو بچوں کو گلے ملتے ہوئے دکھایا جاتا ہے، مسجدوں میں ایسا منظر ہو جاتا ہے جیسے لوگ شکرانے کی دو رکعت پڑھنے نہیں؛ بلکہ گلے ملنے کے مقصد کے لیے جمع ہوئے ہیں، عید کی خوشی کا ذریعہ بس یہی مصافحہ اور معانقہ ہے، مصافحہ ومعانقہ بیشک اظہارِ محبت ومودت کا ذریعہ ہیں؛ لیکن بوقتِ ملاقات، یہ نہیں کہ سب لوگ گھنٹوں سے مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں، باتیں کر رہے ہیں، تقریر سن رہے ہیں اور نماز کے اختتام پر اچانک گلے ملنے لگیں، ایک بار بھی نہیں تین بار مصافحہ معانقہ کرنے لگیں، یہ کہاں کی سنت ہے؟؛ لیکن یہ ایسا رواج پا چکا ہے کہ سمجھنا اور سمجھانا بہت مشکل ہے، کسی کو سمجھایئے تو کہتے ہیں: ؎

عید کا دن ہے گلے آج تو مل لے ظالم
رسمِ دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے

اب انہیں کون سمجھائے کہ مصافحہ ومعانقہ سب کچھ ہے؛ لیکن شریعت وسنت تو نہیں ہے، اس سلسلے میں بنیادی باتیں آپ نے اوپر پڑھ لی ہیں، جب فجر وعصر کے بعد مصافحہ غیر مسنون ہے جو کہ فرض نمازیں ہیں تو عیدین کے بعد کیسے مسنون ہو سکتے ہیں جو کہ واجب ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ صحابہ کرام اور سلف صالحین سے ثابت نہیں ہے(۱) چند فتاوے ملاحظہ فرمائیں:

حضرت تھانویؒ کا اصولی فتویٰ

قاعدہ کلیہ ہے کہ عبادات میں حضور اکرم ﷺ نے جو ہیئت اور کیفیت معیَّن فرمادی ہے،

(۱) احادیث کی شروحات میں کہیں اس کا تذکرہ نہیں ملتا؛ بلکہ اس کے خلاف باتیں ملتی ہیں۔

اس میں تغیر وتبدُّل جائز نہیں اور مصافحہ چوں کہ سنت ہے؛ اِس لیے عبادات میں سے ہے تو حسبِ قاعدۂ مذکورہ اس میں ہیئت وکیفیت منقولہ سے تجاوز جائز نہ ہوگا اور رسول اللہ ﷺ سے صرف پہلی ملاقات کے وقت بالا جماع یا رخصت کے وقت بھی علی الاختلاف منقول ہے، بس اب اس کے لیے ان دو وقتوں کے سوا اور کوئی موقع ومحل تجویز کرنا تغیر عبادت ہے، جو ممنوع ہے؛ لہٰذا مصافحہ بعد عیدین یا بعد نمازِ پنج گانہ مکروہ وبدعت ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ۱/ ۵۵۷)

حضرت گنگوہیؒ کا اصولی فتویٰ

معانقہ ومصافحہ بوجہ تخصیص کے کہ اس روز میں اس کو موجب سرور اور باعث مودت، اور ایام سے زیادہ، مثل ضروری کے جانتے ہیں، بدعت ہے اور مکروہ تحریمی اور علی الاطلاق ہر روز مصافحہ کرنا سنت ہے، ایسا ہی بشرائط خود یوم العید کے ہے اور علی ہذا معانقہ جیسا بشرائط خود دیگر ایام میں ہے ویسا ہی یوم عید کے ہے، کوئی تخصیص اپنی رائے سے کرنا بدعت ضلالہ ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ رشیدیہ: ۱۲۹)

دونوں بزرگوں کے فتاوے کا مطلب یہ ہے کہ مصافحہ دو ہی وقت ثابت ہے، ملاقات اور رخصت کے وقت، یہ شرط جہاں پائی جائے گی وہاں مصافحہ یا معانقہ جائز ہوگا، عید کے دن کی تخصیص کوئی معنی نہیں رکھتی جیسے عام دنوں میں مصافحہ ومعانقہ کا حکم ہوگا، وہی حکم عیدین میں ہوگا، مصافحہ ومعانقہ اظہارِ محبت کا ذریعہ ہر روز ہیں، صرف عید وبقر عید میں نہیں، اِس لیے اِن اوقات میں مصافحہ یا معانقہ غلط نہیں ; بلکہ اِن اوقات میں مصافحہ ومعانقہ کو ضروری سمجھنا غلط ہے۔

حضرت لدھیانویؒ کا فتویٰ

عید کے بعد مصافحہ یا معانقہ کرنا محض ایک رواجی چیز ہے، شرعاً اس کی کوئی اصل نہیں، آں حضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں، اِس لیے اسکو دین کی بات سمجھنا بدعت ہے، لوگ اس دن گلے ملنے کو ایسا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی اس رواج پر عمل نہ کرے تو اس کو برا

سمجھتے ہیں، اس لیے یہ رسم لائق ترک ہے۔ (آپ کے مسائل: ۷/۲۶۸)

عون المعبود کی ایک عبارت: وكذا المصافحة والمعانقة بعد صلاة العيدين من البدع المذمومة المخالفة للشرع. (عون المعبود: ۱۴/۸۲)

مصافحہ ومعانقہ کی حقیقت

دین کی جس قدر بھی ضروری باتیں تھیں ان پر حضرات صحابہ اور تابعین وتبع تابعین اور اس کے بعد اسلاف، اُس پر عمل کرتے چلے آرہے ہیں؛ اِس لیے کہ اُن کو ثواب حاصل کرنے اور دین کا کام کرنے اور چھوٹی سے چھوٹی سنت ادا کرنے کا ہم سے زیادہ شوق وجذبہ تھا، جس چیز کو انہوں نے دین سمجھا، اہتمام کے ساتھ اس پر عمل کیا اور جن چیزوں کو قدرت ہونے کے باوجود نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ وہ دین نہیں ہیں یا ضروری نہیں ہیں۔

......سلام ومصافحہ اور گلے ملنا داخلِ عبادت ہیں اور عبادت کو رسول اکرم ﷺ کے حکم کے مطابق ہی ادا کیا جائے جب ہی عبادت میں شمار ہوگی اور ثواب کے حقدار ہوں گے، ورنہ بدعت ہوجائے گی اور ثواب کے بجائے گناہ اور عذاب ملے گا، حدیث شریف میں عیدین اور دوسری نمازوں کے بعد مصافحہ اور گلے ملنے کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا اور صحابۂ کرام جن کو سنت نبویہ سے بے نظیر عشق تھا، ان کے یہاں یا اُن کے بعد اسلاف کرام کے عمل سے بھی عید کے موقع پر اِس کا ثبوت نہیں ملتا، شریعتِ مطہرہ سے مصافحہ ومعانقہ وغیرہ، ملاقات کرتے وقت تو ہے نہ کہ نمازوں کے بعد، شریعت نے جو عبادت کا موقع ومحل مقرر کر دیا ہے اس کو اسی کے مطابق ادا کیا جائے گا تو ثواب ہوگا۔ (مسائل آدابِ ملاقات: ۱۰۰)

خواص کی ذمہ داری

پیچھے ملا علی قاریؒ کی مرقاۃ کے حوالے سے ''متوازن رائے'' کے تحت یہ بات لکھی گئی ہے کہ؛ اگر اُسی وقت میں کوئی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا ہی دے تو بدخلقی کا مظاہرہ اچھا نہیں، مصافحہ

کر لینا چاہیے، وہ بات یہاں بھی کہی جاسکتی ہے کہ اگر کسی شخص سے اتفاقی طور سے عید کے روز اُسی وقت ملاقات ہو رہی ہے، تو مصافحہ یا معانقہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لیکن خواص اور علماء کو اس مصافحہ اور گلے ملنے سے بھی بچنا چاہیے؛ تاکہ عوام میں صحیح میسیج جائے اور وہ اس مصافحہ یا معانقہ کو دین کا جز یا سنت نہ سمجھیں؛ مگر طریقہ داعیانہ ومشفقانہ ہو، ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے کہ غم وغصہ اور فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جائے۔

ناپاک شخص سے مصافحہ ومعانقہ کرنا

اگر کوئی شخص ناپاک ہے اُس پر غسل فرض ہے؛ اگر اُس سے کوئی مصافحہ یا معانقہ کر رہا ہے تو وہ شخص مصافحہ یا معانقہ کر سکتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: اللہ کے نبی ﷺ حضرت حذیفہؓ کے پاس رکے، کہا: حذیفہ اپنا ہاتھ لاؤ، حضرت حذیفہؓ جھجھکے، آپ نے دوسری بار یہی کہا تو انہوں نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا، آپ نے تیسری بار یہی کہا تو حضرت حذیفہؓ نے عذر بیان کیا، اے اللہ کے رسول میں ناپاک ہوں اور مجھے گوارہ نہیں کہ اس حال میں میرا ہاتھ آپ کے دست مبارک سے مس کرے، آپ نے کہا: ارے ہاتھ لاؤ، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان شخص جب اپنے بھائی یا دوست سے ملاقات کرتا ہے، اُسے سلام کرتا ہے اور مصافحہ کرتا ہے تو غلطیاں اور گناہ جو اُن کے مابین ہیں، ایسے گر جاتے ہیں جیسے درخت سے پتے گرتے ہیں۔ (شعب الایمان، رقم: ۸۹۵۱ فی المصافحۃ)

مسلمان ناپاک نہیں ہوتا

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے: کہ اُن کی نبی کریم ﷺ سے مدینہ کے کسی راستہ میں ملاقات ہوئی؛ جب کہ وہ جنبی تھے، تو وہ فرماتے ہیں کہ میں کھسک گیا اور غسل کر کے آیا، آپ نے پوچھا: ابو ہریرہ! کہاں چلے گئے تھے؟ انہوں نے عرض کیا: میں جنبی تھا، میں نے ناپاکی کی حالت میں آپ کے ساتھ چلنے کو پسند نہیں کیا، پس آپ نے فرمایا: سبحان اللہ! (عجیب بات!) مسلمان

ناپاک نہیں ہوتا۔ (بخاری:۲۸۳، کتاب الغسل)

تشریح: نبی ﷺ کا بعض صحابہ کے ساتھ خصوصی معاملہ تھا، مثلاً جب حضرت جریر بن عبداللہ بَجَلیؓ آتے تو آپ مسکراتے، اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ اور ابوذرؓ سے خصوصی معاملہ تھا کہ ہر ملاقات پر اُن سے مصافحہ کرتے، ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ کا اچانک آں حضور ﷺ سے آمنا سامنا ہوگیا، وہ جنبی تھے، انہوں نے سوچا نبی ﷺ ان سے مصافحہ کریں گے اور وہ ناپاک ہیں؛ اس لیے وہ کھسک گئے اور غسل کر کے آئے، آپ نے وجہ دریافت کی تو بتایا کہ میں غسل کرنے چلا گیا تھا، آپ نے فرمایا: سبحان اللہ! مسلمان ناپاک نہیں ہوتا یعنی جیسا تم نے خیال کیا ہے مسلمان ایسا ناپاک نہیں ہوتا؛ بلکہ اس کو نجاست حکمی لاحق ہوتی ہے، اُس سے مصافحہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(تحفۃ القاری:۶۸/۲)

(پانچویں فصل)

مصافحہ کی غلطیاں

۱) مصافحہ کی ترکیب میں مشہور ہے کہ انگوٹھوں کو دباوے یہ بے اصل ہے اور یہ حدیث کہ انگوٹھوں میں رگِ محبت ہے، موضوع ہے۔

۲) بعض لوگ مصافحہ میں ہاتھ پکڑے رہتے ہیں چھوڑتے نہیں، اِس سے الجھن ہوتی ہے کسی کے ہاتھ کوخواہ مخواہ محبوس کر لینا برا ہے

۳) ایسے وقت مصافحہ کرنا تکلیف دینا ہے جب ہاتھ خالی نہ ہو جیسے ایک ہاتھ میں جوتا ہے، دوسرے ہاتھ میں چھتری ہے۔

۴) اسی طرح جوشخص تیزی سے چلا جارہا ہے اُس کو مصافحہ کے لیے روکنا نہیں چاہیے۔

۵) اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ بعد وعظ، وعظ کہنے والے سے ضرور مصافحہ کرتے ہیں، سو اِس میں تکلیف ہے۔ (اغلاط العوام: ۹۸)

۶) بعض لوگ مصافحہ کر کے اپنے ہاتھ کو چومتے ہیں، اِس کی کوئی اصل نہیں ہے، جہالت کا نتیجہ ہے۔ (فتاوی رحیمیہ: ۳۰۲/۲)

۷) بعض مصافحہ کر کے سینہ پر ہاتھ رکھتے ہیں اور سلام کرتے وقت ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہیں، بے اصل ہے۔ (اغلاط العوام)

۸) بعض حضرات صلح کرانا اِس کو سمجھتے ہیں کہ جہاں دو آدمیوں میں جھگڑا ہوا، فوراً دونوں کا مصافحہ کرادیا، خواہ فریقین کے دلوں میں کچھ بھرا ہو، میں تو کہتا ہوں پہلے معاملہ کی اصلاح کرو پھر مصافحہ کرو، ورنہ بغیر اصلاحِ معاملہ کے مصافحہ بے کار ہے، اِس سے فریقین کے دل کا غبار نہیں نکلتا، تو مصافحہ کے بعد پھر مکافحہ یعنی مقاتلہ (لڑائی جھگڑا) شروع ہو جاتا ہے۔

(کمالات اشرفیہ: ۱۳۹/۱)

۹) مصافحہ میں صرف انگلیاں ملانا یا ہتھیلیاں ملانا غلط ہے۔

۱۰) مصافحہ ہاتھ سے ہاتھ ملانے کا نام ہے، مصافحہ کے بعد سینہ پر ہاتھ پھیرنے کا نہ حدیث میں کہیں ذکر ہے اور نہ فقہاء نے اس کا تذکرہ کیا ہے، یہ محض ایک رواج ہے؛ اِس لیے اس سے گریز کرنا چاہیے۔ (کتاب الفتاوی:۶/۱۲۸)

۱۱) جو لوگ وظیفہ میں مشغول ہوں یا کوئی اور مصروفیت ہو تو مصافحہ نہ کرے، خلل ہوگا۔

۱۲) فرض نمازوں کے بعد مقتدیوں کا التزام کے ساتھ امام سے مصافحہ کرنے کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

۱۳) بعض اُن مسلمانوں کا خیال ہے، جو متشدد رضا خانی ہیں کہ دیوبندی، وہابی سے سلام ومصافحہ کرنے سے انسان ناپاک ہوجاتا ہے یا نکاح ٹوٹ جاتا ہے، یہ غلط ہے اور جہالت کی پیداوار ہے، فتاوی ریاض العلوم میں ہے:

> مسلمانوں سے سلام کرنے کی ترغیب حضور ﷺ نے فرمائی ہے، تو بھلا اِس پر عمل کرنے سے کوئی ناپاک کیوں ہوگا؟ ہاں اِس عمل یعنی کسی مسلمان کو سلام کرنے پر ناپاک ہونے کا عقیدہ خود ناپاک اور خلافِ شریعت ہے۔ (فتاویٰ ریاض العلوم:۱/۳۱۷)

دسواں باب

عن عائشةَ، قالت: قَدِمَ زَيدُ بنُ حَارِثةَ المدينةَ ورسولُ الله ﷺ في بيتي فأتاه، فقَرَعَ البابَ، فقامَ إليه رسولُ الله ﷺ عُرْيَاناً يَجُرُّ ثوبَه - واللهِ ما رَأيتُه عُرياناً قَبلَه ولا بَعدَه - فَاعْتَنَقَه وقَبَّلَه

(شرح السنة: ۳۳۲۷)

معانقہ وتقبیل (دست بوسی) کا بیان

(پہلی فصل)

معانقہ کا بیان

لغوی تحقیق

معانقہ کا لفظ عنق سے ماخوذ ہے، عنق کے معنی ہیں ''گردن'' اور معانقہ بابِ مفاعلۃ کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں: باہم گردن ملانا جس کو اردو میں گلے ملنا کہتے ہیں۔

العُنْقُ والعُنُقُ: وصلة ما بين الرأس والجسد (لسان العرب: ع ن ق)

عانقه معانقة وعناقاً: التزمه فأدنٰى عنقه من عنقه. (ایضاً)

اور تقبیل کے معنی ہیں: بوسہ دینا، چومنا، بابِ تفعیل کا مصدر ہے۔

سب سے پہلے معانقہ کس نے کیا؟

سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام(۱) نے معانقہ کیا؛ ورنہ قبل ازیں یہ اسے سجدہ کر دیتا، وہ اسے سجدہ کر دیتا تھا، اسلام آیا اور اس نے (آؤ بھگت کے لیے) مصافحہ مقرر کیا۔ (کنز العمال: ۲۵۳۵۹)

معانقہ وتقبیل کی حقیقت

محبت وتعلق کے اظہار کا آخری اور انتہائی درجہ معانقہ (گلے ملنا) اور تقبیل (ہاتھ وغیرہ چومنا) ہے؛ بلکہ اِس کی اجازت اُسی صورت میں ہے جب کہ موقع محل کے لحاظ سے کسی شرعی

---

(۱) کنز العمال میں صرف اس کی صراحت ہے کہ سب سے پہلے معانقہ حضرت ابرہیم علیہ السلام نے کیا؛ لیکن اس کی صراحت نہیں ہے کہ معانقہ کس سے کیا؟ مولفِ کتاب کو ایک اردو کتاب میں اس کی صراحت ملی: الفاظ یہ ہیں: اور آپ (حضرت ابراہیمؑ) نے اس وقت یہ معانقہ حضرت ذوالقرنین علیہ السلام سے کیا، وہ مقام ابطح مکہ میں تشریف فرماتھے، اہمیتِ سلام وملاقات: ۵۶۔

مصلحت کے خلاف نہ ہو اور اس سے کسی برائی یا اس کے شک وشبہ کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو؛ بلکہ جائز محبت کی پہچان ہو، بلاتکلف جھپٹنے اور گلے ملنے کا تقاضہ ہو اور یاد رہے معانقہ اور تقبیل بذاتِ خود سلام کا تکملہ اور تتمہ نہیں؛ بلکہ فقط جوشِ مسرت ومحبت کے مواقع پر ثابت ہے اور صحابہ میں سفر سے واپسی کے وقت اِس کا رواج تھا جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

معانقہ کا حکم

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک معانقہ وتقبیل مکروہ ہے، ابن عیینہؒ جواز کے قائل ہیں۔

اختلف الناس في المعانقة، فكرهها مالك وأجازها ابن عيينة.

(شرح ابن بطال:۹/۵۰)

علامہ نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے:

واختلف العلماء في معانقة الرجل للرجل القادم من سفر، فكرهها مالك وقال: هي بدعة (۱) واستحبها سفيان وغيره، وهو الصحيح الذي عليه الأكثرون والمحققون. (شرح النووی:۸/۲۰۸)

یعنی ایک شخص کا سفر سے واپس آنے والے شخص سے معانقہ کرنے کے سلسلے میں اختلاف ہے، امام مالکؒ بدعت کہتے ہیں اور حضرت سفیان ابن عیینہؒ اس کو مستحب کہتے ہیں اور استحباب کا قول ہی صحیح ہے، اکثر محققین کی رائے یہی ہے۔

امام مالکؒ اور حضرت سفیانؒ کا مناظرہ

تقریباً سارے محدثین نے اس مناظرہ کو ذکر کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ: ایک مرتبہ حضرت سفیانؒ، امام مالکؒ سے ملنے آئے، سلام کے بعد امام مالک نے، ابن عیینہ سے مصافحہ کیا اور کہا: يا أبا محمد لولا أنها بدعة لعانقتك کہ اگر معانقہ بدعت نہ ہوتا تو میں آپ سے معانقہ

(۱) حضرت مولانا زکریا صاحبؒ نے لکھا ہے: وروى عنه ما يدل على أنه رجع عن القول بالكراهة (الأبواب والتراجم ۶/۳۵۸) جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

کرتا، حضرت سفیانؒ نے عرض کیا: عانق خير منك کہ آپ سے بہتر ذات نے معانقہ کیا ہے، امام مالکؒ نے کہا: کیا حضرت جعفرؓ نے؟ حضرت سفیانؒ نے کہا: ہاں امام مالکؒ نے کہا ذاك خاص یعنی یہ ایک خاص واقعہ ہے، حضرت سفیانؒ نے کہا: نہیں جو اُن کے لیے حکم ہے وہی ہمارے لیے ہے ما عَمَّه يَعُمُّنا ويخص جعفر يخصنا، پھر ابن عیینہؒ نے حضرت جعفرؓ سے حضور ﷺ کے معانقہ کرنے کی حدیث بیان کی، جو آگے آرہی ہے۔ (شرح ابن بطال:۹/۵۱-فتح الباری:۱۱/۴۷)

حنفی مسلک — چند اقوال اور صحیح تحقیق

علامہ شامیؒ نے ہدایہ کے حوالے سے لکھا ہے: انسان کا انسان کو چومنا (خواہ منہ کو ہو یا ہاتھ کو ہو یا کسی بھی عضو کو) اور اس سے معانقہ کرنا مکروہ ہے، امام طحاویؒ نے اِس رائے کو امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی جانب منسوب کیا ہے اور امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں: اِس میں کوئی حرج نہیں، امام ابو یوسفؒ کا استدلال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے ہے: أنه عليه الصلاة والسلام عانق جعفرا حين قدم من الحبشة وقبّله بين عينيه اور امام صاحبؒ کی دلیل یہ روایت ہے أنه عليه الصلاة والسلام نهى عن المكامعة، وهي المعانقة، وعن المكاعمة (۱) وهي التقبل، یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ جن روایات سے معانقہ کی اجازت ثابت ہوتی ہے، اُن کا تعلق اس زمانے سے ہے، جب کہ معانقہ کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا تھا۔ (ردالمحتار:۹/۵۴۶)

مولانا ظفر احمد تھانویؒ کی تحقیق

اوپر کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور طرفینؒ کا اس مسئلے میں اختلاف ہے، اور بعض لوگوں نے اس اختلاف کو دور کرنے کے لیے کئی توجیہات پیش کی ہیں؛ جیسا کہ آگے آرہا ہے؛ لیکن صاحب اعلاء السنن محقق مولانا ظفر احمد تھانوی صاحبؒ نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اِس مسئلے میں احناف کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، یہاں خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

---

(۱) دونوں احادیث کے لیے دیکھئے، شرح السنۃ ۱۲/۲۹۱، التقبیل.

معانقہ وتقبیل کے متعلق امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کا مسلک یہ ہے کہ (۱) شہوت کے ساتھ حرام ہے، (۲) اور ملاقات کے وقت کی سنت اور سلام کا تتمہ ہونے کی حیثیت سے مکروہ ہے (۳) اور نفسانی شہوت کے شائبہ کے بغیر جوشِ مسرت کی بنا پر جائز ہے، جامع صغیر میں امام محمدؒ کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں ائمہ احناف کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور امام طحاویؒ (۱) نے طرفینؒ اور امام ابو یوسفؒ کے درمیان جو اختلاف نقل کیا ہے، اور صاحب ہدایہ نے بھی ان کی موافقت میں اختلاف نقل کیا ہے، وہ نا قابل التفات ہے اور مذہبِ حنفی کی نقل میں اشتباہ ہو گیا ہے؛ لہٰذا امام محمدؒ کی نقل زیادہ معتبر ہے اور مذہب حنفی کے بیان میں امام محمدؒ کی کتب ستہ، جامع صغیر وغیرہ سب سے زیادہ معتبر اور اصل بھی ہیں۔

پوری عبارت پڑھیے:

(۱) التقبيل والاعتناق قد يكونان على وجه التحية كالسلام والمصافحة وهما اللذان نهى عنهما في الحديث .... وهو ما ذهب إليه أئمتنا الثلاثة: الإمام أبو حنيفة و أبو يوسف ومحمد؛ لأن هذه المسئلة ذكره محمد في الجامع الصغير ونصه على ما في البناية ٤/ ٢٥١) محمد عن يعقوب عن أبي حنيفة قال: أكره أن يقبل الرجل من الرجل فمه أو يده أو شيئا منه وأكره المعانقة ولا أرى بالمصافحة بأساً الخ وهذا يدل بسياقه على أن التقبيل والمعانقة الذين كرههما أبو حنيفة هما اللذان يكونانِ على وجه التحية عند اللقاء لامطلقا، ويدل أيضا على أن المسئلة مما اتفق عليه الأئمة الثلاثة؛ لأن محمدا لم يذكر الخلاف فيها.

(۲) وقد يكونان على وجه الشهوة وهما المكاعمة والمكامعة التى يعبر عنها بالفارسية "ببوس وكنار" وهما لا تجوزان عند أئمتنا الثلاثة لورود النهي عنهما بخصوصها وبالأدلة الأخرى بعمومها.

---

(۱) دیکھیے شرح معانی الآثار: ۲/ ۳۳۶۔

(۳) وقد يكونان بهيجان المحبة والشوق والاستحسان عند اللقاء وغيره من غير شائبة الشهوة وهما مباحان باتفاق أئمتنا الثلاثة؛ لثبوتهما عن النبي ﷺ وأصحابه ولعدم مانع شرعي عنه. اس کے بعد لکھتے ہیں:

هذا هو التحقيق وقد التبس الأمر فيه على مشائخنا، فأثبت الطحاوي الخلاف فيه بين الطرفين وأبي يوسف......إلى قوله: وتبعه صاحب الهداية في إثبات الخلاف بينهم. (اعلاء السنن: ۱۷/۴۲۳، کتاب الحظر)

امام بخاریؒ نے اِس سلسلے میں تین ابواب باندھے ہیں: باب رحمة الولد وتقبيله ومعانقته، باب المعانقة وقول الرجل: كيف أصبحت؟ اور کتاب البیوع میں باب ما ذكر في الأسواق، اہل علم اِن ابواب اوران کے تحت مذکوراحادیث دیکھ سکتے ہیں، اندازہ یہی ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ نے معانقہ وتقبیل کی اباحت کو ثابت کیا ہے۔

روایات - تطبیق وتشریح

(۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ایک شخص نے پوچھا: جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یادوست سے ملے، تو کیا اجازت ہے کہ اُس کے سامنے جھک جائے آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، پھر سائل نے پوچھا، کیا اِس کی اجازت ہے کہ اُس سے لپٹ جائے؟ یعنی اُس کو گلے لگائے اور اُس کو چومے، آپ نے فرمایا نہیں، (کیوں کہ اس میں فساد کا اندیشہ ہے)

(ترمذی، رقم: ۲۷۲۹)

اِس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ معانقہ وتقبیل مکروہ ہے، حالاں کہ معانقہ وتقبیل خود حضور ﷺ سے ثابت ہے؛ جیسا کہ آگے آرہا ہے؛ اِس لیے جمہور نے اِس حدیث کی تاویل کی ہے۔

(۱) علامہ بغویؒ فرماتے ہیں:

وہ معانقہ اور تقبیل مکروہ ہے، جو تملُّق یعنی بے جا خوشامد اور تعظیم کے طور پر ہو اور حضر میں ہو یعنی ایک ہی جگہ رہنے والوں کے لیے مکروہ

ہے؛ ورنہ اُس صورت میں معانقہ کرنا اور ہاتھ وغیرہ چومنا جائز ہے؛ جب کہ کسی کو رخصت کیا جائے، یا کوئی سفر سے آئے یا کسی سے بہت دنوں کے بعد ملاقات ہو اور یا لوجہ اللہ کسی کی محبت کا غلبہ اِس کا متقاضی ہو۔

فأما المكروه من المعانقة والتقبيل، فما كان على وجه الملَق والتعظيم، وفي الحضر؛ فأما المأذون فيه فعند التوديع، وعند القدوم من السفر، وطول العهد بالصاحب، وشدة الحب في الله. (شرح السنۃ:۱۲/۲۹۳)

(۲) امام طحاویؒ فرماتے ہیں:

معانقہ صحابۂ کرامؓ سے ثابت ہے، اور جس روایت میں ممانعت آئی ہے وہ منسوخ ہے۔

فهؤلاء أصحاب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قد كانوا يتعانقون، فدل ذلك أن ما روي عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم من إباحة المعانقة متأخر عن ما روى عنه من النهي عن ذلك فبذلك نأخذ. (شرح معانی الآثار:۲/۳۳۶)

(۳) مولانا ظفر احمد تھانویؒ فرماتے ہیں:

معانقہ سے ممانعت، سلام کا تکملہ اور مستحب ہونے کی حیثیت سے ہے یعنی شریعت نے ملاقات کے وقت جس عمل کو مشروع کیا ہے وہ سلام اور مصافحہ ہے، معانقہ سلام کا تتمہ اور اُس کی جنس سے نہیں (۱) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معانقہ اشتیاق و مسرت اور حد درجے کی محبت

(۱) صاحبِ احسن الفتاویٰ کو حضرت کی اِس توجیہ پر تین وجوہات کی وجہ سے اطمینان نہیں ہے، اہلِ ذوق دیکھ سکتے ہیں احسن الفتاویٰ ۸/۴۱۰.

کے تقاضہ سے کیا ہے، نہ کہ استحباب اور تکملۂ سلام کی حیثیت سے؛ لہٰذا اگر نفسانی اور شیطانی ہیجان اور شہوت کا اندیشہ نہ ہو تو غلبۂ محبت میں معانقہ کرنا جائز ہے، یہی بات تقبیل کے بارے میں کہی جائے گی۔

التقبيل والاعتناق قد يكونان على وجه التحية كالسلام والمصافحة، وهما الذان نهى عنهما في الحديث.
(اعلاء السنن: ۴۲۳/۱۷)

(۴) شیخ ابو منصور ماتریدیؒ فرماتے ہیں:

جو معانقہ برے خیالات اور جنسی جذبات کے تحت ہو وہ مکروہ ہے، اور جس معانقہ کا تعلق محبت واکرام کے جذبہ سے ہو وہ بلا شک وشبہ جائز ہے، وفي العناية: ووفق الشيخ أبو منصور بين الأحاديث فقال: المكروه من المعانقة ما كان على وجه الشهوة (۱) فأما على وجه البر والكرامة إذا كان عليه قميص واحد فلا بأس به. (ردالمحتار: ۵۴۶/۹)

(۵) الخلاف في المعانقة في إزار واحد، أما إذا كان عليه قميص أوجبة لا بأس به بالإجماع وهو الصحيح یعنی معانقہ کے بارے میں جو اختلاف ہے وہ اس صورت میں ہے جب کہ جسم پر کپڑے نہ ہوں (۲) بدن پر قمیص وجبہ وغیرہ ہو اور معانقہ کیا جائے تو

(۱) لیکن اس پر اشکال ہوتا ہے کہ اس صورت میں مظنہ شہوت کے سبب مصافحہ بھی جائز نہیں؛ جیسا کہ علامہ شامیؒ نے تصریح کی ہے (وإن كان صبيحا فحكمه حكم النساء، ردالمحتار: ۲۳۳/۵، نعمانیہ) تو معانقہ کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں، فتاوی ریاض العلوم: ۱۶۹/۲.

(۲) اس توجیہ پر مولانا ظفر احمد تھانویؒ کو تعجب کے ساتھ اعتراض ہے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر بدن پر کپڑے ہوں اور شہوت کا اندیشہ ہو تب بھی جائز ہوگا؛ حالاں کہ یہ صورت بھی ممنوع ہوگی، وأعجب منه أن قال: قالوا: الخلاف في المعانقة في إزار واحد، وأما إذا كان عليه جبة فلا بأس بها بالإجماع وهو الصحيح الخ. لأنك قد عرفت أن لا تعرض في كلامه للإزار والجبة ولا فرق بين الحالتين من جهة النظر؛ لأن الرجل إن كان ممن يشتهي فلا فرق بين كون الجبة عليه وعدمه في مظنة الشهوة وإلا فلا فرق بينهما في عدمها؛ فهذا توجيه لكلامهم بحيث لا يرضونه، اعلاء السنن: ۴۲۳/۱۷.

اِس میں کوئی اختلاف نہیں؛ بلکہ بالاتفاق جائز ہے۔ (ردالمحتار: ۹/۵۴۶)

(٦) علامہ نوویؒ کی رائے یہ ہے کہ معانقہ سے ممانعت عام حالات میں ہے اور مشروعیت وجواز، سفر سے آنے کے وقت ہے۔ وأنه لا بأس به عند القدوم (۱) من سفر وغيره، ومكروه كراهة تنزيه في غيره. (الأذکار: ۳۰۲)

دوسری روایت

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: حضرت زید بن حارثہؓ کسی سفر سے لوٹ کر مدینے پہنچے، اُس وقت نبی کریم ﷺ میرے گھر میں تھے، حضرت زیدؓ آپ سے ملنے آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، نبی کریم ﷺ اُن کی طرف اٹھے، اِس حال میں کہ آپ کا بدن کھلا ہوا تھا اور آپ اپنا کپڑا گھسیٹ رہے تھے، صدیقہؓ فرماتی ہیں: بخدا میں نے آپ کو اس سے پہلے اور اِس کے بعد کبھی کسی سے اِس طرح کھلے بدن ملتے نہیں دیکھا، آپ نے حضرت زید سے معانقہ کیا اور اُن کو چوما۔ (ترمذی، رقم: ۲۷۳۲، باب ماجاء فی المعانقہ)

تشریح: معلوم ہوا کہ سفر سے آنے والے کے ساتھ معانقہ اور تقبیل بلا کراہت جائز ہے اور تقبیل کا مطلب ہے ہاتھ و پیشانی چومنا۔ (۲) اور آپ کا بدن کھلا تھا کا مطلب ہے، کرتے کی جگہ جو چادر آپ زیب تن فرماتے تھے وہ چادر نہیں تھی، اوپر کا آدھا بدن کھلا ہوا تھا اور یہ کمالِ خوشی کی وجہ سے تھا۔

(۳) حضرت ایوب بن بُشَیرؒ بنوعنزہ کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ اُس نے کہا: میں نے ابوذرؓ سے پوچھا، جب آپ لوگ، رسول اکرم ﷺ سے ملاقات کیا کرتے تھے تو کیا حضور ﷺ آپ لوگوں سے مصافحہ بھی کیا کرتے تھے، حضرت ابوذرؓ نے فرمایا: کہ میں نے جب بھی

---

(۱) اِس پر اشکال اُس روایت سے ہوتا جو حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے، وہ روایت آگے آرہی ہے، اس روایت سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ وہ سفر میں نہیں گئے تھے، پھر بھی حضور نے معانقہ کیا، حضرت ابوذر کا گھر پر موجود نہ ہونا، سفر میں ہونے پر دال نہیں ہے، اور حضر کا ہونا اصل ہے، فتاوی ریاض العلوم: ۲/۱۷۰۔

(۲) مظاہر حق: ۵/۳۷۲۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی تو آپ نے مجھ سے (۱) مصافحہ کیا (ایک دن کا واقعہ ہے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلانے کے لیے میرے پاس (ایک شخص) کو بھیجا، اُس وقت میں اپنے گھر میں موجود نہیں تھا، جب میں گھر میں آیا تو مجھے اِس کی اطلاع دی گئی؛ چناں چہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ اُس وقت ایک تخت پر جلوہ افروز تھے، آپ نے مجھے گلے لگایا اور یہ گلے لگانا (حصولِ لطف وسرور اور برکت کے اعتبار سے) مصافحہ کی بنسبت بہتر تھا، بہت بہتر تھا۔ (ابوداوٗد، رقم: ۵۲۱۴، باب فی المعانقۃ)

تشریح: اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ سفر سے آنے کے علاوہ دوسری حالتوں میں بھی اظہارِ محبت وعنایت کے پیشِ نظر معانقہ کرنا جائز ہے، اور یہ واقعہ اظہارِ محبت کے لیے ہی تھا؛ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اِس معانقے کو مصافحہ بلکہ ہر چیز سے بہتر قرار دیا؛ کیوں کہ مصافحہ میں تو صرف ہاتھ مس ہوتا ہے، یہاں گلے کا گلے سے مس ہوگیا تو روحانیت وراحت دونوں کا حصول ہوا۔

(۴) حضرت جعفر ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سرزمین حبشہ سے واپسی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: کہ ہم حبشہ سے روانہ ہوئے اور مدینہ پہنچ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے ملاقات کی آپ نے مجھ کو گلے لگایا اور فرمایا: میں نہیں کہہ سکتا کہ میں خیبر کی فتح سے زیادہ خوش ہوں یا جعفر کے واپس آنے کی وجہ سے اور اتفاق سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اسی دن آئے تھے جس دن خیبر فتح ہوا تھا۔ (شرح السنۃ: ۱۱/ ۲۹۱، باب المصافحۃ وفضلھا)

یہ وہی حدیث ہے، جس کو حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے شیخ اور استاذ حضرت سفیان ابن عیینہ رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کو سنائی تھی، جب امام مالک رحمہ اللہ نے کہا تھا کہ معانقہ بدعت ہے، اور دلیل دی تھی کہ یہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک خصوصی برتاؤ تھا، یہ امام مالک رحمہ اللہ کا ابتدائی قول تھا، بعد میں انہوں نے رجوع کرلیا تھا؛ چناں چہ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے: وروی عنہ ما یدل علی أنہ رجع عن القول بالکراھۃ. (۲) اور علامہ نووی رحمہ اللہ نے بھی اِس مناظرے کو ذکر کیا ہے، اخیر کے

---

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض صحابہ کے ساتھ خصوصی معاملہ تھا، مثلاً: جب حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ آتے تو آپ مسکراتے، اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے خصوصی معاملہ تھا کہ ہر ملاقات پر ان سے مصافحہ کرتے، تحفۃ القاری: ۲/ ۶۸.

(۲) الأبواب: ۶/ ۳۵۸.

الفاظ ہیں: فقال سفيان: ما نخصه بغير دليل، فسكت مالك، کہ ہم بلا دلیل اِسے خاص واقعہ نہیں کہہ سکتے تو امام مالکؒ نے کوئی جواب نہیں دیا؛ بلکہ خاموش رہے، آگے تو مسئلہ بے غبار ہوجاتا ہے، قال القاضي عياض: وسكوت مالك دليل لتسليمه، قولَ سفيان وموافقته وهو الصواب. (۱) یعنی قاضی عیاضؒ جوخود مالکی المذہب ہیں اُن کا کہنا ہے: کہ امام مالکؒ کی خاموشی، حضرت سفیانؒ کی بات کو قبول کرنے اور تسلیم کرنے کے مترادف ہے، اور ابن بطالؒ نے تو تقبیل کے بارے میں مسئلہ بالکل صاف کردیا ہے، لکھتے ہیں: قال الأبهري: إنما كرهها مالك إذا كانت على وجه التكبر والتعظيم لمن فعل ذلك به، وأما إذا قبل إنسان يد إنسان أو وجهه أو شيئاً من بدنه مالم يكن عورة على وجه القربة إلى الله لدينه أو لعلمه أو لشرفه؛ فإن ذلك جائز، وتقبيل يد النبي ﷺ تقرب إلى الله.

یعنی ہاتھ وغیرہ کو بوسہ دینا دینداری، شرافت اور علم کی وجہ سے جائز ہے، امام مالکؒ اسے مکروہ نہیں کہتے، ایسا بوسہ مکروہ ہے جو غیر محل میں ہو اور تقرب الی اللہ کے طور پر نہ ہو؛ بلکہ تکبر کے طور پر ہو۔ (شرح ابن بطال: ۷/۴۹)

(۵) حضرت شعبیؒ کہتے ہیں: وإذا جاء أحدهم من سفر، عانق صاحبه کوئی صحابی جب کسی سفر سے واپس آتے تھے تو اپنے دوست واحباب سے معانقہ کرتے تھے(۲) اور حضرت سلمانؓ (کسی سفر سے آئے) پس مسجد میں تشریف لائے تو حضرت ابوالدرداءؓ اُن کی جانب اٹھے؛ چناں چہ اُن سے چمٹ گئے (گلے ملے) عمر بن ذرؒ کا کہنا ہے: میں جب بھی عطا بن ابی رباحؒ کو رخصت کرتا تھا تو گلے ملتے تھے۔ (شرح السنہ: ۱۲/۲۹۲)

(۶) عن عقبة بن أبي عثمان أن عمر اعتنق حذيفة (۷) عن أبي بَلْجٍ قال: رأيت عمرو بن ميمون والأسود بن يزيد التقيا واعتنق كل منهما صاحبه. (المصنف: ۶/۱۳۹)

---

(۱) شرح النووی: ۸/۲۰۸. (۲) شعب الایمان: ۸۹۵۸.

خلاصہ: اِن تمام روایات سے معلوم ہوا کہ طویل فصل کے بعد معانقہ کی مشروعیت ثابت ہے، صرف ایک روایت ایسی گذری ہے جس سے ممانعت مفہوم ہورہی تھی؛ چناں چہ اس کی تاویل وتوجیہ گذر چکی ہے، امام مالکؒ کا اختلاف تھا، اُن سے بھی رجوع ثابت ہے، اور امام صاحبؒ اور امام محمدؒ جو ممانعت کے قائل ہیں وہ ایک مخصوص حالت میں۔

معانقہ وتقبیل کی روح

معانقہ انتہائی درجہ کی محبت ہے، اور پاک محبت جسے ''حب فی اللہ'' کہا جاتا ہے، کا جذبہ معانقے کے اندر روح کی حیثیت رکھتا ہے؛ لہٰذا غیر محرم سے معانقہ یا نفسانی جذبہ کے تحت شوہر بیوی کے سوا کسی اور سے معانقہ قطعاً حرام ہے، اِس کو حدیث میں ''مکامعہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، حضرت ابوریحانہؓ سے مروی ہے: کہ حضورﷺ اس بات سے منع فرماتے تھے کہ مرد مرد سے یا عورت عورت سے اس طرح گلے ملیں کہ اُن دونوں کے درمیان کوئی کپڑا نہ ہو۔ (نصب الرایہ:۴/۲۵۷)

معانقہ ایک بار یا تین بار؟

گذشتہ صفحات میں معانقہ کے تعلق سے جو روایات وآثار ذکر کیے گئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ معانقہ دراصل کسی سے اپنی بے پناہ عقیدت ومحبت کے اظہار کا ذریعہ ہے؛ لیکن احادیث میں جو فضائل ومناقب سلام ومصافحہ کے تعلق سے بیان کیے گئے ہیں، معانقہ کے بارے میں وہ تفصیلات موجود نہیں ہیں؛ بلکہ فقہ کی کتابوں میں بھی تشفی بخش تفصیلات نہیں ہیں کہ معانقہ کا طریقہ کیا ہے، معانقہ ایک بار کرنا چاہیے یا تین بار، دائیں جانب کرنا بہتر ہے یا بائیں جانب ؟ وغیرہ، یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ جیسی شخصیت کو مدینہ میں رہتے ہوئے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ معانقہ کا حکم عام ہے یا خاص؟ خود حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کو معانقہ کے بارے میں اطمینان نہیں تھا، وہ کراہت کے قائل تھے؛ اگر چہ وہ مفتی بہ قول نہیں ہے؛ اسی طرح پیچھے جو آثار ذکر کیے گئے اُن میں بعض اُن حضرات کے اسماء کی صراحت کی گئی ہے کہ فلاں نے فلاں سے معانقہ کیا، یہ معانقہ کے

قلیل الوقوع ہونے کی دلیل ہے کہ جب کوئی بڑے رتبے کا شخص کسی سے معانقہ کرتا تو لوگ اسے محسوس کرتے اور نوٹ کرتے تھے۔

بہر حال اِس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے معانقہ تو ثابت ہے لیکن اُس کا خاص طریقہ ثابت نہیں؛ اس لیے معانقہ کا بہتر طریقہ وہ طریقہ ہونا چاہیے جو عرف اور معتدل وشرعی ذوق ومزاج کے مطابق ہو، ایک اقتباس پڑھیے:

> معانقہ ایک وقت میں ایک ہی مرتبہ کرنا چاہیے، بار بار یا تین مرتبہ اس کو ضروری سمجھ کر کرنا جہالۃً یا رسماً ہے، اِس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ (اہمیت سلام وملاقات: ۵۵)

مولف عرض گزار ہے کہ عموماً لوگ تین مرتبہ معانقہ کرتے ہیں؛ بالخصوص بعض علاقوں میں شادی بیاہ کے موقع پر دولہے کو مبارک بادی دیتے وقت، تین مرتبہ معانقہ کرنے کا رواج ہے، اور معانقہ کے بعد پھر سے سلام اور مصافحہ ہوتا ہے یہ شرعی طور پر مناسب نہیں ہے مصافحہ، معانقہ سے پہلے کرنا چاہیے، اور چوں کہ معانقہ کا مقصد انتہائی درجہ کی محبت کا اظہار ہے، جس کا محل اور مرکز دل ہے، اور دل ایک اور ایک ہی جانب ہوتا ہے؛ اس لیے معانقہ (گلے ملنا) ایک ہی جانب کرنا قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے، اصلاح کرنی چاہیے۔

معانقہ کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

معانقہ کے مفہوم میں تین چیزیں آتی ہیں: گردن ملانا، سینہ ملانا اور پیٹ کے ساتھ پورا جسم ملانا، ان میں کونسی شکل بہتر ہے اور کونسی بہتر نہیں؟ ذیل میں تقابلی بحث پیش کی جا رہی ہے:

مفتی رشید احمد صاحبؒ لکھتے ہیں:

> معانقہ میں صرف سینہ ملانے کا جو دستور ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے، یہ حضرات صحابہ کرامؓ اور ائمہ حدیث وفقہ سے ثابت نہیں ہے؛ البتہ بعض روایتوں میں معانقہ کے لیے ''التزام'' کا لفظ وارد ہوا

ہے، جس کے مفہوم میں ''الصاق بالصدر'' آ سکتا ہے، لیکن دوسری روایتوں کی روشنی میں اس کا مفہوم ''معانقہ'' گردن سے گردن ملانا ہی لیا جائے گا، عرب میں متوارث بھی یہی ہے کہ پورا جسم الگ رکھ کر صرف گردن سے گردن ملاتے ہیں۔

اور پاکستان و ہندوستان کے عوام میں معانقہ کا مُروَّجہ جو طریقہ کہ سینہ کے علاوہ پیٹ بھی ملا دیتے ہیں، اس کا بطریق خصوصیت نبویہ بھی کوئی ثبوت نہیں، علاوہ ازیں اس میں اور بھی کئی مفاسد ہیں، لہٰذا یہ رسم قبیح واجب الترک ہے۔ (خلاصہ احسن الفتاویٰ: ۸/۴۰۷)

ایک اور تحقیق: مذکورہ عبارت کا خلاصہ یہ نکلا کہ معانقہ کا مطلب صرف گردن سے گردن ملانا ہے، سینہ سے سینہ ملانا، معانقہ کا مفہوم نہیں ہے؛ لیکن اس کے بالمقابل ایک دوسری رائے بھی پڑھنے کے قابل ہے، یہ ایک پورا مقالہ ہے جو ''تیامن کی سنت اور معانقہ کا معہود طریقہ'' کے عنوان سے ماہنامہ دارالعلوم میں شائع ہوا تھا، مقالہ مفتی رشید احمد فریدی صاحب نے لکھا ہے، اس مقالے کا ایک اقتباس ہے:

معانقہ، تعانق اور اعتناق سے مفاعلہ، تفاعل اور افتعال کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں گردن سے گردن ملانا (جیسا کہ مصافحہ کے لغوی معنی ہتھیلی کا ہتھیلی سے ملانا) ہے۔

لغوی حقیقت میں صرف گردن ملانا ہے؛ جب کہ عرفِ شریعت میں اس کی حقیقت محض گردن ملانا نہیں ہے؛ بلکہ (محبت قلبی کے اظہار میں) سینہ سے سینہ ملانا ہے، محدثین نے اپنی کتابوں میں مصافحہ و معانقہ پر مستقل باب قائم کرکے معانقہ سے متعلق جو احادیث و آثار بیان کئے ہیں، اُن میں تین طرح کے الفاظ وارد ہوئے ہیں:

اعتنقي، ضمّني، التزمني، پہلے لفظ میں گردن کا ملانا ظاہر ہے، دوسرے لفظ میں سینہ کا ملانا بھی صراحۃً موجود ہے اور تیسرے لفظ میں سینہ کا لگانا اقتضاءً ہے؛ البتہ پہلا لفظ بابِ مفاعلۃ اور تفاعل سے بھی آثار میں وارد ہے، تینوں کا مصداق ایک ہے یعنی سینہ سے سینہ لگانا جس کو عرف عام میں معانقہ کہتے ہیں۔

آگے مقالہ نگار نے اپنی بات کو مدلل کیا ہے، چند ملاحظہ فرمائیں:

(۱) جب معانقہ میں قلبی مودت وبشاشت اور دل سے وحشت وبغض کے رفع کا اظہار ہے تو حکمت کا تقاضہ ہے کہ معانقہ کرنے والوں کا سینہ اس طرح ملے کہ گویا دونوں کے دل مل گئے؛ تاکہ ظاہر اور معنی میں مطابقت ہو جائے اور دل ہر انسان کے سینہ میں بس ایک ہی اور وہ بھی بائیں جانب رکھا گیا ہے......؛ اس لیے معانقہ میں وہی جہت اپنے مقصود کے لحاظ سے متعین ہو جاتی ہے اور تعامل اس کا شاہد ہے؛ پس اس کی رعایت کرنا شرعاً مطلوب ہے اور وہی سنت کے موافق ہے۔

(۲) اِفاضہ واِستفاضہ اور محبت کا اصل ذریعہ قلب ہے اور اس کے لیے جانبین سے قلوب کا متوجہ ہونا ضروری ہے، قرب مکان ضروری نہیں ہے؛ لیکن محبت کی کشش جب زیارت وملاقات پر آمادہ کرتی ہے اور وصال کے قریب پہنچا دیتی ہے تو بتقاضۂ فرطِ محبت دل کا دل سے ظاہراً اتصال بھی مرغوب ہو جاتا ہے اور معانقہ کی صورت میں مطلوب شرعی بن جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

ماہنامہ دار العلوم، شمارہ: ۸ جلد: ۹۳، شعبان ۱۴۳۰ھ

مولف عرض گزار ہے کہ اتنی بات پر سب کا اتفاق ہے کہ معانقہ کا محرک ہیجان المحبۃ اور انتہائی درجے کہ الفت وعقیدت کا اظہار ہے اور یہ پہلو قابلِ توجہ ہے کہ معانقہ کا یہ مفہوم ''گردن سے گردن'' ملانے میں زیادہ پایا جاتا ہے یا ''سینہ سے سینہ ملانے'' میں زیادہ پایا جاتا ہے، ظاہر سی بات ہے کہ ثانی الذکر مفہوم، معانقہ کے مقصود سے قریب تر ہے، یہی وجہ ہے کہ معانقہ میں عام معمول کے خلاف جانب تیاسر کو فقہاء نے ترجیح دی ہے؛ حالاں کہ آداب واخلاق کے باب میں ایک اہم ادب ''تیامن'' (کسی کام کو داہنے جانب سے انجام دینا ہے) جس کی رعایت کرنا شرعاً مطلوب ومحمود ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اِس کا اہتمام فرمایا ہے؛ لہٰذا اگر کوئی شخص معانقہ کرتے ہوئے صرف اپنی گردن ملائے تو وہ غلط نہیں؛ بل کہ معانقہ کی حقیقت لغویہ پر عمل ہوگا؛ لیکن اگر سینہ سے سینہ ملائے تو وہ بھی غلط نہیں؛ بلکہ وہ زیادہ مناسب ہے؛ کیوں کہ اُسے معانقہ کی حقیقتِ شرعیہ عرفیہ کہا جاسکتا ہے، اور پیٹ سے پیٹ ملانا نہ لغت ہے اور نہ ہی شریعت؛ لہٰذا وہ بالکل غلط ہے۔

معانقہ کی دعا

چوں کہ مصافحہ اور معانقہ دونوں کا مقصد، محبت وتعلق کا اظہار ہے تو جیسے مصافحہ میں "یغفر اللہ لنا ولکم" پڑھنا مستحب ہے، اُسی طرح اگر کوئی معانقہ کرنا چاہے تو بوقت معانقہ اُس کے لیے یہی دعا "یغفر اللہ لنا ولکم" پڑھنا مستحب ہوگا اور اِس دعا کے ساتھ کوئی اور دعا بھی پڑھ سکتے ہیں۔

دلہن کا گلے مل کر رونا

نئی نویلی دلہن کا سسرال میں یا میکے میں گلے مل کر رونا خارج از شریعت ہے۔

(اہمیت سلام وملاقات: ٦٧)

سلام کے وقت مصافحہ ومعانقہ دونوں جمع کرنا

طویل فصل کے بعد بوقتِ ملاقات لوگ سلام کے بعد، کبھی مصافحہ اور معانقہ دونوں

کر لیتے ہیں، سلام کے بعد مصافحہ اور معانقہ دونوں کرنا چاہیے یا کوئی ایک؟ اور اگر دونوں کریں تو پہلے مصافحہ کرنا چاہیے پھر معانقہ یا پہلے معانقہ پھر مصافحہ، روایات میں اِس کی کوئی وضاحت نہیں ہے کہ دونوں کو جمع کر سکتے ہیں یا نہیں، محققین علماء وفقہاء نے اپنی مدلل رائے سے اِس کو طے کیا ہے ،سلام کے موقع کے علاوہ دونوں کو جمع کرنا چاہیں تو جمع کر سکتے ہیں، اِس کو کوئی منع نہیں کرتا؛ لیکن بوقتِ سلام دونوں کو جمع کرنے کے سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے؛ لیکن عملی طور سے اِس مسئلے میں شدت نہیں ہے، ذیل میں دونوں طرح کے فتاوے نقل کیے جارہے ہیں۔

مفتی رشید احمد صاحبؒ لکھتے ہیں:

......معلوم ہوا کہ تمامُ التحیة عند اللقاء علی سبیل البدل، أحد الشیئین ہے، عام حالات میں مصافحہ اور مواقع مخصوصہ میں معانقہ، حاصل یہ کہ اصل تحیۃ اللقاء تو صرف سلام سے ادا ہوجاتا ہے اور تمام التحیۃ، سلام کے بعد مزید اظہار مسرت ومودت سے، جس کے دو طریقے علی سبیل البدل مشروع ہیں، عام حالات میں مصافحہ اور کسی محرک خصوصی کے وقت معانقہ، اظہارِ محبت کے اِن دو طریقوں میں سے کسی ایک کو تمام التحیہ بھی بنایا جاسکتا ہے، اور موقع تحیہ سے الگ مستقل بھی، تحیہ میں دونوں کو جمع کرنے کا واضح ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے، یہ خلافِ سنت معلوم ہوتا ہے؛ البتہ مستقلاً یعنی غیر تحیہ کے موقع پر جمع کرنے میں کوئی اشکال نہیں، اِس کے لیے ثبوت کی حاجت نہیں، والفرق أن الأول من الموارد الشرعیة دون الثاني. (احسن الفتاویٰ: ۸/ ۴۱۰)

مفتی سعید احمد صاحب لکھتے ہیں:

پھر اگر معرفت یا عقیدت ہے تو سلام کے بعد مصافحہ بھی کرنا چاہیے

اور یہ تحیۃ المعرفۃ ہے، اس سے سلام کی تکمیل ہوتی ہے اور اگر غایت درجہ معرفت ہے تو مصافحہ کے بجائے معانقہ کرنا چاہیے، معانقہ: مصافحہ کا نعم البدل ہے اور معانقہ کی دعا بھی وہی ہے جو مصافحہ کی ہے، اور اس دعا کے ساتھ کوئی اور دعا بھی کر سکتے ہیں اور مصافحہ اور معانقہ کو جمع کرنا آبِ زمزم کا پانی پینا ہے۔ (تحفۃ الالمعی: ۶/۵۰۲)

لیکن فتاویٰ ریاض العلوم میں اِس کے برخلاف ہے:

اگر مصافحہ و معانقہ دونوں کریں تو مکمل اختیار ہے، خواہ مصافحہ پہلے کریں یا معانقہ، جیسا کہ رواج ہے۔ (فتاویٰ ریاض العلوم: ۲/۱۷۲)

خلاصہ: اول الذکر دونوں بزرگوں کی رائے کا خلاصہ یہ ہے بوقتِ سلام، مصافحہ اور معانقہ میں سے کوئی ایک ہی کرنا چاہیے، اِس صورت میں تقدیم وتاخیر کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا، اور ثانی الذکر فتوے کا خلاصہ یہ ہے کہ دونوں کو جمع کر سکتے ہیں اور تقدیم وتاخیر کا اختیار ہے کہ پہلے مصافحہ کریں پھر معانقہ یا پہلے معانقہ پھر مصافحہ۔

تجزیہ: روایتوں سے اِتنا معلوم ہوتا ہے کہ سلام کی تکمیل مصافحہ سے ہوتی ہے، یعنی شریعت نے ملاقات کے وقت صراحۃً جس عمل کو مشروع کیا ہے وہ سلام اور مصافحہ ہے، اب سوال یہ ہے کہ معانقہ سلام کا تتمہ اور اُس کی جنس سے ہے یا نہیں؟ بہ الفاظِ دیگر معانقہ مستقل ایک حکم ہے یا سلام کے تابع ہے؟ روایتوں اور فقہی تصریحات سے اتنی بات طے ہے کہ معانقہ اشتیاق ومسرت اور جوشِ محبت کے مواقع پر جائز ہے یا پھر طویل فصل کے بعد۔

صاحبِ احسن الفتاویٰ اور صاحبِ تحفۃ الالمعی کا نقطۂ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ معانقہ، سلام کا تکملہ ہے علی سبیل البدلیت؛ چناں چہ اول الذکر بزرگ نے یہ کہا: سلام کے بعد مزید اظہارِ مسرت ومحبت سے، جس کے دو طریقے علی سبیل البدل مشروع ہیں...... اُن دونوں طریقوں میں سے کسی ایک کو تمام التحیہ بنایا جا سکتا ہے، پورا فتویٰ اوپر مذکور ہوا؛ لیکن اُنھوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ دونوں کو جمع

کرنے کا واضح ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے، یہ خلافِ سنت معلوم ہوتا ہے۔

اور ثانی الذکر بزرگ نے کہا: کہ معانقہ، مصافحہ کا نعم البدل ہے......اور مصافحہ ومعانقہ کو جمع کرنا آبِ زم زم کا پانی پینا ہے، دونوں کے اقوال میں واضح فرق تعبیر کا ہے، اول الذکر نے، مصافحہ ومعانقہ جمع کرنے کو خلافِ سنت کہا ہے؛ جب کہ صاحبِ تحفۃ الالمعی نے خلافِ سنت نہیں کہا؛ بلکہ ہلکی غلطی شمار کی ہے۔

اور فتاوی ریاض العلوم کے صاحبِ فتویٰ کا نقطہ نظر، یہ معلوم ہوتا ہے کہ معانقہ، سلام کا تتمہ وتکملہ نہیں ہے؛ بلکہ وہ الگ جنس ہے اور مستقل حکم ہے؛ لہٰذا دونوں کو جمع کر سکتے ہیں۔

مولف عرض گزار ہے کہ مذکورہ بالا دونوں قول میں اختلاف، رائے کا اختلاف ہے، جو عملی میدان میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا؛ لہٰذا دونوں طرح عمل کی گنجائش ہونی چاہیے؛ لیکن اتنی بات تحقیقی اعتبار سے لائق توجہ ہے کہ امام صاحب اور صاحبین کا مسلک یہ ہے کہ معانقہ ملاقات کے وقت کی سنت اور سلام کا تتمہ ہونے کی حیثیت سے مکروہ ہے جیسا کہ پیچھے اعلاء السنن کے حوالے سے تفصیل سے گذرا ہے؛ لہٰذا یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے۔

معانقہ میں جسم کو بھینچنا

بوقت معانقہ جسم دبانا، بھینچنا اور اپنی طرف ایک دوسرے کو کھینچنا معانقہ کی حقیقت میں داخل نہیں، ہاں اصاغر اور ازواج مستثنیٰ ہیں، اکابر اصاغر کے ساتھ، شوہر بیوی کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے؛ گویا یہ ایک استثنائی شکل ہے، اصل حکم وہی ہے جو مذکور ہوا، مفتی رشید صاحبؒ لکھتے ہیں:

> پاکستان اور ہندوستان میں مروجہ معانقہ کہ سینہ، شکم اور پورا جسم باہم پیوست کر کے خوب بھینچتے ہیں، بلا شبہ بالاتفاق بدعت اور واجب الترک ہے، عدم ثبوت کے علاوہ اور بھی مفاسد ہیں۔
>
> (احسن الفتاوی: ۸/۴۱۲)

معانقہ میں تیامُن افضل ہے یا تیاسُر؟

معانقہ دائیں جانب کرنا چاہیے یا بائیں جانب، اجازت دونوں طرف میں سے ہر طرف کی ہے؛ لیکن بائیں جانب راجح ہے؛ کیوں کہ ادھر دل ہے جو مرکزِ محبت ہے اور معانقہ جوشِ محبت کی وجہ سے ہی مشروع ہے، تو دل سے دل مل جائیں گے محبت بڑھے گی، مفتی رشید صاحبؒ لکھتے ہیں:

> اِس بارے میں کوئی صراحت نظر سے نہیں گذری، عام اصول کے مطابق تو تیامن (دائیں) کو ترجیح معلوم ہوتی ہے؛ مگر معانقہ کا منشا چوں کہ ہیجان المحبۃ ہے، جس کا محل قلب ہے، اور صورتِ تیاسر میں جانبین کے قلوب باہم زیادہ قریب ہوتے ہیں؛ اس لیے تیاسر راجح ہے اور اسی لیے تیاسر ہی کا عام معمول ہے۔
>
> (احسن الفتاوی: ۴۱۱/۸)

(دوسری فصل)

تقبیل (بوسہ) کا بیان

عموماً تقبیل کا مطلب فقہاء یہ لیتے ہیں: ہاتھ یا پیشانی وغیرہ کا چومنا، سلام کے بعد کبھی کوئی کسی کا ہاتھ چومتا ہے اور کبھی پیشانی کو بوسہ دیا جاتا ہے، بڑوں کے ساتھ تقبیل کا یہی مطلب ہوتا ہے اور سلام کے موقع پر ایسا کیا جاتا ہے؛ بلکہ بزرگانِ دین اور متبعین سنت اور عالم باعمل کے ہاتھ کو بوسہ دینے کو بعض حضرات نے مستحب کہا ہے، احادیث اِس سلسلے میں موجود ہیں، دو چار روایتیں اس سلسلے کی پیچھے گذری ہیں، جو بالخصوص بوقتِ ملاقات کی تھیں، اب کچھ روایتیں ایسی ملاحظہ فرمائیں جو عمومی ہیں یا بچوں کے سلسلے کی ہیں۔

(۱) پیچھے حضرت جعفرؓ سے، حضورﷺ کے معانقہ کرنے کا تذکرہ گذرا ہے، وہ روایت حضرت شعبیؒ سے یوں منقول ہے: حضورﷺ نے حضرت جعفر بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کا استقبال کیا، گلے لگایا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ (ابوداؤد، رقم: ۵۲۲۰)

(۲) حضرت زارع رضی اللہ عنہ جو وفدِ عبدالقیس میں شامل تھے بیان کرتے ہیں: جب ہم مدینہ پہنچے تو اپنی سواریوں سے جلدی جلدی اترنے لگے (اور بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے) چناں چہ ہم نے رسولِ کریمﷺ کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا۔ (ابوداؤد، رقم: ۵۲۲۵)

اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ پیروں کو چومنا جائز ہے؛ لیکن فقہاء اِس کو ممنوع قرار دیتے ہیں؛ چناں چہ وہ اِس حدیث کی تاویل کرتے ہیں کہ یا تو یہ آں حضرتﷺ کے خصائص میں تھا (کہ صرف آپ کے پاؤں کو بوسہ دینا جائز تھا) یا ابتداءً یہ جائز تھا؛ مگر پھر ممنوع

قرار دے دیا گیا، یا وہ لوگ اِس مسئلے سے ناواقف تھے اور جس کی بنا پر انہوں نے آپ کے پاؤں کو بوسہ دیا اور یا یہ کہ شوقِ ملاقات میں اضطراری طور پر ان سے یہ فعل صادر ہو گیا تھا۔ (مظاہر حق: ۵/ ۳۷۵)

(۳) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (جب وہ ایک جہاد سے بھاگ کر لوٹے تھے اور کہا تھا: نحن الفرارون کہ ہم لوگ بھاگنے والے ہیں) آپ ﷺ نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا: بل أنتم العكارون تم لوگ پلٹ کر حملہ کرنے والے ہو فقبلنا يده چناں چہ (مارے خوشی اور محبت کے) ہم نے حضور ﷺ کے ہاتھ چومے۔ (الادب المفرد: ۹۰۷، تقبیل الید)

(۴) حضرت عمرؓ جب شام تشریف لائے تو ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرؓ کا استقبال کیا اور اُن سے مصافحہ کیا اور اُن کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، حضرت تمیم بن سلمہؒ جو اُس کے راوی ہیں کہا کرتے تھے کہ ہاتھوں کا بوسہ لینا سنت ہے۔ (کنز العمال، رقم: ۲۵۷۴۶، شرح السنہ: ۱۲/ ۲۹۲)

(۵) ابن جدعانؒ روایت کرتے ہیں: کہ حضرت ثابت نے حضرت انسؓ سے پوچھا: کیا آپ نے حضور ﷺ کو اپنے ہاتھوں سے مس کیا ہے، انہوں نے کہا: ہاں، تو حضرت ثابت نے اُن کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ (الادب المفرد: ۹۰۹، باب تقبیل الید)

(۶) حضرت صہیبؒ کہتے ہیں: میں نے حضرت علیؓ کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ (الادب المفرد، رقم: ۹۱۰، تقبیل الرجل)

(۷) ترمذی میں دو یہودیوں کا حضور ﷺ کے ہاتھ اور پیر کو چومنے کا تذکرہ ہے۔
(ترمذی، رقم: ۲۷۳۵)

(۸) طبرانی نے کعب بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ اُن کے پاس تشریف لے گئے تو آپ نے آں حضرت ﷺ کا دست مبارک اپنے ہاتھوں سے تھاما اور اس کو بوسہ دیا۔

(۹) طبرانی نے معجم اوسط میں سند جید کے ساتھ سلمہ بن اکوعؓ سے روایت کیا ہے: انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی، میں نے آپ کے دست

مبارک کو بوسہ دیا تو آپ نے مجھے منع نہیں فرمایا۔

(۱۰) حافظ ابو موسی مدینیؒ وغیرہ نے حضرت سفیانؒ سے روایت کیا ہے: کہ انہوں نے ایک مجلس میں بیان کیا کہ عالم اور سلطانِ عادل کی دست بوسی سنت ہے، اُس مجلس میں حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ موجود تھے وہ کھڑے ہوئے اور اُن کے سر کو بوسہ دے کر کہا: اس سنت پر عمل کرنے کے لیے اِس سے اچھا موقع کہاں ملے گا؟ تلك عشرة كاملة.(۱)

مسائل واحکام

ہمارے اکابر قدم بوسی کی تو بالکل اجازت نہیں دیتے؛ کیوں کہ وہ ہندوؤں کے فعل کے مشابہ ہے، ہندو اپنے بڑوں کے پاؤں پڑتے ہیں اور وہ اس کو انتہائی تعظیم خیال کرتے ہیں......اور دست بوسی کو اگر چہ جائز کہتے ہیں، مگر پسند نہیں کرتے؛ کیوں کہ دست بوسی کے وقت جھکنا پڑتا ہے اور آدمی رکوع کے مشابہ ہو جاتا ہے، پس وہ سلامی کے سجدہ کی طرح ہو گیا؛ اِس لیے اگر کسی کو چومنا ہے تو پیشانی چومے، نبی ﷺ سے یہی بات ثابت ہے۔ (تحفۃ الالمعی: ۶/ ۵۰۷)

دوسرے کے ہاتھ کو چومنے کا معیار

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: کسی کی بزرگی، زہد، صلاح وتقویٰ، علم اور شرافت یا دیگر دینی فضائل کی وجہ سے ہاتھ چومنا مکروہ نہیں؛ بلکہ مستحب ہے؛ البتہ کسی کی مالداری یا شوکت ودبدبہ یا جاہ وجلال وغیرہ کی وجہ سے ہاتھوں کو چومنا سخت مکروہ ہے اور متولیؒ نے تو ناجائز کہا ہے۔ (الاذکار: ۲۹۹)

مسئلہ: کسی عالم یا سلطان عادل اور حاکم کے ہاتھ کو چومنا، ان کے علم وانصاف کی بنیاد پر اور دین کے اعزاز واکرام کے جذبہ سے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ (الدر علی هامش الرد: ۹/ ۵۴۹)

مسئلہ: اگر کوئی شخص کسی عالم یا کسی بزرگ سے اس کے پیر چومنے کی درخواست کرے تو اس کو ہرگز

(۱) اخیر کی تینوں روایتیں شیخ سندھیؒ کا رسالہ الکرامة والتقبیل سے منقول ہیں، جس کا ترجمہ جواہر الفقہ میں دست بوسی وقدم بوسی کے نام سے شائع ہوا ہے (۱/ ۱۸۲)- اس سلسلے کی مزید روایتوں کے لیے مذکورہ کتاب کا مطالعہ کیا جائے، اُس میں علامہ سندھیؒ نے اِس سلسلے کی انیس (۱۹) روایات جمع کی ہیں۔

نہیں ماننا چاہیے۔ (الدر علی ھامش الرد: ۹/۵۵۰)

مسئلہ: مصافحہ کے بعد خود اپنا ہاتھ چومنا کچھ اصل نہیں رکھتا؛ بلکہ یہ جاہلوں کا طریقہ ہے اور مکروہ ہے۔ (ایضا)

مسئلہ: امراءِ سلطنت اور علماء و مشائخ، بزرگانِ دین وغیرہ کے سامنے سلام کرنے کے بعد یا پہلے، زمین بوسی کرنا حرام ہے، زمین بوسی کرنے والا اور اس زمین بوسی پر راضی ہونے والا دونوں ہی گنہ گار ہوتے ہیں، فقیہ ابو جعفرؒ کہتے ہیں: کہ سلطان و حاکم کے سامنے زمین بوسی اور سجدہ کرنے والا کافر ہو جاتا ہے؛ بشرطیکہ اس کی زمین بوسی وسجدہ، عبادت کی نیت سے ہو اور اگر تحیہ (سلام) کے طور پر ہو تو کافر نہیں ہوتا؛ لیکن آثم اور کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور بعض علماء کے نزدیک کسی بھی طرح کی نیت نہ ہونے کی صورت میں بھی کافر ہو جاتا ہے۔ (الدر علی ھامش الرد: ۹/۵۰۰، مظاہر حق: ۵/۳۶۸)

مسئلہ: شہوت کے ساتھ مرد کا مرد کے کسی بھی حصے کو چومنا حرام ہے، ایسے ہی شہوت کے ساتھ عورت کا عورت کے کسی بھی حصے کو چومنا حرام ہے، خواہ ملاقات کے وقت ہو یا رخصتی کے وقت ہو۔ محبت اور شہوت میں یہ فرق ہے کہ محبت، پاک جذبے کا اظہار ہے اور شہوت ناپاک جذبے کا۔

(الدر مع الرد: ۶/۵۴۶)

مسئلہ: منہ کو چومنا جائز نہیں؛ بلکہ ہاتھ، سر اور پیشانی چومے۔ (شرح السنہ: ۱۲/۲۹۳)

مسئلہ: ہاتھ، پاؤں اور پیشانی کا چومنا طویل وقفے سے ہونا چاہیے، ایک ہی جگہ مقیم ہوں اور ملاقات ہو تو مسنون نہیں؛ بلکہ جائز بھی نہیں۔

بچوں کو چومنا - ثبوت، طریقہ اور جائز و ناجائز کا معیار

بچے پھول ہوتے ہیں، معصوم ہوتے ہیں، آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتے اور روح وقلب کے تسکین کا ذریعہ ہوتے ہیں؛ اس لیے بچوں کو بوسہ سے پیار کرنے کی اجازت ہے؛ اگر چہ وہ

اپنا بچہ نہ ہو؛ بلکہ کسی اور کا ہو، بوسہ دینا، محبت و پیار سے چومنا جائز ہے، یہی حکم بچی کا بھی ہے، بچے اور بچی کو چومنا، شفقت، رحمت اور لطف وکرم کے لیے ہوتا ہے؛ بلکہ بچوں کے ساتھ پیار اور لطف وشفقت کا معاملہ نہ کرنا، رحمتِ خداوندی سے محرومی کا سبب ہے، روایات پڑھیے:

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا بوسہ لیا تو ایک صحابی اقرع ابن حابسؓ نے جو اُس وقت آپ کی خدمت میں حاضر تھے، کہا: کہ میرے دس بچے ہیں اور میں نے اُن میں سے کسی کا کبھی بوسہ نہیں لیا، رسول اکرم ﷺ نے (یہ سن کر) ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: جو شخص رحم نہیں کرتا اُس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ (بخاری: ۵۹۹۷)

یعنی جو شخص اپنی اولاد یا مخلوقِ خدا پر لطف وشفقت نہیں کرتا اس پر اللہ کی رحمت وشفقت نہیں ہوتی۔

(۲) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو شکل وصورت، سیرت وعادت اور چال ڈھال میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ زیادہ مشابہ ہو، صاحبزادی فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے (یعنی اِن سب چیزوں میں وہ سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے مشابہ تھیں) جب وہ حضور ﷺ کے پاس آتیں تو آپ (جوشِ محبت سے) کھڑے ہو کر اُن کی طرف بڑھتے، اُن کا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں لے لیتے اور (پیار سے) اُس کو چومتے اور اپنی جگہ پر اُن کو بٹھاتے (اور یہی اُن کا دستور تھا) جب آپ ان کے یہاں تشریف لے جاتے تو وہ آپ کے لیے کھڑی ہو جاتیں، آپ کا دستِ مبارک اپنے ہاتھ میں لے لیتیں، اُس کو چومتیں اور اپنی جگہ پر آپ کو بٹھاتیں۔ (ابوداؤد، رقم: ۵۲۱۷)

تشریح: اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محبت اور اکرام واحترام کے جذبے سے اپنے کسی عزیز، محبوب اور محترم بزرگ کے لیے کھڑا ہو جانا بھی درست ہے؛ لیکن اُن احادیث سے جو آگے آرہی ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ اپنے لیے صحابہ کے کھڑے ہونے کو ناپسند فرماتے تھے، غالباً اس کی وجہ آپ کی خاکساری اور تواضع پسندی تھی۔

(۳) حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں (ایک مرتبہ) کسی غزوہ سے حضرت ابوبکرؓ کے مدینہ آتے ہی، ان کے ساتھ ان کے گھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اُن کی صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہ لیٹی ہوئی ہیں اور بخار میں مبتلا ہیں؛ چناں چہ حضرت صدیقؓ اُن کے پاس آئے اور پوچھا کہ میری بیٹی تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ اور انہوں نے (ازراہِ شفقت ومحبت یا برعایتِ سنت) اُن کے رخسار پر بوسہ دیا۔(ابوداؤد:۵۲۲۲)

(۴) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بچہ لایا گیا آپ نے اس کا بوسہ لیا اور فرمایا کہ جان لو یہ اولاد بخل کا باعث اور بزدلی کا سبب ہے؛ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اولاد خدا کی عطا کردہ نعمت اور رزق بھی ہے۔(مشکوۃ:۴۰۲/۲)

تشریح: اولاد بخل اور بزدلی کا سبب ہے: مطلب یہ ہے کہ انسان بچوں کی وجہ سے اور اُن کے مستقبل کی وجہ سے بعض دفعہ بخیل ہوجاتا ہے، سارا مال بچوں کے لیے رکھ دیتا ہے، راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتا، اور اولاد کی وجہ سے ہی راہِ خدا میں جہاد کے لیے یا کسی اور مقصد کے لیے نہیں جاتا (عصر حاضر میں اس کا مطلب سمجھنا بہت آسان ہے) لیکن آگے آپ نے اولاد کی خوبی بتائی اور فرمایا: کہ یہ بچے ریحان ہیں: ریحان کے معنی روزی اور نعمت کے بھی ہیں اور ریحان خوشبودار پودے کو بھی کہتے ہیں، پہلی صورت میں مطلب ہوا کہ بچے ماں باپ کا سہارا اور گھر کا چراغ ہوتے ہیں(۱) اور دوسری صورت میں مطلب ہوا کہ: جس طرح کوئی شخص خوشبودار پھول دیکھ کر سرور حاصل کرتا ہے اور سونگھ کر مشام جان کو معطر کرتا ہے، اور کبھی ہونٹوں سے چومتا بھی ہے، اسی طرح بچوں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، ان کو پیار کرکے، اُن کو چوم کر اور اُن کے ساتھ خوش طبعی کرکے سرور حاصل کیا جاتا ہے۔

(۵) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے اپنے بیٹے ابراہیم کو (ہاتھوں میں) لیا؛ پھر انہیں بوسہ دیا اور سونگھا۔(بخاری تعلیقاً قبل حدیث رقم:۵۹۹۴)

تشریح: صاحب زادے ابراہیم، ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، اور بچپن میں ہی وفات پائی۔

---

(۱) مقولہ ہے: الولد إن عاش نفع وإن مات شفع، مرقاۃ:۸۱/۹۔

(۶) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: کچھ دیہاتی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے انہوں نے (صحابہ سے پوچھا) آپ لوگ اپنے بچوں کو چومتے ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: ہاں، انہوں نے کہا: بخدا ہم لوگ ایسا نہیں کرتے تو حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ نے تمہارے دل سے جو رحمت نکال دی ہے میں اس کو واپس لانے پر قادر نہیں ہوں۔ (بخاری، رقم: ۵۹۹۸، باب رحمۃ الولد)

(۷) ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: کہ وہ اپنے بیٹے سالم کو چومتے تھے اور کہتے تھے: اعجبوا من شیخ یقبل شیخا. تم لوگوں کو تعجب ہونا چاہیے، ایک شیخ دوسرے شیخ کو بوسہ دے رہا ہے۔ (الاذکار: ۳۰۱)

حضرت ابن عمرؓ شیخ ہوئے باپ ہونے کے اعتبار سے اور حضرت سالمؒ شیخ ہوئے، علم اور تفقہ کے اعتبار سے۔

(۸) حضرت سہل بن عبد اللہ تُستریؒ جو بڑے درجے کے عابد وزاہد گذرے ہیں، وہ ابوداؤد سجستانیؒ کے پاس آتے تھے اور کہا کرتے تھے: اپنی وہ زبان باہر نکالیے جس سے آپ حضور ﷺ کی احادیث بیان کرتے ہیں؛ تاکہ میں (برکت کے لیے) اسے چوم لوں؛ چناں چہ وہ اُن کی زبان کو چومتے تھے۔ (الاذکار: ۳۰۱)

اِن تمام تفصیلات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان پاک جذبے سے، محبت وشفقت کے اظہار کے لیے، کسی کے ہاتھ، پیشانی اور سر کا بوسہ دے سکتا ہے اور اگر بات بچوں کی جائے تو لطف وشفقت کا اظہار موکد ہو جاتا ہے، امام بخاریؒ نے اس کی اہمیت کے پیش نظر باب رحمة الولد وتقبيله ومعانقته کا باب باندھا ہے، اِس باب سے انہوں نے تقبیل ومعانقے کے جواز پر استدلال کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ چیز ''رحمت'' ہے اور جو اِس کا انکار کرتے ہیں اُن پر رد کیا ہے۔(۱)

چناں چہ ابن بطالؒ لکھتے ہیں:

یجوز تقبیل الولد الصغیر في کل عضو منه، وکذا

(۱) علامہ نوویؒ نے لکھا ہے: وأفعال السلف في هذا الباب أكثر من أن تحصر، الأذكار: ۳۰۱.

الکبیر عند أکثر العلماء ما لم یکن عورۃ. (عمدۃ القاری:۱۵/۱۶۳)

کہ چھوٹے بچوں کے کسی بھی عضو کو چومنا جائز ہے اور بڑے بچوں کو بوسہ دینا از راہِ شفقت جائز ہے؛ بشرطیکہ وہ عضو، ستر کا حصہ نہ ہو۔

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

انسان کا اپنے چھوٹے بچوں کے رخسار اور چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کے رخسار اور دوسرے عضو کو چومنا، شفقت ورحمت اور لطف ومحبت کے طور پر مسنون ہے۔ (الاذکار:۳۰۰)

میت کو بوسہ دینا

اگر کسی نیک زاہد وعابد شخص کا انتقال ہو جائے، تو اُس کی پیشانی کا چومنا جائز ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: (حضو ر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ موجود نہیں تھے) حضرت ابوبکر صدیقؓ حجرے میں داخل ہوئے؛ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور سے کپڑا ہٹایا پھر جھکے اور پیشانی کو چوما، پھر رونے لگے۔ (بخاری:۱۲۴۲، فی الجنائز)

اور خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ ثابت ہے: بخاری میں ہی ہے کہ جب حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور چہرے کو کھولا اور بوسہ دیا۔ (حاشیہ الاذکار:۳۰۲)

ایک انصاری صحابیؓ کا مہرِ نبوت کو چومنا

ایک انصاری صحابیؓ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک روز کچھ لوگ بیٹھے ہوئے باہم بات چیت کر رہے تھے، ان میں ایک ہنسی مزاح کرنے والا بھی تھا جو محفل کو ہنسا رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چھڑی سے اس کی کوکھ کو چھوا وہ فوراً بول اٹھا کہ یا رسول اللہ آپ سے اس کا بدلہ لوں گا، بدلہ دیجیے۔

حضو ر صلی اللہ علیہ وسلم بدلے کے لیے تیار ہوگئے، تو اُس نے قمیص کھولنے کا مطالبہ کیا اور کہنے لگا کہ انتقام اُسی وقت پورا پورا لیا جا سکتا ہے کہ جیسے میں ننگے بدن تھا وہ ایسے ہی آپ بھی ہوں، حضو ر صلی اللہ علیہ وسلم

نے قمیص بدن سے ہٹادی، اُس شخص نے لپک کر پہلو مبارک اور مُہر نبوت(۱) کو بوسہ دیا اور کہنے لگا میرا منشا اس گفتگو سے یہی تھا۔ (السنن الکبریٰ، رقم: ۱۶۰۲۱)

محبت وشفقت اور لذت وشہوت

یہاں یہ تذکرہ بے جانہ ہوگا کہ مصافحہ، معانقہ اور تقبیل بلاشبہ اظہارِ محبت والفت کا ذریعہ ہیں؛ لیکن یہی چیزیں اگر غلط نیت اور برے جذبات سے ہوں تو بجائے ثواب اور الفت ومحبت کے، گناہ اور برائی کا سبب ہوں گی؛ چناں چہ بعض روایتوں میں معانقہ وتقبیل کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے اس سے مراد ایسا معانقہ اور تقبیل ہے جو لذت وشہوت کے ساتھ کیا جائے؛ بلکہ اگر معانقہ، مصافحہ اور تقبیل کی وجہ سے کسی برائی کا صرف شبہ ہو تو بھی ممنوع ہوں گے، علماء نے اس امر کی صراحت کی ہے۔

چناں چہ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

وأما التقبيل بالشهوة فحرام بالاتفاق وسواء في ذلك الولد وغيره؛ بل النظر إليه بالشهوة حرام بالاتفاق على القريب والأجنبي.

یعنی شہوت کے ساتھ کسی کو چومنا بالاتفاق حرام ہے، خواہ اپنا حقیقی بیٹا یا بیٹی ہو یا کسی اور کا بچہ ہو؛ بلکہ اس جذبے سے اس کو دیکھنا تک حرام ہے؛ البتہ شوہر بیوی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (الاذکار: ۳۰۰)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

فأما الأمرد الحسن فيحرم بكل حال تقبيله، سواء كان

(۱) مہر نبوت: علامات نبوی میں سے تھی اور ولادت کے وقت ہی سے تھی، اور وفات کے بعد وہ غائب ہوگئی تھی، اور اس پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا، اور جن روایتوں میں کچھ لکھا ہوا ہونا منقول ہے، وہ روایات درجۂ ثبوت کو نہیں پہنچیں، اور مہر نبوت کی مقدار اور رنگ میں روایتیں مختلف ہیں؛ کیوں کہ یہ تشبیہات ہیں، اور ہر شخص کی تشبیہ اس کے ذہن کے موافق ہوتی ہے؛ اس لیے اختلاف ناگزیر ہے، تحفۃ الالمعی: ۲۹۸/۸.

قدم من سفر أم لا، والظاهر أن معانقته كتقبيله أو قريبة من تقبيله.

اگر کوئی لڑکا بے ریش خوب صورت ہے تو اس کو بوسہ دینا بہر حال حرام ہے، خواہ وہ سفر سے آیا ہو یا حضر میں ہی ہو اور یہی حکم معانقہ کا بھی ہوگا؛ کیوں کہ اس سے معانقہ کرنا تقبیل کے حکم میں ہے یا اس کے قریب ہے۔ (الاذکار:۳۰۲)

اپنے بیٹے، بیٹی، بہن وغیرہ سے معانقہ کرنا درست ہے، جب کہ معانقہ کرنے میں شہوت نہ ہو، اور جہاں اس کا خطرہ ہو، وہاں پرہیز کیا جائے۔

معانقہ وتقبیل میں اگر شہوت ولذت کا گناہ شامل ہو جائے تو پھر یہ چیزیں اس وقت بھی حرام ہو جائیں گی؛ جب کہ دونوں نیک آدمی ہوں یا برے آدمی ہوں یا ان میں سے ایک صالح اور دوسرا برا ہو، سب برابر ہیں۔

ولا فرق في هذا بين أن يكون المقبَّل رجلين صالحين أو فاسقين، أو احدهما صالحاً، فالجيمع سواء. (الاذکار:۳۰۲)

حاصل یہ ہے کہ ایک چیز کو نیک جذبے اور برمحل برتا جائے تو وہ عبادت ہے، وہی چیز اگر برے جذبات اور جنسی ہیجان کے ساتھ انجام دی جائے تو ناجائز اور گناہوں کا ارتکاب سمجھا جائے گا، دیکھیے کسی اجنبیہ عورت کو شہوت کے ساتھ دیکھنا ناجائز اور حرام ہے؛ لیکن اپنی بیوی کو شہوت کے ساتھ دیکھنا؛ بلکہ چھونا وغیرہ ادائے حقوقِ زوجیت کی نیت سے ایک عبادت ہے، ایک محل میں ہے ایک غیر محل میں، بیٹی سراپا رحمت ہے، اُس کو محبت کے ساتھ دیکھنا کارِ ثواب اور پدری شفقت ہے؛ لیکن اگر خباثت وشہوت دماغ میں داخل ہو جائے تو اب دیکھنا بھی ناجائز ہے،(۱) محبت وشفقت اور الفت ورحمت، نیک جذبات اور پاک احساسات کا نام ہے، اور جب ان جذبات واحساسات

---

(۱) فأما إذا كان يخاف الشهوة على نفسه أوعليها فلا يحل له ذلك لما بينا أن النظر عن شهوة والمس عن شهوة نوع زنا وحرمة الزنا بذات المحارم أغلظ، مبسوط سرخسی:۱۰/۱۴۹، کتاب الاستحسان.

کے مفہوم میں لذت وشہوت شامل ہو جائیں تو ان کا نام محبت نہیں؛ بلکہ حیوانیت وشیطانیت ہو جائے گا، ایک عبادت اور جائز ہے، دوسرا نفسانی خواہشات ہے اور ناجائز ہے، اور محبت وشفقت کے درمیان عظمت کا ایک باریک پردہ ہوتا ہے، دونوں کے درمیان تقدس کا ایک باریک دھاگا ہوتا ہے، جس کے ایک طرف شجر سایہ دار ہوتا ہے تو دوسری طرف شجر خاردار، انسان کب وادی باغ وبہار میں ہوتا ہے اور کس وقت وادی پُر خار میں ہوتا ہے، اِس کا فیصلہ دارالافتاء کا کوئی مفتی نہیں کرسکتا، اس کا فیصلہ ہر انسان کے دل ودماغ کا دارالافتاء ہی کرے گا، استفت قلبك.

بوسہ کی قسمیں اور اسماء - ایک فائدہ

علماء نے بوسہ کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں: (۱) قُبلة المودة: محبت کا بوسہ جیسے والدین کا اپنے بچوں کے رخسار کو چومنا (۲) قبلة الرحمة: رحمت واکرام کا بوسہ جیسے اولاد کا اپنے والدین کے سر پر بوسہ دینا (۳) قبلة الشفقة: شفقت کا بوسہ جیسے بہن کا بھائی کی پیشانی کو چومنا (۴) قبلة الشهوة: شہوت کا بوسہ جیسے شوہر کا اپنی بیوی کے چہرے کو چومنا (۵) قبلة التحية: سلام کا بوسہ جیسے مسلمانوں کا ایک دوسرے کے ہاتھ کو چومنا (۶) قبلة الديانة: دیانت کا بوسہ جیسے حاجی کا حجر اسود کو چومنا(۱) (الدر المختار علی ھامش رد المحتار:۱۵۵)

قرآن کو چومنا

قرآن کریم کتاب ہدایت وتلاوت ہونے کے ساتھ ساتھ کتابِ برکت بھی ہے اور خدا کا کلام ہے؛ اس لیے سید الکلام بھی ہے، جس کی مثبت اور بابرکت تاثیر کا انکار غیر بھی نہ کرسکے، اِس

---

(۱) یہ حج کا ایک عمل ہے، حجر اسود ایک پتھر ہے جو جنت سے اس دنیا میں اتارا گیا تھا، ترمذی کی روایت میں ہے: وهو أشد بياضا من اللبن فسوّدته خطايا بني آدم کہ نہایت سفید پتھر تھا، بنی آدم کے گناہوں نے اُسے سیاہ کردیا، بہر حال حضور ﷺ سے حجر اسود کو بوسہ دینا ثابت ہے، حضرت عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ حجر اسود کے پاس آئے اس کو بوسہ دیا اور کہا: مجھے معلوم ہے کہ تم ایک پتھر ہو، نہ نفع پہنچا سکتے ہو نہ ہی نقصان (یہ جملہ اس غلط اعتقاد کے خلاف تھا کہ کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ بت مؤثر حقیقی ہوتے ہیں) اور اگر میں نے حضور ﷺ کو بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تمہارا بوسہ نہ دیتا، ابوداؤد، رقم:۱۸۷۳، باب تقبیل الحجر.

کلام کو جس چیز میں رکھ دیا جائے وہ بابرکت، جس چیز پر لکھ دیا جائے وہ قابلِ احترام، جس پر پڑھ کر دم کر دیا جائے وہ قابل صحت، ظاہر سی بات ہے ایسے کلام کو چھونا، بوسہ دینا، آنکھوں سے لگانا، سرمۂ چشم بنانا، سینے سے چمٹانا سب خیر و برکت کا سبب ہیں؛ لہٰذا قرآن کو چومنا جائز ہے۔

علامہ حصکفیؒ نے نقل کیا ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہر صبح مصحف کو لیتے تھے اور اسے بوسہ دیتے تھے، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی مصحف کو بوسہ دیتے تھے اور اُس کو اپنے چہرے سے مس کرتے تھے۔ (الدر علی ھامش الرد: ۵۵۲/۹)

مولف عرض گزار ہے، پیچھے قبلہ (بوسہ) کی چھ قسمیں گذری ہیں، یہ قرآن کو بوسہ دینا ساتویں قسم ہے، اسے "قبلة البركة" کہنا مناسب ہے۔

صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کی عادت مبارکہ تھی کہ وہ قرآن کریم کو چومتے تھے اور اس میں قرآن کریم کی تعظیم و تکریم مضمر ہے؛ لہٰذا ایسا کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ (فتاوی محمودیہ: ۱۵۹/۲)

دعا کے بعد ہاتھ چومنا

دعا کے بعد ہاتھ وغیرہ چومنا بدعت ہے۔ (فتاوی ریاض العلوم: ۳۶۹/۱)

بوقت اذان انگوٹھا چومنا

اذان و اقامت میں جب أشهد أن محمدا رسول الله کہا جاتا ہے تو بہت سے لوگ انگوٹھا چومتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

مذکورہ بالا مسئلہ میں فقہاء کی تحقیق یہ ہے کہ انگوٹھوں کو عند التشهد چومنا بدعت ہے؛ کیوں کہ اکثر لوگ اس کو ثواب سمجھ کر کرتے ہیں اور تارک پر ملامت کرتے ہیں اور وہ موقوف ہے روایت پر اور اس بارے میں کوئی روایت صحیحہ موجود نہیں، یہ لوگ اُس ضعیف روایت سے استدلال کرتے ہیں، جس میں موجود ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عند التشهد اپنے انگوٹھوں کو

---

(۱) ذكر الديلمي في الفردوس من حديث أبي بكر الصديق أنه لما سمع قول المؤذن "أشهد أن محمداً رسول الله" قال مثله، وقبل بباطن الأنملتين السبابة، ومسح عينيه، فقال ﷺ: من فعل مثل ما فعل خليلي، فقد حلت عليه شفاعتي "ولم يصح"، تذكرة الموضوعات، باب الأذان: ۳۴.

چومتے تھے اور کہتے ہیں کہ حدیث ضعیف باب فضائل میں قابل عمل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فضائل میں حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے بھی محدثین کے یہاں کچھ شرطیں ہیں؛ اگر وہ شرطیں نہیں پائی گئیں تو حدیث ضعیف فضائل میں بھی غیر مقبول ہوگی اور وہ شرطیں یہ ہیں: ثواب سمجھے بغیر عمل کرے، اُس کا ضعف شدید نہ ہو، وہ کسی اصل شرعی کے تحت داخل ہو، كما صرح به في الدر المختار: ۱۲۸/۱: شرط العمل بالحديث العضيف، عدم شدة ضعفه، وأن يدخل تحت أصل عام وأن لا يعتقد سنية ذلك. اور زیر بحث مسئلہ میں کوئی بھی شرط نہیں پائی جارہی ہے؟ اس لیے اس حدیث ضعیف پر عمل کرنا جائز نہ ہوگا۔

(خلاصہ امداد الاحکام، کتاب السنۃ والبدعۃ: ۱۸۸/۱)

دوسری جگہ علامہ شامیؒ نے صرف اذان میں آپ ﷺ کے اسم مبارک پر انگوٹھا چومنے کے استحباب کی ایک عبارت کنز العباد، قہستانی وغیرہ سے نقل کی ہے، اذان کے علاوہ دوسرے اوقات میں علامہ شامیؒ نے خود اس کی تردید کو بھی نقل کیا ہے، اور جو عبارت اذان کے متعلق نقل کی ہے اُس کے بارے میں فرماتے ہیں: اِس کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں؛ لہٰذا اِس کے سنت ہونے پر کوئی دلیل نہیں، اور چوں کہ عوام اِس کو سنت سے بھی بڑھ کر ضروری سمجھتے ہیں اور تارکین کو ملامت کرتے ہیں؛ لہٰذا اِس کا ترک کرنا ضروری ہوگیا۔ (شامی: ۲۶۷/۱)

مولانا یوسف لدھیانوی صاحبؒ لکھتے ہیں:

> جس شخص نے یہ روایت گھڑی ہے، اُس نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے یہ نہیں سوچا کہ اذان واقامت دن میں ایک مرتبہ نہیں؛ بلکہ روزانہ دس مرتبہ دہرائی جاتی ہے، اب اگر اذان واقامت کے وقت انگوٹھے چومنا سنت ہوتا، تو جس طرح اذان واقامت مسلمانوں میں متواتر چلی آئی ہے اور مناروں پر گونجتی ہے، اسی طرح یہ عمل بھی مسلمانوں میں متواتر ہوتا، حدیث کی ساری کتابوں میں اِس کو

درج کیا جاتا ہے اور مشرق ومغرب تک پوری امت اِس پر عمل پیرا ہوتی۔(اختلاف امت اور صراط مستقیم:۱۰۵)

فتاویٰ ریاض العلوم میں ہے:

بدعت وناجائز ہے، اَسلاف یعنی صحابہ وتابعین کے تعامل کے خلاف ہے، حدیث میں تو یہ ہے کہ جو موذن کہے وہی تم بھی کہو؛ مگر یہ کہیں نہیں کہ انگوٹھا چومو۔(۱/۲۷۰)

گیارہواں باب

مَنْ سَرَّہ أنْ یَّتَمَثَّلَ لَہُ الرِّجَالُ قِیَاماً فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہُ مِنَ النَّارِ

(ترمذي:۲۷۵۹)

سلام کے وقت کھڑے ہونے کا بیان

سلام کے وقت کھڑے ہونا

سلام و مصافحہ یا معانقہ وتقبیل کے علاوہ بوقت ملاقات، کبھی کبھی کھڑے ہونے کی ضرورت پڑتی ہے، کبھی تعظیم وتکریم کے لیے، کبھی آنے والے کی آمد سے خوش ہو کر اور کبھی مجبوری میں؛ چوں کہ قیام کا تعلق سلام سے ہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں باب القیام کا تذکرہ کیا ہے اسی طرح احادیث اور فقہ کی کتابوں میں ''قیام'' سے متعلق اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے، روایات پیش کی جارہی ہیں اور اُن کے ضمن میں مسائل واحکام اور احادیث کا صحیح مفہوم ذکر کیا جائے گا۔

(۱) حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں: صحابہؓ کے نزدیک نبی ﷺ سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہیں تھا اور صحابہ جب آپ کو دیکھتے تھے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے؛ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ آپ اس کو پسند نہیں کرتے۔ (ترمذی: ۲۷۵۸، فی کراھیۃ قیام الرجل للرجل) (۱)

(۲) ابو مجلزؒ کہتے ہیں: حضرت معاویہؓ (گھر سے) نکلے تو ابن الزبیرؒ اور ابن صفوانؒ کھڑے ہوئے، جب انہوں نے حضرت معاویہؓ کو دیکھا تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا: دونوں بیٹھ جاؤ، میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے: من سرّه أن يتمثل له الرجالُ قياما، فليتبوأ مقعده من النار، جس کو یہ بات پسند ہو کہ لوگ اس کے سامنے کھڑے رہیں تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ (ترمذی: ۲۷۵۹)

ملحوظہ: اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر کھڑے ہوئے؛ لیکن یہی روایت ابوداؤد میں ہے، اس میں فقام ابن عامر وجلس ابن الزبير ہے۔ (۲) اسی طرح شرح السنہ میں ہے: فقام ابن عامر وقعد ابن الزبير (رقم: ۳۳۳۰).

---

(۱) حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں: اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی خاص ادب وتعظیم یا کوئی خاص خدمت کسی کے مزاج کے خلاف ہو، اس کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے؛ گو اپنی خواہش ہو؛ مگر دوسرے کی خواہش کو اس پر مقدم رکھے، بعضے لوگ جو بعض خدمات میں اصرار کرتے ہیں، وہ بزرگوں کو تکلیف دیتے ہیں، آداب المعاشرت مع اصلاحی نصاب: ۴۶۲.

(۲) ابوداؤد، رقم: ۵۲۲۹.

ان روایات سے معلوم ہوا کہ ابن زبیرؓ کھڑے نہیں ہوئے، شیخ سہارن پوریؒ نے بذل المجہود میں اِس تعارض کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ دو واقعے الگ الگ ہیں، ترمذی میں مذکورہ واقعہ پہلی مرتبہ کا ہے، اُس وقت ابن الزبیرؓ اور ابن صفوانؓ دونوں کھڑے ہوئے تھے اور ابوداؤد کا واقعہ دوسری مرتبہ کا ہے، اس میں ابن زبیرؓ کھڑے نہیں ہوئے؛ کیوں کہ اُن کے سامنے حدیث آچکی تھی، ایک اور صاحب ابن عامرؓ کھڑے ہوئے تھے، انھیں حضرت معاویہؓ نے منع کیا۔

یحتمل أن تكون الروايتان قصتين فما في "الترمذي" وقع أولا بأن ابن الزبير قام مع ابن صفوان فنهاهما معاوية وما في رواية أبي داؤد وقع ثانيا......
(بذل المجہود: ۱۳/۶۱۵)

(۳) حضرت ابو امامہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ ہمارے پاس لاٹھی ٹیکے ہوئے تشریف لائے؛ چناں چہ ہم آپ کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے، آپ نے فرمایا: لا تقوموا كما تقوم الأعاجم، يعظم بعضها بعضا کہ جس طرح عجمی لوگ کھڑے ہوتے ہیں ویسے مت کھڑے ہوؤ۔ (ابوداؤد، رقم: ۵۲۳۰)

احادیث — تشریح اور احکام

علامہ عینیؒ نے ابوالولید بن رشدؒ کے حوالے سے قیام کی چار قسمیں لکھی ہیں (۱) محظور (۲) مکروہ (۳) جائز (۴) مندوب۔

محظور: یعنی ایک آدمی از راہِ تکبر یہ چاہتا ہے کہ جب وہ آئے تو لوگ اُس کے واسطے کھڑے ہو جائیں۔

مکروہ: ایک آدمی کی یہ عادت تو نہیں ہے کہ لوگ اُس کے لیے کھڑے ہوں، اور وہ متکبر بھی نہیں ہے؛ لیکن کھڑا ہونے والا یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس کے واسطے کھڑے نہیں ہوئے تو کچھ نقصان ہو سکتا ہے؛ پس وہ کھڑا ہو گیا۔

جائز: کسی کی نیکی سے متاثر ہوکر اُس کے اعزاز واکرام میں کھڑے ہوجانا؛ جب کہ اُس کی طرف سے کھڑے ہونے کی کوئی خواہش وارادہ نہیں۔

مندوب: کوئی سفر سے آیا تو مارے خوشی کے سلام ومصافحہ کے لیے کھڑے ہوجانا، یا کسی کو کوئی نعمت ہاتھ آگئی، اس کو مبارک باد دینے کے لیے کھڑے ہونا یا کوئی مصیبت آن پڑی تو تسلی ودلاسہ کے لیے کھڑے ہوجانا۔ (عمدۃ القاری:۱۵/۳۷۶)

مفتی سعید احمد پالن پوری صاحب کے افادات میں ہے:

> کسی کا کسی کے لیے کھڑا ہونا دو طرح پر ہوتا ہے: ایک: تعظیم کے لیے، دوسرا انبساط وفرحت کے طور پر، پھر قیام تعظیمی کی دو صورتیں ہیں: ایک: مسلسل کھڑے رہنا یعنی جب تک بڑا مجلس میں رہے، لوگ کھڑے رہیں، دوم: کھڑے ہوکر بیٹھ جانا یعنی جب بڑا آ گے آئے تو لوگ کھڑے ہوجائیں، پھر جب وہ بیٹھ جائے تو لوگ بھی بیٹھ جائیں، یہ دونوں صورتیں ممنوع ہیں، پہلی صورت مکروہ تحریمی ہے اور دوسری صورت اُس سے کم مکروہ ہے، رہا انبساط وفرحت کے طور پر کھڑا ہونا، اور آنے والے کو خوش آمدید کہنا تو یہ نہ صرف جائز ہے؛ بلکہ مستحسن ہے۔ (تحفۃ الالمعی:۶/۵۲۳)

ابن وہبانؒ فرماتے ہیں:

> ہمارے زمانے میں کسی کی آمد پر کھڑے ہوجانا مستحب ہے؛ کیوں کر ترکِ قیام کے نتیجہ میں کینہ، بغض اور دشمنی جیسی مہلک بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں؛ بالخصوص اگر کوئی ایسی جگہ ہو جہاں قیام کی عادت ہو، اور رہ گئی بات قیام پر وعید کی تو وہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو کسی کے سامنے قیام کو واجب سمجھتے ہوں۔

وفي عصرنا ينبغي أن يستحب ذلك أي القيام لما يورث تركه من الحقد والبغضاء والعداوة لا سيما إذاكان في مكان اعتيد فيه القيام. (ردالمحتار:۹/۵۵۱)

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

ایسا شخص جس میں کوئی ظاہری فضیلت کی بات ہو مثلاً: علم، صلاح وتقویٰ یا عدل وانصاف یا کوئی قریبی رشتہ داری ہو تو اُس کے اعزاز واکرام میں کھڑے ہو جانا مستحب ہے اور دکھاوا اور بڑائی کے طور پر ناجائز ہے، اور اخیر میں لکھتے ہیں:

وعلى هذا الذي اخترناه استمر عمل السلف والخلف. کہ سلف وخلف سے یہی معمول منقول ہے۔(الاذکار:۳۰۵)

مولانا یحییٰ مرحوم لکھتے ہیں: قیام فی نفسہ جائز ہے، ہاں جب کوئی وجہِ کراہت پیدا ہو جائے تو مکروہ ہے۔(الأبواب والتراجم:۶/۳۵۳)(۱)

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

قیام علی سبیلِ الاِعظام مکروہ ہے اور علی سبیل الاِکرام جائز ہے، اکرام کا مطلب ہے سلام ومصافحہ کے لیے کھڑا ہونا، یہ قیام محبت میں اضافہ کا باعث ہے اور اِعظام کا مطلب ہے مسلسل کھڑے رہنا۔(مرقاۃ::۹/۸۳)

جگہ دینے کے لیے کھڑے ہو جانا ممنوع نہیں ہے

اگر کوئی شخص کسی مجلس میں آئے اور جگہ کی قلت ہو تو کوئی دوسرا شخص کھڑا ہو جائے؛ تا کہ

---

(۱) مثلاً: ریا کے لیے قیام مکروہ ہوگا، یعنی ظاہر میں کھڑا ہو گیا؛ لیکن دل میں اس کے لیے کوئی عزت نہیں ہے؛ ہاں اگر کھڑا نہ ہونے میں جانی یا مالی، دینی یا دنیاوی نقصان کا اندیشہ ہے تو مکروہ کا ارتکاب جائز ہے، بذل المجھود:۱۳/۶۰۲.

اُس نو وارد کے لیے جگہ بن سکے تو یہ قیام مختلف فیہ قیام نہیں ؛ بلکہ نہ صرف جائز ہے؛ بلکہ اخلاقی تقاضہ بھی ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص کسی دوسرے کی آمد پر کھڑا نہ ہو؛ لیکن اُس کے لیے کشادگی پیدا کرے۔ (المصنف :۶/۱۱۹)

خلاصۂ اقوال: حاصل یہ کہ اگر کوئی شخص ایسا نظر آئے جو علم وفضل اور بزرگی کا حامل ہو تو اس کی تعظیم وتوقیر کے طور پر کھڑے ہو جانا جائز ہے، اِس میں کوئی مضائقہ نہیں، اِسی طرح مجبور وعاجز شخص کی مدد کے لیے کھڑے ہونا، بیٹے کا باپ کے واسطے، بیوی کا شوہر کے واسطے کھڑے ہو جانا یا کسی کو مبارک بادی پیش کرنے کے لیے کھڑے ہو جانا، اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ البتہ ایسے شخص کے آنے پر کھڑے ہونا جو نہ صرف یہ کہ اس اعزاز کا مستحق نہ ہو؛ بلکہ اپنے آنے پر لوگوں کے کھڑے ہو جانے کی طلب وخواہش بھی رکھتا ہو، مکروہ ہے اور اسی طرح بے جا خوشامد وچاپلوسی کے طور پر کھڑے ہونا بھی مکروہ ہے، نیز دنیاداروں کے لیے کھڑے ہونا اور اُن کی تعظیم کرنا بھی نہایت مکروہ ہے۔

مذکورہ احادیث کا محمل

پہلی حدیث کا مصداق یہ صورت ہے کہ لوگ بڑے کے آنے پر تعظیم کے لیے کھڑے ہوں، پھر بیٹھ جائیں، صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کے لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے؛ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ آپ اس کو ناپسند کرتے ہیں۔

آں حضرت ﷺ اپنی انکساری کی اظہار اور اہل تکبر کے طور طریقوں کی مخالفت کی بنا پر اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ آپ کی آمد پر صحابہ تعظیما کھڑے ہوں، آپ کی زندگی تکلفات سے خالی تھی۔

اور دوسری حدیث بڑے کے سامنے مسلسل کھڑے رہنے کے بارے میں ہے جیسے پچھلے زمانوں میں راجہ مہاراجہ کے دربار میں لوگ مسلسل کھڑے رہتے تھے؛ لہٰذا یہ وعید اُس شخص کے بارے میں ہے جو از راہِ تکبر اور زبردستی اپنی تعظیم کرانے کے لیے اپنے سامنے لوگوں کے کھڑے

رہنے کو پسند کرتا ہو اور لوگوں کو یہ حکم دیتا ہو کہ میں آؤں تو لوگ کھڑے رہیں اور اس کو لازم وضروری قرار دے۔

قال أبو سليمان الخطابي رحمه الله في معنى: هذا هو أن يأمرهم بذلك ويلزمه إياهم على مذهب الكبر والنخوة. (شعب الایمان:۶/۴۶۹)

مولانا منظور صاحبؒ لکھتے ہیں:

ظاہر ہے اِس وعید کا تعلق اُس صورت سے ہے جب کہ کوئی آدمی خود یہ چاہے، اور اس سے خوش ہو کہ اللہ کے بندے اُس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں اور یہ تکبر کی نشانی ہے، اور تکبر والوں کی جگہ جہنم ہے، جس کے حق میں فرمایا گیا ہے، بئس مثوى المتكبرين (وہ دوزخ متکبرین کا برا ٹھکانہ ہے)

(معارف الحدیث:۶/۱۷۵)

تیسری حدیث کا اصل مصداق بھی بڑے کے سامنے مسلسل کھڑے رہنا ہے؛ مگر نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد اس موقع پر فرمایا ہے جب صحابہ تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے تھے، جو بعد میں بیٹھ گئے تھے؛ لہٰذا یہ دوسری صورت بھی حدیث کا مصداق ہے۔

غرض عجمیوں کی طرح کھڑا رہنا جائز نہیں، اُن کا طریقہ یہ تھا کہ نوکر آقا کی خدمت میں اور رعایا بادشاہ کی خدمت میں کھڑی رہتی تھی، اُن کو بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی اور یہ انتہائی درجہ کی تعظیم سمجھی جاتی تھی، جس کی سرحدیں شرک سے ملی ہوئی تھیں؛ اس لیے اس کی ممانعت کی گئی۔

اسی طرح بڑے کے آنے پر تعظیم کے لیے کھڑا ہونا، پھر بیٹھ جانا بھی ممنوع ہے، نبی ﷺ جب مکان سے باہر تشریف لاتے تھے اور صحابہ کرام ہوتے تھے تو وہ تعظیم ہی کے لیے کھڑے ہوتے تھے، مُثُول یعنی خدمت میں مسلسل کھڑا رہنا مقصود نہیں تھا، پھر بھی آپ نے ممانعت فرمائی؛ کیوں کہ یہی قیام تعظیمی مُثُول تک مُفضی ہوتا ہے اور اس سے مقتدیٰ کا نفس بھی خراب ہوجاتا ہے اور اگر

تعظیم میں غلو شروع ہو جائے تو مقتدی کا حال بھی برا ہو جاتا ہے؛ جیسا کہ لوگوں کے احوال میں یہ بات مُشاہَد ہے۔ (شرح ابن بطال:۹/۴۷، تحفۃ الالمعی:۶/۵۲۴)

مولانا منظور نعمانیؒ لکھتے ہیں:

> اگر کوئی آدمی خود بالکل نہ چاہے؛ مگر دوسرے لوگ اکرام وعقیدت ومحبت کے جذبہ میں اس کے لیے کھڑے ہو جائیں تو یہ بالکل دوسری بات ہے؛ اگرچہ رسول اللہ ﷺ اپنے لیے اس کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ (معارف الحدیث:۶/۱۷۶)

جوازِ قیام کی روایتیں

کسی کے آنے پر فرحت وسرور سے کھڑے ہونے کی، اُس کے لیے جھوم جانے کی اور اُس کے اکرام اور اُس کی خوش دلی کے لیے اٹھنے کی، پھر بیٹھ جانے کی گنجائش ہے، روایت پڑھیے:

(۱) حضرت فاطمہؓ آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو حضور ﷺ (جوشِ محبت سے) کھڑے ہو کر اُن کی طرف بڑھتے، اُن کا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں لے لیتے اور (پیار سے) اُس کو چومتے اور اپنی جگہ پر ان کو بٹھاتے (اور یہی اُن کا دستور تھا) جب آپ ان کے یہاں تشریف لے جاتے تو وہ آپ کے لیے کھڑی ہو جاتیں، آپ کا دستِ مبارک اپنے ہاتھ میں لے لیتیں، اُس کو چومتیں اور اپنی جگہ پر آپ کو بٹھاتیں۔ (ابوداؤد:۵۲۱۷)

تشریح: اسی لیے ہمارے اکابر کسی مہمان، دوست، بزرگانِ دین وغیرہ کی آمد پر فرحت وسرور اور اعزاز واکرام کے طور پر کھڑے ہونے کو جائز کہتے تھے، ہاں کسی کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونے کو ناپسند کرتے تھے، شارح بخاری شیخ ابن بطالؒ نے مذکورہ قیام کے جواز پر اسی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ (۹/۴۷)

(۲) امام بخاریؒ نے ''الادب المفرد'' میں باب قیام الرجل لأخیه کے تحت وہ مشہور روایت ذکر کی ہے، جس میں حضرت کعب ابن مالکؓ کی توبہ کی قبولیت کا تذکرہ ہے، اس میں

ہے: حتی دخلتُ المسجدَ؛ فإذا برسول الله ﷺ حوله الناس، فقام إليَّ طلحة بن عبيد الله يهرول حتی صافحني وهنأني. میں مسجد میں آیا، حضور ﷺ کے ارد گرد لوگوں کو موجود پایا، حضرت طلحہ میری جانب لپکے اور مصافحہ کیا، مبارک بادی پیش کی۔ (الأدب المفرد، رقم: ۸۸۰)

(۳) فتح مکہ کے موقع پر حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ مکہ چھوڑ کر یمن چلے گئے تھے، اُن کی بیوی نے اُن کے لیے پناہ مانگی، آپ نے پناہ دے دی، اُن کی بیوی ان کے پاس پہنچیں اور انہیں مسلمان بنا کر مکہ لے آئیں، فلمّا رآه النبي ﷺ وثب إليه فرحا وما عليه رداء، جب نبی ﷺ نے اُن کو دیکھا تو آپ چادر کے بغیر اُن کی طرف بڑھے اور ان کو خوش آمدید کہا اور بھاگ کر جہاں تک پہنچے تھے وہاں سے نبی ﷺ کے پاس لوٹنے کو ہجرت قرار دیا۔ (ترمذی، رقم: ۲۷۳۷)

(۴) حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: میں جب حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ میرے لیے کھڑے ہو جاتے یا اپنی جگہ سے ہل جایا کرتے تھے۔
(بذل المجہود: ۶۰۱/۱۳، شعب الایمان، رقم: ۸۹۳۱)

ملحوظہ: اس سلسلے کی مزید روایتوں کے لیے، شرح النووی دیکھی جائے، نیز حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اِس حوالے سے بڑی اچھی بحث کی ہے اور علامہ نوویؒ کا طرزِ استدلال اور ابن الحاجؒ کا طرزِ جواب، فتح الباری میں دیکھنے کے لائق ہے۔

الغرض: نفس قیام ممنوع نہیں؛ بلکہ قیام کی چاہت ممنوع ہے، والمنهي عنه محبة القيام.

حضرت سعد بن معاذؓ کی حدیث: طرزِ استدلال اور صحیح تحقیق

غزوہ بنو قریظہ کے موقع پر حضرت سعد بن معاذؓ بیمار تھے اور مدینہ منورہ میں مقیم تھے، فوج کے ساتھ نہیں آئے تھے، پھر جب بنو قریظہ ان کے فیصلے پر راضی ہوئے تو نبی ﷺ نے ان کو بلوایا وہ گدھے پر سوار ہو کر آئے، جب نبی ﷺ کے قیام گاہ کے قریب پہنچے تو آپ نے اُن کے قبیلے کے لوگوں سے فرمایا: قوموا إلی سيّدكم اپنے سردار کی طرف اٹھو۔ (بخاری، رقم: ۶۲۶۲)

یہ حدیث قیام تعظیمی کے جواز پر دلالت کرتی ہے یا نہیں، یعنی کیا اِس حدیث سے یہ بات ثابت ہوسکتی ہے کہ کوئی بڑا آدمی مجلس میں آئے تو تعظیم کے لیے کھڑے ہو جانا چاہیے جیسا کہ حضور ﷺ نے کھڑے ہونے کا حکم دیا یا نہیں؟ امام بخاریؒ نے باب قول النبي ﷺ: قوموا إلى سيدكم کا باب باندھا ہے؛ لیکن خود انہوں نے کوئی یقینی بات صراحۃً نہیں بیان کی ہے؛ تاہم شُراحِ حدیث نے اس پر گفتگو کی ہے، ابوداوٗدؒ نے اِس روایت کو بابٌ فی القیام کے تحت ذکر کیا ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جواز قیام تعظیمی کو ثابت کیا ہے۔(۱)

بذل میں شیخ سہارن پوریؒ نے لکھا ہے: احتج به المصنف والبخاري ومسلم على مشروعية القيام وقال مسلم: لا أعلم في قيام الرجل للرجل حديثا أصح من هذا. خلاصہ یہ کہ کچھ لوگوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ قیامِ تعظیمی مستحسن ہے، اس کے برخلاف کچھ محدثین کی رائے یہ ہے کہ حدیث سے قیام تعظیمی کے استحسان پر استدلال درست نہیں، ونازعه فيه طائفة، منهم ابن الحاج، اور عدمِ صحتِ استدلال کی کئی وجوہات ہیں۔

(۱) قوموا إلى سيدكم سے آں حضرت ﷺ کی مراد یہ نہیں تھی کہ حضرت سعدؓ کی تعظیم وتکریم کے لیے کھڑے ہو جاؤ جیسا کہ کسی بڑے آدمی کے آنے پر کھڑے ہونے کا رواج ہے، اور جس کی ممانعت پیچھے گذری ہے کہ یہ چیز عجمیوں کے رائج کردہ تکلفات میں سے ہے، اور صحابہ کو معلوم بھی تھا کہ حضور ﷺ قیام کو ناپسند کرتے ہیں؛ بلکہ آپ کی مراد یہ تھی کہ دیکھو تمہارے سردار آ رہے ہیں، ان کی حالت اچھی نہیں ہے، جلدی سے اٹھ کر اُن کے پاس جاؤ اور سواری سے اترنے میں اُن کی مدد کرو؛ تا کہ اترتے وقت اُن کو تکلیف نہ ہو اور زیادہ حرکت کی بنا پر زخم سے خون نہ بہنے لگے، اِس کا قرینہ یہ ہے کہ اگر مراد تعظیم وتکریم ہوتی تو آپ قوموا إلى سيدكم کے بجائے قوموا لسيدكم فرماتے۔ (بذل المجہود: ۱۳/۶۰۱، فتح الباری: ۱۱/۶۲)

---

(۱) غرض الباب على الظاهر جوازه، حاشیہ بذل: ۱۳/۶۰۰، امام بیہقیؒ نے اس روایت کو فصل في قيام المرء لصاحبه على وجه الإكرام والبر کے تحت ذکر کیا ہے، دیکھیے: شعب الایمان: ۶/۴۶۶۔

ایک شبہ: یہاں ایک شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ لفظ ''سید'' اِس پر دال ہے کہ ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ حکم، قیامِ تعظیمی کے لیے ہی دیا ہو؛ چناں چہ تحفۃ الالمعی میں ہے:

> یہ شبہ حضرت عمرؓ کے دل میں بھی پیدا ہوا تھا، مسند احمد کی مذکورہ روایت (۱۴۲/٦) میں ہے: فقال عمر: سیدنا الله عزوجل! قال: أنزلوه فأنزلوه حضرت عمرؓ نے کہا: ہمارے آقا اللہ عزَّ وجلَّ ہیں! نبی ﷺ نے فرمایا ان کو اتارو؛ چناں چہ لوگوں نے ان کو اتارا، اس میں اشارہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے لفظ سید سے قیامِ تعظیمی سمجھا تھا، نبی ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ تعظیم کے لیے نہیں ؛ بلکہ تعاون کے لیے اٹھنا ہے۔ (۵۲۵/٦)

(۲) اگر یہ قیام کا حکم تعظیم کے لیے ہوتا تو انصار کی تخصیص کیوں کی جاتی ؟ حکم انصار اور مہاجرین سب کو ہوتا، اور انصار میں بھی قبیلہ اوس کو یہ حکم تھا وہ انھیں کے سردار تھے (۱)؛ بلکہ شیخ ابن الحاجؒ نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ یہ قیام، اکرام اور اُن کی نیکی کی وجہ سے بھی نہیں تھا، ورنہ حضور ﷺ خود کھڑے ہوتے، دیگر اکابر صحابہ بھی کھڑے ہوتے (۲)؛ لیکن علامہ طیبیؒ نے اِس دوسری رائے پر تنقید کی ہے اور کہا ہے: کہ یہ قیام تعظیم کے لیے نہیں تھا؛ لیکن اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اکرام کے لیے بھی نہ ہو اور لام اِلی کا فرق ضعیف ہے؛ کیوں کہ قوموا إلی سیدکم مطلب ہے قوموا وافشوا إلیه تلقیا وإکراماً. (عمدۃ القاری: ۳۷٦/۱۵)

(۳) اور اگر مان لیا جائے کہ یہ قیام اعانت و مدد کے لیے نہیں تھا تو یہ کہا جائے گا کہ حضرت سعدؓ وہاں موجود نہیں تھے، اب وہ آئے تو ان کے لیے کھڑا ہوا گیا اور یہ جائز ہے، لأنه غائب قدم والقیام للغائب إذا قدم مشروع. (فتح الباری: ٦۲/۱۱)

---

(۱) لو کان القیام المامور به لسعد هو المتنازع فیه لما خص به الأنصار، فتح الباری: ٦۲/۱۱.

(۲) ولو کان القیام المأمور به لسعد علی سبیل البر والإکرام لَکَانَ هو ﷺ أول من فعله وأمربه من حضر من أکابر الصحابة (ایضا)

(۴) اور اس کا بھی احتمال ہے کہ قیام مبارکبادی دینے کے لیے ہو؛ کیوں کہ انہیں سرداری کے ساتھ ساتھ ایک بڑا رتبہ حاصل ہوا ہے کہ یہودیوں نے انہیں حَکَم بنایا ہے اور حضور ﷺ ان کے حَکَم ہونے پر راضی ہیں، والقیام لأجل التهنئة مشروع أیضا. (ایضا)

مسئلہ: علامہ خطابیؒ نے اِس حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ طالب علم کے لیے مستحب ہے کہ جب استاذ تشریف لائیں تو کھڑا ہو جائے۔ مراد یہ ہے کہ ملاقات کی غرض سے آئیں؛ اگر استاذ درسگاہ میں درس دینے کے لیے آرہے ہوں تو کھڑا ہونا ضروری نہیں ہے۔ (عمدۃ القاری: ۱۵/۳۷۶)

مفتی سعید احمد صاحب لکھتے ہیں:

> مسئلہ: اگر کوئی شخص بالکل نہ چاہے؛ مگر دوسرے اکرام و عقیدت و محبت میں کھڑے ہوں تو اُن کو منع کرنا چاہیے؛ کیوں کہ نبی ﷺ کو یہ کھڑا ہونا پسند نہیں تھا، میں نے اپنے اساتذہ سے سنا ہے: جب حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ درس گاہ میں تشریف لاتے تھے اور کوئی طالب علم کھڑا ہوتا تھا تو حضرت وہیں رک جاتے تھے، اُس کو ڈانٹتے تھے اور جب تک وہ بیٹھ نہیں جاتا تھا، حضرت آگے نہیں بڑھتے تھے۔ (تحفۃ الالمعی: ۶/۵۲۵)

قیام و تقبیل کے چند اور مسائل

اوپر حضرت شیخ الاسلام کا طرزِ عمل بیان ہوا؛ غالباً اِسی سلسلے کا ایک استفتاء ہے، جس میں حضرت مہتمم صاحب اور حضرت شیخ کے آتے وقت طلباء کے کھڑے ہونے کے بارے میں شرعی مسئلہ پوچھا گیا ہے اور مہتمم صاحب سے مراد غالباً قاری طیب صاحبؒ ہوں گے اور حضرت شیخ سے مراد شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی محمود صاحبؒ نے جواب لکھا ہے:

> اگر حضرت مہتمم صاحب اور حضرت شیخ یا کوئی بھی بزرگ تشریف لائیں تو ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونا، تقاضائے ادب ہے اور

مستحب ہے؛ لیکن اگر ان کو اِس قیام سے اذیت ہو اور وہ منع کریں تو قیام نہیں کرنا چاہیے، اذیت سے بچانا واجب ہے، جیسے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس حضرت رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ کو دیکھ کر سب کھڑے ہوگئے، اس پر قیام سے منع فرمادیا، پھر اِس کے بعد تشریف لاتے ہوئے دیکھتے تو ناگواری کا لحاظ رکھتے ہوئے قیام نہیں کیا کرتے تھے۔

(فتاوی محمودیہ:۱۹/۱۲۱)

حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

کسی بزرگ یا معزز آدمی کے آنے کے وقت تعظیماً کھڑا ہونا مضائقہ نہیں؛ مگر اس کے بیٹھنے سے بیٹھ جانا چاہیے، یہ کفار کی مشابہت ہے کہ سردار بیٹھا رہے اور سب حشم وخدم دست بستہ کھڑے رہیں، یہ تکبر کا شعبہ ہے؛ البتہ جہاں زیادہ بے تکلفی ہو اور بار بار اٹھنے سے ان بزرگ کو تکلیف ہوتی ہو تو نہ اٹھے۔

(تعلیم الدین مع اصلاحی نصاب:۲۸۱)

غیر مسلم وزراء کے لیے کھڑے ہونا

جہاں تک غیر مسلموں کی بات ہے تو ان کی اعتقادی گمراہی اپنی جگہ؛ لیکن مناسب حد میں رہتے ہوئے اُن کی تعظیم وتوقیر میں بھی حرج نہیں، رسول اللہ ﷺ نے جب قیصر روم کو خط لکھا تو اُن کے لیے ”عظیم الروم“ کا لفظ استعمال کیا؛ کیوں کہ اہل روم اُن کو اسی لقب سے یاد کیا کرتے تھے؛ اِس لیے اگر کسی غیر مسلم وزیر کا کھڑے ہو کر ہاتھ باندھے بغیر خیر مقدم کیا جائے تو اِس کی گنجائش ہے کہ یہ بھی

توقیر واحترام کا ایک طریقہ ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۱/۲۸۲)(۱)

قیام کا قانون غلط ہے

بعض متکبر افسران اپنے ماتحتوں کے لیے قانون بنا دیتے ہیں کہ وہ ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوا کریں، اور اگر کوئی ایسا نہ کرے تو اس کی شکایت ہوتی ہے، اُس پر عتاب ہوتا ہے اور اُس کی ترقی روک دی جاتی ہے، ایسے افسران بلاشبہ اس ارشاد نبوی ﷺ کا مصداق ہیں کہ "انہیں چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنائیں" (آپ کے مسائل ۷/۲۶۲)

مہمان کے لیے قیام وتقبیل

بڑوں کے لیے قیام کرنا درست بلکہ مستحسن ہے، مہمان کا اکرام چاہیے، تقبیل یدین میں بھی مضائقہ نہیں، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ جب حبشہ سے مدینہ طیبہ آئے تو حضرت نبی اکرم ﷺ نے ان کی پیشانی کی تقبیل کی تھی، ہاں! محل فتنہ ہو تو اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

رسمی تعظیم — ایک واقعہ

حضرت تھانویؒ کے وعظ میں ہے:

> ایک صاحب تشریف لائے اور سلام کر کے کھڑے ہوگئے، بہت دیر ہوگئی میں نے کہا بیٹھتے کیوں نہیں؛ کہنے لگے بلا اجازت کیسے بیٹھوں، میں نے کہا ابھی ایک ہفتہ تک اجازت نہیں بس فوراً بیٹھ گئے، میں نے کہا یہ کیا واہیات ہے یا تو بلا امر بیٹھتے نہ تھے یا اب

---

(۱) قیام کی چند قسمیں ہیں: ایک محبت کا وہ ایسے شخص کے لیے جائز ہے، جس سے محبت کرنا جائز ہے، دوسری قسم قیام تعظیمی ہے، اس میں اگر تعظیم دل سے ہو تو وہ شخص اس تعظیم کے قابل ہونا چاہیے، ورنہ اگر تعظیم کے قابل نہیں مثلاً کافر ہے تو اس قسم کی اجازت نہیں، اور اگر تعظیم صرف ظاہر میں ہے اور کسی مصلحت سے ہے، مثلاً یہ خیال ہے کہ اگر تعظیم نہ کریں گے تو یہ شخص دشمن ہو جائے گا یا یہ کہ خود اس کی دل شکنی ہوگی یا اس شخص کے ہدایت پر آنے کی امید ہے، یا یہ شخص اس کا محکوم ونوکر ہے، یا ایسی ہی کوئی اور مصلحت ہے تو جائز ہے......اور اگر نہ وہ قابل تعظیم ہے نہ کوئی مصلحت وضرورت ہے تو ممنوع ہے، امداد الفتاویٰ: ۴/۲/۲۱۷.

باوجود نہی کے بیٹھ گئے اور رواج یہ ہے کہ جب رخصت ہوں گے تو
الٹے پاؤں چلیں گے پشت کرنا بے ادبی سمجھتے ہیں، ظاہری برتاؤ
تو اِس قدر اچھا، مگر اطاعت کا نام نہیں، ہاں رسمی تعظیم وتکریم بہت
ہے، ہم لوگوں کی طبیعتیں ہی بدل گئیں، صحابہ رسمی تعظیم بہت نہ
کرتے تھے مگر مطیع اِس قدر تھے کہ دنیا کو معلوم ہے صحابہ کو جو تعلق
حضور ﷺ سے تھا وہ تعشُّق کا مرتبہ ایسا رکھتا ہے کہ دنیا میں کسی محبّ
اور محبوب میں اِس کی نظیر ملنا مشکل ہے؛ لیکن حالت یہ تھی کہ اِس
کے بھی پابند نہ تھے کہ حضور ﷺ کو آتے دیکھ کر کھڑے ہی ہو جایا
کریں، خود حضور ﷺ نے بھی اُن کو اس سے منع فرما رکھا تھا۔
(اصلاح ظاہر، آداب العشیر :۵۳۷، مجموعہ خطبات حکیم الامت)

دست بستہ کھڑا ہونا

اگر کوئی شخص دین کے اعتبار سے قابلِ احترام ہو اور اس کے لیے کھڑا ہوا جائے تو اِس کی گنجائش ہے، درمختار میں ہے: يجوز بل يندب القيام تعظيما للقادم؛ البتہ دست بستہ کھڑا ہونا مناسب نہیں، کہ اِس میں نماز کی کیفیتِ قیام سے مشابہت ہے؛ گویا اس کیفیت میں عبادت اور بندگی کا ایہام ہوتا ہے، اور ایسی باتوں سے منع فرمایا گیا ہے، جس میں غیر اللہ کی نسبت سے عبادت کا اِیہام ہوتا ہو۔ (کتاب الفتاویٰ :۱/۲۸۲)

کسی کے شر اور ضرر سے بچنے کے لیے قیام — ایک واقعہ

علامہ شامیؒ نے عنایہ کے حوالے سے شیخ حکیم ابو القاسمؒ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے: جب اُن کے پاس کوئی مالدار دنیا دار شخص ملنے کے لیے آتا تو شیخ کھڑے ہو کر اُس کا اِعزاز و اِکرام کرتے اور جب طلبہ کرام اور فقراء ومساکین آتے تو اُن کے واسطے کھڑے نہیں ہوتے تھے، اُن سے اس کی وجہ معلوم کی گئی، کہنے لگے: الغني يتوقع مني التعظيم، فلوتركته لأتضرر یعنی یہ دنیادار

لوگ مجھ سے تعظیم کی خواہش رکھتے ہیں، اگر میں کھڑا نہ ہوں تو مجھے ضرر پہنچائیں گے تو میرا قیام، دفعِ مضرت کے لیے ہے، جلبِ منفعت کے لیے نہیں ہے اور جہاں تک فقراء اور طلبہ کی بات ہے وہ لوگ سلام کا جواب اور کچھ علمی مذاکرہ کی تڑپ لے کر آتے ہیں، سواُن کے ساتھ میرا معاملہ ویسا ہی ہوتا ہے۔ (ردالمحتار: ۵۵۱/۹)

بزرگوں کے ہاتھ پیر چومنا

اپنے پیر ومرشد سے ملاقات کے وقت ہاتھوں اور پیروں کا چومنا جائز ہے یا نہیں؟ مفتی محمود صاحبؒ لکھتے ہیں:

> جو مستحقِ تعظیم وتوقیر ہواس کی ایسی تعظیم وتوقیر بجالانا جو خدا کے ساتھ مخصوص نہیں جائز ہے، یہ شرک نہیں ہے، کسی بزرگ پیر ومرشد کا ہاتھ چومنا جائز ہے، پَر اِس طرح نہ چومے جس سے سجدہ کی صورت ہوجائے۔ (محمودیہ: ۱۲۵/۱۹)

علامہ سندھیؒ نے تقبیل کے جواز کی انیس روایات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے: ان تمام روایات وواقعات سے ثابت ہوا کہ علماء ومشائخ اور دینی شرف رکھنے والے حضرات کی دست بوسی؛ بلکہ قدم بوسی بھی، نیز پیشانی پر بوسہ دینا سنت اور تعامل صحابہ وتابعین سے بلا کسی نکیر کے ثابت ہے۔ (بحوالہ جواہر الفقہ: ۱۹۳/۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> جو شخص واجب الاکرام ہو، اس کی قدم بوسی کی اجازت ہے؛ لیکن اعتقاد میں غلو نہ ہو اور سجدہ کی ہیئت نہ ہونے پائے۔ (ایضا: ۱۲۹/۱۹)

نوٹ: مولف عرض گزار ہے کہ علامہ حصکفیؒ نے قدم بوسی کے سلسلے میں دو قول نقل کئے ہیں: (طلب من عالم أو زاهد أن) يدفع إليه قدمه و(يمكنه من قدمه ليقبله أجابه،

وقیل لا) یرخص فیہ.(۱)؛چناں چہ جواز کا قول،وسعت اور فتوی ہے اور دوسرا قول ورع وتقویٰ ہے،چوں کہ عوام اس سلسلے میں غلو اختیار کر جاتے ہیں اور جس کی قدم بوسی کی جائے اس کے اَندر تکبر پیدا ہونے کا یقینی خطرہ رہتا ہے؛ اِس لیے قدم بوسی کا ترک ہی بہتر ہے،حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام کو ناپسند کرنا اسی بنیاد پر تھا کہ کہیں بعد میں غلو نہ پیدا ہو جائے۔

حضرت تھانویؒ نے اصول کی بات لکھی ہے: پیر پر ہاتھ لگا کر چہرہ پر ملنا جائز ہے یا نہیں یہ پوچھا گیا تو جواب دیا:

> اور ظاہراً قواعد سے تفصیل معلوم ہوتی ہے کہ اگر ممسوح (جس کے پیر کو چھو کر چہرے پر ملا جائے) متبرک متقی ہو اور ماسح متبع سنت، صحیح العقیدہ ہو تو جائز ہے ورنہ نہیں۔(امداد الفتاویٰ:۴/۲۷۹)

حضرت گنگوہیؒ لکھتے ہیں:

> بوسہ دینا بزرگوں، اہل سنت کے قدم کو، اگر چہ درست ہے؛ مگر اس کا کرنا اولیٰ نہیں کہ عوام اس سے فتنہ میں پڑ جاتے ہیں؛ لہٰذا اس کا ترک کرنا چاہیے۔(۲) (فتاوی رشیدیہ:۱۵۰)

کیا طلبہ استاذ کی آمد پر کھڑے ہو سکتے ہیں؟

استاذ کی آمد پر طلبہ کا کھڑے ہو جانا، جائز ہے یا ناجائز، یہ رواج عموماً بعض اسکول وکالج میں پایا جاتا ہے کہ ٹیچر، پروفیسر اور استاذ کی آمد پر سارے طلبہ، اسٹوڈینٹس کھڑے ہو جاتے ہیں، جب استاذ بیٹھ جاتا ہے تو طلبہ بھی بیٹھ جاتے ہیں، یہ طرزِ عمل مناسب نہیں، مسلمان بچوں کو اِس سے پرہیز کرنا چاہیے اور اگر ایسا رواج کسی دینی درسگاہ میں ہو تو اصلاح کرنی چاہیے،تربیت صرف سلام کی دی جائے؛ چناں چہ یہ روایت گذر چکی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو صحابہ کھڑے ہو گئے تو آپ نے منع فرمایا اور اسے عجمیوں کا طریقہ بتایا یعنی اسلامی طریقہ نہیں ہے،تاہم کہیں دفعِ ضرر کے

(۱) الدر علی ھامش الرد:۵۵۰. (۲) یہ اصول ہر جگہ پیشِ نظر رہے گا.

لیے گنجائش ہے۔

کتاب الفتاوی میں ہے:

> اِس صراحت سے ظاہر ہے کہ احترام میں کھڑا ہونا بہتر نہیں، ہاں اگر کوئی شخص ایسا فرعون مزاج ہو کہ اُس کے احترام میں کھڑے نہ ہونے والے عتاب وابتلاء کا شکار ہو جاتے ہوں تو ضرر سے بچنے کے لیے کھڑے ہونے میں قباحت نہیں۔(۴۲۹/۱)

والد کے پیر چومنا —— جائز یا ناجائز

اصل مسئلہ تقبیل میں کوئی اختلاف نہیں ہے؛ بلکہ اختلاف اس میں ہے کہ جس شخص کی قدم بوسی، دست بوسی کی جائے اُس کے لیے بھی یہ جائز ہے کہ اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا کر لوگوں کو اِس کا موقع دے اور اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اِس صورت میں اگر حقیقۃً عُجب وتکبر نہ بھی ہو تو صورۃً ایک متکبرانہ فعل ہے، جس سے تکبر پیدا ہو جانے کا احتمالِ غالب ہے؛ اِس لیے بعض فقہاء نے اِس خطرہ کی بنا پر مکروہ قرار دیا، بعض نے اصل فعل کے جواز پر نظر کر کے جائز قرار دیا؛ چناں چہ حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

> پس صحیح، جواز تقبیل قدم، فی نفسہ ہے اور فقہاء کے منع کو عارض مفسدہ پر محمول کیا جائے گا۔(امداد الفتاویٰ: ۳۴۵/۵)

ماں باپ یقیناً قابل تعظیم ہیں؛ لیکن اُن کی تعظیم وتکریم، اسلامی قانون کے دائرے میں رہ کر ہی جائز ہے، والدین کی قدم بوسی کی اجازت تو ہے؛ لیکن اِس کی وجہ سے عقائد میں غلو ہو سکتا ہے؛ اس لیے فقہاء نے بر بناء اِحتیاط والدین کے قدموں کو چومنے سے منع کیا ہے، چند فتاوے پڑھیے:

(۱) تعظیم کے لیے ماں کے پیروں کو چھونا قرآن پاک کی کسی آیت اور حدیث

شریف(۱) کی کسی روایت میں نہیں دیکھا، یہ اسلامی تعظیم نہیں؛ بلکہ غیروں کا طریقہ ہے، جس سے بچنا چاہیے۔(فتاوی محمودیہ:۱۹/۱۳۲)

(۲) والدین، اساتذہ اور مشائخ کی قدم بوسی کی اجازت ہے؛ بشرطیکہ سجدہ کی ہیئت نہ پیدا ہو جائے اور دیکھنے والوں کو یہ محسوس نہ ہو کہ یہ سجدہ کر رہا ہے؛ ورنہ اجازت نہیں اور احتیاط کا تقاضہ بھی ہے کہ اُن کی بھی قدم بوسی نہ کی جائے۔(حوالہ سابق)

(۳) پاؤں کو چومنے میں بسا اوقات سجدہ کی صورت ہو جاتی ہے، نیز دوسروں کے عقائد خراب ہونے کا اندیشہ ہے کہ وہ تعظیم میں غلو کریں گے؛ لہٰذا احتیاط یہ ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے۔(حوالہ سابق)

(۴) حدیث میں ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے والدہ کے سامنے احتراماً جھکنے کے بارے میں دریافت کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی منع فرما دیا اور ارشاد فرمایا: زبان سے سلام کر دینا کافی ہے، تو جب جھکنے کی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرما دی تو ظاہر ہے کہ پاؤں چھونے اور قدم بوسی کرنے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے۔(کتاب الفتاوی:۱/۳۴۳)

بیوی شوہر کے پیر چھو سکتی ہے؟

یہ طریقہ عام طور سے غیر مسلموں میں پایا جاتا ہے کہ اُن کے یہاں بیوی، شوہر کے پاؤں چھوتی ہے؛ بلکہ ہر چھوٹا، اپنے بڑے کے پاؤں چھو کر اس کی تعظیم کرتا ہے، اسی طرح غیر مسلموں میں یہ رواج ہے کہ کوئی عمر میں چھوٹا، اپنے بڑے کے پاؤں کو چھوتا ہے، بڑا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتا ہے، جسے وہ لوگ آشیرواد کہتے ہیں، یہ بھی ناجائز ہے، اولاً یہ اسلامی طریقہ نہیں، ثانیاً غیر مسلموں کا طریقہ ہے؛ اِس لیے مسلم گھرانوں میں بیوی کا، اپنے شوہر کے پاؤں

(۱) مولف عرض گزار ہے: مبسوط سرخسی میں ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من قبل رجل أمه فكأنما قبل عتبة الجنة کہ جس نے اپنی ماں کا پاؤں چوما گویا اس نے جنت کی چوکھٹ کو بوسہ دیا، مبسوط میں ہی ہے: محمد بن المنکدر سے منقول ہے کہ ایک رات میں اپنی والدہ کے پاؤں دباتا رہا اور میرا بھائی ابو بکر تمام رات نماز میں مشغول رہا اور مجھے ہرگز پسند نہیں کہ میں اپنی رات کو ان کی رات سے بدل لوں، مبسوط کتاب الاستحسان:۱۰/۱۴۹۔

چھونا جائز نہیں۔

مفتی محمود صاحبؒ لکھتے ہیں:

> پیر پکڑنا جس کو ''پرلاگن'' بھی کہتے ہیں یعنی صرف پیروں کو چھو لینا یہ برہموں کے یہاں تعظیم کا رواج اور ان کا شعار ہے، اس سے پرہیز لازم ہے۔ (محمودیہ: ۱۹/۱۳۴)

پیر پکڑ کر معافی مانگنا

پیچھے کی تصریحات کی روشنی میں یہی کہا جائے گا کہ پرہیز لازم ہے، کبھی انسان کسی سے معافی مانگنے پر دل سے ایسے آمادہ ہو جاتا ہے اور اُس کے قدموں میں گر جاتا ہے، پاؤں پکڑ کر رونے اور معافی مانگنے لگتا ہے؛ عموماً ایسا احساسِ ندامت اور جذبات شرمندگی کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اُس وقت انسان مغلوب الحال ہوتا ہے؛ لیکن جس کے پاؤں پکڑ رہا ہے، اُس کے لیے جائز نہیں کہ اپنے پاؤں مزید پھیلا دے؛ بلکہ اپنے پاؤں کو سمیٹ لے اور سامنے والے کو اٹھا کر کھڑا کرے اور اسے معاف کر کے گلے لگالے، مفتی محمود صاحبؒ لکھتے ہیں:

> معافی مانگنے کے لیے پیر پکڑنا نظر سے نہیں گذرا، بظاہر تو یہ برہمن کی تعظیم ہے، بغیر معافی کے بھی ان کے یہاں کسی کے پیر چھونے کا رواج ہے، جس کو پیرلاگن کہتے ہیں .... مگر ایسی ہیئت نہ ہو کہ سجدہ کی شکل بن جائے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۹/۱۳۵)

والدین یا استاذ کی قبر کو بوسہ دینا

والدین یا اساتذہ ومشائخ یا کسی بھی بڑی ہستی کی قبر کو بوسہ دینا درست نہیں ہے، ناجائز ہے۔

ولا یمس القبر ولا یقبله، فإنه من عادة أهل الكتاب.

(حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح: ۶۲۰ زیارۃ القبور)

بوسہ لینا قبر کا حرام ہے، مدارج میں ہے: اور بوسہ دینا قبر کا اور اس کو سجدہ کرنا اور سر رکھنا

حرام اور ممنوع ہے اور والدین کی قبروں کو بوسہ دینے میں ایک فقہی روایت نقل کرتے ہیں، اور صحیح یہ ہے کہ لا یجوز (جائز نہیں) اور لا یجوز کا ادنی گناہ، گناہ صغیرہ ہے اور اس پر اصرار کرنا گناہ کبیرہ ہے۔..............(فتاوی رشیدیہ: ۱۳۵)

روضۂ مطہرہ کی تصویر کو بوسہ دینا

آج کل ایسے کلینڈر آتے ہیں، جن میں کعبہ، روضہ اقدس یا بیت المقدس وغیرہ کی تصویریں چھپی ہوتی ہیں، اُن کو بوسہ دینا یا آنکھوں پر ملنا، روایات سے ثابت نہیں ہے؛ ہاں اگر کوئی غایت شوق اور غلبہ محبت میں ایسا کر لے تو ملامت نہیں کرنا چاہیے، امداد الفتاوی میں ہے:

> بوسہ دادن وچشم مالیدن برین نقشہا ثابت نیست واگر از غایت شوق سرزد، ملامت وعتاب ہم برجا نباشد، کتبہ الاحقر رشید احمد گنگوہی عفی عنہ......الجواب صحیح، اشرف علی عفی عنہ ۴/۲۸۰۔

مسئلہ قیامِ میلا دمروجہ

پیچھے یہ مسئلہ گذر چکا ہے کہ کوئی شخص سفر سے آئے تو سلام ومصافحہ کے لیے کھڑے ہونا جائز ہے، اس سے کچھ لوگوں نے یہ غلط مسئلہ مستنبط کیا کہ مروجہ میلاد میں قیام جائز ہے؛ کیوں کہ میلا دمروجہ میں حضور ﷺ تشریف لاتے ہیں، اس کے بارے میں حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

> رہا اہل مولد کا استدلال دلائل جواز قیام للقادم سے محض لچر ہے؛ اِس لیے کہ وہاں قدوم کہاں ہے، صرف ذکرِ قدوم ہے، فأین هذا من ذاك (قدوم اور ذکر قدوم میں آسمان زمین کا فرق ہے) بلکہ جس قدوم کا ذکر ہے، اُس قدوم کے وقت قیام کہیں منقول یا متعارف بھی نہیں؛ چناں چہ سلاطین کے گھر بچے پیدا ہوتے ہیں، حاضرین نے کبھی قیام نہیں کیا، پس یہ فرق جواب کے

لیے کافی ہے، قیام للقادم کی نفی کی ضرورت نہیں، اور سوچ کر دیکھا
جائے کہ اگر بطور اعجاز کے کہیں خود حضور ﷺ تشریف لے آویں
اور رویت اور یقین دونوں حاصل ہو جاویں، کیا علی قاری و من تبعہ
کھڑے نہ ہو جاویں۔ (امداد الفتاوی: ۳/۴/۲۷)

قرآن شریف کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونا

قرآن شریف کی تعظیم کے واسطے کھڑا ہونا درست ہے، قرآن شریف کلام الٰہی تعالیٰ شانہ ہے؛ اس کی جس قدر تعظیم ہو، بجا ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ: ۵۹۹)

ایک تعارض اور اس کا حل: حضرت انسؓ کی ایک روایت پیچھے گذری ہے کہ ایک صاحب نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ بوقت ملاقات کوئی شخص جھک سکتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں (کیوں کہ جھکنا رکوع کے مشابہ ہے اور جیسے غیر اللہ کے سامنے سجدہ حرام ہے، رکوع کرنا بھی حرام ہے)

(ترمذی، رقم: ۲۷۲۹)

اب سوال ہے کہ جن شرطوں کے ساتھ قدم بوسی کی اجازت ہے تو اس میں انحناء (جھکنا) تو پایا جائے گا، اِسی لیے فقہاء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ قدم بوسی اس صورت میں تو جائز ہے جب انحناء رأس، بہ ہیئت رکوع و سجود نہ ہو، اُن کا مستدل مذکورہ روایت ہے؛ لیکن فقہاء کی دوسری جماعت کہتی ہے کہ جب قدم بوسی جائز ہے تو اگر چہ بصورتِ رکوع و سجود، اِنحناءِ رأس سے ہو تب بھی جائز ہے، بہ ظاہر دونوں باتوں میں تعارض ہے؟

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ: جو انحناء مقصوداً ہو وہ ناجائز ہے اور جو بہ ضرورت تقبیل کے لازم آجائے وہ حکم میں تقبیل کے تابع ہے۔ (جواہر الفقہ: ۱/۲۰۰)

تقبیل قدم کا مطلب

سوال: تقبیل قدم کے کیا معنی ہیں؟ قدم کو بوسہ دینا، حجر اسود کی طرح ہاتھ سے قدم کو مس

کر کے ہاتھ کو بوسہ دینا یا عام معنی لیے جاویں۔

جواب: معنی اول ہی اس کا مدلول ہے اور ثانی بے اصل ہے۔ (ایضاً)

خلاصۂ کلام

مصافحہ، معانقہ اور تقبیل کی روایات، تشریحات، مسائل اور اعتراضات و جوابات آپ نے تفصیل سے ملاحظہ فرمائے: تفصیلی گفتگو کا مقصد اہل علم تک بات پہنچانا ہے؛ تا کہ وہ تنقیدی و تحقیقی جائزہ لے سکیں، ان تمام تفصیلات کا خلاصہ ذیل میں عوام کے لیے لکھا جا رہا ہے، خلاصہ مولف کتاب کو اپنی طرف سے لکھنا تھا، اُسی دوران جواھر الفقہ دیکھنے کی توفیق ہوئی، جس میں ''دست بوسی اور قدم بوسی'' کے عنوان سے ایک مقالہ ہے، جو در حقیقت بارھویں صدی ہجری کے مشائخ سندھ میں سے ایک شیخ امام محمد عابد سندھیؒ کا ایک عربی مقالہ ہے الکرامۃ والتقبیل کے نام سے، آپ کے حواشی تقریبا صحاح ستہ پر معروف ومقبول ہیں، اس میں انہوں نے مستقل طور سے کرامت اور تقبیل کی روایات اور تطبیقات کا تذکرہ بہت ہی آسان انداز میں کیا ہے، مفتی شفیع صاحبؒ نے اُس رسالے کا ترجمہ جواھر الفقہ میں اضافہ کے ساتھ شامل کیا ہے، اخیر میں خلاصۂ کلام پیش کیا ہے، جس میں بحث تو معانقہ اور تقبیل کے سلسلے میں ہے؛ لیکن اسی خلاصہ پر مصافحہ اور قیام کو قیاس کیا جا سکتا ہے، مولف اسی خلاصہ کو من وعن نقل کر رہا ہے، بڑوں کی باتوں میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے، ذرا پڑھ کر اندازہ کیجیے۔

۱- تقبیل و معانقہ اگر شہوت کے ساتھ ہو وہ باتفاق امت اپنی بیوی یا زرخرید کنیز کے علاوہ کسی کے ساتھ جائز نہیں، اسی طرح جب اپنے نفس میں یا دوسری جانب میں شہوت پیدا ہو جانے کا خطرہ ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

۲- اور جو تقبیل اور معانقہ چھوٹوں پر شفقت یا بزرگوں کی تعظیم واکرام کے لیے ہو وہ باتفاق جائز اور سنت سے ثابت ہے؛ بشرطیکہ اس کے ساتھ کوئی امر منکر یعنی ناجائز کام شامل نہ ہو جائے۔

۳- اور جہاں تقبیل ومعانقہ بلکہ مصافحہ (اور قیام) میں بھی کچھ منکرات شامل ہو جائیں وہ باتفاق مکروہ ہے، وہ منکرات جو ایسے مواقع میں شامل ہو جاتے ہیں کئی قسم کے ہیں ان کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے؛ تاکہ اُس سے بچ سکیں۔

تقبیل اور معانقہ ومصافحہ میں شامل ہونے والے منکرات

۱- اول یہ کہ جس شخص کو ان امور سے اپنے نفس میں تکبر واِعجاب پیدا ہو جانے کا خطرہ ہو اس کو درست نہیں کہ دوسرے لوگوں کو دست بوسی، قدم بوسی وغیرہ کا موقع دے۔

۲- دوسرے یہ کہ جس صورت میں یہ خطرہ ہو کہ اس عمل سے دوسرے شخص کو ایذا وتکلیف پہنچے گی تو وہاں ان امور میں سے کچھ یہاں تک کہ مصافحہ بھی جائز نہیں مثلاً جب دیکھے کہ جس سے ملاقات کرنا ہے وہ مشغول ہے یا کسی ضروری کام میں ہے اس وقت اس کے ساتھ معانقہ وتقبیل؛ بلکہ مصافحہ کی کوشش کرنا بھی اُس کی ایذا وتکلیف کا سبب ہوسکتا ہے، ایسی صورت میں اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

۳- تیسرے جہاں یہ خطرہ ہو کہ جس کی دست بوسی کی جارہی ہے یہ اس کے نفس میں تکبر وغرور پیدا کردے گا تو اس سے اجتناب ضروری ہے؛ خصوصاً دست بوسی اور قدم بوسی اگر کسی مجمع کے اندر ہو تو ایک مفسدہ تو یہی ہے کہ اُس میں وقت بڑا خرچ ہوگا، کام کی ضروری باتوں میں خلل آئے گا، اور دوسرا بڑا مفسدہ یہ ہے کہ جس جگہ اس کی رسم اور عادت ہو جائے تو ہر آنے والا یا تو خواہی نہ خواہی دست بوسی اور قدم بوسی میں اہل مجلس کا اتباع کرے یا پھر سب سے مختلف ہونے کا گویا اعلان کرے جس سے اور بہت سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔

ایک قیمتی اور یاد رکھنے والی بات

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ وتابعین کے جو واقعات آپ نے اس رسالہ میں ملاحظہ فرمائے، اُن کو اُسی درجہ میں رکھنا ضروری ہے، جس درجہ میں سنت اور تعامل سلف سے اس کا ثبوت

ہوا ہے، اُن تمام روایات و واقعات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کام ہوئے؛ مگر اتفاقی طور پر کسی ایک دو آدمی نے کر لیے، نہ اس کی عادت تھی، نہ سب مجمع کو یہ کرنا تھا، نہ کوئی کسی کو اِس کی دعوت دیتا تھا اور نہ کوئی کسی کی حرص کرتا تھا، بس اسی سادگی اور عدم پابندی کے ساتھ، جہاں ہوں جائز و درست؛ بلکہ مستحب بھی ہوسکتا ہے، جہاں یہ سادگی نہ رہی، پابندی آ گئی یا عادت پڑ گئی تو وہ مفاسد سے خالی نہیں اور فقہاء کا یہ ضابطہ معروف و مشہور ہے کہ اگر کسی مستحب کام میں کچھ منکرات شرعیہ شامل ہو جائیں تو اُس مستحب کو بھی چھوڑ دینا واجب ہو جاتا ہے؛ بشرطیکہ وہ سنن مقصودہ میں سے نہ ہو جیسے جماعت نماز کے بعد مصافحہ کو بعض فقہاء نے اِس لیے مکروہ قرار دیا کہ اس کو نماز کی ایک سنت جیسا قرار دے دینا خلاف شرع اور گناہ ہے۔

بس مختصر بات یہی ہے کہ سنت رسول اللہ ﷺ اور تعامل صحابہ میں اس کی جو حد منقول ہے، اُس کو اُسی حد پر رکھا جائے تو بلا شبہ دست بوسی، قدم بوسی، معانقہ مصافحہ (اور قیام) سب جائز؛ بلکہ سنت و مستحب ہیں اور جہاں اِس میں غلو کے پہلو یا دوسروں کی ایذا شامل ہو جائے وہ گناہ ہے۔

(جواہر الفقہ: ۱/۲۰۱-۲۰۳)

بارھواں باب

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيماً

(الأحزاب: ٥٦)

درود و سلام کا بیان

تحفہ درود وسلام —— ایک عبادت، ایک اعزاز اور حضورﷺ کا حق

اِس کائنات میں ایک مومن کا سب سے بڑا محسن، نبی پاکﷺ کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا، حضورﷺ کی پوری زندگی اِس فکر اور غم میں گذری کہ میری امت کا ایک ایک فرد عذابِ جہنم سے بچ جائے اور جنت میں داخل ہو جائے، تنہا یہی احسان اتنا بڑا ہے کہ زندگی اور زندگی کے سارے لمحات اُن پر قربان کر دیئے جائیں تو حق ادا نہ ہوگا؛ تاہم کوشش کرنی چاہیے، ایک امتی اتنا تو کرسکتا ہے اور کرنا چاہیے کہ حضورﷺ کا حق بھی ہے کہ جب بھی موقع ملے حضورﷺ پر درود وسلام کا ہدیہ پیش کرے اور اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے، ہمیں سلامتی کی ضرورت ہے، ہم محتاج ہیں، ہمارے درود اور ہمارے سلام کی ضرورت حضورﷺ کو نہیں، حضورﷺ کی ذات تو وہ ذات ہے کہ خود خالقِ کائنات اور اس کے معصوم فرشتے اُن پر درود وسلام بھیجتے ہیں، ضرورت تو ہمیں ہے، ہم درود وسلام ایک بار بھیجیں گے، وہاں سے دس مرتبہ سلامتی کی دعا ملے گی، اور اس دعاءِ سلامتی کی قبولیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا، ایمان خطرے میں پڑ جائے گا؛ اِسی لیے درود وسلام کے پڑھنے پر فضائل اور ترک پر وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

رب کائنات کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيماً .(الاحزاب:۵۶)

بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں نبیﷺ پر، اے ایمان والو! تم بھی آپﷺ پر درود بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو)

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ وہ نبی کریمﷺ پر کثرت کے ساتھ درود پڑھیں اور خوب سلام بھیجیں، نبی کریمﷺ پر درود کے لیے عربی میں لفظ "صلاۃ" سے مشتق الفاظ مستعمل ہوتے ہیں اور سلام کے لیے "سلام" سے مشتق الفاظ استعمال ہوتے ہیں، حضورﷺ پر سلام کا طریقہ وہی ہے جو ہم آپس میں کرتے ہیں؛ چناں چہ روایت میں ہے جب یہ آیت نازل

ہوئی تو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ، سلام کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہے یعنی التحیات میں جو پڑھا جاتا ہے "السلام عليك أيها النبي ورحمة الله وبركاته" "صلاۃ" کا طریقہ بھی بتا دیجئے تو آپ ﷺ نے اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد اخیر تک درود شریف ارشاد فرمایا۔

(بخاری، رقم الحدیث: ۶۳۵۷، باب الصلاۃ علی النبی ﷺ)

یہ اعزاز صرف سید الکونین کو حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے "صــلاۃ" کی نسبت اولاً اپنی طرف کی، اس کے بعد فرشتوں کی طرف پھر عام مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ بھی درود بھیجیں اور اس کے ساتھ ساتھ "سلام" بھی کثرت سے بھیجیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بہت سے احکام بیان کیے ہیں؛ لیکن یہ نہیں فرمایا کہ میں بھی یہ کام کرتا ہوں، دورد کو ایک ایسا اعزاز حاصل ہے کہ اللہ نے فرمایا میں بھی یہ کام کرتا ہوں اور فرشتے بھی؛ البتہ ہمارے درود اور اللہ کے درود میں فرق ہے، اللہ کے درود بھیجنے کا مطلب حضور ﷺ کو مقام محمود تک پہنچانا ہے اور فرشتوں کے درود کا مطلب حضور ﷺ کے درجات کی زیادتی کی دعا کرنا ہے اور حضور کی امت کے لیے استغفار کرنا اور مومنین کے درود کا مطلب، حضور ﷺ کی پیروی اور اُن کے ساتھ محبت اور اُن کے اوصاف جمیلہ کا تذکرہ اور تعریف۔ (روح المعانی: ۲۵۲/۱۱)

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: کہ مجھ سے بعض لوگوں نے یہ اشکال کیا کہ آیت شریفہ میں صلاۃ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، سلام کی نہیں کی گئی ہے؟ میں نے اِس کی وجہ بتائی کہ شاید اس وجہ سے کہ سلام دو معنی میں مستعمل ہوتا ہے ایک دعا میں، دوسرے انقیاد و اتباع میں، مومنین کے حق میں دونوں معنی صحیح ہو سکتے تھے، اس لیے اُن کو اِس کا حکم کیا گیا اور اللہ اور فرشتوں کے لحاظ سے تابعداری کے معنی صحیح نہیں ہو سکتے تھے اس لیے اس کی نسبت نہیں کی گئی۔ (فتح الباری: ۵۳۳/۸)

لیکن اللہ تعالیٰ کو جیسے درود پسند ہے اسی طرح حضور ﷺ پر سلام بھیجنا بھی بہت پسند ہے؛ چناں چہ اللہ رب العزت نے ایک ایسا نظام بنایا ہے کہ آپ روضۂ اقدس کے پاس سلام کریں تو حضور خود سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں اور دنیا کے کسی کونے میں رہتے ہوئے حضور ﷺ پر سلام بھیجیں تو

جیسے درود کو پہنچانے کا نظام ہے ویسے ہی سلام پہنچانے کا بھی نظام ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے، درود اور متعلقات درود کے لیے مستقل کتابیں ہیں اُن کا مطالعہ کیا جائے، مولف کی کتاب سلام سے متعلق ہے اس لیے مستقل طور سے ''سلامِ نبی'' اور اس کے متعلقات کا تذکرہ ہوگا، ضمناً درود کا بھی۔

اللہ تعالیٰ نے جیسے تمام مسلمانوں کو "السلام علیکم" جیسی بے مثال اور دنیا وآخرت کی بھلائیوں سے پُر دعا عطا فرمائی ہے اور حکم دیا ہے کہ بندے آپسی ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب کے لیے بھی یہ انتظام فرمایا کہ بندے انہیں سلام کریں، دور ہیں کیا ہوا وہ سلام کا تحفہ تیار کریں، اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ وہ سلام آپ تک پہنچا دیں گے اور حضور ﷺ پر؛ بلکہ دیگر انبیاء پر ''سلام'' اللہ کو بہت پسند ہے۔

چناں چہ ارشادِ خداوندی ہے:

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفَى آللّٰهُ خَيْرٌ أَمَّا يُشْرِكُوْن. (النمل:۵۹)

ترجمہ: آپ کہیے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لے سزاوار ہیں اور اس کے ان بندوں پر سلام ہو جس کو اس نے منتخب فرمایا ہے، منتخب بندوں سے مراد انبیاء ورسل ہیں، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے:

وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْن. (الصافات:۱۸۱)

لہٰذا ہم مسلمانوں کو حضور پر درود کے ساتھ ساتھ ''سلام'' کا بھی اہتمام کرنا چاہیے ''سلام'' کے لیے "السلام علی رسول الله، السلام علی النبي" جیسے الفاظ استعمال کریں اور اگر روضۂ اقدس پر ہیں تو "السلام علیك یا رسول الله" کہیں یا "سلام" کے جو صیغے منقول ہیں وہ پڑھیں، اب اس سلسلے کی چند روایات پڑھیے۔

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے: کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو کوئی بھی مجھ پر سلام بھیجتا ہے، اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر واپس کر دیتے ہیں؛ یہاں تک کہ میں اُس کے سلام کا جواب دے دیتا ہوں۔ (ابوداؤد، رقم الحدیث:۲۰۴۱، باب زیارۃ القبور)

تشریح: سنن ابوداؤد کے مصنفؒ نے یہ روایت باب زیارۃ القبور کے تحت ذکر کی ہے، جس کا مطلب ہے کہ یہاں حضور ﷺ پر سلام سے مراد زیارتِ روضۂ اقدس کے وقت سلام کرنا ہے؛ چناں چہ بذل کے حاشیہ میں مسند احمد کے حوالے سے یہ حدیث یوں ہے "ما من أحد يسلم علی عند قبري" (۱) اس میں عند قبری کی قید ہے، معلوم ہوا کہ جوخوش نصیب بندہ، روضۂ اقدس پر حضور ﷺ کو سلام کرتا ہے، حضور ﷺ اُس کے سلام کا جواب وعليك السلام کے ذریعہ دیتے ہیں، گویا ایک اعتبار سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا، اگر یہ نعمت ساری دنیا؛ بلکہ اُس دنیا جیسی اور چار پانچ دنیا خرچ کر کے بھی حاصل ہوتو ایک امتی کے حق میں ارزاں اور سستا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا مشاہدہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں اس حدیث کے تحت گفتگو کی ہے، خلاصہ درج ذیل ہے:

> روح پاک جو مشاہدۂ حق میں مشغول ہے اور جس کا کسی طرف التفات باقی نہیں رہا، باذن الٰہی وہ سلام پیش کرنے والے کی طرف مُلتَفِت ہوتی ہے اور جواب دیتی ہے یعنی روح پاک سے سلام کرنے والے کو فیض پہنچتا ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: میں نے ۱۱۴۴ھ میں جب میرا قیام مدینہ منورہ میں تھا، اِس بات کا بار بار مشاہدہ کیا ہے، یعنی روح نبوی سے فیض پایا ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعۃ: ۴/۳۴۵)

شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ لکھتے ہیں:

> علامہ سخاویؒ نے قولِ بدیع میں سلیمان بن سحیمؒ سے نقل کیا ہے: کہ میں نے خواب میں حضور اقدس ﷺ کی زیارت کی، میں نے

(۱) مسند احمد: ۲/۵۲۷، بذل: ۷/۵۶۷.

دریافت کیا یا رسول اللہ! یہ جو لوگ حاضر ہوتے ہیں اور آپ پر سلام کرتے ہیں، آپ اس کو سمجھتے ہیں؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں سمجھتا ہوں اور اُن کے سلام کا جواب بھی دیتا ہوں، ابراہیم بن شیبانؒ کہتے ہیں کہ میں حج سے فراغ پر مدینہ منورہ حاضر ہوا اور میں نے قبر شریف کے پاس جا کر سلام عرض کیا تو میں نے حجرہ شریف کے اندر سے "وعليك السلام" کی آواز سنی، ملا علی قاریؒ کہتے ہیں: کہ اس میں شک نہیں کہ درود شریف قبر اطہر کے قریب پڑھنا افضل ہے، دور سے پڑھنے سے، اس لیے کہ قریب میں جو خشوع، خضوع اور حضورِ قلب حاصل ہوتا ہے وہ دور میں نہیں ہوتا، صاحب مظاہر حق اس حدیث پر لکھتے ہیں: یعنی پاس والے کا درود خود سنتا ہوں بلا واسطہ اور دور والے کا درود ملائکہ سیاحین پہنچاتے ہیں، اور جواب سلام کا بہر صورت دیتا ہوں۔

اس سے معلوم کیا چاہیے کہ حضرت ﷺ پر سلام بھیجنے کی کیا بزرگی ہے اور حضرت ﷺ پر سلام بھیجنے والے کو خصوصا بہت بھیجنے والے کو کیا شرف حاصل ہوتا ہے؛ اگر تمام عمر کے سلاموں کا ایک جواب آوے، سعادت ہے؛ چہ جائیکہ ہر سلام کا جواب آوے۔

بہر سلام مکن رنجہ در جواب آں لب ☆ کہ صد سلام مرا بس یکے جواب از تو

(فضائل درود شریف، ص:۲۰)

ایک علمی اشکال اور اس کا جواب

''اللہ میری روح کو مجھ پر واپس بھیج دیتے ہیں'' .... واپسی کا مطلب ہوتا ہے، پہلے جدائی ہوئی ہو یعنی روح جسم سے جدا ہوگئی اور جب کسی نے سلام کیا تو روح کو جسم میں واپس کردیا

گیا؛ حالاں کہ یہ چیز حیاتِ انبیاء کے خلاف ہے، انبیاء تو اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں، پھر ردِّ روح کا کیا مطلب؟ حضرت گنگوہیؒ نے یہ توجیہ فرمائی ہے کہ آپ کی مراد یہ ہے وفات کے بعد میری روح واپس کردی گئی ہے۔

اور بذل المجہود میں قاضی عیاضؒ مالکی طرف سے اس کی ایک توجیہ پیش کی گئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

> غالبًا اس حدیث میں ردروح سے مراد یہ ہے کہ حضور ﷺ کی روحِ مقدس تجلیات ربانیہ اور معارف الٰہیہ کی طرف متوجہ رہتی ہے، جب کسی امتی کا سلام آپ کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کی روح مبارک کو اس سلام کرنے والے کی طرف متوجہ کردیتے ہیں؛ تاکہ سلام کا جواب دیں، قال القاضي: لعل معناه أن روحه المقدسة في شان ما في الحضرة الإلٰهية؛ فإذا بلغه سلام أحد من الأمة رد الله تعالىٰ روحه المطهرة من تلك الحالة إلى رد من سلّم عليه. (بذل:۵۶۸/۷)

اس توجیہ پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ کے روضۂ شریف پر تو تقریباً ہر وقت ہی سلام پڑھنے کا سلسلہ قائم رہتا ہے تو کیا بار بار یہ استغراق کی کیفیت اور اس سے افاقہ ہوتا رہتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ جب تک صلاۃ وسلام کا سلسلہ رہتا ہے، توجہ بھی اسی طرف رہتی ہے اور جب اس میں انقطاع ہوتا ہے تو توجہ میں بھی انقطاع ہوجاتا ہے، اس میں اشکال کیا ہے؟ روح تو بڑی لطیف اور سریع السیر ہے، دوسری بات یہ ہے کہ سلام پڑھنے والے اس عالَم میں ہیں اور جس پر سلام پڑھا جارہا ہے، وہ ذات دوسرے عالَم میں ہے، اس دنیا میں نہیں ہے، جب مکان میں اختلاف ہے تو زمان میں بھی اختلاف ہوسکتا ہے، ممکن ہے وہاں کے زمان میں طول وامتداد زیادہ

ہو بنسبت یہاں کے زمان کے کما يظهر بالتأمل في قصة الإسراء والمعراج والله أعلم.
(الدر المنضود: ۳/۳۳۰)

دوسرا جواب یہ ہے کہ رَدّ روح کا مطلب ہے، جب کوئی حضور ﷺ کو سلام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس سلام کی اطلاع حضور ﷺ کو دے دیتے ہیں، قال ابن الملك: رد الروح كناية عن إعلام الله تعالىٰ إياه بأن فلانا صلى عليه. (بذل: ۷/۵۶۷)

مزید تفصیل کے لیے مرقاۃ المفاتیح: ۳/۱۲، اور الدر المنضود: ۷/۳۳۰ دیکھیے۔

(۲) دوسری حدیث

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ کے بہت سے فرشتے ایسے ہیں جو (زمین میں) پھرتے رہتے ہیں، اور میری امت کی طرف سے مجھے سلام پہنچاتے ہیں۔ (نسائی بحوالہ فضائل درود: ۱۷)

تشریح: ”میری امت کی طرف سے مجھے سلام پہنچاتے ہیں“

آں حضرت ﷺ نے یہ بات گویا خاص طور پر اس امتی کے حق میں فرمائی ہے جو مزار شریف (روضہ اقدس) سے جسمانی طور پر دور ہے، جو امتی مدینہ میں مزار شریف پر حاضر ہوکر سلام پیش کرتا ہے، اس کا سلام آں حضرت ﷺ بلا واسطہ خود سنتے ہیں، فرشتوں کو پہنچانے کی احتیاج نہیں ہوتی، اِس وضاحت کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ حدیث میں ایک تو آں حضرت ﷺ کی حیات دائمی کی طرف اشارہ ہے، دوسرے اس طرف اشارہ ہے کہ آں حضرت ﷺ اپنی امت کی طرف سے سلام پہنچنے پر خوش ہوتے ہیں، اور تیسرے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو بھی امتی آں حضرت ﷺ پر سلام بھیجتا ہے، اس کا وہ سلام ضرور قبول ہوتا ہے، یعنی فرشتے اُس سلام کو قبول کرتے ہیں اور آں حضرت ﷺ تک لے جاتے ہیں اور پھر آں حضرت ﷺ اُس امتی کے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں، جو آپ پر سلام بھیجتا ہے، نیز ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ فرشتے جب کسی امتی کا سلام

آں حضرت ﷺ تک پہنچاتے ہیں تو اُس امتی کا نام لیتے ہیں مثلاً: یارسول اللہ! محمد قطب الدین بن محی الدین، خدمت بابرکت میں سلام عرض کرتا ہے (یا مثلاً محمد تبریز عالم بن فقیر محمد سلیمان، خدمت اقدس میں سلام عرض کرتا ہے) (مظاہر حق جدید: ۱/۶۴۷)

(۳) تیسری حدیث

ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ملا انہوں نے مجھ کو خوش خبری سنائی کہ پروردگارِ عالم فرماتے ہیں: کہ جو شخص آپ پر درود بھیجے گا، میں اُس پر رحمت بھیجوں گا، اور جو شخص آپ پر سلام پڑھے گا، میں اُس پر سلامتی نازل کروں گا، میں نے یہ سن کر سجدۂ شکر ادا کیا۔ (القول البدیع، الباب الثانی: ۱/۱۱۱)

تشریح: جو آدمی حضور ﷺ پر سلام پڑھے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی کا نزول ہوگا، ظاہر سی بات ہے، سلامتی کا جو وسیع مفہوم ہے: یعنی جلبِ منفعت اور دفع مضرت اگر وہ کسی امتی کو حاصل ہو جائے تو اس کے نصیبہ ور ہونے میں کیا شبہ ہے؟

دورد وسلام کی حکمتیں

پہلی حکمت — عقیدۂ توحید کی حفاظت، درود شریف دین کو تحریف سے بچاتا ہے، اُس سے شرک کی جڑ کٹتی ہے، درود (وسلام) بھیجنے سے یہ بات ذہن نشیں ہوتی ہے کہ سید کائنات ﷺ بھی اللہ کی رحمت وعنایت اور نظر وکرم کے محتاج ہیں، اور محتاج ہستی بے نیاز ذات کی شریک وسہیم نہیں ہوسکتی۔

دوسری حکمت — دعاؤں میں قبولیت کی صلاحیت پیدا کرنا۔

تیسری حکمت — نبی ﷺ سے قربِ منزلت۔

چوتھی حکمت — رحمت کے جھونکوں سے استفادہ۔

پانچویں حکمت — روحِ نبوی سے استفادہ۔ (رحمۃ اللہ الواسعۃ: ۴/۳۴۴)

درود وسلام کا شرعی حکم

سورۃ الاحزاب کی مذکورہ بالا آیت کی وجہ سے تمام فقہاء متفق ہیں کہ زندگی میں ایک بار نبی ﷺ پر درود وسلام بھیجنا فرض ہے......پھر امام شافعیؒ کا مذہب اور امام احمدؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ نماز میں قعدہ اخیرہ میں تشہد کے بعد درود شریف پڑھنا فرض ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی اور امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک سنت ہے، اس کو چھوڑ دینے سے بھی نماز ہو جائے گی اور جب بھی نبی ﷺ کا تذکرہ کیا جائے یا ذکر آئے تو ہر دفعہ درود بھیجنا واجب نہیں مستحب ہے، جمہور فقہاء کا یہی مسلک ہے اور ایک مجلس میں بار بار ذکر آئے تو ایک بار درود شریف پڑھنا کافی ہے اور ہر بار بار درود بھیجنا اولیٰ ہے۔ (شرح الشفا:۲/۱۰۷)

روضۂ اقدس پر درود افضل ہے یا سلام؟

روضۂ اقدس پر الصلاۃ علیك یا رسول اللہ افضل ہے یا السلام علیك یا رسول اللہ افضل ہے؟

شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ لکھتے ہیں:

> علامہ باجیؒ کی رائے یہ ہے کہ درود افضل ہے، علامہ سخاویؒ کہتے ہیں: کہ روضۂ اقدس کے پاس کھڑے ہو کر سلام پڑھنا، درود پڑھنے سے افضل ہے؛ کیوں کہ حدیث میں ما من مسلم یسلم عليّ عند قبري آیا ہے......لیکن اس ناکارہ کے نزدیک صلاۃ کا لفظ (یعنی درود) بھی کثرت سے روایات میں ذکر کیا گیا ہے؛ اس لیے بندہ کے خیال میں اگر ہر جگہ درود وسلام دونوں کو جمع کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے، یعنی بجائے السلام علیك یا رسول اللہ، السلام علیك یا نبي اللہ کے، الصلاۃ والسلام علیك یا رسول اللہ، الصلاۃ والسلام علیك یا نبي اللہ اِس

صورت میں علامہ باجیؒ اور علامہ سخاویؒ دونوں کے قول پر عمل ہو جائے گا۔ (خلاصہ فضائل درود شریف:۲۴)

مولف عرض گزار ہے کہ روضۂ اقدس کے علاوہ کہیں اور سے سلام پڑھنا چاہیں تو دونوں کو جمع کر کے الصلاۃ والسلام علی رسول اللہ پڑھیں؛ تا کہ دونوں فضیلتیں حاصل ہو جائیں۔

روضۂ اقدس پر پڑھا جانے والا ایک سلام

السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ، السَّلَامُ عليك يا خِيَرة اللهِ مِن خَلقِه، السلام عليك يا حبيبَ اللهِ، السلام عليك يَا سيدَ المرسلين وخاتم النبيين، السلام عليك وعلى آلك و أصحابك و أهل بيتك وعلى النبيين وسائر الصالحين، أشهد أنك بلّغتَ الرسالةَ، و أدّيتَ الأمانة، ونصحتَ الأمةَ، فجزاك اللهُ عنا أفضل ما جزى رسولا عن أمتِه. (الاذکار:۲۳۴)

صلاۃ وسلام کے الفاظ، غیر انبیاء کے لیے جائز یا ناجائز؟

جمہور علماء کی رائے یہ ہے: کہ ان الفاظ کا استعمال صرف انبیاء کے لیے مخصوص ہے؛ معلوم ہوا کہ جو لوگ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ علیہ السلام لکھتے ہیں وہ ٹھیک نہیں؛ لہٰذا انبیاء کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے لیے ان الفاظ کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے؛ البتہ دوسرے لوگوں کے اسماء کے ساتھ رضی اللہ عنہ، غفر اللہ، رحمہ اللہ وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے جائیں، ہاں اگر انبیاء کے ساتھ ضمناً ان پر درود وسلام بھیج دیا گیا تو جائز ہے، مثلاً صلى الله على محد وعلى آله و أصحابه وسلّم. (مظاہر حق جدید:۱/۷۴۰)

صدیق اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ پر بھی سلام پڑھیے

علامہ سخاوی لکھتے ہیں: جب کوئی مسجد نبوی پہنچ جائے تو قبلہ کی جانب سے قبر شریف پر

حاضر ہو اور بقدر چار ہاتھ فاصلہ سے کھڑا ہو اور نیچی نگاہ رکھتے ہوئے، نہایت خشوع وخضوع اور ادب واحترام کے ساتھ سلام پڑھے (یہ ایک طویل اور جامع سلام ہے، مذکورہ کتاب میں دیکھا جاسکتا ہے) اس کے بعد اپنے نفس کے لیے اور سارے مومنین اور مومنات کے لیے دعا کرے، اس کے بعد حضرات شیخین: حضرت ابوبکر، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر سلام پڑھے اور اُن کے لیے بھی دعا کرے اور اللہ سے اِس کی بھی دعا کرے کہ اللہ جل شانہ ان دونوں حضرات کو بھی اُن کی مساعی جمیلہ جو انہوں نے حضور اقدس ﷺ کی مدد میں خرچ کی ہیں اور جو حضور اقدس ﷺ کے حق کی ادائیگی میں خرچ کی ہیں، ان پر بہتر سے بہتر جزائے خیر عطا فرمائے۔ (القول البدیع: ۱/۲۱۴)

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

> حضور ﷺ پر سلام پڑھنے کے بعد، جس نے سلام کہلوایا ہے، اس کا سلام پہنچائے پھر حضراتِ شیخینؓ کو سلام کرے، پھر دعا کرے۔
>
> ثم يتأخر قدر ذراع إلى جهة يمينه، فيسلم على أبي بكر، ثم يتأخر ذراعاً آخر للسلام على عمرؓ؛ ثم يرجع إلى موقفه الأول قبالة وجه رسول الله ﷺ؛ فيتوسل به في حق نفسه ويتشفع به إلى ربه سبحانه وتعالىٰ ويدعو لنفسه...... (الاذکار: ۲۳۴)

مولف عرض گزار ہے: کہ علامہ سخاویؒ اور علامہ نوویؒ نے جو ادب بتایا ہے، دونوں میں ذرا فرق ہے، علامہ نوویؒ کے مطابق شیخینؓ پر سلام سے فراغت کے بعد اپنے لیے دعا کرے، اور علامہ سخاویؒ کی رائے کے مطابق، حضور ﷺ پر سلام پڑھنے کے بعد دعا کرے، پھر حضرات شیخینؓ پر سلام پڑھے۔

جب تک مدینہ میں قیام ہو خوب سلام عرض کیجیے

مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

> جب تک مدینہ منورہ میں قیام ہو کثرت سے روضۂ اقدس کے

سامنے حاضر ہوکر سلام عرض کیا کرے؛ خصوصاً پانچ نمازوں کے بعد (زبدہ)

مسئلہ: اگر کسی وقت خاص مواجہہ شریف پر حاضری کا موقع نہ ملے تو روضۂ اقدس کے کسی طرف بھی کھڑے ہوکر یا مسجد نبوی میں کسی جگہ میں بھی سلام عرض کرسکتا ہے؛ اگر چہ اُس کی وہ فضیلت نہیں جو سامنے حاضر ہوکر سلام عرض کرنے کی ہے۔

مسئلہ: عورتوں کو بھی روضۂ اقدس کی زیارت اور مواجہہ شریف میں حاضر ہوکر سلام عرض کرنا چاہیے؛ البتہ اُن کے لیے بہتر ہے کہ رات کے وقت حاضر ہوں اور جب زیادہ ازدہام ہوتو کچھ فاصلہ ہی سے سلام عرض کردیں۔ (جواہر الفقہ ۴/۱۷۶)

حضرت رفاعیؒ کا ایک واقعہ

سید احمد کبیر رفاعی رحمہ اللہ جو حضرت غوث پاک کے معاصر ہیں، اُن کا واقعہ ہے کہ جب مزار شریف پر حاضر ہوئے تو عرض کیا: السلام عليك يا جدي (داداجان السلام عليك) جواب مسموع ہوا وعليك السلام يا ولدي (بیٹا! وعليك السلام) اِس پر اُن کو وجد ہوا اور بے اختیار یہ اشعار زبان پر جاری ہوئے۔

فــي حـــالة البُـعـدِ رُوحـي كـنـتُ أرسـلهـا
تــقـبــل الأرض عـــنـي وهــي نـــائبتـي
فهـــذه نـــوبةُ الأشبـــاح قــد حـــضـرتْ
فــا مــدُد يـمـينَك كـي تـحـظى بهـا شَفتـي

ترجمہ: جب ہم دور تھے تو اپنی روح کو اپنا نائب بنا کر بھیج دیا کرتے تھے، وہ روضۂ اقدس ﷺ پر

زمین بوس ہوجایا کرتی تھی، اب جسم کی باری آئی ہے، ذرا اپنے دست مبارک کو بڑھایئے؛ تاکہ میرا لب اس سے بہرہ ورہ ہوسکے اور ہونٹوں کو یہ دولت نصیب ہوجائے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے نقل کیا ہے کہ روضۂ منورہ کے اندر سے ایک نہایت نورانی ہاتھ ظاہر ہوا (جس کے روبرو آفتاب بھی ماند تھا) وہ حضور ﷺ کا دست مبارک تھا، انہوں نے دوڑ کر بوسہ دیا اور بے ہوش ہوگئے، بس ہاتھ غائب ہوگیا مگر کیفیت یہ ہوئی کہ تمام مسجد نبوی ﷺ میں نور ہی نور پھیل گیا، ایسا نور کہ اس کے سامنے آفتاب کی بھی حقیقت نہ تھی اور واقعی آفتاب کی، اُس نور کے سامنے کیا حقیقت ہوتی۔

ایک بزرگ سے جو کہ اس واقعہ میں حاضر تھے کسی نے پوچھا کہ آپ کو رشک تو بہت ہوا ہوگا، فرمایا ہم تو کیا اس وقت ملائکہ کو بھی رشک تھا کہ ہمیں بھی یہ دولت نصیب ہوتی۔

(خطبات حکیم الامت ۴: ۲۰۲/۱، مجمع البحور بحوالہ فتاویٰ رحیمیہ: ۴۴/۳)

سلام پڑھیں بھی اور بھیجیں بھی

جیسے ہم آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، اور کبھی سلام کہلواتے ہیں کہ فلاں سے میرا اسلام کہہ دینا، ایسے ہی حضور ﷺ کو سلام بھیجنا چاہیے مثلاً کوئی حاجی حج کرنے جارہا ہے، اُس سے درخواست کریں کہ اس ناچیز کا ہدیہ سلام حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیجیے گا، اکابر کا یہ معمول تھا اور جو شخص یہ سلام قبول کرلے اس کے ذمہ ضروری ہے کہ وہ سلام حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کرے، یہ ایک امانت ہے، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

هكذا عليه تبليغ السلام إلى حضرة النبي ﷺ عن الذي أمره به.

(شامی: ۵۹۵/۹)

ایک حکایت: حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جو جلیل القدر تابعی اور خلیفۂ راشد ہیں، شام سے مدینہ منورہ کو خاص قاصد بھیجتے تھے کہ ان کی طرف سے روضہ شریف پر حاضر ہوکر سلام عرض کرے۔

(شعب الایمان، رقم: ۳۸۶۹)

درود و سلام پیش کیجیے اور حضور ﷺ کی دعائیں لیجیے

مفتی تقی عثمانی صاحب کا بیان ہے:

بہت سے لوگ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں جا کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ ہمارے حق میں دعا فرما دیجئے، دعا کی درخواست کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، ہاں ایک راستہ ہے وہ یہ کہ ہم درود وسلام کثرت سے بھیجیں، جواب میں حضور اقدس ﷺ ہمارے حق میں دعا فرمائیں گے؛ کیوں کہ درود وسلام حضور ﷺ کی خدمت میں ایک تحفہ اور ہدیہ ہے اور سیرت طیبہ میں یہ بات لکھی ہے کہ جب کوئی شخص حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں کوئی ہدیہ لاتا تو آپ اُس سے بہتر تحفہ پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے؛ تاکہ اس کی مکافات ہو جائے، تو آج اگر ہم درود وسلام بھیجیں گے اور فرشتے جا کر پہنچائیں گے تو غالب گمان یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ اس ہدیہ و تحفہ کا جواب دیں گے اور جوابی ہدیہ، یہ ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ جس طرح اِس بندے نے مجھے ہدیہ بھیجا، اے اللہ اس بندے کی حاجتیں بھی آپ پوری فرما دیں اور اس کی پریشانیاں دور فرما دیں۔ (خلاصہ اصلاحی خطبات: ۷۹/۶)

یا رب صل وسلم دائما أبدا ☆ علی حبیبك خیر الخلق کلهم

اس ادب کو ملحوظ رکھیے

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: بڑا بخیل وہ شخص ہے کہ اُس کے روبرو میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے(۱) اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا جب نام نامی اسم گرامی کوئی اپنی

(۱) ترمذی، رقم: ۳۵۴۶

زبان سے ادا کرے یا کسی سے سنے تو درود وسلام دونوں پڑھنا چاہیے، ہم مسلمانوں سے اس بابت میں بڑی کوتاہی ہوتی ہے، وعظ کی مجلسوں میں، جلسے جلوس اور حدیث کی درس گاہوں میں نہ جانے کتنی بار حضور ﷺ کا نام گرامی آتا ہے اور ہماری زبان خاموش رہتی ہے؛ اس لیے ایسے موقع پر ہمیں درود پڑھنا چاہیے اور اس کا ادنیٰ درجہ ہے ''صلی اللہ علیہ وسلم'' یہ چھوٹا سا جملہ ہے جس میں درود بھی ہے اور سلام بھی، اگر ایک سلام کا بھی جواب آ گیا اور قبول ہو گیا تو اس خوش بختی پر جتنا ناز کیا جائے کم ہے۔

ایک کوتاہی — سزا، تنبیہ اور اصلاح

عموماً جو لوگ لکھنے پڑھنے کا مشغلہ رکھتے ہیں، وہ لوگ جب اپنی تحریروں میں حضور ﷺ کا نام لکھتے ہیں تو ﷺ یا تو لکھتے ہی نہیں یا صرف صلعم یا صرف ؐ بنا دیتے ہیں، یا لکھنے والا تو ﷺ لکھتا ہے؛ لیکن کاتب یا کمپوز کرنے والا حذف کر دیتا ہے، وجہ یا تو وقت کی کمی یا جگہ کی کمی ہوتی ہے؛ یا پھر بے توجہی ہوتی ہے۔

حالاں کہ ادب نبوی اور محبت مصطفیٰ ﷺ اِس امر کے متقاضی ہیں کہ جب اسم مبارک لکھا جائے تو صلاۃ وسلام بھی لکھا جائے یعنی صلی اللہ علیہ وسلم پورا لکھا جائے، رحمتِ خداوندی، مغفرت کا بہانا ڈھونڈھتی ہے، کیا پتہ ہماری بخشش کا یہ بہانا بن جائے، حکایت پڑھیے:

ایک شخص حدیث شریف لکھتا تھا اور بسبب بخل کاغذ کے نام مبارک کے ساتھ دورد شریف نہ لکھتا تھا، اس کے سیدھے ہاتھ کو مرض آکلہ عارض ہوا یعنی ہاتھ اُس کا گل گیا۔

(زادالسعید، اصلاحی نصاب: ۵۵۹)

یا رب صل وسلم دائما أبدا ☆ علی حبیبك خیر الخلق کلهم

وَسَلَّمَ پر چالیس نیکیاں

شیخ ابن حجر مکیؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک شخص صرف ''صلی اللہ علیہ'' پر اکتفا کرتا تھا، وَسَلَّمَ نہ لکھتا تھا، حضور ﷺ نے اُس کو خواب میں ارشاد فرمایا: تو اپنے آپ کو چالیس نیکیوں سے کیوں

محروم رکھتا ہے یعنی "وسلَّم" میں چار حرف ہیں، ہر حرف پر ایک نیکی اور ہر نیکی پر دس گنا ثواب؛ لہٰذا "وسلَّم" میں چالیس نیکیاں ہوئیں۔ (زادالسعید:۵۶۰)

صیغۂ سلام نہ لکھنے پر شکایت

ابراہیم نسفیؒ کہتے ہیں: میں نے نبی کریم ﷺ کی خواب میں زیارت کی، تو میں نے نبی کریم ﷺ کو کچھ اپنے سے مُنقَبِض پایا تو میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں تو حدیث کے خدمت گاروں میں ہوں، اہل سنت سے ہوں، مسافر ہوں، حضور ﷺ نے تبسم فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ جب تو مجھ پر درود بھیجتا ہے تو "سلام" کیوں نہیں بھیجتا، اِس کے بعد سے میرا معمول ہوگیا کہ میں صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے لگا۔ (القول البدیع:۱/۲۵۰)

چناں چہ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

إذا صلّى على النبي ﷺ؛ فليجمع بين الصلاة والتسليم، ولا يقتصر على أحدهما؛ فلا يقل "صلى الله عليه" فقط، ولا "عليه السلام" فقط. (الاذکار:۱۳۷)

حدیث کی قراءت کا ایک استحبابی ادب

حدیث پڑھنے والے بالخصوص اور متعلقات حدیث پڑھنے والے بالعموم: انہیں چاہیے کہ جب حضور ﷺ کا تذکرہ آئے تو معتدل آواز میں حضور ﷺ پر درود وسلام بھیجیں، علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

يستحب لقارئ الحديث وغيره ممن في معناه، إذا ذكر رسول الله ﷺ أن يرفع صوته بالصلاة عليه والتسليم. (الاذکار:۱۳۷)

مولف عرض گزار ہے: اِسی لیے خطیب یا مقرر کو اپنی تقریر سے پہلے خطبہ میں حمد وصلاۃ

کے ساتھ ''سلام'' بھی ملانا چاہیےاور الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين کہنا چاہیے،صرف والصلاة على الأنبياء الخ پر اکتفانہیں کرنا چاہیے؛اِسی طرح دیگر انبیاء کے ناموں کی ساتھ بھی درودوسلام دونوں بڑھانا چاہیے مثلا: حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام،حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام وغیرہ۔

بَسملہ اورحمدلہ کے بعد درودوسلام کی ابتدا کب ہوئی

ابتداءِ رسائل وکتب میں، بعد بسم اللہ اور حمد کے دورِ درودوسلام لکھنا، ابن حجر مکیؒ نے لکھا ہے کہ یہ رسم، اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں جاری ہوئی، خود انہوں نے اپنے خطوط میں اِسی طرح لکھا۔(زادالسعید دراصلاحی نصاب:۵۵۹)

جب خطبہ میں نام مبارک آجائے

جب خطبہ میں حضور اقدس ﷺ کا نام مبارک آوے یا خطیب یہ آیت پڑھے يا أيها الذين آمنوا صلوا عليه وسلموا تسليما تو اپنے دل میں بلاجنبش زبان(۱) کے ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہہ لے۔(فضائل درود شریف:۸۶بحوالہ درمختار)

سلام کے احادیث سے منقول صیغے

درود وسلام کے صیغے تو بہت ہیں، مگر بقول حضرت تھانویؒ: جو صیغے، درود وسلام کے احادیث مرفوعہ حقیقیہ یا حکمیہ میں وارد ہیں، ان میں سے چالیس صیغے ہیں، جن میں ۲۵ صلاۃ کے ہیں؛ جب کہ ۱۵ سلام کے ہیں، ان سب کی مکمل تفصیل کے لیے حضرت تھانویؒ کی زادالسعید اور شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ کی فضائل اعمال میں شامل فضائل درود شریف دیکھیں، اور عربی میں علامہ سخاویؒ کی القول البديع في الصلاة على الحبيب الشفيع جس میں تمام درودوسلام جمع کیے گئے ہیں، دیکھیں۔ مولف، کتاب کی مناسبت سے صرف سلام کے دوتین صیغے حصولِ برکت

(۱) دکن کے بہت سے علاقوں میں مساجد کے اندر دورانِ خطبہ جب خطیب یہ آیت پڑھتا ہے تو اکثر مصلی زور سے صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے ہیں؛ حالاں کہ آہستہ پڑھنے کا حکم ہے۔

کے لیے لکھ دینا مناسب سمجھتا ہے۔

(۱) التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ والصَّلَوَاتُ والطَّيِّبَاتُ السَّلَامُ عَلَيكَ أيُّهَا النَّبِيُّ ورحمةُ اللّٰهِ وبَرَكَاتُه. السَّلَامُ عَلَيْنَا وعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ أَشْهَدُ أنْ لَّا إلٰهَ إلَّا اللّٰهُ وأشْهَدُ أنَّ محمداً عَبْدُه ورسولُه.

(۲) التحياتُ الطَّيباتُ والصلواتُ. والمُلْكُ لِلّٰه. السلامُ عليك أيها النبي ورحمة اللّٰه وبركاته.

(۳) بسم اللّٰه والصلاةُ والسلامُ على رسولِ اللّٰه.

ترتیب وار ترجمہ

(۱) ساری عبادات قولیہ اور عبادات بدنیہ اور عبادات مالیہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، سلام ہو آپ پر اے نبی (ﷺ) اور اللہ کی رحمت اور اُس کی برکتیں آپ پر نازل ہوں، سلام ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر، میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ بے شک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور شہادت دیتا ہوں کہ بے شک سیدنا محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

(۲) ساری عبادات قولیہ اور عبادات بدنیہ اور عبادت مالیہ اور ملک اللہ کے لیے ہیں، سلام ہو آپ پر اے نبی اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔

(۳) اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں اور درود وسلام ہو اللہ کے رسول پر۔

حرفِ آخر

مولف کا قلم صرف یہ لکھے گا اور اس کے سوا کچھ نہیں لکھ سکتا کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ اُس نے اِس ناچیز سے جو حقیقت میں ناچیز بھی لکھنے کے لائق نہیں، یہ کام لیا؛ اگر مولف اس کے شکر میں زندگی بھر اور زندگی کے ہر لمحے میں سجدۂ شکر بجالاتا رہے تو وہ حقِ شکر یہ ادا

کرنے والا کہلائے گا؟ ہرگز نہیں، بس اللهم لك الحمد ولك الشكر أولا وآخراً ظاهراً وباطنا دائما أبداً.

مولف نے اپنی تالیف کا آغاز سلام سے کیا تھا جو اللہ کا ایک ''نام'' ہے اور تالیف کا اختتام قصداً حضور ﷺ پر ''سلام'' کے ذریعہ کرر ہا ہے؛ کیوں کہ عرقِ انفعال کے قطرات کو شانِ کریمی موتی سمجھ کر چن لیتی ہے، کیا میں اِس کا امیدوار بن سکتا ہوں؟ معلوم نہیں؛ لیکن امیدو آس کا دامن چھوڑنا گناہ ہے، کریم کے در سے کوئی خالی دامن کبھی تھوڑے ہی گیا ہے اور وہ تو کریموں کا کریم ہے، بس اخیر میں۔

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا ☆ عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

يَا رَبِّ بِالْمُصْطَفٰى بَلِّغْ مَقَاصِدَنَا ☆ فَاغْفِرْ لَنَا مَا مَضٰى يَا وَاسِعَ الْكَرَمِ

والحمد لله أولًا وآخراً وما توفيقي إلا بالله

محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی (عفا اللہ عنہ)

مقیم حال: دار العلوم حیدر آباد

۱۰ر جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ

۳۱ر مارچ ۲۰۱۵ء (۱۵-۷ بجے صبح سہ شنبہ)

فهرست مراجع (أَلِفْبَائِياً)

شمار	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	وفات	مطبوعہ
۱	القرآن الكريم			
۲	أحكام القرآن	المفتي شفيع العثمانيؒ	١٣٩٦هـ	إدارة القرآن والعلوم الإسلاميه كراتشي
۳	أحكام القرآن	أحمد بن علي الرازيؒ	٣٧٠هـ	دارالكتب العلمية بيروت
۴	أحكام القرآن	محمد بن عبد الله بن العربيؒ	٥٤٣هـ	دارالكتب العلمية بيروت
۵	الأدب المفرد	محمد بن اسماعيل البخاريؒ	٢٥٦هـ	دارالكتب العلمية بيروت
۶	الأذكار	محي الدين يحيىٰ بن شرف النوويؒ	٦٧٦هـ	دارالسلام الرياض
۷	إعلاء السنن	ظفر أحمد التهانويؒ	١٣٩٤هـ	المكتبة الأشرفية ديوبند
۸	إرشاد الساري	شهاب الدين أحمد بن محمد القسطلانيؒ	٩٢٣هـ	دارالكتب العلمية بيروت
۹	أوجز المسالك	الشيخ زكريا الكاندهلويؒ	١٤٠٢هـ	مركز الشيخ أبي الحسن الندوي، أعظم جراه
۱۰	الأبواب والتراجم	// // //	//	// // //
۱۱	الآداب الشرعية	محمد بن مفلح الحنبليؒ	٧٦٣هـ	المكتبة الشاملة
۱۲	الأشباه والنظائر	زين الدين بن إبراهيم ابن نجيمؒ	٩٧٠هـ	زكريا بك ڈپو ديوبند
۱۳	الأشباه والنظائر	جلال الدين السيوطيؒ	٩١١هـ	دارالكتب العلمية بيروت (١٩٩٠ء)
۱۴	الاختيار لتعليل..	عبد الله بن محمود الموصليؒ	٦٨٣هـ	المكتبة الشاملة
۱۵	احسن الفتاویٰ	مفتی رشید احمدؒ	۲۰۰۱ء	دارالاشاعت دیوبند
۱۶	امداد الاحکام	مولانا ظفر احمد عثمانیؒ مفتی عبدالکریم گمتھلویؒ	۱۳۹۴ھ ۱۳۶۸ھ	زکریا بک ڈپو دیوبند
۱۷	امدادالفتاویٰ	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۳۶۲ھ	مکتبہ دارالسلام کراچی
۱۸	اغلاط العوام (مکمل)	// // //	//	مکتبہ تھانوی دیوبند
۱۹	احکام اسلام عقل...	// // //	//	دارالکتاب دیوبند

۲۰	اسلامی تہذیب	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۳۶۲ھ	ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان
۲۱	اصلاحی خطبات	مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہ		دارالکتاب دیوبند
۲۲	اصلاحی بیانات	مفتی عبدالرؤف سکھروی		مکتبہ جاوید دیوبند (۲۰۱۳ء)
۲۳	آپ کے مسائل...	مولانا یوسف لدھیانویؒ	۱۳۹۷ھ	کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
۲۴	اختلافِ امت اور....	مولانا یوسف لدھیانویؒ	۱۳۹۷ھ	
۲۵	انوارِ رحمت	مفتی شبیر احمد قاسمی صاحب		فیصل پبلیکیشنز دیوبند
۲۶	بدائع الفوائد	محمد بن أبي بكر (ابن القيمؒ)	٧٥١ھ	دارالكتاب العربي بيروت
۲۷	بدائع الصنائع	علاء الدين بن سعود الكاسانيؒ	٥٨٧ھ	دارالكتاب ديوبند
۲۸	بذل المجهود	الشيخ خليل أحمد سهارنفوريؒ	١٣٤٦ھ	مركز الشيخ أبي الحسن الندوي، أعظم جراه
۲۹	البحر الرائق	زين الدين بن إبراهيم ابن نجيمؒ	٩٧٠ھ	زكريا بكڈپو ديوبند (١٩٩٨ء)
۳۰	اشاعتی بہشتی زیور	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۳۶۲ھ	ادارہ اشاعت دینیات، نئی دہلی
۳۱	الترغيب والترهيب	حافظ عبد العظيم بن عبد القوي المنذريؒ	٦٥٦ھ	إحياء التراث الإسلامي، بيروت
۳۲	تفسير القرطبي	محمد بن أحمد القرطبيؒ	٦٧١ھ	دارالكتب العلمية
۳۳	تفسير ابن كثير	إسماعيل بن عمر بن كثيرؒ	٧٧٤ھ	دارالكتب العلمية، بيروت
۳۴	التعليق الممجد مع مؤطا	مولانا عبد الحئ لكهنويؒ	١٣٠٤ھ	أشرفي بك ڈپو ديوبند
۳۵	تفسیر انوار القرآن	مولانا محمد نعیم صاحبؒ		مکتبہ انوار القرآن، دیوبند
۳۶	تحفة الأحوذي	محمد عبد الرحمان المبارك فوريؒ	١٣٥٢ھ	دارالكتب العلمية، بيروت
۳۷	تفسير الأحلام	محمد بن سيرينؒ	١١٠ھ	المكتبة الشاملة
۳۸	تبيين الحقائق	عثمان بن علي الزيلعيؒ	٧٤٣ھ	مكتبة إمدادية، ملتان
۳۹	تكملة فتح الملهم	المفتي تقي العثماني حفظه الله		المكتبة الأشرفية ديوبند
۴۰	تحفۃ الالمعی	مفتی سعید احمد پالن پوری زید مجدہ		مکتبہ حجاز دیوبند
۴۱	تحفۃ القاری	// // //		// //
۴۲	تسہیل المواعظ	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۳۶۲ھ	مکتبہ تھانوی دیوبند (۱۹۸۴ء)
۴۳	جامع الترمذي	محمد بن عيسىٰ الترمذيؒ	٢٧٩ھ	مكتبة الاتحاد، ديوبند
۴۴	جواہر الفقہ	مفتی شفیع صاحب عثمانیؒ	۱۳۹۶ھ	مکتبہ تفسیر القرآن، سید منزل دیوبند

۴۵	حجة الله البالغة	الشاه ولي الله المحدث الدهلويؒ	١١٧٦هـ	المكتبة الأشرفية ديوبند
۴۶	خطباتِ حکیم الامت	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۳۶۲ھ	مکتبہ اشرفیہ محمد علی روڈ ممبئی، (۱۴۱۹ھ)
۴۷	الدر المنضود	مولانا عاقل صاحب زید مجدہ		مکتبہ الشیخ سہارن پور
۴۸	الدعاء المسنون	مفتی ارشاد صاحبؒ	۲۰۰۹ء	ادارہ اسلامیات، ممبئی (۲۰۰۶ء)
۴۹	رحمۃ اللہ الواسعۃ	مفتی سعید احمد پالن پوری زید مجدہ		مکتبہ حجاز دیوبند
۵۰	روح المعاني	محمود بن عبد الله الآلوسيؒ	١٢٧٠هـ	دار الكتب العلمية، بيروت
۵۱	رد المحتار (شامی)	محمد أمين المعروف بابن عابدينؒ	١٢٥٢هـ	زكريا بك ڈپو ديوبند (١٩٩٦ء)
۵۲	زاد السعید	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۳۶۲ھ	مکتبہ فیض اصغر سہارن پور
۵۳	زاد المعاد	محمد بن أبي بكر (ابن القيمؒ)	٧٥١هـ	مؤسسة الرسالة، بيروت
۵۴				
۵۵	سنن أبي داؤد	أبوداؤد سليمان بن أشعثؒ	٢٧٥هـ	ياسر نديم اينڈ كمپنی، ديوبند
۵۶	سنن ابن ماجة	أبو عبد الله محمد بن يزيدؒ	٢٧٣هـ	// //
۵۷	السنن الكبرىٰ	أبو بكر أحمد بن الحسين البيهقيؒ	٤٥٨هـ	دار الكتب العلمية، بيروت
۵۸	السنن الكبرى	أحمد بن شعيب النسائيؒ	٣٠٣هـ	المكتبة الشاملة
۵۹	شعب الإيمان	أبو بكر أحمد بن الحسين البيهقيؒ	٤٥٨هـ	دار الكتب العلمية، بيروت (٢٠٠٠ء)
۶۰	شرح ابن بطال	علي بن خلف بن عبد الملك ابن بطالؒ	٤٤٩هـ	دار الكتب العلمية، بيروت
۶۱	شرح السنة	محي السنة الحسين بن مسعود البغويؒ	٥١٠هـ	المكتب الإسلامي، بيروت
۶۲	شرح الطيبي	شرف الدين حسين بن محمد الطيبيؒ	٧٤٣هـ	زكريا بك ڈپو، ديوبند
۶۳	شرح الصدور	جلال الدين السيوطيؒ	٩١١هـ	دار المعرفة لبنان (١٩٩٦ء)
۶۴	شرح الشفاء	علي بن محمد الملا القاريؒ	١٠١٤هـ	دار الكتب العلمية، بيروت (١٤٢١هـ)
۶۵	الصحيح للبخاري	محمد بن اسماعيل البخاريؒ	٢٥٦هـ	مختار اينڈ كمپنی، ديوبند
۶۶	الصحيح للمسلم	مسلم بن حجاجؒ	٢٦١هـ	ياسر نديم اينڈ كمپنی، ديوبند
۶۷	عمدة القاري	علامه بدر الدين العينيؒ	٨٥٥هـ	زكريا بك ڈپو، ديوبند
۶۸	عون المعبود	محمد أشرف بن أمير بن علي عظيم آباديؒ	١٣٢٩هـ	دار الكتب العلمية، بيروت (١٩٩٠ء)
۶۹	العرف الشذي....	العلامة أنور شاه الكشميريؒ	١٣٥٢هـ	مكتبة الاتحاد، ديوبند

۷۰	عمل اليوم والليلة	أحمد بن محمد ابن السنيؒ	٣٦٤	دار القبلة، جدة
۷۱	فتح الباري	حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلانيؒ	٨٥٢ھ	دار السلام ، الرياض (١٤٢١ھ)
۷۲	فيض الباري	العلامة محمد أنور شاه الكشميريؒ	١٣٥٢ھ	المكتبة الشاملة
۷۳	الفقه الإسلامي و..	الأستاذ وهبة الزحيلي		دار الفكر المعاصر، بيروت
۷۴	فتاوىٰ عالمگيري	الشيخ نظام الدين وجماعة من علماء الهند		مكتبة زكريا ، ديوبند
۷۵	فتاویٰ محمودیہ	مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ	۱۴۱۷ھ	مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند
۷۶	فتاویٰ رشیدیہ	حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	۱۳۲۳ھ	مکتبہ محمودیہ سہارن پور
۷۷	فتاویٰ رحیمیہ	مفتی عبد الرحیم لاجپوریؒ	۱۴۲۴ھ	مکتبہ رحمانیہ لاہور
۷۸	فتاویٰ ریاض العلوم	مفتیان مدرسہ ریاض العلوم		مدرسہ عربیہ ریاض العلوم (۱۴۳۲ھ)
۷۹	فضائل اعمال، عکسی	شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ	۱۴۰۲ھ	ادارہ اشاعتِ دینیات، نئی دہلی
۸۰	فتاویٰ دار الافتاء دار العلوم دیوبند	مفتیان دار العلوم دیوبند		www.darulifta-deoband.org
۸۱	القول البديع	شمس الدين محمد بن عبد الرحمان السخاويؒ	٩٠٢ھ	المكتبة الشاملة
۸۲	كنز العمال	علاء الدين علي متقيؒ	٩٧٥ھ	المكتبة الشاملة
۸۳	المنتقىٰ شرح المؤطا	أبو الوليد سليمان بن خلف الباجيؒ	٤٧٤ھ	دار الكتاب العربي، بيروت (١٩٨٣ء)
۸۴	کفایت المفتی	مفتی کفایت اللہ صاحبؒ	۱۳۷۲ھ	مکتبہ امدادیہ پاکستان
۸۵	کتاب الفتاویٰ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی زید مجدہ		کتب خانہ نعیمیہ (۲۰۰۵ء)
۸۶	لسان العرب	العلامة ابن منظورؒ	٧١١ھ	دار إحياء التراث العربي
۸۷	معارف القرآن	مفتی شفیع عثمانی صاحبؒ	۱۳۹۶ھ	فرید بک ڈپو، دہلی
۸۸	مشكاة المصابيح	محمد بن عبد الله الخطيب التبريزيؒ	٧٤١ھ	یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند
۸۹	مرقاة المفاتيح	علي بن محمد الملاّ القاريؒ	١٠١٤ھ	مكتبة إمدادية، پاكستان
۹۰	المعجم الكبير	سليمان بن أحمد الطبرانيؒ	٣٦٠ھ	المكتبة الشاملة
۹۱	المعجم الأوسط	سليمان بن أحمد الطبرانيؒ	٣٦٠ھ	المكتبة الشاملة
۹۲	مسند الشهاب ...	محمد بن سلامة القضاعيؒ	٤٥٤ھ	مؤسسة الرسالة بيروت
۹۳	المبسوط	شمس الدين السرخسيؒ	٤٩٠ھ	دار المعرفة، بيروت

۹۴	ميزان الاعتدال	محمد بن أحمد بن عثمان الذهبيؒ	٧٤٨هـ	دار المعرفة، بيروت
۹۵	مظاہر حق جدید	علامہ نواب محمد قطب الدین خانؒ	۱۲۸۹ھ	ادارہ اسلامیات، دیوبند
۹۶	معارف الحدیث	مولانا منظور نعمانیؒ	۱۴۱۷ھ	الفرقان بک ڈپو لکھنؤ
۹۷	مواہب ربانیہ	شاہ حکیم محمد اخترؒ	۲۰۱۳ء	مکتبہ اشرفیہ، ممبئی (۱۴۱۹ھ)
۹۸	ملفوظات فقیہ الامت	افادات: مفتی محمود حسن گنگوہیؒ	۱۴۱۷ھ	زمزم بک ڈپو، دیوبند (۱۹۹۲ء)
۹۹	المصنّف في الأحاديث والآثار	حافظ عبد الله بن محمد بن أبي شيبةؒ	٢٣٥هـ	المكتبة التجارية، بيروت
۱۰۰	المستدرك للحاكم	الحاكم محمد بن عبد الله النيسابوريؒ	٤٠٥هـ	المكتبة الشاملة
۱۰۱	مسند أبي يعلىٰ	أبو يعلى أحمد بن علي الموصليؒ	٣٠٧هـ	دار المأمون للتراث، دمشق
۱۰۲	نزهة المتقين	الدكتور مصطفى وغيرهم		مؤسسة الرسالة، بيروت (١٩٩٣ء)
۱۰۳	نصب الراية	جمال الدين أبومحمد الزيلعيؒ	٧٦٢هـ	دار نشر الكتب الإسلامية، پاكستان

سلام سے متعلق کچھ خاص کتابیں

أحكام السلام والمصافحة بن الجنسين	رياض بن محمد المُسَيميرى	المكتبة الشاملة
أحكام السلام	عبد السلام بن برجسؒ م: ١٤٢٥هـ	المكتبة الشاملة
من أدب الإسلام	الشيخ عبد الفتاح أبوغدةؒ م: ١٤١٧هـ	
اہمیتِ سلام وملاقات	مولانا افروز عالم قاسمی	دارالفقہ قاسمیہ دہلی (۱۹۹۱ء)
سلام کی اہمیت وحیثیت	مفتی حبیب اللہ قاسمی چمپارنی	مکتبۃ الحبیب سنجر پور، اعظم گڈھ
مسائل وآدابِ ملاقات	مولانا رفعت قاسمی	مکتبہ رضی دیوبند
سلام کے احکام وفضائل	الشیخ عبدالولی حقانی	المکتبۃ الکریمیۃ، پاکستان
سلام اور مصافحہ کے فضائل ومسائل	محمد اختر صدیقی	ادارہ تبلیغِ اسلام جام پور، پاکستان

مولف کے کوائف

نام :	محمد تبریز عالم
تاریخ پیدائش :	یکم فروری ۱۹۸۵ء
آبائی وطن :	B.N منزل، نیوا یریا، ڈہری آن سون، ضلع رُہتاس (بہار)
ابتدائی تعلیم :	(۱) مدرسہ روح المسلمین، ڈہری (۲) مدرسہ فلاح الدارین، ڈہری (۳) مظہر العلوم بنارس (۱۴۱۴ تا ۱۴۲۲ھ)
چہارم تا دورۂ حدیث :	ریاض العلوم گورینی جون پور (۱۴۲۳ تا ۱۴۲۶ھ)
مکرر دورۂ حدیث :	دارالعلوم دیوبند ۱۴۲۷ ھ
تکمیلِ ادب عربی :	دارالعلوم دیوبند ۱۴۲۸ ھ
تکمیلِ افتاء :	دارالعلوم دیوبند ۱۴۲۹ ھ (اول پوزیشن)
تدریب المعلمین (معین مدرس) :	دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۰ تا ۱۴۳۱ ھ
تدریس :	دارالعلوم حیدرآباد ۱۴۳۲ھ تا حال و اِلی ماشاء اللہ تعالیٰ
تالیف :	اسلام کا نظامِ سلام ومصافحہ، متعدد کتب زیرِ ترتیب، اخبار ورسائل میں مختلف موضوعات سے متعلق درجنوں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔
رابطے کے لیے :	09631337468, 07207326739
ای میل :	mtalam800@gmail.com